ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اپریل 2013
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

جلد 43 • شمارہ 04 • اپریل 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

سیاسی موسم کے آغاز کے ہمراہ اپریل کا شمارہ حاضر خدمت ہے۔ ایک معجزہ سا ہوا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک منتخب جمہوری اسمبلی اور حکومت نے تمام تر تو تکار، کھینچا تانی اور شعلہ نوائی کے باوجود اپنی آئینی مدت پوری کی اور اب قوم نئے انتخابات کے لیے تیار ہے۔ کاش حزب اقتدار و اختلاف مل کر نگراں وزیر اعظم منتخب کر لیتے تو یہ اس جمہوری دور کا روشن اختتام ہوتا۔ دونوں نے مشاورت کی، پارلیمانی کمیٹی بھی بنی لیکن بات نہ بن سکی۔ آخر کار گیند الیکشن کمیشن کے آئینی کورٹ میں چلی گئی جہاں پیپلز پارٹی کے نامزد کیے ہوئے کھوسو صاحب کثرت رائے سے نگرانی کے منصب کے سزاوار قرار پائے۔ یہ کیوں ہوتا ہے کہ اقتدار و اختلاف والے مل جل کر بڑے فیصلے کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور یوں تیسری قوت فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ شکر ہے رب العزت کا کہ اس بار یہ تیسری قوت آئینی تھی اور اس کے فیصلے پر حزب اختلاف نے سرِتسلیم خم کر دیا۔ امید کی جانی چاہیے کہ حالاتِ حاضرہ اور امن و امان کے موجودہ پیش منظر میں انتخابی نتائج کو بھی ایسی ہی خوش دلی سے قبول کر لیا جائے گا۔ دھونس، دھاندلی، جانب داری وغیرہ کے روایتی الزامات اس خطے میں ہر حریف کا انتخابی حربہ ہوتے ہیں، کچھ مارکٹائی بھی ہو جاتی ہے۔ انہیں نتائج پر ہرگز اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری دعا ہے کہ گزرے ہوئے پانچ سال جمہوری دور کا تسلسل دس، پندرہ سال... بلکہ ہمیشہ چلتا رہے۔ ووٹ دینے والوں نے سمجھ داری کا ثبوت دیا تو ہر بار ہمیں بہتر سے بہتر قیادت میسر آتی رہے گی۔ جانے والوں کی خامیوں اور خرابیوں کے بجائے آنے والوں کی نیک نامی اور بے لوثی ہمارا ہدف ہونا چاہیے۔ انتخابات کی چھلنی اسی طرح مضبوط رہ سکتی ہے۔

آئیے اب اس چھلنی سے گزر کر چلتے ہیں اپنی تلخ و شیریں محفل میں۔

کوٹلی آزاد کشمیر سے فہد علی جنجوعہ کی جذباتیت ''خلافِ معمول جاسوسی خاصا لیٹ یعنی آٹھ تاریخ کو موصول ہوا۔ حسب معمول سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی جہاں ٹائٹل کی بالائی سطح پر ایک آدمی جس کی شکل بالی ووڈ کی پرانی فلموں کے ہیرو سے ملتی جلتی تھی جو مضروب تھا اور فون کان سے لگائے شاید 1122 یا 15 پر کال کر رہا تھا۔ نیچے ایک ان دیکھا آدمی جس کے صرف ہاتھ نظر آ رہے تھے، پستول میں گولیاں لوڈ کر رہا تھا اور صنفِ نازک ہمیشہ کی طرح ادائے دلبری سے مسکرائے جا رہی تھی اور کئی دلوں پر بجلیاں گرا رہی تھی۔ وہ شاید اس صورتِ حال کو انجوائے کر رہی تھی۔ دیدہ زیب فہرست کو دیکھا اور حسب معمول چیں بہ جبیں میں جا کر دم لیا۔ سب سے پہلے انکل کا اداریہ پڑھا جہاں پر حسب معمول انہوں نے ہمارے معاشرے کے ناسوروں کا ذکر کیا ہوا تھا۔ کرسیٔ صدارت اس مرتبہ صنفِ نازک کے حصے میں آئی۔ پتا نہیں صدارت کے سلسلے میں صنفِ وجاہت کے ساتھ کیوں امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے؟ بہرحال دل کڑا کر کے آصفہ صاحبہ کو مبارک باد دے دیتے ہیں۔ آصفہ صاحبہ ہماری طرف سے ڈھیروں مبارک باد قبول کیجیے۔ نعیم اللہ صاحب! آپ کو بلقیس خان کا ماہ ایمان کی خوشامد سے کیا لینا دینا اور ویسے بھی آپ کو پتا ہے کہ عورتیں، مردوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی خوشامدی ہوتی ہیں۔ ندا مغل صاحبہ! آپ نے جو مشورہ بندۂ ناچیز کو دیا ہے، بندۂ ناچیز اس پر ضرور عمل کرے گا۔ حماد فرہاد صاحب کے بارے میں جان کر دکھ ہوا کہ وہ سزائے موت کے قیدی ہیں۔ بہرحال ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ صبا گل صاحبہ کا خط پڑھ کر آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میری بہن آپ کو خود پر فخر ہونا چاہیے کہ آپ ایک شہید کی بیٹی ہیں۔ اب کچھ بات ہو جائے اس ماہ کے فن پاروں کی۔ اس مرتبہ خلافِ معمول آغاز گرداب سے کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ گرداب کی قسط کا شدت سے انتظار تھا بلکہ کیونکہ جاسوسی دن کو ہی موصول ہو گیا تھا۔ اس لیے للکار کو رات کے لیے بچا کر رکھا کیونکہ رات کو تنہائی میں للکار کے پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ بات ہو رہی تھی گرداب کی۔ گرداب کی یہ قسط قدرے بہتر تھی۔ اسما قادری صاحبہ نے منظر نگاری کے ذریعے ہمیں پڑوسی ملک کی سیر کروانے کی کوشش کی اور ان کی یہ کوشش قدرے بارآور ثابت ہوئی۔ مغل صاحب کی للکار، للکارتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے کہ کوئی ہمسا ہو تو سامنے آئے۔ فی زمانہ اگر ہمیں کسی چیز کا شدت سے انتظار ہوتا ہے تو وہ ہے للکار کی اگلی قسط کا۔ اس ماہ کی قسط تو ایسا مزہ دے گئی کہ کچھ مت پوچھیں۔ لگتا ہے مغل صاحب اب اسٹوری کو وائنڈ اپ کرنے لگے ہیں کیونکہ کہانی کے جو دو مرکزی ولن تھے وہ تو اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ میرا تو خیال تھا کہ تابی، سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے کے ساتھ بلی، چوہے والا کھیل کھیلے گا اور گھمسان کا رن پڑے گا لیکن مغل صاحب نے تمام قارئین کو یقیناً ششدر کر دیا ہے۔ ابتدائی صفحات پر سلیم فاروقی بلیک چیک کے ساتھ حاضر تھے اور ہمیشہ کی طرح ان کی تحریر مار دھاڑ سے بھرپور تھی۔ علی حسن چانڈیو ایک روایتی وڈیرا ثابت ہوا جسے ہوس زر نے اس قدر اندھا کر دیا کہ وہ اپنی ہی اولاد کا دشمن بن گیا۔ بہرحال، اس کا انجام عبرت ناک ہوا۔ کچھ بات ہو جائے اس ماہ کے جاسوسی کے قوسِ قزح کے رنگوں کی تو سب سے پہلے بات ہو جائے پہلے رنگ مقدر کا سوداگر کی۔ مختار آزاد کی یہ تحریر درمیانے درجے کی تھی۔ منیر راجی اور شنکر دیال نے سیموئل شائے کی موت کے راز سے پردہ اٹھایا۔ سیموئل شائے نے شاید خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ سیموئل شائے کے پاس عزت، شہرت، دولت اور صحت بھی تھی لیکن اس کی مزید چاہ ختم نہ ہوئی اور اسے اس کی یہ چاہ...... موت کے اندھیروں میں لے گئی۔ کہانی کا پلاٹ نہایت اچھوتا اور یادگار تھا۔ سرورق کا دوسرا رنگ جو میرے نزدیک رنگوں میں سے نمبر ایک تھا قدرے بہتر لگا۔ شرمات زن، زر اور زمین کے گرد گھومتی تحریر تھی۔ اگر اس ماہ کے مختصر فن پاروں کی بات کی جائے تو سب سے زیادہ متاثر کن تحریر کاشف زبیر صاحب کی نجات تھی۔ کاشف صاحب سسپنس، تھرل اور ہارر لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ مارٹی نے اپنی اور لیزا کی جان بچائی اور اپنی ماں کے قتل کا بدلہ بھی لے لیا۔ یہ اسٹوری انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں پر روشنی ڈال رہی تھی۔ منظر امام کی مردہ قاتل کا نام پڑھ کر محسوس ہوا کہ ایک دلچسپ

تحریر ہوگی لیکن وہ دلچسپی جس کے ہم متلاشی تھے کہیں نظر نہ آئی۔ سلیم انور کی دل گرفت ایک اچھی تحریر تھی۔ کہانی میں جذباتیت کے عنصر کو نمایاں کیا گیا تھا۔ گناہ بے لذت کچھ خاص متاثر نہ کر پائی۔ میر بنا راض کی خراج جنگ نے ہمیں دوسری جنگ عظیم کے دور میں پہنچا دیا۔ کہانی کو پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے دوسری جنگ عظیم کے موضوع پر ہالی ووڈ کی کوئی مووی دیکھ رہے ہیں۔ خراج جنگ کا اینڈ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کارل اگر چاہتا تو اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن اس کی محبت اس کی آنکھوں سے دور چلی جائے اور وہ زندہ رہے تو ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی جان کی پروا نہ کی اور اپنی محبت اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ محبت کیا ہے؟ کیوں کوئی شخص محبت میں زندگی کی پروا بھی نہیں کرتا۔ یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت کی ہو۔ میں یہ دکھ بہتر طور پر جان سکتا ہوں کیونکہ...''

لاہور سے محمد اشفاق قریشی کی داد اپروری ''جاسوسی ڈائجسٹ مارچ زیر مطالعہ ہے۔ چٹکی، نکتہ چینی کے لیے کچھ خیالات حاضر ہیں۔ فجر کی نماز پڑھ کر میں غنودگی میں لیٹ جاتا ہوں پھر مجھے اوپری منزل سے اپنے پوتوں اور پوتی کی کھٹ پٹ، بھاگم دوڑ کی آوازیں آتی ہیں۔ وہ اسکول جانے کی تیاری میں ہوتے ہیں جب آنکھوں میں ان کی آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے صبح دم پرندے چہچہا رہے ہوں۔ میں مسکراتے ہوئے اٹھتا ہوں اور ان کے پیچھے آنے کا انتظار کرتا ہوں۔ اسی طرح جب میں جاسوسی کو کھولتا ہوں اور خطوں کی محفل میں جاتا ہوں تو بھی لگتا ہے جیسے پرندے چہچہا رہے ہوں۔ میں مسکراتے ہوئے نام پڑھتا جاتا ہوں اور آپ کی کاوش کو سراہتا ہوں کہ آپ نے کتنی شگفتہ محفل سجائی ہے اور نئی پود کو پاکیزہ ماحول عطا کیا ہے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں بارہا تربیلا ڈیم جاتا ہوں۔ لاہور سے موٹروے کے سفر میں راستے میں حافظ آباد کو جانے کا اشارہ آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اس نگر میں ایک دختر رہتی ہے جو کسی بھائی کو معاف نہیں کرتی اور جنوں والے بھائی کی خوب خبر لیتی ہے۔ اس ماہ وہ بھی پردہ ہوئی۔ ماہا ایمان! مانا کہ تم کسی سے کم نہیں ہو مگر لازم ہے کہ بات کہنے اور سننے میں شگفتگی بھی ہو۔ سال ہا سال پہلے ایک ڈیم کے سلسلے میں، میں جنوں گیا تھا۔ تب معلوم نہ تھا کہ اس نگر میں ایک ذہین بیٹا بھی ہوگا جو محفل میں طرفہ اور ہر دلعزیز ہوگا۔ محمد ہمایوں سعید راج نے ماہا ایمان پر اب تک اتنی گل پاشی کی ہے کہ میں نے سوچا سعید راج کا نام اب سعید بہار راج ہونا چاہیے۔ مغل صاحب نے جو اپنی کہانی للکار کا آغاز کیا تھا، وہ راوی روڈ لاہور اور موت کے کنوئیں کے ذکر سے تھا۔ یہ پچاس کی دہائی کا زمانہ تھا۔ میں کہانی کا گرویدہ ہوا تھا کہ سب کچھ آنکھوں دیکھا لگتا تھا۔ تاہم بعد میں ان سے کچھ لغزشیں بھی ہوئیں۔ کہانی اپنے معیار سے گر گئی تھی۔ خیر ان کی کاوش اور پیشکش قابل تعریف ہے کہ ہم نے بھارت کی ریاستوں کی سیر کرلی۔ اب کہانی کا یہ عالم ہے کہ بقول غالب... نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ اسما قادری کا نام متبرک لگتا ہے اس لیے ادب ملحوظ خاطر ہے۔ اتنی عرض ہے کہ جو بات دو سطروں میں کہی جاسکتی ہے، وہ دو لمبے پیراگراف میں کہتی ہیں۔ ترجمہ شدہ کہانیاں خوب ہوتی ہیں۔ کوئی پریشانی ہو تو میں ان کا سہارا لیتا ہوں اور نئے ماحول میں گم ہو جاتا ہوں۔ البتہ سرورق کی کہانیاں خالی جگہ پر کرنے کی بات لگتی ہے۔ جب کچھ نہ باقی رہے تو جی کڑا کرکے پڑھ لیتا ہوں۔ (اب ایسے تو نہ ہولائیں ہم کو...) شاہد آرٹسٹ کی کاوشوں پہ بہت کم بات ہوتی ہے۔ وہ ہر ماہ داد کے مستحق ہوتے ہیں۔ آپ نے لکھاریوں کو جو شرف ہمنوائی بخش رکھا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ ایک خواہش میرے خانہ دل میں ہے کہ میں چٹکی، نکتہ چینی کے مستقل تبصرہ نگاروں کی اپنے ہاں دعوت کروں مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو؟''

پشاور سے انجینئر عمیر شہزاد بنگش کے ارادے ''ہمیشہ کی طرح اس ماہ بھی جاسوسی نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور 7 تاریخ کو بک اسٹال پر نمودار ہوا۔ سرورق پر روز اول کی طرح حسینہ دو آدم زادوں کے بیچ گھری ہوئی پائی گئی۔ ان سنگین حالات کے باوجود اس نے میری طرف ہی دیکھنا گوارا کیا اور میں نے وہاں سے کھسکنے ہی میں عافیت جانی اور دبے قدموں سے بغیر آہٹ لگائے دوستوں کی محفل میں وارد ہوا۔ کرسی صدارت پر آصفہ صداقت کو ایک ماہ کے لیے نگراں حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے پایا۔ سید شکیل حسین نے گرداب کی طرح ہر ماہ نئے کردار متعارف کرانے کا عمل جاری رکھا اور شیکسپیئر کے بعد پڑوسن اور اس کے بعد پتا نہیں اور کون ہوگا؟ میر فوزی علی نے پندرہ سال بعد اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ شکریہ بھئی۔ منشی حماد فرہاد! آپ کے حالات جان کر دل خفا ہو گیا لیکن جب آخر میں وافر مقدار میں ماہا ایمان کی تعریفیں شروع کیں تو دل مزید غم کی وادی میں چلا گیا۔ سارہ باجی! اپنے محلے کی اہمیت پر روشنی ڈالنے میں مگن رہیں۔ بلقیس خان! سالگرہ مبارک، ہاں اگر سالگرہ پارٹی رکھی ہو تو ہم حاضر خدمت ہیں۔ ثاقب تبسم! ہماری طرف سے مبارک باد قبول کرکے ہمیں خوشی کا موقع عنایت فرمائیں۔ محی الدین نواب! ہم میرا مطلب اشفاق صاحب آپ کا بہت شکریہ۔ صبا گل! ہم پوری قوم آپ کی فیملی کو سلام پیش کرتے ہیں اور پورا ملک آپ لوگوں کے مرہون منت ہے۔ طاہرہ گلزار باجی! آپ نے ہمیں جو عزت اور شرف بخشا اس کا شکریہ۔ ندا مغل، تصویر امین اور ماہ تاب گل کا تبصرہ ناقابل یقین حد تک پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مغل صاحب کے دربار میں وارد ہوئے۔ ہم صرف یہ کہیں گے کہ مغل صاحب کی وجہ سے ایک نہ ایک دن سسپنس ہماری جان لے لے گا۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ اگر ایک ساتھ پورا رسالہ پڑھ لیا تو پھر ہم پورا مہینا کیسے گزاریں گے۔''

جنوں سے محمد ہمایوں سعید کی بلند پروازی ''حسن کی مختلف اقسام اور نسلیں جاننے کے شوقین شیر برادر کے لیے اور ای لیلا میں ڈاکٹریٹ کرنے والے دیگر حضرات کے لیے اطلاع عام ہے کہ ڈاکٹر انکل نے اب کی بار مظروانہ حسن جسے یار لوگ کترینہ کیفی حسن بھی کہتے ہیں کی حامل لڑکی کو سرورق پر سجایا۔ آصفہ صداقت سے انکل نے بہت ہی ڈپلومیٹک جھوٹ بولا کہ ہم آپ کے بنا اداس تھے۔ عمیر برادر! آپ ساری باتیں چھوڑیں صرف اتنا کلیئر کردیں کہ ایف اے کے اسٹوڈنٹ ہو کر خود کو بڑی شان سے انجینئر لکھتے ہوئے آپ کے ہاتھ نہیں کانپتے؟ کاشی برادر! کمال کرتے ہو۔ دلنشین کو راز کی باتیں نہ کرنے کی ہدایت جاری کرکے خود راز اگلنا شروع کر دیے۔ بھائی میرے پڑوسنیاں سب کی ہوتی ہیں اور کافی اچھی ہوتی ہیں۔ پڑوسیوں کے حقوق کا خیال رکھتی ہیں۔ ان کا دل نہیں دکھاتیں مگر اتنا کھلے عام ان کا ذکر فرمانا قطعی درست نہیں۔ اور عبدالستار جی! آپ برائے مہربانی اپنی پڑوسن پہ توجہ دیں۔ مصدق جی! ٹھیک فرمایا مگر بھائی جان امی جان ہوتی ہی ایسی ہیں۔ اب دیکھو نا، آپ کی امی جان بھی آپ کی بلائیں لیتے نہیں تھکتیں اور ہر صبح آپ کے دائیں گال پہ تھوڑا سا کالک لگاتی ہیں کہ نظر نہ لگے۔ یعنی کہ حد ہی ہو گئی نا؟ منشی حماد صاحب! ایسا مت کیجیے آپ بار بار آئیں، آپ کا آنا ہمیں بہت ہی اچھا لگا۔

تصویر امین صاحب! یقیناً آپ کا بھانجا بہت خوش قسمت ہے جو بارہ ربیع الاول جیسے مبارک دن کو پیدا ہوا۔ میری طرف سے محمد مصطفیٰ کو اپنے ذاتی پیسوں سے ایک شاندار گفٹ دینا۔ انور برادر! اگر آپ کو لگتا ہے کہ نگوڑے ڈاک والے اتنے نااہل ہیں کہ بنا ٹکٹ کے خط کو کراچی بھیج دیں گے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ واہ نگینہ جی واہ! آپ کا شمار غالباً ان حضرات میں ہوتا ہے جو بیوی کی ڈانٹ پھٹکار دانت نکالے بس سنتے جاتے ہیں اور اس ادا پر بھی نثار ہونے سے باز نہیں آتے۔ صبا گل! آپ کے والد کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ مگر یاد رکھیے گا وہ شہید ہیں اور شہید کبھی مرتے نہیں اور آپ کے لیے باعث افتخار کہ آپ ایک شہید کی بیٹی ہیں۔ اللہ ان شہیدوں کے صدقے ہمارے پیارے وطن کو تاقیامت قائم و دائم رکھے، آمین۔ سب سے پہلے ہمیشہ کی طرح گرداب پڑھی۔ عجب سی عقیدت ہو گئی ہے اس کہانی سے۔ شہریار اور سلو آخر کار انڈیا پہنچ ہی گئے۔ پوری قسط پر عائشہ چھائی رہی۔ اس کی کہانی بھی دلچسپ تھی۔ سرورق کی کہانیاں دونوں ہی غیر متاثر کن تھیں۔ مقدر کا سوداگر قدرے بہتر رہی۔ ابتدائی صفحات پر سلیم فاروقی اپنے پرجوش قلم کی پرجوش روانی سمیت موجود تھے۔ حالیہ کہانی کا ہیرو بھی مارکٹائی کی وجہ سے فوج سے مستعفی ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح نہایت پرجوش، انر جیک ایس ایس جی کا چمکتا ستارہ اور استعفے کے فوراً بعد سیکیورٹی ایجنسی کی دکان سجائے بیٹھنے والا تھا۔ جانڈیو کا کردار مجھے شروع سے ہی مشکوک لگا تھا اور بالآخر اپنی کمینگی سمیت ظاہر ہو گیا۔ یہ دولت کا لالچ نہ جانے انسان کو اور کتنا گرائے گا۔''

ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ کی پسندیدگی ''پیارا دوست جاسوسی پانچ مارچ کو ملا۔ دبلے پتلے چہرے والی حسینہ اسمارٹ پوز میں بہت پیاری لگی۔ دائیں طرف کے ریسیور سے گھبرایا ہوا کہیں فون ملا رہا ہے۔ ثاقب گل سے اپنی پیاری محفل میں قدم رکھا سب شریک محفل تھے۔ آصفہ صداقت فرسٹ پوزیشن پر ہیں، مبارک باد قبول کریں۔ پڑوسی شہر سے عمیر شہزاد! پسندیدگی کا شکریہ۔ سید شکیل کاظمی! آپ کا زبان پر عبور قائم و دائم ہے۔ خیر ہی ہو آپ کی پڑوسن کی اور اس کے ملنے کی۔ مصدق محمود دانش! آپ کی شاعری تو پہلے ہی سے حالات خراب ہیں۔ منشی حماد فرہاد! اللہ کرے آپ کو باعزت رہائی کی خوش خبری جلد ملے۔ آپ کی جاسوسی سے محبت بہت بہت اچھی لگی لیکن یہ بات بری لگی کہ یہ آخری خط ہے۔ بے شک لیٹ ملتا ہے جاسوسی لیکن آپ رابطہ رکھیں۔ آپ کی مجبوری ہے اس لیے آپ نئے ڈائجسٹ کی آمد سے پہلے لیٹر پوسٹ کیا کریں، امید ہے ادارہ میری باتیں آپ تک پہنچائے گا۔ بلقیس بلو! کیسی ہو؟ زبردست لیٹر لکھا۔ ریاض بٹ حسن ابدال! کہاں تھے، بڑے عرصے بعد آئے جاسوسی میں، دیر آید درست آید۔ ثاقب تبسم بلقیس کو بیٹا کہنا بہت مزہ دے گیا۔ محی الدین اشفاق تھینکس۔ طاہرہ گلزار! آپ نے یاد کیا میں آگئی کیسی ہو ڈیئر؟ محمد ہمایوں! اتنے پیارے مشورے کا شکریہ، اچھا لگا مجھے۔ سب سے پہلے اپنے ہر دلعزیز مصنف کی دلچسپ رومانی داستان للکار پڑھی جس میں ایکشن، رومان، تھرل سب موجود ہوتا ہے جس کی سطر سطر قاری آنکھوں کے رستے دل میں جذب کرتا جاتا ہے۔ للکار بہت خوب صورتی سے دلوں کو جکڑے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے۔ دوسرے رنگ میں امجد جاوید شامات لے کر آئے۔ کہانی میں شروع میں خرم بہت برا لگا جو عائزہ کی خاطر سمیرا کی سچی کھری معصوم محبت کو ٹھکراتا رہتا ہے لیکن اسٹوری نے ایک خوب صورت موڑ لیا۔ اذلان کا کمینہ پن، عائزہ کی بے وفائی سامنے آگئی اور سمیرا کا خلوص آئینہ بن کے سامنے آیا اور خرم کا خوب صورت اعتراف محبت بہت اچھا لگا۔''

بہاولپور سے بشیر احمد بھٹی کی فرمائش ''جاسوسی کا ٹائٹل ہر ماہ نئے انداز کا ہوتا ہے۔ یہ ذاکر صاحب کی محنت ہے۔ چٹکی، نکتہ چینی میں تبصرے بھی خوب تر ہوتے ہیں۔ مارچ 2013ء کا جاسوسی اس دفعہ دس مارچ کو لیا ہے۔ دو دن تک گھر والے پڑھتے رہے ہیں۔ اب میرے ہاتھ لگا ہے۔ تبصرہ لکھ تو رہا ہوں، شائع ہونے کا یقین نہیں۔ پہلی کہانی بلیک جیک تیز طرار رہی۔ مغربی ادب کی کہانیاں جاسوسی کی جان ہیں۔ خراج جنگ ایک زبردست کہانی ہے۔ سائکل سوار کا دل جھوٹ بولتے بولتے آخر ایک سچ سمیت بیوی کے ہمراہ ملک عدم کو روانہ ہو گیا۔ نجات اور مردہ قاتل کے بعد للکار کی قسط 38 دیکھ کر میں سوچوں میں گم ہو گیا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ یوں لگتا ہے للکار کل شروع ہوئی ہے۔ تین سال اور دو ماہ تیزی سے گزر گئے۔ ثروت اور عمران اس کہانی کے مرکزی کرداروں نے ایک خوب صورت تصور ذہنوں میں قائم کر رکھا ہے پھر ادھر ادھر کے دیہاتی ماحول، ساہیوال جیسے شہر کی سیر، لاہور کی منظر کشی، للکار دلربا انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ جرم بے گناہی، اجنبی چال دونوں انگریزی ادب کی لاجواب کہانیاں ہیں۔ اسما قادری صاحبہ کی گرداب پندرہ قسطیں پینتالیس کی ہو چکی۔ گل فروشی نہ کی۔ اس قسط میں کچھ پنجابی اور کچھ سندھی زبان کے استعمال والے ڈائیلاگز نے خوب لطف دیا۔ ہنگامہ خیزیوں سے نبرد آزما ہوتے بستی نظام الدین شہریار اور سلو جا نکلے۔ فون کال، گناہ بے لذت، کوشش ناکام، دل گرفتہ چاروں شاہکار کہانیاں ثابت ہوگئیں۔

صاحب پر اتنا شکوہ بھی نہ کریں۔ محمد اسمٰعیل جی، دانش کا پتا نہیں لیکن ہمارے دلوں پر آپ کا بس نہیں چلنے والا جو پہلے ہی کندن بن چکے ہیں۔ منشی حماد فرہاد آپ کی ڈائجسٹ سے بچپن سے دل لگی لیکن افسوس کہ آپ اس وقت ایک ایسی دیوار پر کھڑے ہیں جس کی ایک طرف زندگی اور دوسری طرف موت۔ خدا آپ کو تمام سزائے موت کے اسیران کو معاف فرمائے، آمین۔ آپ کا دکھ میں سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میں نے بھی 6 سال سزائے موت کاٹی ہے۔ جھنگ جیل میں آپ کا یہ آخری خط کیوں ہے، بتانا پسند کریں گے۔ تصویر الحسن صاحب آپ کو بھانجے کی آمد کی خوشی مبارک ہو۔ کہانیوں میں للکار کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ قسمت تابی کا بہت ساتھ دے رہی ہے لیکن افسوس کہ ثروت نزدیک ہونے کے باوجود زخموں پر مرہم نہ رکھ سکی۔ عمران کی دوستی اور قربانی بھی قابل داد ہے۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔"

لفظوں کے کھلاڑی تفسیر عباس بابر کی باری" بارش بغیر عہد گزشتہ کی جھلکیاں۔ دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد دیار در یار پر اذن باریابی کے ملتجی ہیں۔ وجوہات ناگزیر وہی جو کہ اس قوم و ملت اور عوام کا المیہ ہے۔ رونا ہے جو ہوتا آیا ہے۔ جو ہو رہا ہے یہی ہوتا ہے۔ زندگی کے تلخ رویے، سفاک لمحوں کے دلخراش لہجے، تغیر و تبدیلی، زوال و زبوں، گردش ایام و افتراز نامہ، مسائل کا لامحدود و لاتناہی سلسلہ۔ امنگوں کا ترجمان جاسوسی 2013ء کا تیسرا شاہکار تین مارچ کو دریافت ہوا۔ دوشیزہ سرورق قابل دید و داد ہے اور قابل غور بھی۔ آنکھوں میں عیاری اور متبسم لبوں میں مکاری ہے اور اکلوتا شانہ پورے وجود سے بھاری ہے۔ خیر جو بھی ہے اسی وجود سے تصویر کائنات میں رنگ بھی ہے اور جنگ بھی، آہنگ بھی اور ترنگ بھی۔ آغاز بزم یاراں میں ادارے کا پر اثر اداریہ حالات حاضرہ کی عکاسی۔ آصفہ صداقت کو تہ دل سے مبارکباد۔ اپنی ہی صنف کو کھانے کی خواہش۔ ممکن ہے محترمہ کا تعلق قوم یاجوج ماجوج سے ہو یا افریقہ کے آدم خور قبائل سے اور بابا کو اتنا کمزور مت لگائیے کیونکہ کمزور بہت مہنگا ہے۔ اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی یہ خبر بھی زبان زد خاص و عام ہے کہ آپ نے اپنی پڑوسن کی تخریب و شر کے ڈر سے اپنا آبائی گاؤں چھوڑ رکھا ہے، واللہ عالم بالصواب۔ چوچک اوکاڑہ سے عبدالمنان آپ کو محفل میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ چوچک ہمارے گاؤں سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اوکاڑہ سے تصویر الحسن کا بہترین تبصرہ اور خوبصورت گفت و شنید بھانجے کی آمد کے لیے ڈھیروں مبارکاں۔ لگے ہاتھوں راجن پور سے ماہ تاب گل آپ کو بھی شادی مبارک ہو اور یہ بھی کہ ہماری دلی ہمدردیاں اپنے بھائی بند اور ہم صنف یعنی آپ کے ان کے ساتھ ہیں۔ کراچی سے سارہ ممکن ہے ہمایوں سعید نادر کی بلندی پر دوربین بلکہ خوردبین لے کر بیٹھے آپ کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ پشاور سے بلقیس خان آپ کے خوبصورت نام کے ساتھ بلو کا دم چھلہ چاند کو گرہن لگا رہا ہے یہ بھی بتا دیں کہ 23 مارچ کو آپ کی کتنی ویں سالگرہ تھی؟ حسن ابدال سے ریاض بٹ بہ تقاضائے عمر طویل بابا ایمان دماغی امراض و مسائل سے نبرد آزما ہیں اس لیے ان سے کچھ کہنا گویا گائے کو کلاسیکل غزل سنانے کے مترادف ہے۔ علی پور چٹھہ سے عاقب تبسم نگینہ کا مفصل و جامع تبصرہ بھی بصد شوق ملاحظہ کیا۔ مالاکنڈ سے صبا گل کے المناک تبصرے نے مغموم و افسردہ کر متزلزل حوصلوں کو مہمیز کیا۔ پشاور سے طاہرہ گلزار جی فون پر آپ کی پیار بھری ڈانٹ ڈپٹ اور حکم کے عین مطابق ہم بمعہ تبصرہ حاضر خدمت ہیں۔ ابتدائی صفحات پر سلیم فاروقی کا نوشتہ خاص ایک دلچسپ پرتجسس اور سنسنی خیز سرگزشت۔ محمد اعظم کی للکار دلچسپ، سنسنی خیز اور ایکشن سے بھرپور مراحل و منزلیں طے کر رہی ہے۔ سینہ سراج کی اچانک رونمائی اور عبرت و دہشت ناک انجام گویا کہانی اختتامی مراحل کے گرد و نواح میں گھوم رہی ہے۔ اسما قادری کی گرداب ایک تعمیری اور اصلاحی سلسلہ ثابت ہو رہا ہے۔ سیریناٹا اس کی خراج جنگ نے کافی سے زیادہ متاثر کیا۔ نسلی تعصب، ذہنی انتشار، اختلافات و انتشار اور ایک معصوم محبت درد کے خمیر سے گندھی اس تلخ تحریر کا انجام و اختتام افسردہ کر گیا۔ تلخ و شیریں لہجے کے منفرد مصنف کاشف زبیر کی پراثر تحریر نجات نفسیاتی پیچیدگیوں پر مبنی تھی۔"

شاہدرہ، لاہور سے عبدالوہاب کی جسارت" پہلی بار جاسوسی کے لیے لکھ رہا ہوں۔ لکھنے کا تو ہر ماہ سوچتا تھا لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ دل کڑا کر کے لکھ رہا ہوں۔ امید ہے بلکہ یقین ہے کہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ (یقیناً) اس مرتبہ جاسوسی ذرا تاخیر سے 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق کو پھلانگتے ہوئے چٹکی نکتہ چینی میں پہنچے۔ تمام دوستوں کے خط لاجواب تھے۔ اس بارے میں اتنا ہی کہنا۔ اب بڑھے کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی للکار پڑھی جو تمام کی طرح ہمیں للکار رہی تھی۔ تابش نے اپنے پہلے دشمن کو ختم کر دیا جو اس کے حالات کا ذمے دار تھا۔ گرداب بھی اچھی کہانی ہے لیکن ذرا سلو ہے۔ ابتدائی صفحات کی بلیک چیک اچھی کہانی تھی۔ چانڈیو صاحب کو پچھتانا پڑا۔ دولت چیز ہی ایسی ہے۔ دونوں رنگ بھی اچھے تھے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔"

چکلالہ سے راحی خارس کی بے تابیاں" ماہنامہ جاسوسی میں دوسری بار شمولیت اختیار کر رہی ہوں اور میں صرف للکار کے لیے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں نے بہت سے مصنفوں کو پڑھا ہے۔ مگر جو چیز طاہر جاوید مغل میں نظر آئی، وہ کسی اور مصنف میں نہیں پائی ان کا انداز تحریر ہر لحاظ سے منفرد ہے۔ مارچ کا سرورق ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور جاسوسی کے تمام لوازمات سے بھرپور تھا۔ مجھے سرورق پر موجود لڑکی کے ہاتھوں میں چوڑیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ ضرور بنایا کریں کیونکہ مجھے چوڑیاں پہننا بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ اشتہارات کو نظرانداز کرتے ہوئے چٹکی نکتہ چینی میں پہنچی تو آصفہ کو مسند خاص پر براجمان پایا۔ آصفہ آپ اتنے عرصے کے بعد آئیں تو آتے ہی ملکہ بن گئیں۔ واقعی قلم کا جوہر ضرور رنگ دکھاتا ہے۔ آپ کا تبصرہ بہترین تھا۔ الجھتر عمیر آپ کی طرح ثروت کے بارے میں پڑھ کر مجھے بھی سلطانہ نہ جانے کیوں یاد آجاتی ہے۔ خاص طور پر اس کا گفتگو میں ارے بولنا۔ شاید تابی کے لیے جتنی بے تاب وہ تھی، اس قدر ثروت نظر نہیں آتی یا پھر کوئی اور وجہ ہو۔ شکیل صاحب آپ کا شیکسپیئر سے کیا ناتا ہے کہ ہر گفتگو میں وہ آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ منشی حماد فرہاد، آپ کا پہلا خط ضرور ہے مگر آخری نہیں۔ آئندہ بھی ضرور آتے رہیں چاہے، دو سطروں کا خط ہی کیوں نہ ہو آپ کا۔ تصویر الحسن ایف ایم کا چسکا واقعی بہت زبردست ہے۔ سلیم فاروقی کی بلیک چیک میں جس طرح خاور کا کردار تھا لڑائی بھڑائی کا، اس طرح کا ایکشن بہت کم تھا مگر بہرحال ایک عمدہ کہانی تھی۔ کاشف زبیر کی کہانی جاندار تھی۔ ان کا انداز تحریر بھی بہت عمدہ اور پختہ ہوتا ہے۔ للکار جہاں بے حد خوبصورت پیرائے کی عمدہ ترین کہانی ہے وہیں مجھے اس کے ختم ہونے کا بھی شدت سے انتظار ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کو ہر بار پڑھ کر جو اضطراب اور بے چینی ہوتی ہے کہ ہائے آگے کیا ہوگا۔ بہت تکلیف دہ انتظار محسوس ہوتا ہے۔ اف... مت پوچھیں میرا کیا حال ہوتا ہے جب للکار پڑھ رہی ہوتی ہوں۔ تابش اور عمران کے بہت سے طرح جملے تو مجھے زبانی یاد

ہو جاتے ہیں اور یہ بات ہماری گفتگو کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ دوسری کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ ایک گزارش ہے کہ مدیر اعلیٰ صاحب میرا خط اگر ایڈیٹنگ کیا بھی تو للکار کے متعلق کچھ مت کاٹنے کا پلیز اور طاہر جاوید صاحب کو میری پسندیدگی سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ کیا ان کو کچھ دینا چاہیں کوئی تحفہ یا کارڈ ان کی اتنی زبردست للکار پر ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے تو کیا یہی پتا استعمال کریں گے کراچی والا؟" (جی ہاں)

ر... سے سحرش افضل کی شمولیت" اس بار جاسوسی نے زیادہ انتظار نہیں کروایا اور ہمیشہ کی طرح جلد مل گیا۔ ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا، کچھ خاص نہیں تھا۔ سب سے پہلے اپنی پیاری محفل میں جھانکا۔ محفل ہمیشہ کی طرح عروج پر تھی۔ جس طرح محفل کا نام چٹکی نکتہ چینی ہے، اس طرح قارئین بھی ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے کہ انہیں بھی کہانیوں میں لڑائی بھڑائی پڑھ کر لڑنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے اور ہر وقت غصے میں نظر آتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے للکار پڑھی اور کہانی کے ہیروز للکارتے ہوئے نظر آئے پڑھ کر مزہ آ گیا۔ دوسرے نمبر پر گرداب پڑھی۔ گرداب تو مزید سنسنی خیز ہو گئی ہے۔ ویلڈن اسما قادری۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی عرق ریزی" سرورق اس بار بھی دلکش تھا۔ ذاکر صاحب سے کہیں کہ وہ سرورق پر صنف کرخت کے خاکے اتنے کرخت نہ بنایا کریں۔ خطوط میں بی بی آصفہ صداقت کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ شاید یہ پہلی بار اس سال میں شریک ہوئی ہیں۔ پہلی کہانی سلیم فاروقی کی بلیک چیک بہت اچھی رہی۔ اس شمارے کی واحد مختصر سی کہانی مردہ قاتل ایک نیا رنگ لیے ہوئی کیسے ایک مردہ شخص کے ہاتھوں ریوالور چل گیا۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں گناہ بے لذت سب سے بہتر رہی۔ سرورق کی پہلی کہانی مقدر کا سوداگر ایک دلچسپ تحریر تھی جو شاید کسی ہندی کہانی کا ترجمہ تھی۔ گیتا دیوی بڑی عیاری سے اپنے گاہکوں کو بے وقوف بناتی تھی اور آخر کار شہزاد شکر دیال اور شوبھا نے سیموئل کے قتل کا سراغ لگا ہی لیا۔ دوسری کہانی امجد جاوید کی شرمات بس خانہ پری والی تحریر نکلی جس میں کوئی جان نہ تھی۔ قسط وار کہانی للکار میں عمران نے بڑی چالاکی سے جاوا کے ریوالور والے کھیل سے اپنی جان بچائی۔ دیکھیں، اب وہ تابش کے ساتھ مل کر آرا کوئے کی مورتی کو کب اور کیسے تلاش کرتا ہے اور ثروت کو جاوا کی قید سے چھڑاتا ہے۔ گرداب میں اب شہریار بھی ایکشن میں آ گیا ہے۔"

کوئٹہ سے ثمینہ حبیب کی چٹکی نکتہ چینی" خدا خدا کر کے اس بار رسالہ جلدی 6 مارچ کو ہی مل گیا۔ سرورق کی صرف دوشیزہ ہی جاذب نظر تھی (شکریہ) سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس قسط میں تابش اور عمران کی جوڑی نے قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا۔ مغل صاحب کہانی کو دلچسپ انداز میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ للکار کے بعد رخ کیا چٹکی نکتہ چینی کا جہاں تمام ساتھیوں کی نوک جھوک سے لطف اندوز ہوئی۔ اس کے بعد باقی کہانیوں کی طرف آئی۔ سلیم فاروقی کی بلیک چیک بخت وصول کہانی تھی۔ تانا بانا دلچسپ انداز میں بنا گیا تھا۔ نجات عجیب و غریب نفسیاتی قسم کی کہانی تھی۔ ایسی بھی کون سی نفسیاتی گرہ تھی جس نے بے نام ڈرائیور کو اتنا سفاک اور بے رحم قاتل بنا ڈالا تھا۔ مارلی عرف چوہے نے اس کا صفایا کر کے خس کم جہاں پاک کر دیا۔ منظر امام صاحب اکثر مزاح کے رنگ میں معاشرے کے تلخ حقائق لکھ کر قارئین کو زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہی دیتے نظر آتے ہیں لیکن مردہ قاتل نے میرا سر گھما دیا۔ اس لیے کہانی کو آخر سے دو مرتبہ پڑھنا پڑا تب کہیں جا کر کچھ سمجھ شریف میں آیا (آ تو گیا نا ...) جرم بے گناہی گزارہ کر گئی۔ خونی چال... گنجلک کہانی تھی۔ گناہ بے لذت میں دولت کے مایہ جال میں جکڑے لالچی افراد کی کہانی پڑھنے کو ملی دولت کی ہوس انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ کوشش ناتمام میں سراغ رساں مارش کی کوششیں اتنی بھی ناتمام نہیں رہیں مجرم کا سراغ تو لگا لیا گیا ہوا جو سزا سے بچ گئی۔ حیران کن انجام کی دلچسپ کہانی دل گرفتہ نے تھوڑا سا دل گرفتہ کیا لیکن ریمنڈ نے گارلینڈ کو مار کے دل گرفتگی تھوڑی سی کم کر دی۔ سرورق کی پہلی کہانی مختار آزاد کی مقدر کا سوداگر انسانی رویوں کی مختلف پرتیں کھولتی ہوئے کشاں کشاں انجام کی طرف بڑھی۔ ویسے انسان تدبیر پر قادر ہو سکتا ہے خلوص نیت اور اچھے برے کی پہچان کو مدنظر رکھ کر۔ شرمات امجد جاوید کی سرورق کی دوسری کہانی میں خرم بے چارہ پوری طرح سے چکر بتا رہا اور اصل دشمن ایک بھائی نکلا جو دولت کے حرص میں اپنی ماں جیسی بہن کو مار دینا چاہتا تھا۔ دولت بھی کیا کیا تماشے دکھاتی ہے۔ کہانی پڑھ کر اندازہ ہوا۔ آخر میں ایک ضروری بات پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر خط فیکس کر دیا کروں تو کیا آپ کو مل جائے گا؟" (جی ہاں لیکن پڑھنے میں دشواری ہوگی، آپ ای میل کر دیں)

ہاشم آباد، کراچی سے ادریس احمد خان کی ستائش" مارچ کا جاسوسی 3 مارچ کو ملا۔ سرورق حسب معمول تھا۔ کراچی میں پھر ایک بار انسانیت فروشوں نے بے گناہ انسانوں کو خاک و خون میں نہلا دیا۔ ایسی بربریت سے انسانیت بھی شرما جاتی ہوگی مگر بے ضمیر انسانوں کا دل نہیں پسیجتا۔ خیر آصفہ صداقت کو مبارک ہو، دیگر دوست بھی خوش گپیوں میں مصروف عمل ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار سے شروع کیا جہاں ایک بار پھر عمران ایکشن میں نظر آ رہا ہے۔ نئے نئے معرکے درپیش ہیں۔ اس کے بعد گرداب شروع کی۔ بلاشبہ گرداب بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ابتدائی کہانی بلیک چیک پڑھی۔ مجموعی طور پر بلیک چیک بھی اچھی رہی۔ خراج جنگ، نجات بھی اچھی تھیں۔ مردہ قاتل میں انتہائی ہوشیاری سے دولت ہتھیائی گئی۔ جرم بے گناہی، خونی چال نے اچھا تاثر دیا۔ خون کال میں ایک شوہر نے آزادی اور دولت کے لالچ میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ لالچ میں اندھا ہو کر کچھ نہ ملا۔ گناہ بے لذت میں بیلی اور کوری پولیس کے دام میں آ گئے۔ کوشش ناکام میں ایک چھوٹی سی غلطی نے مجرم کو قانون کے شکنجے میں پھنسا دیا۔ دل گرفتہ اور سرورق کی کہانیاں بہترین تھیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

ریاض بٹ، حسن ابدال۔ ناصر حسین ہرل، چنیوٹ۔ رائے قیصر عباس کھرل، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ حافظ شاہد عمران، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ غزالہ ترین، سرائے عالمگیر۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ شان غنی، پشاور۔ بلقیس خان، پشاور۔ سوبی خان، کھارو۔ ایم غزالہ اسد، چکوال۔ ڈاکٹر آصل باز آفریدی، [illegible]۔

ہوس کار

کاشف زبیر

کوئی زیردست ہوتا ہے اور کوئی زبردست... زندگی سب ہی گزار لیتے ہیں اور اپنے اپنے مقررہ وقت پر ملک عدم کو سدھار جاتے ہیں... لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہر لمحے اور ہر سانس میں اپنی برتری چاہتے اور جتاتے ہیں... اپنے اس زعم کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ایسے ایسے مکروفریب کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنی خود پسندی کی نخوت آمیز دنیا میں مست رہتے ہیں... انہیں ذرا پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور انہیں کیا سمجھتے ہیں... اپنی خواہشات کے غلام ہر جگہ اور ہر دور میں پنپتے رہے ہیں۔وہ کاٹھ کی ہنڈیا کی طرح ہوتے ہیں جو بس ایک بار چڑھائی جاسکتی ہے۔ حرص وہوس اور ظلم وجبر ان کی انا کی خوراک ہوتے ہیں... وہ بھی اسی قبیل کا ایک شہدہ تھا... جسے پے درپے کامیابیوں نے انجام سے غافل کردیا تھا۔

حرص وہوس کے ہولناک گرداب میں پھنسے ایک وحشی کی داستان

دروازے پر دستک سن کر مہر کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ کچھ دیر لیٹی سوچتی رہی کہ وہ کہاں تھی اور دستک کیوں ہو رہی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ دو کمروں کے اس تنگ وتاریک فلیٹ میں تھی جس کا اس نے گزشتہ دو مہینے سے کرایہ نہیں دیا تھا۔ کامران اسکول جاچکا تھا اور وہ اس کے جانے کے بعد لیٹی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ مالک مکان آج کی وارننگ دے کر گیا تھا۔ اسے ہر صورت کرایہ چاہیے تھا ورنہ آنے والی پہلی کو وہ مکان خالی کرالیتا۔ مہر کو مالک مکان کی صورت سے نفرت تھی اس لیے نہیں کہ وہ ہر دوسرے دن کرایہ لینے آجاتا تھا بلکہ اس لیے کہ سامنا ہوتے ہی وہ اسے اتنی غلیظ نظروں سے دیکھتا تھا کہ مہر کا دل چاہتا، اس کی گندی آنکھیں پھوڑ دے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی اس لیے خود پر جبر کرتی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر دروازے تک جائے لیکن جانا تو تھا۔ اس نے خود پر جبر کیا اور دروازے تک آئی۔ اسے صرف اتنا کھولا کہ اس کا نصف چہرہ ہی نظر آئے۔ مگر دوسری طرف مالک مکان کے بجائے اس کا لڑکا تھا۔ اس نے مہر کو دیکھتے ہی رٹا لگانے کے انداز میں کہا۔

''ابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، اس نے کرایہ لینے کے لیے بھیجا ہے۔''

''ابا سے کہنا کہ کرایہ پہلی تک دوں گی ورنہ فلیٹ خالی کردوں گی۔'' مہر

نے بیزاری سے کہا۔ وہ یہ بات اس کے باپ سے پہلے بھی کہہ چکی تھی، اس کے باوجود اس نے آج آنے کا کہا تھا۔ اس طرح وہ ایک بار اور مہر کے وجود کو اپنی غلیظ نظروں سے ٹٹولنا چاہتا تھا۔ اس کا لڑکا سولہ سترہ سال کا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بھی باپ جتنی گندگی تھی۔ وہ اچک اچک کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مہر نے بات مکمل کرتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ لڑکا باہر سے بولا۔ ”پہلی تاریخ کو آؤں گا۔“

”لعنت ہو تجھ پر اور تیرے باپ پر۔“ مہر نے اندر جاتے ہوئے کہا اور تب اسے یاد آیا۔ آج اس کا انٹرویو تھا۔ اس نے زیڈ اے کیمیکلز نامی کمپنی میں ملازمت کے لیے سی وی بھیجی تھی۔ وہاں سے انٹرویو لیٹر آیا تھا۔ اس کی گزشتہ ملازمت ایک میڈیکو کمپنی میں تھی اور اسے جاب چھوڑنا پڑی کیونکہ وہ اپنے باس کے ساتھ شام کو تفریح پر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شام کی یہ تفریح ڈنر سے شروع ہو کر کسی بیڈ روم میں ختم ہوگی۔ وہ ضرورت مند اور مجبور تھی لیکن کسی کی تفریح بننا اسے گوارا نہیں تھا اس لیے اسے ملازمت چھوڑنا پڑی۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے دو بار اور اسی وجہ سے ملازمت چھوڑنا پڑی تھی۔ وہاں بھی صاحبان اختیار نے اسے کھلونا بنانے کی کوشش کی تھی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مہر کی عمر تیس سے کچھ کم تھی۔ آنے والی جنوری میں وہ تیس کی ہو جاتی۔ گزشتہ نو سالوں سے بہت مشکل وقت دیکھنے کے باوجود وہ فٹ تھی۔ کسی قدر سنہری گندم جیسی رنگت، شفاف جلد، متناسب جسم اور میانہ قد، ہلکے براؤن بال اور اسی رنگ کی آنکھیں جن پر قدرتی آئی بروکی آرچ تھی۔ دلکش نقوش کے ساتھ اسے خوب صورت عورت کہا جا سکتا تھا لیکن وہ اتنی حسین نہیں تھی کہ مرد اس کے پیچھے پاگل ہو جاتے۔ اس سے کہیں زیادہ حسین عورتیں اور لڑکیاں سکون سے ملازمت کر رہی تھیں اور کوئی انہیں تنگ نہیں کرتا تھا۔ اس میں نہ جانے کیا بات تھی، وہ جہاں جاتی کسی نہ کسی صاحب امر کی نگاہ کا مرکز بن جاتی اور پھر اسے ملازمت چھوڑنا پڑتی۔

بیس برس کی عمر تک اسے پتا ہی نہیں تھا کہ زندگی میں کوئی مشکل بھی ہوتی ہے۔ ماں باپ کے چھوٹے سے گھر میں وہ یوں بے فکری سے رہتی تھی جیسے یہ دو کمروں کا مکان نہیں کسی شہنشاہ کا محل ہو۔ اکلوتی اولاد تھی اس لیے ساری توجہ اور لاڈ پیار اس کے لیے مخصوص تھا۔ اس نے گریجویشن کیا۔ حالانکہ وہ جس محلے میں تھے وہاں لڑکیوں کو میٹرک سے آگے پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ یہ محلہ ہی ان کا خاندان تھا۔ مہر کے ماں باپ مشرقی پاکستان سے لٹ پٹ کر آئے تھے۔ ان کے دو بچے وہیں رہ گئے تھے، نہ جانے زندہ تھے یا نہیں۔ وہ آ کر اورنگی میں آباد ہوئے تھے۔ یہاں ایک زمین کا ٹکڑا مل گیا جس پر کچا پکا مکان بنا لیا۔ عبدالصمد نے سبزی کا ٹھیلا لگا لیا تھا اور نورالنسا گھر میں کاغذ کے لفافے بنانے لگی تھی۔ اس زمانے میں سبزی فروخت کر کے آدمی بس اس قابل ہوتا تھا کہ اس کے گھر میں دو وقت سبزی بن جائے۔ آج کل سبزی بیچنے والے خود گوشت کھاتے ہیں۔ جب انہیں صبر آنے لگا تو انہیں مزید بچوں کی خواہش ہوئی لیکن اب قدرت کی طرف سے دیر ہونے لگی۔ ان کے بس میں جو ٹوٹکے تھے وہ کر لیے مگر نورالنسا کے گھر مزید کوئی پھول نہیں کھل سکا۔

جب وہ مایوس ہو چکے تھے تو خدا نے انہیں نوید دی اور نورالنسا امید سے ہو گئی۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا لیکن جب علاقے میں بیٹھنے والی لیڈی ڈاکٹر نے تصدیق کر دی تب اسے یقین آیا۔ اس وقت نورالنسا چالیس کی ہو گئی تھی۔ دونوں میاں بیوی خوشی سے پاگل ہو گئے۔ صرف وہی نہیں، پورا محلہ خوش تھا کیونکہ وہ سب کے لیے نور آپا اور صمد بھائی تھے۔ مہرالنسا پیدا ہوئی تو اسے اٹھانے والوں اور خود سے کھیلنے والوں کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ سارا محلہ اس کا رشتے دار تھا۔ عبدالصمد نے پورے محلے کو مٹھائی کھلائی اور پھر مہرالنسا کے عقیقے میں بکرا قربان کر کے گوشت بانٹا۔ اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر خوشی منائی۔ اس کے بعد بھی وہ مہر کے لیے سب کچھ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کرتا رہا۔ مہر بڑی ہوئی اور اسے اپنا سادہ مکان اچھا نہیں لگا تو عبدالصمد نے رفتہ رفتہ مکان کو پکا کرا لیا۔

مہر بچپن سے بہت مزے میں رہی تھی۔ اس کی ہر خواہش پوری ہوئی تھی۔ ویسے اس کی ہر خواہش اپنی حیثیت کے مطابق ہی ہوتی تھی۔ اس نے کبھی ماں باپ پر ان کی گنجائش سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا تھا اور اس کی بہت ساری چیزیں اور خواہشیں تو دونوں میاں بیوی خود پوری کر دیتے تھے۔ اسے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرایا جبکہ محلے کے بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسے گڑیا کا شوق ہوا تو ہر مہینے اس کے لیے گڑیا آنے لگی اور اس کا کھلونوں کا ریک گڑیاؤں سے بھر گیا۔ مہر کو ٹی وی اچھا لگا تو عبدالصمد کوشش کر کے سیکنڈ ہینڈ کلر ٹی وی لے آیا۔ دونوں میاں بیوی سادہ سستا لباس پہنتے تھے لیکن مہر کو ہمیشہ اچھا اور بہترین لباس پہنایا۔ اس کے لیے برانڈڈ چپل آتی تھی۔ میٹرک کے بعد اس نے کالج میں پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو یہ بھی پوری کی گئی۔

مگر جیسے ہی اس نے گریجویشن کیا، ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ اس کے لیے کوئی شہزادہ چاہتے تھے جو اسے بہت پیار و آسائش کے ساتھ رکھے۔ لیکن کوئی شہزادہ غریبوں کی بستی کے اس دو کمروں والے مکان میں کیوں آنے لگا؟ یہاں تو زیادہ سے زیادہ عدنان جیسے پلمبر کا رشتہ آسکتا تھا اور اس کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ وہ دبئی میں کام کرتا تھا اور اس نے نہایت شاندار دو منزلہ مکان بنوا لیا تھا جس میں اس کے چار بھائی اور اتنی ہی بہنیں رہتی تھیں۔ نورالنسا اور عبدالصمد اس رشتے سے خوش تھے۔ عدنان صرف میٹرک پاس تھا اور وہ بھی نقل کر کے لیکن خوش شکل تھا اور سب سے بڑھ کر باہر تھا۔ اپنا کام کرتا تھا اس لیے آمدنی اچھی تھی۔ مہر گریجویشن کرنے اور ماں باپ کی لاڈلی ہونے کے باوجود بہت سادہ تھی۔ اس میں دوسری لڑکیوں کی طرح چالاکی اور نخرے نہیں تھے۔ نہ اس نے کبھی سوچا تھا کہ اس کا شوہر کیسا ہونا چاہیے۔ اس لیے اس نے ماں باپ کے کہنے پر سر جھکا دیا اور عدنان کو اپنے دل میں بسا لیا۔ پہلے منگنی ہوئی اور دو مہینے بعد عدنان باہر سے آیا تو جھٹ پٹ شادی کر دی گئی کیونکہ وہ صرف پندرہ دن کی چھٹی پر آیا تھا۔

ماں باپ کے گھر کا سنہری دور تمام ہوا اور مہر کے لیے شادی مصیبت و ابتلا کا ایسا پیغام لے کر آئی جسے شروع ہوئے دس سال ہونے کو آئے تھے لیکن اس کے ختم ہونے کا امکان کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ سسرال والے جاہل اور تنگ نظر تھے۔ شوہر کے باہر ہونے کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے اس کی زندگی حرام کر دی اور اس بات کی پروا بھی نہیں کی کہ وہ امید سے ہے۔ ایک سال اس نے جہنم میں گزارا اور اس جہنم سے اس وقت نجات ملی جب سلطان خرابی صحت کی وجہ سے ملک واپس آنے پر مجبور ہوا۔ دبئی کی گرمی اور ریت زدہ ماحول نے اس کے گردے بیکار کر دیے تھے اور اب وہ محنت کے قابل نہیں رہا تھا۔ جیسے ہی اس کے گھر والوں کو پتا چلا کہ وہ اب مزید کمانے کے قابل نہیں رہا ہے، انہوں نے اس سے آنکھیں پھیر لیں۔ مکان سسر کے نام پر تھا اور وہ جو کما کر بھیجتا رہا تھا، گھر والے کھا پی کر ختم کر چکے تھے۔ اس کے لیے تو گھر میں بھی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

جب انہیں دو وقت کا کھانا بھی مشکل ہو گیا تو مجبوراً مہر شوہر اور بیٹے سمیت ماں باپ کے گھر لوٹ آئی۔ عدنان کی دبئی واپسی کا امکان نہیں رہا تھا کیونکہ اس کی حالت مسلسل خراب ہو رہی تھی۔ اس کا واحد علاج گردے کا ٹرانسپلانٹ تھا۔ اگر مہر کسی طرح تین لاکھ روپے کی رقم جمع کر بھی لیتی تو گردہ کہاں سے آتا؟ جو بھائی ایک وقت کی روٹی دینے کو تیار نہیں تھے، وہ گردہ کہاں سے دیتے۔ کڈنی سینٹر میں گردے کے منتظر مریضوں کی لائن بہت طویل تھی۔ عدنان کا نمبر تین سال سے پہلے نہیں آتا اور موت اسے اتنی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دو سال کے اندر وہ ہمت اور جان ہار گیا لیکن اس وقت تک نور اور عبدالصمد اتنے مقروض ہو چکے تھے کہ قرض ادا کرنے کے لیے انہیں اپنا مکان فروخت کرنا پڑا۔ وہ کرائے کے مکان میں آگئے۔ کامران اس وقت تین سال کا تھا۔

مہر اب تک شوہر کے لیے پریشان تھی۔ وہ ختم ہوا تو ساتھ اس کی پریشانی بھی ختم ہو گئی اور اب یہ پریشانی سامنے آ کھڑی ہوئی کہ زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی۔ ابھی باپ کا سہارا تھا لیکن کل وہ بھی نہیں رہے گا۔ عبدالصمد اڑسٹھ برس کا ہو گیا تھا اور اب اس سے ٹھیلا نہیں کھینچا جاتا تھا۔ وہ ایک جگہ کھڑے ہو کر سبزی بیچتا تھا لیکن اس میں اتنی آمدنی نہیں تھی۔ کامران کو پڑھانا تھا۔ مکان سے نکلے تو پتا چلا کہ کرایہ دینا کتنا مشکل کام ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ مہر خود کچھ کرے۔ پہلی بار نوکری کے لیے باہر نکلی اور اسے نزدیکی انڈسٹریل ایریا میں ایک بڑی گارمنٹ فیکٹری میں کوالٹی کنٹرول میں ملازمت مل گئی۔ اس کا کام تیار ہونے والے مال کی انسپکشن تھا۔ مہر کے شعبے کا سربراہ نیک اور شریف آدمی تھا۔ تین سال مہر نے یہاں ملازمت کی۔ اس دوران میں اس کے دکھوں پر کڑھتی ماں پہلے دنیا سے رخصت ہوئی۔ ایک سال بعد باپ بھی چل بسا۔ مشکلات ایک کے بعد ایک کر کے آتی رہیں۔ نیک آدمی جاب چھوڑ کر چلا گیا اور اس کی جگہ ایک شیطان صفت آ گیا۔ اس نے آتے ہی اپنی شیطانیت کا نشانہ مہر کو بنایا اور وہ دو مہینے بعد جاب چھوڑنے پر مجبور ہوئی۔ دوسری جاب اسے بہت مشکل سے ملی اور بہت آسانی سے چھوٹ گئی۔ یہاں بھی وہی مشکل پیش آئی اور اسے دو سال کام کرنے کا موقع ملا۔

تیسری جاب صرف چھ مہینے چل سکی اور اب مہر بے روزگار تھی۔ کچھ رقم تھی جو اس نے برے وقت کے لیے بچا رکھی تھی اور برا وقت آ گیا تھا اس لیے وہ رقم خرچ ہو چکی تھی۔ گزشتہ تین مہینے میں وہ درجن جگہوں پر انٹرویو کے لیے جا چکی تھی لیکن لگتا تھا کہ اس کے لیے ہر جگہ ایسے ہی لوگ بیٹھے تھے۔ جیسے ہی انہیں معلوم ہوتا کہ وہ بیوہ ہے اور کوئی سہارا نہیں ہے، ان کی آنکھوں میں مردار خور گدھ آ بیٹھتا تھا۔ کئی جگہوں پر اسے جاب کے نام پر کچھ اور پیشکش ہوئی لیکن اس

نے انکار کر دیا۔ جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس نے سوچا کہ آج دیکھتے ہیں کہ اس کے نصیب میں کیا آتا ہے، کوئی گدھا یا پھر انسان۔

زیڈ اے کیمیکلز کا دفتر اور فیکٹری اس کے فلیٹ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اگر اسے یہاں جاب مل جاتی تو اسے آنے جانے میں بہت آسانی رہتی۔ لیکن جب وہ فیکٹری میں داخل ہوئی اور انٹرویو والی جگہ پہنچی تو اس کا دل ڈوب گیا کیونکہ وہاں پہلے سے دو درجن سے بھی زیادہ عورتیں اور لڑکیاں اس جاب کے لیے موجود تھیں۔ اشتہار میں ایک فیمیل آفس اسسٹنٹ کی اسامی تھی۔ سادہ گریجویشن، کمپیوٹر اور دفتری کاموں سے عام واقفیت مانگی گئی تھی اور مہر کو یہ سب آتا تھا۔ مگر یہاں تو اس کے اندازے سے زیادہ لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں۔ ان میں سے اکثر نے فیشن ایبل لباس پہن رکھا تھا اور نک سک سے تیار تھیں۔ مہر کی طرح چادر اوڑھے صرف چند ایک ہی تھیں۔ فیکٹری بہت بڑے رقبے پر تھی لیکن اسے دفتر میں زیادہ لوگ نظر نہیں آئے۔ شاید آج اسٹاف کم تھا یا آج کل کام کم تھا۔ لیکن اس صورت میں انہیں ایک فیمیل آفس اسسٹنٹ کی ضرورت کیوں پیش آئی

امیدوار ایک ایک کر کے اندر جا رہی تھیں اور کوئی بھی دس منٹ سے زیادہ نہیں رکی تھی۔

سوائے پہلی ملازمت کے مہر نے باقی کام چھوٹی جگہوں پر کیا تھا۔ یہ فرم ان سب سے بڑی تھی۔ کامران ایک پرائیویٹ اسکول میں پانچویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ مہر نے پچھلے مہینے بہ مشکل اس کی فیس ادا کی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس بار وہ کیا کرے گی۔ گھر میں بیچنے کے لائق کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی اور وہ اپنا سب سے اچھا سوٹ پہن کر آئی تھی جو دوسری امیدواروں کے مقابلے میں بہت پرانا لگ رہا تھا۔

اس کا نام دوسری بار پکارا گیا تو وہ چونکی۔ پکارنے والے آدمی نے خفگی سے کہا۔ "آپ سن کیوں نہیں رہی ہیں؟"

"سوری، میرا ذہن کہیں اور تھا۔" اس نے خفت سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کا خیال تھا کہ وہاں کوئی انٹرویو بورڈ ہوگا جس میں دو تین افراد ہوں گے اس لیے صرف ایک آدمی کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ یہ تقریباً چالیس سال کا سوبر اور خوش شکل مرد تھا۔ اسے رکتے دیکھ کر اس نے سر کو جنبش دی، وہ آگے آئی اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ مرد نے اپنے سامنے رکھی اس کی سی وی پر نظر ڈالی اور پہلا سوال کیا۔

"مہر النسا صاحبہ! آپ کئی جگہوں پر جاب کر چکی ہیں۔ دس سال کے عرصے میں چار مختلف جگہوں پر کام کیا ہے۔ چار بار جاب چھوڑنے کی وجہ؟"

"میں کام کے ماحول اور لوگوں کے رویے سے مطمئن نہیں تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ وضاحت کریں گی؟"

"سر! وہاں مجھے ورکر کے بجائے ایک عورت سمجھ کر ٹریٹ کیا جانے لگا تھا، مجبوراً مجھے جاب چھوڑنا پڑی۔"

مرد نے سر کو جنبش دی اور دوسرے سوالات کی طرف آیا۔ دس منٹ سے پہلے اس نے انٹرویو ختم کر دیا۔ مہر اٹھنے لگی تو اس نے رکنے کا اشارہ کیا۔ "جاب کا انٹرویو ختم ہو گیا ہے لیکن مجھے آپ سے کچھ سوالات اور کرنے ہیں۔ البتہ آپ کو اختیار ہے، آپ چاہیں تو جواب دینے سے انکار کر سکتی ہیں۔"

وہ واپس بیٹھ گئی۔ "جی سر!"

"آپ میریڈ ہیں؟"

اس نے ہچکچا کر جواب دیا۔ "ویڈو۔"

"اولاد ہے؟"

یہ سوال اسے پہلے سے زیادہ عجیب لگا لیکن اس نے جواب دیا۔ "میرا ایک نو سال کا بیٹا ہے۔"

مرد نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ "لگتا نہیں ہے۔ آپ کی شادی کم عمری میں ہو گئی تھی؟"

"بیس سال کی عمر میں سر!"

"آپ نے پھر شادی کے لیے نہیں سوچا؟"

مہر کا دل چاہا کہ اس بار جواب دینے سے انکار کر دے لیکن پھر اسے یاد آیا کہ وہ مجبور ہے۔ اسے ملازمت کی اشد ضرورت ہے۔ "سر! اول تو میرا کوئی ارادہ نہیں تھا، دوسرے کوئی رشتہ نہیں آیا۔"

"اگر مستقبل میں آپ کو اچھا پروپوزل ملتا ہے تو آپ اس پر غور کریں گی؟"

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ "اچھا رشتہ تو مجھے پہلی بار بھی نہیں ملا تھا۔"

"شوہر کا انتقال کیسے ہوا؟"

"وہ گردوں کے مریض تھے، انہیں ٹرانسپلانٹ کی ضرورت تھی۔"

"گردے کا بندوبست نہیں ہو سکا؟"

اس نے سر کو نفی میں جنبش دی۔ آدمی نے گہری سانس لی۔ "مس مہر النسا! اشتہار میں پوری وضاحت نہیں کی گئی تھی لیکن اصل میں مجھے اپنے لیے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔"

مہر پریشان ہو گئی۔ "لیکن سر! مجھے سیکریٹری کے کام کا

کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"اس جاب میں سیکریٹری کے تجربے کی ضرورت نہیں ہے۔" آدمی نے کہا۔ "عام قسم کا فائلنگ ورک ہے اور کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی ایک دو دن میں سیکھ سکتا ہے۔ کچھ کمپیوٹر اور... انٹرنیٹ کا کام ہے۔ جیسے ای میل کرنا یا ای میلز کا ریکارڈ رکھنا۔"

"یہ میں کر سکتی ہوں۔" مہر نے ایک امید کے ساتھ کہا۔ اس آدمی کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ اسے جاب آفر کرنے جا رہا ہو۔ مہر کی امید پوری ہوئی جب اس نے کہا۔

"مس مہر النسا! مجھے امید ہے آپ میری اچھی مددگار ثابت ہوں گی۔ آپ کل سے آکر جوائن کر لیں اور کل ہی اپائنٹ منٹ لیٹر لے لیں۔"

مہر کو بڑی مشکل سے اپنے کانوں پر یقین آیا اور جب یقین آیا تو اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے۔ "تھینک یو ویری مچ سر... تھینک یو... آپ نہیں جانتے کہ مجھے اس ملازمت کی کتنی ضرورت تھی۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "آپ کا اندازہ غلط ہے مس مہر النسا! میں جانتا ہوں اسی لیے میں نے آپ کو یہ جاب آفر کی ہے۔"

وہ باہر آئی تو اسے خیال آیا کہ اس نے اس شخص کے بارے میں تو جانا ہی نہیں۔ وہ وہاں موجود آدمی کی طرف بڑھی جو امیدواروں کے نام پکار کر انہیں اندر بھیج رہا تھا۔ وہ اس وقت انٹرکام پر مصروف تھا۔ "یس سر... ٹھیک ہے، میں کہہ دیتا ہوں۔" اس نے انٹرکام رکھا اور زیرلب بولا۔ "مشکل کام میرے ہی سر پڑتا ہے۔" پھر اسے مہر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ "جی فرمایئے؟"

"جو صاحب اندر انٹرویو لے رہے ہیں، ان کا نام اور عہدہ کیا ہے؟"

"ان کا نام ظفریاب انصاری ہے۔" آدمی نے بیزاری سے جواب دیا۔ "اور وہ اس کمپنی کے مالک ہیں۔"

مہر دنگ رہ گئی۔ کمپنی کے مالک نے خود انٹرویو لیا تھا اور اسے اپنے لیے اسسٹنٹ کی ضرورت تھی۔ مہر کو لگا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے کیونکہ وہ خود کو ہرگز اتنی اہم پوسٹ کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اس دوران میں آدمی وہاں موجود باقی امیدوار خواتین کو بتا رہا تھا کہ اب مزید انٹرویو نہیں ہوں گے کیونکہ سلیکشن ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے سب سے آخر میں مہر گئی تھی اور سلیکشن اسی کا ہوا تھا۔ اس لیے باقی امیدوار اسے گھورتی اور زیرلب سناتی ہوئی وہاں سے جانے لگیں۔ اس آدمی نے مہر سے کہا کہ وہ کل آکر اپنا اپائنٹ منٹ لیٹر وصول کر لے۔

مہر وہاں سے گھر جانے کے لیے نکلی تو اسے لگ رہا تھا وہ بدستور کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہے۔

☆☆☆

مہر ایک چھوٹے لیکن بہت جدید خوب صورت انداز میں آراستہ کمرے میں موجود تھی۔ نارنجی بھورے رنگ کی لکڑی، دھات اور شیشے سے بنی میز پر اس کے سامنے ایک کمپیوٹر رکھا تھا۔ ایک طرف دھات کے چمکتے ریک پر پرنٹر اور کمپیوٹر کے دوسرے لوازمات تھے۔ میز پر صرف بڑے سائز کا ایل ای ڈی ڈسپلے وائرلیس کی بورڈ اور ماؤس تھا۔ اس کے ساتھ جدید وضع کا فون سیٹ تھا جو بیک وقت فون اور انٹرکام کے طور پر کام کرتا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ دھات کا بنا فائل کیبنٹ تھا جس میں درازیں بنی ہوئی تھیں۔ فرش پر نارنجی رنگ کا قالین تھا اور دیواروں پر ہلکا براؤن پینٹ تھا لیکن چھت بالکل سفید تھی اور اس میں مینٹل لائٹس اتنی مہارت سے لگائی گئی تھیں کہ بہ ظاہر کمرے میں روشنی کا منبع نظر نہیں آ رہا تھا۔

مہر کا خیال تھا کہ اسے زیڈ اے کیمیکلز والی فیکٹری کے دفتر میں بیٹھنا ہوگا لیکن وہاں صرف اس کا اپائنٹ منٹ لیٹر تیار ہوا تھا اور پھر ایک ڈرائیور اسے زیڈ اے کیمیکلز کے صدر دفتر چھوڑ گیا جو شہر کے اہم ترین کاروباری مرکز میں ایک جدید شیشوں والی عمارت کے ساتویں فلور پر تھا اور یہاں سے دور بندرگاہ کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دفتر تقریباً نصف فلور پر تھا لیکن عملہ یہاں بھی زیادہ نہیں تھا۔ ظفریاب نے اسے آتے ہی طلب کر لیا۔ مہر کا کمرا اس کے کمرے سے پہلے تھا۔ مہر فکرمند ہو گئی تھی کہ یہاں سے اس کا گھر دور پڑتا۔ لیکن ظفریاب نے اس کی فکر دور کر دی۔ اسے جو اپائنٹ منٹ لیٹر ملا تھا، اس کے مطابق اسے تین مہینے کے آزمائشی دور کے لیے بیس ہزار روپے جائیں گے۔ لیکن ظفریاب نے اسے بتایا۔ "مس مہر! آپ کا لنچ اور کنوینس بھی کمپنی کے ذمے ہے۔ اگر میرے ساتھ باہر لنچ نہیں ہوا تو آپ کو یہاں دفتر میں آپ کی پسند کا لنچ مہیا کر دیا جائے گا۔"

وہ ہچکچائی۔ "باہر..."

"ہاں، میں نائن ٹو فائیو کام پر ہوتا ہوں اور مجھے کسی وقت بھی آپ کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس لیے میں لنچ کرنے باہر نکلوں گا، تب بھی آپ میرے ساتھ ہوں گی۔"

تنخواہ مہر کی توقع سے زیادہ تھی اور کام واقعی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کمپنی کے نام پر چند ای میلز اکاؤنٹ تھے۔ مہر کا کام ان کو دیکھنا تھا۔ فائل کیبنٹ میں اہم فائلیں تھیں۔

فائلیں ترتیب وار تھیں اور مہر ایک منٹ میں مطلوبہ فائل نکال سکتی تھی۔ اسے نہ تو کچھ ٹائپ کرنا تھا اور نہ ہی ظفریاب اسے کچھ ڈکٹیٹ کراتا۔ اس نے طریقہ کار مہر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "مس مہر! اس کام میں اہمیت رازداری کی ہے۔ یہ نہایت اہم ای میلز اور فائلز ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ اہم ہے اور اسے ہر صورت راز میں رہنا چاہیے۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟"

"آپ بے فکر رہیں سر! ان میں سے ایک لفظ بھی کبھی باہر نہیں نکلے گا۔" مہر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"گڈ... اسی بنا پر میں نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ میرے نزدیک کسی عورت کی ایمان داری اس پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ اپنی عزت کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔ جو عورت اپنی عزت کو سب سے مقدم نہیں سمجھتی، اس سے ایمان داری کی توقع محال ہے۔"

"شکریہ سر!" مہر نے جھینپ کر کہا۔ "آپ کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوگی۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے۔" ظفریاب نے کہا۔ "آج آپ سب سے پہلے میری کمپنی کے بارے میں جانیں۔"

اس نے کچھ بروشر اور مختصر کتابچے مہر کی طرف بڑھائے، ان میں کمپنی کے بارے میں معلومات تھیں۔ زیڈ اے کیمیکلز ظفریاب کے باپ ظہیر انصاری نے قائم کی تھی۔ اس کا تعلق ایک کاروباری خاندان سے تھا۔ اس نے کمپنی کا نام زیڈ اے کیمیکلز رکھا۔ اب اتفاق سے ظفریاب انصاری کے نام کا مخفف بھی زیڈ اے ہی تھا۔ کمپنی باہر سے کیمیکلز منگوا کر ملک میں فروخت کرتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے خود کیمیکلز کی پیداوار شروع کر دی۔ آج اس کا شمار ملک کی چند بڑی کیمیکلز کمپنیوں میں ہوتا تھا۔ مہر نے انڈسٹریل ایریا میں اس کی فیکٹری دیکھ لی تھی۔ یہاں مقامی طور پر کئی اقسام کے صنعتی کیمیکلز بنائے جاتے تھے اور کئی سو طرح کے کیمیکلز کمپنی باہر سے منگوا کر ملک میں فروخت کرتی تھی۔ باہر سے منگوائے جانے والے کیمیکلز بڑی مقدار میں اور بغیر برانڈ کے ہوتے تھے۔ یہاں ان کو چھوٹی مقدار میں پیک کر کے اور ان پر زیڈ اے کیمیکلز کا برانڈ ڈال کر فروخت کیا جاتا تھا۔ سالانہ فروخت اربوں روپے میں جاتی تھی اور کمپنی ہر سال حکومت کو کروڑوں روپے ٹیکس ادا کرتی تھی۔

اشتہار کا جواب دیتے ہوئے مہر نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زیڈ اے کیمیکلز اتنی بڑی کمپنی ہوگی اور اسے یہاں براہ راست مالک کے اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت مل جائے گی۔ ابتدائی تنخواہ اس کی امیدوں سے کہیں زیادہ تھی اور ظفریاب نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کے کام سے مطمئن ہوا تو تنخواہ میں کم سے کم بیس فیصد اضافہ ہوگا۔ کچ بہت شان دار ہوتا تھا۔ شام کو اسٹاف وین اسے اس کے فلیٹ کے سامنے اتارتی اور صبح یہیں سے پک کرتی تھی۔ مہر نے ہمت کر کے دس ہزار روپے ایڈوانس لے لیا۔ ظفریاب نے اسی وقت اسے ایڈوانس دلوا دیا تھا اور ساتھ ہی اسے خوش خبری سنائی کہ رقم یک مشت نہیں کٹے گی بلکہ ہر تنخواہ سے دو ہزار کاٹ لیے جائیں گے۔ مہر نے سب سے پہلے فلیٹ کا دو مہینے کا کرایہ ادا کیا اور سکون کا سانس لیا کہ اب اسے مالک مکان کی منحوس صورت اور گندی آنکھوں کا بار بار سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ساتھ ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر تین مہینے بعد اس کی تنخواہ بڑھ گئی تو وہ یہ فلیٹ اور علاقہ بھی چھوڑ دے گی۔ اس تنگ و تاریک فلیٹ سے زیادہ اسے یہاں بسنے والوں کی تنگ و تاریک ذہنیت سے وحشت ہوتی تھی جو گھر سے باہر نکلنے والی ہر عورت کو عجیب طرح سے دیکھتے تھے۔ بس اسٹاپ سے فلیٹ کے دروازے تک اسے ایسی ہی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ چھ سات سال سے ایسی ہی نگاہوں کا سامنا کر رہی تھی۔

☆☆☆

کل تک مہر سوچتی آئی تھی کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے یا سچ مچ اسے خواب کی تعبیر مل گئی ہے۔ لیکن آج وہ پھر سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ کیا اس بار وہ خواب ہی دیکھ رہی ہے؟ کیا قسمت اس پر اس حد تک بھی مہربان ہو سکتی ہے؟ کامی اسکول جا چکا تھا۔ آج اسے دیر سے دفتر جانا تھا کیونکہ ظفریاب نے اسے گزشتہ شام ہی بتا دیا تھا کہ وہ دیر سے دفتر آئے گا اس لیے وہ بھی بارہ بجے تک آئے۔ اسٹاف وین ساڑھے گیارہ بجے آتی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مہر نے چھوٹے موٹے کام نمٹائے اور اپنے لیے چائے بنا کر بالکونی میں نکل آئی جہاں سامنے دور تک پھیلا سرسبز پارک بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ پانچویں فلور پر سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا بہت تیز اور خنک تھی۔ جب وہ چہرے سے ٹکراتی تو پورے جسم میں ایک سنسنی آمیز کیفیت دوڑ جاتی تھی۔ اس نے پھر سوچا کہ کیا یہ سچ ہے یا خواب ہے؟ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی اور وہ خود کو اسی تنگ و تاریک فلیٹ میں پائے گی۔ اسے ملازمت کرتے ہوئے تیسرا مہینا شروع ہوا تو ظفریاب نے اسے خوش خبری سنائی۔ "مس مہر! میں تمہارے کام سے مطمئن ہوں اور تین مہینے سے پہلے ہی تمہیں مستقل کیا جا رہا ہے۔ تنخواہ ابھی ستائیس ہزار ہوگی اور ایک سال بعد کمپنی پالیسی کے مطابق انکریمنٹ لگے گا۔"

"تھینک یو سر۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "اب میں کسی اچھی جگہ رہائش لے سکوں گی۔"

"اچھا۔" ظفریاب نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ "جہاں رہ رہی ہیں وہاں کیا مسئلہ ہے؟"

"وہاں مسئلہ ہی مسئلہ ہے سر۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "مجبوری میں رہ رہی تھی۔ اب آپ کی مہربانی سے مجبوری باقی نہیں رہی ہے۔"

"اچھا تو کہاں گھر تلاش کرو گی؟"

"گھر نہیں سر! میں فلیٹ لوں گی۔ اکیلی عورت کے لیے گھر لے کر رہنا مشکل ہے اور گھروں کا کرایہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔"

"کوئی جگہ دیکھی ہے؟"

"نہیں سر! اب دیکھوں گی۔"

ظفریاب نے سوچا اور بولا۔ "ایک اسٹیٹ ایجنٹ کا فون نمبر دے رہا ہوں، اس سے بات کر لو اور اپنی رینج بتا دینا، وہ تمہیں اچھی جگہ دلوائے گا۔"

مہر خوش ہو گئی۔ "یہ تو اور اچھا ہے سر! میں کہاں تلاش کرتی، مجھے تو شہر کے دوسرے علاقوں کا پتا بھی نہیں ہے۔"

صداقت شیخ نامی گرامی اسٹیٹ ایجنٹ تھا اور وہ عام طور سے بڑے سودے کراتا تھا لیکن اپنے مستقل گاہکوں کے لیے چھوٹے موٹے کام کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ مہر نے اس سے رابطہ کر کے اسے اپنی ضرورت اور رینج بتائی۔ اس نے دو دن بعد مہر کو جوابی کال کی۔ "میڈم! ایک چھوٹا فلیٹ ہے۔ سنگل بیڈ اٹیچ باتھ کے ساتھ اور ایک نشست گاہ ہے۔ کچن اور اسٹور الگ ہے۔ ویسٹ اوپن ہے اور پانچویں فلور پر ہے۔"

"یہ تو بہت اوپر ہو جائے گا۔"

"میڈم! یہ لگژری پروجیکٹ ہے۔ لفٹ کبھی مسئلہ نہیں کرتی ہے۔" صداقت شیخ نے ہنس کر کہا۔ "آپ کہیں تو میں آج شام ہی دکھا دیتا ہوں۔"

علاقے کا سن کر مہر فکرمند ہو گئی۔ "یہاں تو کرایہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن مالک کو کرائے کی پروا نہیں ہے۔ وہ اپنے فلیٹ میں کسی مختصر فیملی کو آباد دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو دفتر سے پک کر لیتا ہوں۔"

مہر نے دو گھنٹے پہلے چھٹی مانگی جو اسے آسانی سے مل گئی اور اس نے صداقت شیخ کے ساتھ جا کر یہ فلیٹ دیکھا جو پہلی نظر میں اس کے دل کو بھا گیا۔ فلیٹ پوری طرح فرنش تھا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کچن میں فریج، گیس اوون اور واٹر فلٹر تک لگا تھا۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائنیں تھیں۔ بالکل صاف ستھرا اور چمکتا ہوا فلیٹ تھا۔ اس کے باہر کا ماحول بھی اسی طرح چمکتا ہوا تھا۔ کہیں گندگی یا معمولی سا داغ کا نشان بھی نہیں تھا۔ کرایہ مینٹی نینس سمیت صرف سات ہزار تھا اور ایک مہینے کا ایڈوانس کرایہ تھا۔ "کرایہ لینے میں خود آؤں گا، آپ مجھے کال کر دیجیے گا اور اگر فلیٹ چھوڑنے کا ارادہ ہو تو صرف ایک ہفتے کا نوٹس کافی ہوگا۔"

اگرچہ کرایہ اس کے سابق فلیٹ سے دگنا تھا لیکن یہ اس سے سو گنا زیادہ اچھا اور صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ علاقہ نہایت پوش تھا۔ چاروں طرف بڑی اور صاف ستھری سڑکیں تھیں اور نزدیک ہی مارکیٹ تھی جہاں سے ہر چیز مل جاتی۔ مہر دوسرے دن ہی یہاں شفٹ ہو گئی۔ سابق مالک مکان نے نوٹس دیے بغیر جانے پر بقیہ مہینے کا کرایہ کاٹ لیا تھا لیکن مہر نے پروا نہیں کی۔ کامی کے اسکول میں داخلے کا مسئلہ بھی صداقت شیخ نے حل کر دیا۔ اس کی بہن اسی علاقے میں ایک اچھا اسکول چلا رہی تھی۔ کامی کو مڈ ٹرم میں ہونے کے باوجود وہاں داخلہ مل گیا۔ یہ جگہ دفتر سے بھی زیادہ دور نہیں تھی۔ وین میں بیس منٹ لگتے تھے۔ آس پاس مختصر اور اچھی فیملیز آباد تھیں۔ چند دن میں مہر کی اچھی جان پہچان ہو گئی۔ سامنے ہی ایک شادی شدہ جوڑا تھا۔ بیوی سیما طبیعت کی بہت اچھی تھی۔ اس کی مہر سے دوستی ہو گئی اور اس نے مہر سے کہا کہ کامی دوپہر میں اس کے پاس آ جایا کرے وہ اسے پڑھا بھی دے گی اور خیال رکھے گی۔ سیما کا شوہر صغیر احمد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا تھا اور شام کو دیر سے آتا تھا۔ سیما کی بوریت بھی کم ہو جاتی۔ اب کامی اسکول سے اس کے پاس آتا اور وہیں دوپہر کا کھانا کھاتا۔ اگرچہ مہر نے منع کیا کہ وہ کامی کے لیے لنچ بنا کر جاتی ہے مگر سیما نے اصرار کیا۔

"اگر بچہ ایک وقت میرے ہاں کھا لے گا تو کون سی کمی ہو جائے گی۔"

شام کو جب مہر دفتر سے آتی تو سیما بھی آ جاتی۔ وہ مل کر گپ شپ اور کام کرتے تھے۔ جب مہر نے اسے اپنی کہانی سنائی تو اسے بھی حیرت ہوئی کہ آج کے دور میں کسی کے حالات ایسے بھی بدلتے ہیں۔ "باجی... آپ سچ مچ خوش قسمت ہیں ورنہ ہم جتنی مشکل سے یہاں تک آئے ہیں، ہم ہی جانتے ہیں اور یہاں رہنے کی کیا قیمت ادا کر رہے ہیں، اس کا بھی ہمیں ہی پتا ہے۔"

مہر نے اسے اپنے فلیٹ کا کرایہ نہیں بتایا تھا کیونکہ صداقت شیخ نے اسے منع کیا تھا۔ اس سے فلیٹوں کی ریپوٹیشن خراب ہوتی تھی۔ وہ جان کر حیران رہ گئی کہ سبینا کے فلیٹ کا کرایہ پندرہ ہزار تھا اور مینٹی نینس الگ دینا پڑتا تھا جبکہ فلیٹ بھی ایسٹ اوپن تھا۔ مہر کو اے سی کیا پنکھا چلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس فلیٹ کے مالک نے اسے اتنے کم کرائے پر کیوں دیا تھا۔ کچھ عرصے تو اس نے یہ بات سبینا کو نہیں بتائی لیکن جلد اس سے دوستی اور بے تکلفی اس درجے کو پہنچ گئی کہ مہر سے رہا نہیں گیا اور اس نے سبینا کو بتا دیا کہ وہ صرف سات ہزار کرایہ دے رہی ہے۔ سبینا دنگ رہ گئی۔

"صرف سات ہزار باجی۔"

"اور میں مالک سے ملی تک نہیں ہوں بلکہ مجھے تو اس کا نام تک نہیں معلوم ہے۔ میرا معاہدہ صداقت شیخ سے ہوا ہے۔"

"کہیں یہ ایجنٹ درمیان میں کوئی ڈنڈی تو نہیں مار رہا ہے؟"

مہر ہنسی۔ "بے وقوف اگر اسے ڈنڈی مارنی ہوتی تو مجھ سے صرف سات ہزار کیوں لیتا۔ اور پھر اس کی ساکھ ہے، وہ اس قسم کی حرکت کیسے کرسکتا ہے۔ مالک نے اسے اتھارٹی لیٹر دیا ہوا ہے۔"

سبینا کسی قدر چھوٹی قامت کی بڑی دلکش عورت تھی۔ عمر چھبیس برس تھی۔ شولڈر کٹ بالوں اور چمکتی آنکھوں سے وہ لڑکی لگتی تھی۔ جسم بہت متناسب تھا۔ بچے یوں نہیں تھے کہ بقول اس کے شوہر کے وہ ابھی بچے افورڈ نہیں کرسکتے تھے حالانکہ سبینا کو بچوں کی بہت خواہش تھی۔ مہر بھی کبھی اسے چھیڑتی۔ "تمہارے شوہر کو پتا ہے بچے ہوگئے تو تمہارا حسن ماند پڑ جائے گا۔ اس لیے وہ بچہ نہیں چاہتا۔ وہ دیوانہ ہے تمہارا۔"

سبینا شرما جاتی۔ "آپ کون سی کم ہیں... لگتا ہی نہیں ہے کہ نو سال کے بیٹے کی ماں ہیں۔"

ایسی ہی ایک گفتگو کے دوران سبینا نے کہا۔ "مہر باجی... آپ سے اتنی بے تکلفی ہوگئی ہے کہ ہم ہر بات کرسکتے ہیں میرے ذہن میں کئی دن سے ایک بات آرہی ہے مگر میں کہہ نہیں پا رہی ہوں۔"

"کیا بات ہے؟"

"کہیں ان مہربانیوں میں آپ کے باس ظفریاب کا ہاتھ تو نہیں ہے؟"

مہر چونک گئی۔ "ظفریاب صاحب... نہیں وہ کیسے ہوسکتے ہیں؟ ان کو بھلا مجھ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟"

"دلچسپی تو ہوسکتی ہے۔" سبینا نے معنی خیز انداز میں ہنس کر کہا۔

مہر جھینپ گئی۔ "فضول بولے جارہی ہو۔ وہ اس قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے چار مہینے سے بھی اوپر ہوگئے ہیں لیکن آج تک انہوں نے مجھ سے کوئی فالتو بات نہیں کی۔"

"مہر باجی... اس طرح ملازمت دینا پھر اتنا آسان کام جو کسی کمپنی کے مالک کا تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ آپ خود سوچیں، آج کل اچھے اچھے تجربے کار لوگوں کو اتنی تنخواہ نہیں ملتی ہے۔"

مہر فکرمند ہوگئی۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن سبینا میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے آج تک ظفریاب صاحب کے انداز میں کوئی غرض نہیں دیکھی۔ وہ تو جب مجھے لنچ کے لیے باہر لے کر جاتے ہیں، تب بھی ان کا رویہ باس والا ہی ہوتا ہے۔"

سبینا ہنس پڑی۔ "باجی، تب آپ بہت لکی ہیں۔ اللہ نے آپ کے مسائل بیٹھے بیٹھے حل کردیے۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا، یہ سب اسی کی مہربانی ہے۔"

سبینا نے معذرت کی کہ اس کا مقصد برا نہیں تھا اور مہر نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس کے خلوص کو سمجھتی ہے۔ مہر کو کچھ دیر کے لیے تو اس کی بات کھٹکی تھی لیکن پھر اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کے ساتھ جو ہوا تھا، وہ صرف خوش قسمتی تھی۔ اس میں کسی کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ بہت خوش تھی اور زیادہ خوش اس لیے تھی کہ کاشی بہت خوش تھا۔ اس سے پہلے وہ جہاں رہتے تھے، وہاں نچلے طبقے کے بدتمیز اور گالیاں دینے والے بچوں سے اس کی نہیں بنتی تھی اس لیے وہ سکول سے آنے کے بعد گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ لیکن یہاں اس نے دو مہینے میں کئی دوست بنا لیے تھے۔ شام کو جب وہ دفتر سے آتی تو وہ اسے فلیٹ کے سامنے میدان میں بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی فرمائش پر مہر نے اسے کرکٹ کٹ اور گرین شرٹ لادی تھی۔ اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے ستر فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کیے تو وہ اسے اس کی پسند کی سائیکل دلائے گی۔

دفتر سے آکر وہ رات کے کھانے کی تیاری کرتی تھی۔ ساتھ میں سبینا سے گپ شپ کرتی۔ نشست گاہ میں ٹی وی لگا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد کاشی ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتا اور وہ سبینا کے ساتھ عمارت کی چھت پر آجاتی جہاں رات کے وقت اکثر خواتین آتی تھیں۔ دس گیارہ بجے تک وہ واپس آجاتی اور اگلے دن کے لیے اپنے اور کاشی کے کپڑے پریس کرکے سو جاتی۔ کبھی کبھی ظفریاب دیر سے دفتر آتا۔ اگر اس کا پروگرام پہلے سے طے ہوتا تو وہ مہر کو بھی منع کر دیتا ورنہ وہ دفتر میں آکر معمول کے کاموں میں لگ جاتی۔ یہ معمول کے کام بھی اتنے کم ہوتے تھے کہ دو تین گھنٹے میں نمٹ جاتے تھے۔ اس دن وہ دفتر پہنچی تو ظفریاب نہیں آیا تھا۔ اس نے دس بجے تک انتظار کیا اور اسے کال کرنے جا رہی تھی کہ خود ظفریاب کی کال آگئی۔

"مہر! میں گھر پر ہوں اور میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن کچھ ضروری فائلیں درکار ہیں۔ میں ڈرائیور کو بھیج رہا ہوں۔ تم اس کے ساتھ فائلیں لے آؤ۔ اور ہاں، ای میلز آئی ہیں؟"

"جی سر۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے، انہیں بھی یو ایس بی میں لیتی آنا... اور ہاں دفتر لاک کر دینا۔ یہ کام کرکے تم چھٹی کرنا۔ ڈرائیور تمہیں ڈراپ کردے گا۔"

اس سے پہلے ظفریاب نے اسے کبھی گھر نہیں بلایا تھا ورنہ ہی مہر کو پتا تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ وہ پریشان تو ہوئی لیکن اتنی بھی نہیں کہ اسے ذہن پر طاری کرلیتی۔ نوکری کے دوران اس قسم کی چیزیں دیکھنا پڑتی ہیں اور اب تک ظفریاب کا رویہ نہایت اچھا رہا تھا۔ وہ تیار ہوئی، اس نے مطلوبہ فائلیں نکالیں۔ ای میلز یو ایس بی میں منتقل کیں اور دفتر کو لاک کردیا۔ ڈرائیور بیس منٹ میں آگیا۔ وہ ایڈمن آفیسر کو بتا کر اس کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ ڈرائیور نے گاڑی ڈیفنس کی طرف موڑ دی۔ کچھ دیر بعد وہ وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہوئے جس کے چاروں طرف شاندار لان تھا۔ گیٹ پر مسلح چوکیدار موجود تھا۔ اس نے باقاعدہ معائنہ کرکے گاڑی کو اندر آنے کی اجازت دی۔ گیٹ پر ظفریاب ہاؤس کی تختی لگی تھی۔ سفید رنگ کی محل نما عمارت دیکھنے والی تھی۔ اس عمارت کو دیکھ کر مہر کو اندازہ ہوا کہ ظفریاب کتنا دولت مند اور باذوق شخص ہے۔ کیونکہ ایسی حسین عمارت دولت اور ذوق حسن کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ظفریاب تن ہولی نشست گاہ میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے گاؤن پہن رکھا تھا اور پیروں میں نفیس سلیپرز تھے۔

"اس زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" مدعم کا جواب دیتے ہوئے اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں سر... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "بس طبیعت پر تھوڑا آمادہ نہیں تھی اس لیے میں دفتر نہیں آیا۔"

مہر نے فائلیں اس کے سامنے رکھیں۔ "سر ایک بات پوچھوں اگر آپ اجازت دیں؟"

"ہاں، اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے سر... سوال آپ کی پرسنل لائف کے بارے میں ہے۔"

ظفریاب نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم مجھ سے ہر بات پوچھ سکتی ہو۔ یہ حق تمہیں اسی وقت حاصل ہوگیا تھا جب میں نے تمہاری ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"سر! آپ اکیلے رہتے ہیں؟"

"یہ اندازہ کیسے لگایا؟"

"سر! میں کئی مہینے سے آپ کی اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کررہی ہوں۔ اس دوران میں آپ نے ایک بار بھی گھر کے کسی فرد کا ذکر نہیں کیا۔ ایک بار بھی آپ کے گھر سے کسی کی کال نہیں آئی۔"

ظفریاب نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ "تمہارا مشاہدہ تیز ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ انتقال کرچکے ہیں۔ ایک شادی کی لیکن تجربہ کامیاب نہیں ہوا۔ طلاق پر ختم ہوا۔ کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ طلاق کے بعد سے اکیلا ہوں۔ دوست احباب بہت کم ہیں کیونکہ ہمارے طبقے میں تعلق دولت کی بنیاد پر بنتے ہیں اور میں انسان کو صرف انسان سمجھتا ہوں۔ امیروں والے شوق بھی نہیں ہیں۔ پڑھنے کا شوق ہے۔ کام سے نمٹ کر میں تمہیں اپنی لائبریری دکھاتا ہوں۔ گھر میں ہوتا ہوں تو زیادہ وقت وہیں گزرتا ہے۔"

ظفریاب نے ایک ہی بار میں اپنے بارے میں سب بتا کر فائل اٹھالی۔ ایک ملازم کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ٹرالی لے کر آیا۔ اس نے سرو کرنے کی کوشش کی لیکن مہر نے مہمان ہوتے ہوئے بھی چارج سنبھال کر اسے رخصت کردیا۔ اس نے ظفریاب کی پسند کے مطابق کافی تیار کی اور مگ اس کی طرف بڑھایا۔ "کچھ لیں گے سر؟"

"نو تھینکس۔" اس نے کہا۔ "ای میلز لائی ہو؟"

"جی سر۔"

ایک طرف میز پر لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ ظفریاب نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے ڈیسک ٹاپ پر محفوظ کردو۔"

یہ کام کرکے مہر چائے اور دیگر لوازمات سے محظوظ ہونے لگی۔ ظفریاب پوری توجہ سے کام کررہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے آخری فائل بھی دیکھ کر عینک اتار دی اور مہر سے دوسری کافی طلب کی۔ ہاٹ پاٹ میں کافی اب بھی گرم تھی۔ اس نے مہر سے کہا۔ "اب میں بھی ایک سوال کرنے کی اجازت چاہوں گا۔"

"پلیز سر... شرمندہ نہ کریں۔"
"یہاں آتے ہوئے تمہیں عجیب نہیں لگا یا جھجک نہیں ہوئی؟"
"بہت معمولی سی ہوئی تھی کیونکہ پہلی بار ایسا ہوا۔"
"کئی بار ایسا ہوا کہ میرا دفتر آنے کا موڈ نہیں بنا لیکن میں نے تمہیں بلانے کے بجائے چھٹی کرلی۔"
"کیوں سر؟"
"میں نہیں جانتا تھا کہ اگر میں نے تمہیں اپنے گھر بلایا تو تم کیا سوچوگی۔"
"آپ میرا اتنا خیال کرتے ہیں؟" مہر نے حیرت سے کہا۔ "میں ایک معمولی ملازم ہوں۔"
ظفریاب نے مسکراتے ہوئے تردید کی۔ "تم معمولی ملازم نہیں ہو۔ جب تم نے انٹرویو میں بتایا کہ پچھلی جابز کیوں چھوڑیں تو میں بہت احتیاط کرنے لگا کہ تمہیں میری کوئی بات ناگوار نہ گزرے، میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"
"اس کے لیے میں آپ کی شکرگزار ہوں سر۔" مہر نے کسی قدر جذباتی انداز میں کہا۔ "میں اتنے عرصے سے جاب کرتی آئی ہوں لیکن آپ جیسا ایک شخص بھی نہیں ملا۔ آپ کے ساتھ رہ کر میں خود کو اتنا ہی محفوظ تصور کرتی ہوں جتنا اپنے گھر میں کرتی ہوں۔"
"یہ میری خوش قسمتی ہے۔" وہ بولا۔ "اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنا گھر اور لائبریری دکھاؤں؟"
"یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی سر... جب اس عمارت پر پہلی نظر پڑی تب ہی سے میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔" مہر نے کہا۔ "اس کا طرزِ تعمیر بہت آرٹسٹک ہے۔"
"میں نے خود اسے آرکیٹیکٹ سے ڈیزائن کرایا ہے۔" ظفریاب کھڑا ہوگیا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"
ظفریاب نے اسے پوری عمارت دکھائی۔ عمارت باہر سے جتنی خوب صورت تھی، اندر سے اتنی ہی پُرآسائش اور صاف ستھری تھی۔ نچلے فلور پر نشست گاہوں کے ساتھ ڈائننگ ہال، ظفریاب کی لائبریری اور ایک چھوٹا سا گیسٹ ہاؤس تھا۔ اوپری منزل خواب گاہوں کے لیے مخصوص تھی۔ ایک ایک چیز متاثر کن اور امارت کا تاثر لیے ہوئے تھی۔ اتنے بڑے اور خوب صورت گھر میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ پھر وہ اسے عقبی حصے میں لایا۔ یہاں لان کے بجائے باغ تھا جس میں بہت سارے ایسے درخت اور پھول دار پودے لگے تھے جن میں سے اکثر مہر نے پہلی بار دیکھے تھے۔ یہ بھی ظفریاب کا ایک شوق تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پرند احاطہ تھا جس میں دنیا بھر کے نایاب اور قیمتی پرندے موجود تھے۔ عمارت کے دائیں طرف بڑا سا سوئمنگ پول تھا۔ اس نے وضاحت کی۔
"مجھے ایکسرسائز کا شوق نہیں ہے لیکن سوئمنگ کرلیتا ہوں۔ اس سے فٹ رہتا ہوں۔"
جسمانی لحاظ سے ظفریاب مناسب لگتا تھا۔ خدا نے اسے سب دے رکھا تھا، اس کے باوجود وہ اکیلا تھا۔ اکیلا ہونا کتنا بڑا عذاب ہے، مہر اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے پھر بھی کام کا سہارا تھا لیکن ظفریاب کے پاس تو کچھ نہیں تھا۔ وہ وہیں... پاس رکھی کرسیوں پر آبیٹھے۔ مہر نے جھجک کر کہا۔
"سر! آپ نے دوبارہ شادی کے لیے کیوں نہیں سوچا؟"
اس نے گہری سانس لی۔ "مہر! میں نے بتایا نا ہمارے طبقے میں آدمی تعلق کی بنیاد دولت پر رکھتا ہے اور مجھے ایسی عورت درکار تھی جو صرف مجھے چاہے، میری دولت کو نہیں۔"
"لیکن سر... مادی آسائشیں بھی تو اہمیت رکھتی ہیں۔"
"ہاں لیکن صرف ان کو اہمیت دینا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ میرے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے لیکن اکثر لوگ مجھ سے رشتے کے نام پر کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے پھر میں نے تلاش ہی ترک کردی۔ اب میں اکیلے زیادہ خوش ہوں۔"
"لیکن انسان ہمیشہ تو اکیلے نہیں رہ سکتا۔"
"غلط انتخاب سے بہتر ہے، وہ اکیلا ہی رہے۔"
کچھ دیر میں ظفریاب کے شیف نے لنچ کی اطلاع دی۔ میز پُرتکلف کھانوں سے سجی تھی اور ظفریاب اصرار کرکے اس کی طرف ڈشز بڑھا رہا تھا۔ خود اس نے برائے نام ہی کھایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ نشست گاہ میں آئے تو مہر نے کہا۔ "آج میں نے زیادہ ہی کھا لیا ہے۔ اب مجھے بدہضمی کی دوا لینی پڑے گی۔ میں دوپہر میں کم کھاتی ہوں۔"
"اسی وجہ سے تم اسمارٹ ہو۔ بہرحال میں بھی دوپہر میں کم لیتا ہوں اور سادہ کھاتا ہوں۔ آج میرے شیف نے تمہارے اعزاز میں یہ سب بنایا ہے۔"
مہر جانتی تھی کہ ظفریاب دوپہر میں کم اور سادہ کھانا کھاتا تھا۔ اس لیے اسے بھی میز پر اہتمام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اب کام کوئی نہیں تھا اس لیے کافی کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوگئی۔ ڈرائیور نے اسے فلیٹ تک چھوڑ دیا۔ اس ایک دن میں مہر نے ظفریاب کی نجی زندگی کے بارے میں جانا تھا کیونکہ دفتر میں وہ اپنے بارے میں بات نہیں کرتا تھا ورنہ کبھی اپنے نجی معاملات مہر کے سامنے رکھے تھے۔ وہ اس سے عام موضوعات پر بات کرلیتا تھا۔ دفتر میں اس کا تاثر ایک بہت

اچھے باس والا تھا جو رکھ رکھاؤ والا تھا اور عورتوں کی عزت کرتا تھا۔ اپنے گھر میں بھی اس کا رویہ ویسا ہی رہا اور مہر نے اس میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی۔ اس نے مہذبانہ انداز میں اس کی میزبانی کی۔ کام مکمل کیا اور جب اس کی ضرورت نہیں رہی تو اسے گھر بھجوا دیا۔ اس نے فائلیں مہر کے حوالے کردی تھیں کہ اگلے دن وہ انہیں دفتر لے جائے۔
اس کے بعد ظفریاب ہفتہ دس دن میں ایک بار اسے کام کے سلسلے میں اپنے بنگلے پر بلوالیتا۔ ایک دو گھنٹے کام ہوتا تھا پھر [illegible] ہوتی۔ لنچ مہر وہیں کرتی تھی۔ پہلی دفعہ کے بعد [illegible] شیف سے کہہ دیا تھا کہ اس کے لیے سادہ لنچ تیار [illegible]۔ ظفریاب کو اس کے ہاتھ کی کافی پسند [illegible] وہ یہاں بھی خود کافی تیار کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس سے گھر کے معاملات پر بات کرتا اور اس سے مشورہ لیتا۔ نشست گاہ کی سیٹنگ بہت پرانی اور بھاری تھی۔ مہر نے مشورہ دیا کہ اسے ہلکا اور جدید انداز کا کرلیا جائے۔ اگلی بار وہ گئی تو نشست گاہ کی پوری سیٹنگ بدل گئی تھی۔ ہلکا جدید دھات اور لیدر کا بنا فرنیچر تھا۔ گلاس ٹاپ ٹیبل تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری پردوں کے بجائے ہلکے اور خوب صورت رنگوں والے پردے موجود تھے۔ ایک طرف کھڑکی کی جگہ شیشہ فکس کردیا گیا تھا جس سے لان کا خوب صورت منظر کسی سینری کی طرح نظر آرہا تھا۔
"خوب صورت۔" مہر نے تعریف کی تو ظفریاب مسکرایا۔
"یہ تمہارے مشورے پر ہوا ہے۔"
مہر کو حیرت ہوئی کیونکہ [illegible] معمولی سا تھا اور اس نے مختصر الفاظ میں یہ تجویز پیش کی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی سنجیدگی سے اس پر عمل کرے گا۔ اسی طرح ایک بار مہر [illegible] پاجامے میں اچھے لگتے ہیں تو اگلی بار ظفریاب نے سفید کرتہ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ وہ کبھی مہر کی تعریف کرتا تو یہ کہتا کہ کوئی چیز اس پر اچھی لگ رہی ہے لیکن یہ سب بہت محتاط اور مہذب پیرائے میں ہوتا تھا۔ اس کے [illegible] محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ ظفریاب [illegible] میں وہ بہت سادہ سے حلیے میں دفتر [illegible] رہی تھی۔ ظفریاب نے ایک بار بھی اس سے نہیں کہا کہ وہ [illegible]۔ پھر رفتہ رفتہ میں آئی تو مہر نے اپنے [illegible] اچھے جوڑے لیے۔ مہر کے بال بہت لمبے اور گھنے [illegible] سے انہیں لیئر کٹ کروایا۔ [illegible]

کر وہ چادر اتار کر دوپٹا لے لیا کرتی۔ پہلے سادہ سینڈل ہوتا تھا، اب وہ جدید وضع کے سینڈلز اور شوز استعمال کرتی تھی۔ اس میں یقیناً خاصی تبدیلی آئی تھی اور یہ بات ظفریاب نے بھی محسوس کی تھی۔ شاید اسی لیے اب وہ اس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ایک دن وہ دفتر آئی تو ظفریاب نہیں آیا تھا اور اس نے آنے کے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔
مہر نے کال کی۔ "سر! آپ آئے نہیں؟"
"آج موڈ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "کیا تم آسکتی ہو؟"
"کیوں نہیں سر۔"
"لیکن کام سے نہیں، آج میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں اور شاید ہم کہیں باہر بھی جائیں گے۔"
مہر نے سوچا اور بولی۔ "میں آتی ہوں سر۔"
ڈرائیور اسے لینے دیر سے آیا۔ وہ دو بجے ظفریاب پیلس پہنچی تو ظفریاب باہر ہی موجود تھا۔ اس نے پورچ میں ہی ڈرائیور سے گاڑی کی چابی لی اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "ہم باہر جارہے ہیں۔"
مہر ہچکچائی اور پھر فرنٹ سیٹ پر آبیٹھی۔ ظفریاب گھوم کر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کچھ دیر بعد وہ میرین ڈرائیو کی طرف جارہے تھے۔ مہر خاموش تھی۔ ظفریاب نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ "تمہیں اچھا نہیں لگا میرا اس طرح بغیر پوچھے فیصلہ کرنا؟"
"نہیں سر... لیکن میں آج تک اس طرح کسی کے ساتھ باہر نہیں گئی۔"
"باہر تو گئی ہو۔"
مہر نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ دوسری بات تھی، اس وقت میں آپ کی اسسٹنٹ ہوتی ہوں مگر اس وقت آپ یقیناً مجھے اسسٹنٹ کی حیثیت سے نہیں لے جارہے ہیں۔"
ظفریاب خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر میں وہ ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران پہنچے جہاں ان کے لیے ٹیرس پر میز ریزرو تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے سامنے شیشے کی رکاوٹ کھڑی کردی گئی تھی جس کے پار سمندر واضح دکھائی دے رہا تھا لیکن ہوا کے زور میں کمی آگئی تھی۔ لنچ بھی خاموشی سے کیا گیا۔ لنچ کے بعد ظفریاب نے کافی منگوائی اور مہر نے چائے کو ترجیح دی۔ کافی کے بعد ظفریاب نے اس سے ساحل پر چہل قدمی کے بارے میں پوچھا۔ مہر نے سر ہلایا تو اس نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ وہ ریستوران سے نکل کر سڑک کے پار ساحل پر آگئے۔ موسم ابر آلود تھا اور سمندر کی طرف سے بہت نم ہوا چل رہی تھی۔ ظفریاب نے کچھ دیر بعد کہا۔ "مہر! میں تم سے

بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اتنی بڑی دنیا میں تم واحد ہستی ہو جس سے میں دل کی بات کر سکتا ہوں۔"

"یہ میرے لیے اعزاز ہے سر۔"

"نہیں... نہیں، اعزاز نہیں ہے تم اس قابل ہو، اس سے بھی بڑھ کر قابل ہو۔ تم نے آج تک میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے۔" ظفریاب نے بے چینی سے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا میں بہت اکیلا ہوں... کیونکہ اب تک مجھے کوئی ایسی عورت نہیں ملی جو مجھے اہمیت دے۔"

"جی سر..."

"پلیز سر نہیں... اس وقت مجھے ظفریاب کہو۔ تم بھول جاؤ کہ تم میری اسسٹنٹ ہو۔"

"جی... ظفریاب صاحب۔" مہر نے ذرا مشکل سے کہا۔

"مجھے وہ عورت مل گئی لیکن اب تک میں اس سوچ میں تھا کہ اسے پروپوز کروں یا نہ کروں۔ کہیں وہ مجھے غلط نہ سمجھے۔"

مہر کا بدن سنسنا اٹھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "پروپوز کرنا ایسی بات نہیں ہے جو غلط سمجھی جائے۔"

"جب میں اس سے پہلی بار ملا، تب ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ وہی عورت ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کے نزدیک میرا جو امیج بن گیا تھا، اسے بھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ امیج ٹوٹ گیا تو وہ مجھ سے دور نہ ہو جائے اور یہ بات میرے لیے قطعی ناقابلِ برداشت ہوگی۔"

"امیج ٹوٹنا؟"

"نہیں، اس کا دور ہونا۔"

مہر محسوس کر رہی تھی کہ بات کس رخ پر جا رہی ہے اور ظفریاب اس کے منہ سے کیا سننا چاہتا ہے۔ اس نے بہت ناپ تول کر کہا۔ "آپ ایک اچھے آدمی ہیں اور جو شخص بھی آپ کو قریب سے جانتا ہے، وہ آپ سے بدگمان نہیں ہوگا۔ کم سے کم اس لیے تو نہیں ہوگا کہ آپ اسے پروپوز کر رہے ہیں۔ انکار یا اقرار آگے والے کی مرضی پر ہوگا۔"

"یہی چیز تو مجھے روک رہی ہے۔ اگر وہ انکار کرتی ہے تو کیا بات ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو جائے گی؟ کیا پھر وہ میرے قریب رہ سکے گی؟"

"شاید نہیں۔"

"اسی لیے میں ہچکچا رہا ہوں۔ اگر وہ مجھے قبول نہیں کرتی تو یہ مجھے گوارا ہے لیکن وہ مجھ سے دور چلی جائے، یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔" ظفریاب نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

"ظفریاب صاحب... اس معاملے میں اتنی احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، آپ بات کر کے دیکھ لیں۔"

ظفریاب نے گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے تم جان گئی ہو؟"

اس نے انجان بن کر کہا۔ "نہیں، جب تک آپ نہیں بتائیں گے میں کس طرح جان سکتی ہوں؟"

"مہر! وہ عورت تم ہو۔ میں پانچ مہینے سے یہ بات تم سے کہنا چاہ رہا تھا لیکن نہیں کہہ پا رہا تھا۔" کہتے ہوئے ظفریاب کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

مہر کا چہرہ سرخ ہوا لیکن اس نے اپنا رویہ نارمل رکھا۔ "میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس عزت کے قابل سمجھا لیکن شادی کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ خاص طور سے ایک ایسی عورت کو جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو اور جس کا ایک نو سال کا بیٹا ہو۔ آپ اس سے متفق ہیں نا؟"

ظفریاب نے سکون کا سانس لیا۔ مہر کے نارمل رویے سے اسے حوصلہ ہوا اور وہ بھی معمول پر آ گیا۔ "میں بالکل متفق اور شکر گزار ہوں کہ تم نے سکون سے میری بات سنی اور اسے غلط معنوں میں نہیں لیا۔"

"ظفریاب صاحب! آپ نے کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔ آپ جیسے اچھے انسان ایسے ہی کرتے ہیں۔ آج میرے دل میں آپ کی عزت اور بھی بڑھ گئی ہے۔"

"تم اطمینان سے سوچو اور اگر کوئی وضاحت طلب بات ذہن میں آئے تو بلا جھجک مجھ سے پوچھ لینا۔ اور مہر، اگر تم انکار کرنا چاہو تو میں آج کا دن اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دوں گا۔ میں نے صرف شادی کی پیشکش نہیں کی ہے، یوں سمجھ لو اپنی زندگی اور اپنا سب کچھ تمہارے سامنے ڈھیر کر دیا ہے۔" ظفریاب کا لہجہ بھیگ گیا۔

وہ اس سے دل کی بات کہہ کر پُرسکون ہو گیا تھا لیکن مہر کا ابتدائی اطمینان رخصت ہو رہا تھا اور ایک بے چینی سی اس کے وجود پر قبضہ جما رہی تھی۔ اس نے ظفریاب کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کیا مجھے سوچنے کے لیے کچھ دن کی چھٹی مل سکتی ہے؟"

"چھٹی کرنا ضروری ہے؟" وہ یک بہ یک مضطرب ہو گیا۔

"ہاں، میں آپ سے دور رہ کر بالکل غیر جانبداری سے فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔" مہر نے کہا۔ "ہاں، ایک بات پوچھنا چاہوں گی۔"

"پوچھو۔"

"مجھے جواب دینا پھر اتنی زیادہ تکلیف دہ ہے اور مجھے ایک [illegible] جس کا [illegible] سے [illegible] بھی نہیں ہے... آپ کی

یہ مہربانیاں اس لیے ہیں کہ آپ مجھے پسند کرتے ہیں؟"

ظفریاب نے اعترافِ جرم کے انداز میں سر جھکا لیا۔ "تم نے درست سمجھا۔"

مہر نے گہری سانس لی۔ "یہ آپ نے اچھا نہیں کیا... مجھے زیرِ بار کر دیا۔ اب مجھے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے آپ کی مہربانیوں..."

"نہیں پلیز، ان کو بھول جاؤ۔ یہ سب میں نے دل سے مجبور ہو کر کیا۔ تمہارے کسی فیصلے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

☆☆☆

بالکنی میں مہر، سبینا کے ساتھ تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور کامی سو گیا تھا۔ وہ ساڑھے دس بجے تک بستر پر چلا جاتا تھا۔ مہر نے سبینا کو ظفریاب کی پیشکش کے بارے میں بتایا۔ وہ غور سے سن رہی تھی۔ جب مہر نے بات مکمل کی تو اس نے کہا۔ "یعنی میرا شبہ درست تھا۔"

"ہاں۔" مہر نے خفت سے کہا۔ "لیکن اس وقت میں ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔"

"اس میں آپ کا قصور نہیں ہے۔ ظفریاب نے ایسا کوئی رویہ نہیں رکھا تھا۔ اب وہ کھل کر سامنے آیا ہے۔"

"سبینا! اسے مجھ سے کہیں زیادہ خوب صورت اور کنواری بلکہ دولت مند لڑکی مل سکتی ہے۔"

"باجی، اس نے کہہ تو دیا ہے وہ شادی کرنا چاہتا ہے کاروبار نہیں اور آپ میں اسے وہ ہستی نظر آئی ہے جو اسے اہمیت دے گی نہ کہ اس کی دولت کو۔"

"سبینا! مجھے اس کے خلوص پر شبہ نہیں ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس کی پیشکش کا کیا جواب دوں۔" مہر نے بے بسی سے کہا۔ "میں اکیلی نہیں ہوں، میرا بیٹا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ آپ کا بیٹا ہے لیکن یہ کوئی انوکھا کام تو نہیں ہوگا۔ اس دنیا میں لاکھوں مرد اور عورتیں دوسری شادی کرتے ہیں اور اولاد ہونے کے باوجود کرتے ہیں۔ اس میں برائی نہیں ہے۔ ظفریاب مہذب اور سلجھا ہوا آدمی ہے۔ اگر وہ کامی کو باپ کی شفقت نہ بھی دے گا تب بھی امید ہے کہ وہ اس سے برا سلوک نہیں کرے گا۔ اس شادی سے کامی کو [illegible] کہ آپ کی [illegible] تقسیم ہو جائے گی۔ لیکن دو ڈھلتی عمر کا [illegible]۔ چند سال بعد اس کی دلچسپیاں گھر سے باہر ہو جائیں گی اور وہ اس کمی کو اتنا محسوس نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس ہر گزرتے سال آپ کو زندگی کے [illegible] محسوس ہوگی۔ ڈھلتی عمر میں میاں بیوی ہی ایک دوسرے کا سہارا ہوتے ہیں۔ ظفریاب دولت مند ہے، اس سے شادی کے بعد آپ کو معاش کا مسئلہ نہیں رہے گا۔ نوکری کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، بہرحال نوکری ہوتی ہے۔"

مہر نے سبینا کے مدلل تبصرے پر غور کیا۔ "یعنی تمہاری رائے ہے کہ مجھے یہ پروپوزل قبول کر لینا چاہیے؟"

"مجھے تو اس میں فائدے زیادہ نظر آ رہے ہیں۔ ظفریاب ذاتی حیثیت میں بھی پُرکشش ہے۔ آپ کے لحاظ سے بہت مناسب ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ آپ دونوں کی جوڑی سجے گی۔ اسے آپ سے کوئی لالچ نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ اپنی پیشکش میں پُرخلوص ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اب مجھے کامی سے بات کرنی ہوگی۔"

"یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔ شاید وہ مزاحمت کرے لیکن مان جائے گا۔"

کامی سبینا سے مانوس ہو گیا تھا اور وہ ماں کی طرح اس کی بات مانتا تھا۔ خلافِ توقع کامی نے مخالفت نہیں کی بلکہ وہ خوش تھا۔ وہ اتنا بڑا تو نہیں تھا کہ شادی کا مفہوم صحیح معنوں میں سمجھ سکتا لیکن وہ ماں کی خوشی میں خوش تھا۔ ایک ہفتے بعد اس نے ظفریاب کو کال کر کے اپنی رضامندی دے دی۔ وہ خوشی سے بے تاب ہو گیا۔ "بس تو ہم اسی ہفتے نکاح کر رہے ہیں۔"

مہر شرما گئی۔ "اتنی جلدی؟"

"جلدی؟" ظفریاب بولا۔ "میں پانچ مہینے سے انتظار کر رہا ہوں اور اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔"

سبینا نے بھی جلدی شادی کی تائید کی۔ "باجی! جب آپ فیصلہ کر چکی ہیں تو بس اس پر عمل کر لیں۔"

یوں صرف دس دن کے اندر مہر اور ظفریاب کا نکاح سادگی سے ہو گیا۔ ظفریاب اس کے لیے صرف دلہن کا جوڑا لایا تھا۔ کامی کو ایک دن کے لیے سبینا نے روکنا چاہا لیکن ظفریاب نے کہا۔ "کامی اب ہمارا بیٹا ہے اور یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

مہر، ظفریاب پیلس پہنچی تو اس کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پورا پیلس روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ بیڈروم میں اتنے پھول تھے کہ خوشبو سے ہوا بوجھل ہو گئی تھی۔ ظفریاب نے نئے سرے سے بیڈروم فرنش کرایا تھا۔ اس نے کامی کے لیے الگ کمرا نئے سرے سے اس کی عمر کے حساب سے فرنش کرایا تھا۔ یہ سب مہر کے تصور سے بھی بڑھ کر تھا۔ اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ اگلے دن ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ولیمہ تھا جس میں لوگ کم تھے لیکن یہ شہر کے چنے ہوئے لوگ

تھے۔ مہر کا خیال تھا کہ وہ کہیں ہنی مون منانے جائیں گے۔ شاید باہر ملک جائیں لیکن جب ظفریاب نے کئی دن ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تو اس نے خود پوچھ لیا۔ ”ہم کہیں گھومنے نہیں جائیں گے؟“

”تمہارا مطلب ہے ہنی مون؟“ ظفریاب نے کافی پیتے اور اخبار دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ چھٹی کا دن تھا اور انہوں نے ناشتا بیڈ روم میں ہی کیا تھا۔ کامی ابھی سو رہا تھا۔

”ہاں، شادی کے بعد ہنی مون ہی ہوتا ہے۔“

ظفریاب نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ ”ابھی کچھ دن رک جاؤ، دفتر میں کچھ مصروفیات ہیں۔ وہ نمٹ جائے تو ہم کہیں جاتے ہیں۔“

مہر خوش ہو گئی۔ ”کہاں جائیں گے؟“

”جہاں تم کہو... ملک میں بہت ساری جگہیں ہیں یا پھر کہیں باہر چلتے ہیں۔ جیسا تم پسند کرو۔“

”میں نے تو اپنا ملک بھی نہیں دیکھا ہے۔ ہم یہیں جائیں گے۔“

”بس تو کچھ دن رک جاؤ۔“

”آپ کو اب کون اسسٹ کرتا ہے؟“

ظفریاب مسکرایا۔ ”کوئی نہیں... پہلے بھی کوئی نہیں کرتا تھا۔ درحقیقت مجھے کبھی اسسٹنٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ جو کام تم کرتی تھیں، وہ پہلے میں خود کرتا تھا۔ یہ سب کانفیڈنشل ای میلز اور فائلیں ہیں جنہیں میں خود دیکھتا اور رکھتا ہوں۔ دوسری فرد تم ہو لیکن اب تم اور میں ایک ہی ہیں۔ آج تک کسی ملازم نے یہ ای میلز اور فائلیں نہیں دیکھی ہیں۔“

مہر سمجھتی تھی ہر بزنس کے کچھ سیکرٹس ہوتے ہیں جنہیں خفیہ رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی ظفریاب کی خفیہ چیزیں تھیں۔ اس نے مہر کو اپنے قریب کر لیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم صرف لائف پارٹنر نہ ہو بلکہ میری ہر چیز میں پارٹنر بن جاؤ۔ اس گھر میں بھی اور بزنس میں بھی۔“

”نہیں، میرا خیال ہے کہ یہ آپ کے دیکھنے کا کام ہے۔ اسے آپ ہی دیکھیں۔“ مہر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اب صرف گھر کی ذمے داری سنبھالنا چاہتی ہوں۔“

”میں ذمے داری کی بات نہیں کر رہا، بزنس میں شیئر کی بات کر رہا ہوں۔ خیر ابھی اتنی جلدی نہیں ہے، اس پر بعد میں بات کریں گے۔“

کامی ابھی اسی اسکول میں پڑھ رہا تھا اور مہر اس کی تعلیم سے مطمئن تھی۔ اس نے ظفریاب سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کامی کو اسی اسکول میں پڑھنے دیں۔“

”یہ اچھا اسکول ہے لیکن اب کامی کو جس سرکل میں موو کرنا ہے، اس کے لحاظ سے یہ تعلیم ناکافی ہے۔ وہ مس فٹ ہو جائے گا۔ میں نے اس کے لیے اسکول سوچ لیا ہے۔ وہ فائنل ٹرم مکمل کر لے تو اسے وہاں داخل کرا دوں گا۔ جو کمی رہ جائے گی، وہ ٹیوشن سے پوری کر لے گا۔“

ظفریاب شادی کے دو دن بعد ہی دفتر جانے لگا تھا۔ وہ اکثر شام کو دیر سے آتا لیکن اس کے بعد کہیں نہیں جاتا یا وہ دونوں ساتھ ہی نکلتے تھے۔ مہر اس میں خوش تھی مگر اسے دن میں بوریت ہوتی تھی۔ یہاں ہر کام کے لیے ملازم موجود تھا اور اس کا کام صرف دیکھ بھال کرنا تھا۔ اس کی بھی زیادہ ضرورت نہیں تھی کیونکہ تمام ملازمین اپنی ذمے داریوں سے واقف تھے اور وہ اپنا کام اچھی طرح کرتے تھے۔ پیلس میں تین گاڑیاں تھیں۔ ڈرائیور نے مہر کو ڈرائیونگ سکھانا شروع کر دی تھی اور جلد اس نے اتنا عبور حاصل کر لیا کہ ڈیفنس کی حد تک خود چلی جاتی تھی۔ البتہ کہیں باہر نکلنا ہوتا تو پھر ڈرائیور یا ظفریاب کے ساتھ ہی جاتی تھی۔

کامی کو اسکول وین لاتی لے جاتی تھی۔ وہ ایک بجے اسکول سے واپس آتا تھا۔ مہر اس کے ساتھ لنچ کرتی اور پھر کامی اپنے کاموں میں لگ جاتا۔ وہ اسکول کا ہوم ورک کرتا۔ ظفریاب نے اس کے لیے ایک ٹیوٹر رکھ دیا تھا۔ تین سے پانچ بجے تک وہ ٹیوشن لیتا اور اس کے بعد وہ پرڈ ہاؤس میں پایا جاتا۔ اسے یہ جگہ اتنی پسند آئی تھی کہ اس کا بس چلتا تو وہ رات تک وہاں رہتا لیکن مہر نے اسے صرف سات بجے تک وہاں رہنے کی اجازت دی تھی۔ یہاں ان لوگوں کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا اور نہ ہی آس پاس زیادہ بچے تھے، اس لیے کامی کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی اور اسے ساحل والا فلیٹ یاد آتا جہاں اس کے کئی دوست بن گئے تھے۔ بہر حال، اب اسے اسکول کے دوستوں پر گزارہ کرنا تھا۔ گھر میں اس کے بے شمار گیمز اور کھیلوں کا سامان تھا، وہ یہاں بور نہیں ہوتا تھا۔

دو ہفتے بعد ظفریاب نے شام کو گھر آتے ہی ایک لفافہ مہر کے حوالے کیا۔ ”اس میں کیا ہے؟“

”کھول کر دیکھو۔“ ظفریاب نے کوٹ اور ٹائی اتارتے ہوئے کہا۔

مہر نے کھولا تو اندر سے دو ائر ٹکٹ نکلے۔ دو دن بعد ان کی فلائٹ تھی۔ مہر نے ظفریاب کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”ہم ہنی مون پر جا رہے ہیں۔ تمہارے پاس کل کا دن ہے، جو لینا ہے وہ لے لو۔ سردی بہت ہوگی کیونکہ وہاں سردی کا موسم شروع ہو گیا ہے۔“

کامی کی اسے فکر نہیں تھی، یہاں کئی ملازمین تھے جو اس کی دیکھ بھال کرتے۔ آنے والے تین ہفتے بہت خوب صورت اور مصروف گزرے۔ وہ بے شمار جگہوں پر گئے۔ ظفریاب نے ایک فور وہیل ڈرائیو حاصل کی تھی۔ وہ اسی پر گھومتے رہے۔ مہر نے زندگی میں پہلی بار اتنی رنگوں والی جگہیں دیکھی تھیں۔ کہیں سبزہ اب ہرا تھا۔ کہیں یہ پیلا ہو کر خزاں رسیدہ ہو رہا تھا۔ کہیں درخت پتوں سے محروم ہو کر جیسے بے لباس ہو گئے تھے۔ سطح سمندر سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر انہوں نے برفباری بھی دیکھی تھی۔ یہاں اتنی شدید سردی تھی کہ وہ بہت گرم کپڑوں میں بھی ٹھٹھر رہے تھے۔ مہر سے سردی برداشت نہیں ہوئی اور وہ ایک دن وہاں رک کر واپس آ گئے۔

ایک بار پھر مہر کو یہ سب خواب لگنے لگا۔ آٹھ مہینے پہلے اس کی زندگی مشکلات اور تکلیفوں کا ایک ڈھیر تھی۔ ایک مسلسل اذیت کا سفر تھا جس کے خاتمے کا امکان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ تنہائی تھی اور بے بسی تھی۔ لیکن اچانک ہی تقدیر نے پلٹا کھایا۔ جہاں پہلے مسائل ہی مسائل تھے، اب وہاں آسانیاں آنے لگیں۔ پھر جیسے تقدیر مہربان ہوتی چلی گئی۔ دس سال کی تکلیفوں کا ازالہ کرنے لگی۔ اب تو خوش قسمتی کی انتہا ہو رہی تھی۔ مہر نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اس لیے یہ سب اب خواب ہی لگ رہا تھا۔ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی چھٹی منزل سے شیشے کی دیوار کے پار دور تک پھیلے سبز جنگل جو اوپر سفید اور درمیاں میں پیلے ہو رہے تھے۔ مہر نے اسے دیکھتے ہوئے ظفریاب سے کہا۔ ”سچ کہتی ہوں مجھے ڈر لگتا ہے۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور میں اسی ویران زندگی میں ہوں گی۔“

”ایسا کیوں سوچتی ہو؟“ ظفریاب نے اسے قریب کر لیا۔

”یہ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ مہر نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ”مجھے کسی چیز کی پروا نہیں ہے لیکن میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔“

”فرض کرو، تمہیں معلوم ہو کہ میری دولت اور شان و شوکت سب شو آف ہے اور میرے پاس درحقیقت کچھ نہیں ہے تب بھی تمہاری محبت برقرار رہے گی؟“

مہر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر آپ شادی سے پہلے مجھ سے یہ سوال کرتے تو شاید مجھے جھوٹ بولنا پڑتا لیکن اب یہ سو فیصد سچ ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہر پریشانی بھی آپ کے حوالے سے ہوگی۔“

ظفریاب مسکرایا۔ ”مجھے یقین ہے۔“

”پھر یہ سوال کیوں کیا؟“

”ایسے ہی چھیڑنے کے لیے۔“ اس نے سچ مچ چھیڑا تو مہر جھینپ گئی۔

”تو یہ ہے، بالکل ٹین ایجر بن جاتے ہیں۔“

”محبت کرنے والے ہمیشہ ٹین ایجر ہوتے ہیں، چاہے ان کی اصل عمر کچھ بھی ہو۔“

مہر ان حسین وادیوں میں ظفریاب کے ساتھ اتنا کھوئی کہ اسے اپنا بیٹا بھی یاد نہیں رہا۔ اگرچہ وہ اس سے تقریباً روز فون پر بات کرتی تھی۔ جہاں موبائل سگنل نہیں آتے تھے، وہاں سے وہ لینڈ فون سے کال کر لیتی تھی۔ مگر اسے کامی کی یاد اتنی شدت سے نہیں آئی، جتنی شدت سے وہ توقع کر رہی تھی۔ واپسی پر اس کا دل واپس آنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ شروع میں ظفریاب کا پروگرام بارہ دن کا تھا، مہر کی خاطر وہ چار دن اور رک گیا۔ حالانکہ اسے دفتر میں کچھ کام تھے۔ مہر خوش ہوئی کہ ظفریاب اسے اپنے کام پر ترجیح دے رہا ہے۔ چار دن بعد بھی وہ بادل ناخواستہ واپسی کے لیے تیار ہوئی۔ وہ ظفریاب کو ٹین ایجر کہہ رہی تھی لیکن خود اسے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی الھڑ دوشیزہ ہے اور اس کی شادی اب ہوئی ہے۔ واپسی کی فلائٹ میں ظفریاب نے اس سے کہا۔ ”اب تم تیار ہو جاؤ، تم میرے بزنس میں برابر کی شریک ہوگی۔“

☆☆☆

ظفریاب دیر سے آیا اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے ایک لیدر کیس اٹھا رکھا تھا۔ اس کا بریف کیس الگ تھا۔ اس نے دونوں مہر کو تھما دیے۔ اس نے لیدر کیس کے بارے میں پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے؟“

”کچھ اہم کاغذات ہیں جو تمہیں... سائن کرنے ہیں۔“

”وہ کس لیے؟“

”میں نے کیا کہا تھا تم سے کہ بزنس میں برابر کی شریک ہوگی۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بغیر بھی مجھے سب میسر ہے۔“

ظفریاب نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ذہن سے سوچو، یہ ضروری ہے۔ صرف یہی نہیں تمہارا بزنس سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر کل کو میں نہیں رہا تو یہ سب تمہیں ہی دیکھنا ہے۔“

”پلیز، ایسی باتیں نہ کریں۔“ مہر گھبرا گئی۔

ظفریاب مسکرایا۔ ”یہ زندگی کے حقائق ہیں اور انہیں غیر جذباتی انداز میں لینا چاہیے۔ بہر حال میں نے فیصلہ کر لیا

ہے اور تمہیں اسے قبول کرنا ہوگا، یہ میرا حکم ہے۔"

مہر مسکرا دی۔ "جو حکم سرکار لیکن پہلے کھانا کھا لیا جائے۔"

"سوری، اسی چکر میں دیر ہو گئی۔ کامی نے کھا لیا؟"

"میں نے اسے کہا تھا لیکن وہ بولا کہ ساتھ ہی کھائے گا۔"

"بس دس منٹ۔" ظفریاب سر ہلاتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ ڈنر کے بعد ظفریاب کچھ دیر کامی سے اس کے مشاغل اور تعلیمی مراحل پر بات کرتا رہا۔ اس نے کامی کو خبردار کیا کہ اسے جس اسکول میں داخل کرانا ہے جب تک وہ اس کا ٹیسٹ پاس نہیں کرے گا اسے وہاں داخلہ نہیں ملے گا۔

"میں تیاری کر رہا ہوں انکل۔" کامی نے کہا۔ "جب تک ٹیسٹ کا وقت ہوگا، میں پوری تیاری کر چکا ہوں گا۔"

"گڈ، میری رئیس صاحب سے بات ہوئی تھی۔" ظفریاب نے کامی کے ٹیوٹر کا نام لیا۔ "وہ تمہاری تیاری سے مطمئن ہیں لیکن یاد رکھو ہمیشہ دوسروں کی توقع سے بڑھ کے دکھاؤ۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز یہی ہے۔"

مہر خوش تھی۔ ظفریاب کامی پر بھی توجہ دیتا تھا اور اس کی تعلیم اور دوسری چیزوں کا پورا خیال رکھتا تھا۔ کامی کو کرکٹ کا شوق تھا اور یہاں اسے کھیلنے والے لڑکے میسر نہیں تھے اس لیے ظفریاب نے ایک کرکٹ جم خانہ کی جونیئر ٹیم میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ اب کامی پانچ سے سات تک وہاں جا کر کرکٹ کھیلتا اور سیکھتا تھا۔ اتوار کے دن میچ بھی ہوتا تھا۔ ظفریاب نے اس کے لیے خاص طور سے باہر سے اس کی عمر کے مطابق کرکٹ کٹ منگوا دی تھی۔ وہ ہر اتوار کو باہر جاتے تھے۔ اگر انہیں کسی خاص تقریب میں نہیں جانا ہوتا تھا تو کامی بھی ان کے ساتھ جاتا تھا۔ اگر کسی اتوار کو موقع نہیں ملتا۔ تو ظفریاب اسے کسی اور دن کہیں باہر لے جاتا تھا۔ مہر کو گمان نہیں تھا کہ ظفریاب کامی کا اس حد تک خیال رکھے گا۔ کامی اسے انکل کہتا تھا اور اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ کامی سے دوستانہ رویہ رکھتا تھا۔ اس نے کامی کے بعض معاملات اپنے ذمے لے لیے تھے اور انہی سے سروکار رکھتا تھا۔ کامی کے باقی معاملات اس نے مہر پر چھوڑ رکھے تھے اور اس میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔

جب کامی سونے کے لیے چلا گیا تو وہ بیڈ روم میں آئے۔ ظفریاب نے لیدر کیس سے دو فائلیں نکالیں۔ اس نے ایک فائل مہر کے سامنے رکھی۔ "یہ بزنس میں شراکت سے متعلق ہے۔"

ظفریاب جہاں جہاں بتاتا رہا، مہر سائن کرتی رہی اور اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا لگاتی رہی۔ ایک فائل پر سائن لے کر ظفریاب نے دوسری فائل کھولی۔ "یہ انشورنس سے متعلق ہے۔"

"کیسی انشورنس؟"

"بزنس اور ہماری انشورنس ہے۔" ظفریاب نے کہا۔ "چاہو تو پڑھ لو۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ جب آپ مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے۔" مہر نے کہا اور اس فائل پر بھی سائن کر دیے۔ ظفریاب نے دونوں فائلیں واپس لیدر کیس میں رکھ دیں۔ وہ خوش نظر آ رہا تھا۔

"اب میں نہ بھی رہا تو تمہیں بزنس کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

"ایسی باتیں مت کریں۔" مہر روہانسی ہو گئی۔

"ڈیئر! یہ سب ضروری ہے۔ اور ہاں، اب تم ہفتے میں ایک دو بار میرے ساتھ دفتر جاؤ گی تاکہ بزنس سمجھ سکو۔"

"کیا یہ ضروری ہے؟"

"ہاں، بہت ضروری ہے۔" ظفریاب نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم ہر لحاظ سے میری پارٹنر ثابت ہو۔"

☆☆☆

مہر کا خیال تھا کہ دو فائلوں پر سائن کر کے اس کا کام ختم ہو جائے گا لیکن یہ تو آغاز تھا۔ اسے کئی جگہوں پر جانا پڑا اور دو مواقعوں پر عدالت میں بھی پیش ہونا پڑا۔ میڈیکل چیک اپ اور دوسرے کئی مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ میڈیکل چیک اپ انشورنس کے سلسلے میں تھا۔ کبھی ظفریاب اس کے ساتھ ہوتا تھا اور کبھی اس کا وکیل حامد علی آغا اس کے ساتھ ہوتا اور وہ مہر کی مدد کرتا تھا۔ تقریباً ایک مہینے بعد وہ باضابطہ ظفریاب کی بزنس پارٹنر بن گئی تھی اور یہ پارٹنر شپ برابری کی بنیاد پر تھی۔ یعنی وہ اور ظفریاب بزنس میں ففٹی پرسنٹ کے شریک تھے۔ زیڈ اے کیمیکلز بڑی کمپنی تھی اس کا ٹرن اوور اربوں روپے میں آتا تھا۔ لیکن مہر کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ ظفریاب صرف کیمیکلز کمپنی ہی چلاتا تھا اور اس کا کوئی اور بزنس نہیں تھا۔ جبکہ آج کل کے حالات میں کاروباری لوگ ہمیشہ ایک سے زیادہ کام کرتے ہیں تاکہ کسی ایک کام میں نقصان بھی ہو یا بزنس کم ہو جائے تب بھی ان کا کام چلتا رہے۔ اس نے ظفریاب سے اس سلسلے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

"یہی کام بہت ہے۔ دوسرے میں اکیلا آدمی ہوں اور کسی اور بزنس کی دیکھ بھال مشکل ہے۔ پھر کیمیکل کے بزنس پر زوال کم ہی آتا ہے کیونکہ کیمیکل کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ صنعتوں سے لے کر عام آدمی کو اپنے کاموں کے لیے کیمیکلز درکار ہوتے ہیں۔ جب سے میں یہ کمپنی چلا رہا ہوں، بزنس اپ ڈاؤن ہوتا رہا ہے لیکن کبھی نقصان نہیں ہوا ہے۔ آج میں جس مقام پر ہوں، اسی کام کی وجہ سے ہوں۔"

"لیکن پھر بھی آدمی کو ایک دوسرا کام دیکھ کر رکھنا چاہیے۔" مہر نے اصرار کیا تو ظفریاب مسکرایا۔

"اچھا تم بتاؤ، دوسرا کام کون سا کروں؟"

یہ تو مہر نے بھی نہیں سوچا تھا۔ "آپ بزنس لینڈ میں ہیں آپ کی نظر میں ہوگا کہ کون سا بزنس اوپر جا رہا ہے۔"

ظفریاب نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس وقت کوئی بزنس اوپر نہیں جا رہا، سب ڈاؤن ہیں اسی لیے نئی سرمایہ کاری رکی ہوئی ہے۔"

باقاعدہ مالک بننے کے بعد ظفریاب نے دفتر میں اس کے لیے کمرا سیٹ کرایا اور پہلے دن دفتر میں ایک چھوٹی سی پارٹی ہوئی جس میں دفتر کے تمام ملازمین شریک ہوئے۔ وہاں ظفریاب نے ان کے سامنے اعلان کیا کہ مہر اب بزنس میں اس کی شریک ہے۔ سب نے تالیاں بجائیں اور پھر مبارکباد دے کر مہر کا خیر مقدم کیا۔ ظفریاب کا جنرل منیجر صائم مرزا عمر رسیدہ اور تجربہ کار شخص تھا۔ جب مہر ظفریاب کے لیے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتی تھی تو کبھی کبھی اسے صائم مرزا سے واسطہ پڑتا تھا۔ مگر براہ راست اس کا صائم مرزا سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ ظفریاب کے ماتحت تھی۔ لیکن اب مالک کی حیثیت سے صائم مرزا سے اس کا واسطہ پڑتا۔ ویسے ظفریاب نے اس سے کہا تھا کہ وہ ہفتے میں دو تین دن آیا کرے لیکن جب مہر نے اس معاملے میں دلچسپی لینا شروع کی تو اس نے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں روز آپ کے ساتھ آؤں گی اور [illegible] آپ چلی جاؤں گی۔"

ظفریاب ہچکچایا۔ "اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن اگر تم چاہو تو روز بھی جا سکتی ہو۔"

مہر نے بھانپ لیا کہ ظفریاب کو یہ بات پسند نہیں آئی [illegible] جلدی سے کہا۔ "[illegible] روز وا[illegible] [illegible] ہے۔ البتہ ہر دوسرے تیسرے دن جب میری ضرورت پڑے گی تو میں آ جایا کروں گی۔ یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

"[illegible] تمہارے سامنے رکھا ہوگا لیکن وہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں فائلیں اور کاغذات گھر لے آؤں گا یا فوری ضرورت ہوئی تو کسی کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" مہر نے کسی قدر بے دلی سے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم بزنس کی ٹینشن لو۔ ہاں تم طریقہ کار سارا سیکھو اور مسئلے مسائل میرے لیے چھوڑ دو۔"

"مجھے بھی مسئلوں سے دلچسپی نہیں ہے۔" مہر نے کہا۔ "بس گھر میں تھوڑی سی بوریت ہوتی ہے۔ آپ چلے جاتے ہیں اور شام کو آتے ہیں۔ کامی اسکول سے آتا ہے تو صرف لنچ کرتا ہے میرے ساتھ اور پھر اس کی مصروفیات شروع ہو جاتی ہیں۔"

ظفریاب مسکرایا۔ "اب تم اپنی مصروفیات خود تلاش کرو۔ یہاں بہت سارے سوشل سرکل اور لیڈیز کلب ہیں۔ وہاں بہت ساری سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ کہو تو کسی کلب میں تمہاری انٹری کرا دوں۔"

"ابھی نہیں، پہلے میں اس سوسائٹی کو پاس سے دیکھ لوں۔ ابھی تو میری حیثیت وہی ہوگی جو کسی دیہات سے آنے والی کی شہر میں ہوتی ہے۔"

"تم جم بھی جوائن کر سکتی ہو۔ یہاں ایک اچھا فٹنس سینٹر ہے، وہاں ساری سہولیات ہیں۔"

مہر کو یہ آئیڈیا اچھا لگا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ گھر بیٹھنے سے اس کا وزن کسی قدر بڑھ گیا ہے۔ وہ اسے قابو میں رکھنا چاہتی تھی۔ ظفریاب نے اسے فٹنس سینٹر کا پتا سمجھایا۔ وہ ڈیفنس میں ظفریاب پیلس سے کچھ ہی دور تھا۔ مہر آرام سے خود آ جا سکتی تھی۔ اگلے دن وہ خود وہاں چلی گئی۔ فٹنس سینٹر اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ اس میں جدید ترین مشینوں سے آراستہ جم، ہیلتھ کیئر سینٹر، بیوٹی پارلر، سوئمنگ پول اور سونا باتھ کے ساتھ مساج کی سہولت بھی تھی۔ ایک چھوٹا سا کیفے ٹیریا بھی تھا۔ فٹنس سینٹر صرف خواتین کے لیے تھا اور سارا عملہ بھی خواتین پر مشتمل تھا۔ ماحول بہت اچھا اور پرکشش تھا۔ فٹنس سینٹر کی ممبر شپ ایک لاکھ روپے کی تھی اور باقی فیس سہولتوں کے استعمال پر منحصر تھی۔ جتنی سہولتیں مہینے بھر میں استعمال کی جاتی تھیں، ان کا بل بنا کر دے دیا جاتا۔ جم اور سوئمنگ پول کی سہولت ممبر شپ میں شامل تھی۔ تربیت یافتہ فزیوتھراپسٹ اور جم کا عملہ تھا جو ایکسرسائز میں مدد دیتا تھا۔

مہر کو سوئمنگ سے دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تیراکی کا لباس پہن کر دوسروں کے سامنے جانا اچھا نہیں لگتا تھا، چاہے وہ خواتین ہی کیوں نہ ہوں۔ اگرچہ یہ حصہ بالکل الگ تھا اور یہاں صرف تیراکی کرنے والی خواتین یا ان کی انسٹرکٹر اور عملہ ہوتا تھا۔ اسی طرح اسے سونا باتھ اور مساج کا شوق بھی نہیں تھا۔ اس نے جم اور بیوٹی پارلر سے استفادے کا فیصلہ

کیا۔ ممبر شپ لینے کے اگلے دن اس نے فٹنس سینٹر جانا شروع کر دیا اور صبح کے دو ڈھائی گھنٹے اچھے گزرنے لگے۔ ظفریاب کو اس کے سائن کی ضرورت ہوتی تو وہ فائلیں اور کاغذات گھر لے آتا تھا یا ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیتا تھا۔ اگر وہ فٹنس سینٹر میں ہوتی تو ڈرائیور وہاں آجاتا اور مہر مطلوبہ جگہ سائن کر دیتی۔ چند دنوں میں اس کی کئی خواتین سے جان پہچان اور ہیلو ہائے ہو گئی تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ ظفریاب نے اسے اپنے کاروبار میں شریک کر لیا ہے تو وہ اس پر رشک کرنے لگیں۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون زرینہ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”ہمیں تو شوہر نے سوائے بچوں کے کچھ نہیں دیا۔ بچے بھی اب باہر جا چکے ہیں۔“

دوسری خواتین کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ ان کے شوہروں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی لیکن دولت، جائداد اور کاروبار میں شریک کسی نے نہیں بنایا تھا۔ ان خواتین میں ایک مسز داؤد بھی تھیں۔ ان کے شوہر سیٹھ داؤد کا فوڈ کیمیکلز کا بزنس تھا۔ انہوں نے مہر سے کہا۔ ”حیرت ہے تمہارے شوہر نے اس دور میں تمہیں پارٹنر بنا لیا جب لوگ اپنا پیسا دبا کر رکھ رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ حالات بہت خراب ہیں۔ بزنس دسواں حصہ بھی نہیں رہا ہے۔ داؤد کہہ رہے تھے کہ وہ بزنس دبئی منتقل کرنے کا سوچ رہے ہیں۔“

”نہیں، حالات اتنے خراب بھی نہیں ہیں۔“ مہر نے سادگی سے کہا۔ ”ہمارا بزنس تو اچھا چل رہا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہیں مسز ظفریاب... حالات خراب سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ آج کل کوئی اچھے بزنس کی بات کرتا ہے تو وہ غلط کہتا ہے۔“

مہر کو غصہ آ گیا۔ ”ممکن ہے جو خراب حالات کا رونا روتے ہوں وہ جھوٹ کہہ رہے ہوں۔“

مسز داؤد نے بے پروائی سے کہا۔ ”خیر تم اب بزنس میں آ چکی ہو اس لیے دیکھ لو گی۔“

ظفریاب کا ایک دفتر دبئی میں بھی تھا اور درآمد کا کام اصل میں وہاں سے ہوتا تھا۔ دبئی سے شپ منٹ ری ڈائریکٹ ہو کر آتی تھی۔ اس کے لیے دبئی کا بزنس ویزا ظفریاب کے پاس تھا اور اس نے وہاں ایک کمپنی بھی رجسٹر کرا رکھی تھی۔ چار پانچ افراد کا عملہ کام کرتا تھا اور ظفریاب بھی مہینے میں ایک دو بار دبئی کا چکر لگاتا تھا۔ ان دنوں بھی وہ دبئی گیا ہوا تھا۔ مہر فٹنس سینٹر میں تھی کہ اس کے موبائل پر صائم مرزا کی کال آ گئی۔ ”میڈم! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ ظفریاب صاحب سے رابطہ نہیں ہو رہا اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کو زحمت دوں۔“

”مسئلہ کیا ہے صائم صاحب؟“ مہر ایک طرف آ گئی جہاں کوئی اور نہیں تھا۔ وہ جاگنگ مشین پر دوڑ رہی تھی اور اس وقت پسینے میں شرابور تھی۔ اس کا سانس تیز چل رہا تھا۔

”ایک چیک کا مسئلہ آیا ہے۔ غلط تاریخ کی وجہ سے چیک واپس آ گیا ہے۔ اب کلائنٹ کو دوسرا چیک دینا ہے۔“

مہر نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ”اچھا، ہم کلائنٹ کو چیک دیتے بھی ہیں؟ میرا تو خیال تھا ہم چیک لیتے ہیں۔“

”نہیں ہم مقامی مارکیٹ سے بھی مال خرید رہے ہیں بلکہ آج کل تو زیادہ تر یہیں سے اٹھا رہے ہیں۔“

مہر کو تعجب ہوا کیونکہ وہ یہی سمجھتی تھی کہ زیڈ اے کیمیکلز اپنا سارا مال باہر سے منگواتی تھی۔ ”تو اب کیا کرنا ہے؟“

”آپ کہیں تو میں چیک بک لے کر آ جاتا ہوں۔“

”آپ ایک گھنٹے بعد پیلس آ جائیں۔“

مہر کی ایکسر سائز باقی تھی۔ اس کی ٹرینر نے اس کی عمر اور جسم کے لحاظ سے کچھ ایکسر سائز تجویز کی تھیں جو اسے ہر روز یا ہفتے میں کچھ دن کرنا ہوتی تھیں۔ صرف دو ہفتے میں اس کا بہت اچھا نتیجہ نکلا تھا۔ اس کا فالتو وزن چھٹ گیا تھا اور جسمانی ساخت بہتر ہوئی تھی۔ وہ خود کو تازہ دم محسوس کرتی تھی۔ بیوٹی پارلر کے چھوٹے موٹے کام بھی وہ روز کے روز نمٹا لیا کرتی تھی اور اسے گھنٹوں کے حساب سے نہیں آنا پڑتا تھا۔ ابھی اس کی ایکسر سائز باقی تھی لیکن اس مسئلے کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ کر پیلس روانہ ہو گئی۔ جب تک صائم مرزا آیا، وہ باتھ لے چکی تھی۔ صائم مرزا تقریباً پچپن برس کا تھا اور وہ اس وقت سے کمپنی میں ملازم تھا جب یہ ابتدائی دور میں تھی اور ظہیر انصاری نے اسے نیا نیا قائم کیا تھا۔ ظہیر انصاری اس پر بہت اعتماد کرتا تھا اور اس کے بعد ظفریاب بھی اسے ملازمین میں سب سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ دفتر کے اہم ترین کاغذات اور چیک بکس اس کی تحویل میں رہتی تھیں۔ مہر کو حیرت تھی، اس کے باوجود ظفریاب نے کبھی وہ فائلیں جو اس کے دفتر میں تھیں، نہ تو صائم مرزا کو بھجوائیں اور نہ اس کی موجودگی میں یہ فائلیں منگوائی تھیں۔ اس نے خود مہر سے کہا تھا کہ یہ فائلیں اس کے سوا صرف مہر نے دیکھی ہیں۔ ایک گھنٹے بعد وہ پیلس پہنچ گیا۔ مہر نشست گاہ میں آئی تو وہ کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھیں مرزا صاحب۔“ مہر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”مسئلہ کیا ہوا ہے؟“

صائم مرزا کلائنٹ کی فائل لایا تھا۔ ”اس پارٹی سے ہم نے دو ٹن سوڈا ایش خریدا تھا اور دو مہینے بعد کا چیک دیا تھا لیکن غلطی سے تاریخ تین مہینے بعد کی لکھ دی۔ اب وہ چیک واپس کر کے دو مہینے بعد کا چیک چاہتے ہیں۔“

مہر نے فائل دیکھی۔ اس میں خریداری کی مکمل دستاویزات اور واپس آنے والا چیک موجود تھا۔ ”ظفریاب سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا؟“

”آج صبح سے ان کا نمبر بند جا رہا ہے۔“

”میری کل رات بات ہوئی تھی۔“

”کل تو میری بات بھی ہوئی تھی۔“ صائم مرزا نے کہا۔ وہ درست کہہ رہا تھا کیونکہ پیلس آتے ہوئے مہر نے کئی بار ظفریاب کو رنگ کیا لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ چیک زیادہ بڑا نہیں تھا چند لاکھ روپے مالیت کا تھا اور پھر صائم مرزا قابلِ اعتماد شخص تھا۔ اس لیے مہر نے دوسرے چیک پر سائن کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

”شکریہ میڈم... آپ تھیں ورنہ مسئلہ بنا رہتا۔ ظفریاب صاحب تین دن بعد آتے اور پارٹی روز صبح شام میرا دماغ کھاتی رہتی۔“

”یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن آج کل کاروباری حالات خراب ہیں۔ سب کو اپنی رقم کی فکر پڑی رہتی ہے۔ جہاں کہیں بھی رقم موجود ہے، لوگ اسے جلد از جلد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ایک بار رقم پھنس جائے تو ریکوری مشکل ہو جاتی ہے۔ ہم خود کتنی جگہوں سے رقم حاصل نہیں کر سکے۔ پارٹی نے پیسے لیے اور چیک ڈس آنر ہو گیا۔“

”اچھا پھر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی؟“

”درخواست دیتے ہیں، ڈس آنر چیک کی ایف آئی آر بھی کراتے ہیں جب کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔“

مہر کو مسز داؤد کی بات یاد آئی۔ ”بزنس کیسا جا رہا ہے؟“

صائم مرزا ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ”میڈم! سچی بات ہے کہ بزنس بہت ڈاؤن جا رہا ہے۔ آرڈر بہت کم ہیں اور زیادہ تر لوگ تین سے چار مہینے کا کریڈٹ مانگ رہے ہیں۔ آج کل اتنا کریڈٹ دینا مشکل ہے۔“

”لیکن ظفریاب تو کہہ رہے تھے کہ بزنس اچھا چل رہا ہے؟“

”اس لحاظ سے اچھا چل رہا ہے کہ خسارے میں نہیں ہے لیکن اگر وصولیابی کی رقم شامل کی جائے تو مجموعی طور پر نقصان ہی سامنے آئے گا۔“

”فیکٹری میں پروڈکشن کی کیا صورتِ حال ہے؟“

”معمول کا کام چل رہا ہے۔“ اس بار صائم مرزا نے ٹالنے والے انداز میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میڈم! مجھے اجازت دیں۔ پارٹی کا آدمی آنے والا ہو گا چیک لینے کے لیے۔“

مہر، صائم مرزا کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر سوچتی رہی۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ کمپنی کے حالات اچھے نہیں ہیں جبکہ ظفریاب نے اسے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے پتا چلے کہ کمپنی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس کے بجائے وہ اسے ہمیشہ خوش اور پُراعتماد ہی نظر آیا تھا۔ پھر مہر کو یاد آیا کہ جب وہ انٹرویو کے لیے فیکٹری گئی تھی تو اسے وہاں بہت کم لوگ نظر آئے تھے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی فیکٹری نہیں گئی تھی۔ ہیڈ آفس میں پہلے بھی کم لوگ تھے۔ مگر مہر کو کبھی خیال نہیں آیا کہ کمپنی مشکل حالات میں ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر سچ مچ بزنس ٹھیک نہیں تھا تو ظفریاب سے ضرور بتاتا۔ صائم مرزا جنرل منیجر تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ اسے ہر بات کا علم ہو۔ مہر کو وہ فائلیں دراز میں یاد آئیں جو ظفریاب کسی کو نہیں دکھاتا تھا، سوائے مہر کے کوئی ان سے واقف نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بزنس کی اصل صورتِ حال ان فائلوں میں ہو... نہ کہ کمپنی کی فائلوں میں جو صائم مرزا کی تحویل میں رہتی تھیں۔

اسی شام کو ظفریاب کی کال آ گئی۔ ”سوری... موبائل مسئلہ کر گیا تھا۔ اسے ٹھیک کرانے کے لیے دیا تھا لیکن ٹھیک نہیں ہوا تو دوسرا لیا ہے۔“

مہر نے اسے صائم مرزا کے بارے میں بتایا۔ ظفریاب بولا۔ ”ٹھیک کیا تم نے... صائم صاحب پوری طرح اعتماد کے قابل ہیں اور کیا بات ہوئی ان سے؟“

”بات تو نہیں ہوئی، وہ عجلت میں تھے لیکن ظفر! میرا خیال تھا ہمارا کیمیکل باہر سے آتا ہے لیکن ہم یہاں سے بھی لیتے ہیں؟“

”ظاہر ہے جو چیز یہاں پیدا ہوتی ہے، سستی پڑتی ہے۔ وہ ہم یہیں سے لیں گے۔ باہر سے منگوانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم تھا۔“ مہر نے کہا اور پھر ہچکچائی۔ ”ظفر! کیا کمپنی ٹھیک چل رہی ہے؟“

”ہاں۔“ وہ حیرت سے بولا۔ ”تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟ کیا صائم صاحب نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں، فٹنس سینٹر میں مسز داؤد ملتی ہیں، داؤد کیمیکلز والی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ان کے حالات بہت خراب ہیں۔“

”ان کے حالات خراب اس لیے ہیں کہ سیٹھ داؤد نے

جس کمپنی کی ڈسٹری بیوشن لی ہے، وہ نہایت مہنگے فوڈ کیمیکلز بناتی ہے۔ یہ صرف اعلیٰ درجے کے کھانوں میں استعمال ہوتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں اسمگل کیے ہوئے فوڈ کیمیکلز عام اور سستے ملتے ہیں۔ اس لیے داؤد کیمیکلز نقصان میں ہی چلے گی۔ ہمارا کام ان سے مختلف ہے۔" ظفریاب نے سمجھ میں آنے والی وضاحت کی۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" مہر نے سکون کا سانس لیا۔

"یہ بتائیں آپ کب آرہے ہیں؟"

"دو دن اور لگ سکتے ہیں۔ دراصل مجھے ایک بڑا چانس مل رہا ہے۔ مڈل ایسٹ میں پیٹرولیم سے نکلنے والے کیمیکلز کی ایک بڑی شپ منٹ موجود ہے۔ پہلے کچھ چینی کمپنیوں نے اس کا سودا کیا تھا لیکن اب انہوں نے سودا کینسل کر دیا ہے۔ جن کے پاس کیمیکلز ہے، وہ اسے جلد فروخت کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"جلد کیوں؟"

"کیمیکلز ایکسپائر بھی ہو جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی افادیت کم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ مارکیٹ پرائس سے کم پر مل سکتے ہیں۔ میں اسی وجہ سے یہاں آیا تھا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اس شپ منٹ کا کچھ حصہ مجھے مل جائے۔ کچھ بھارتی کمپنیاں بھی میدان میں آگئی ہیں اور وہ ہمارے مقابلے میں زیادہ وسائل رکھتی ہیں۔"

"تب آپ کوشش کریں۔" مہر نے کہا۔ "اگر قیمت کم ہوگی تو نفع خود بڑھ جائے گا۔"

"بس یہی سوچ کر میں رک گیا۔ دو دن میں معاملہ کلیئر ہو جائے گا۔"

"آپ یہاں سے بے فکر رہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں دفتر بھی چلی جاؤں گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" ظفریاب نے کہا۔ "صائم صاحب معاملات دیکھ لیتے ہیں۔ ان کو ضرورت پڑی تو وہ تم سے رابطہ کرلیں گے۔"

کچھ دیر بعد ظفریاب نے فون بند کر دیا۔ مہر کے دل میں جو رہا سہا کھٹکا تھا، وہ ظفریاب سے بات کر کے دور ہو گیا۔ مسز داؤد اور صائم مرزا کو بزنس کا اتنا علم نہیں تھا جتنا کہ ظفریاب کو تھا۔ حالات اچھے تھے، تبھی تو وہ نئے سودے کر رہا تھا۔ کامی کا فائنل ٹرم نزدیک تھا اور وہ دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔ اب وہ خود بھی اس اسکول میں داخلے کے لیے بے تاب تھا جہاں ظفریاب اسے داخل کرانا چاہتا تھا۔ یہ بہت اونچے درجے کا اسکول تھا جس کی ماہانہ فیس ہی پچیس ہزار روپے تھی۔ کئی لاکھ روپے ایڈمیشن کے وقت لیے جاتے تھے اور اس کے علاوہ بھی متعدد خرچ تھے۔ اس کا ٹیوٹر اسے اسکول میں داخلے کے لیے امتحان کی تیاری کرا رہا تھا۔ ماہانہ دس ہزار تو وہ لے رہا تھا لیکن اس کی محنت سے کامی کی انگلش اور میتھ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ گریجویٹ ہونے کے باوجود مہر نے نہ کبھی اتنا اچھا میتھ کیا تھا اور نہ اس کی انگریزی اتنی اچھی تھی حالانکہ وہ دفتروں میں کام کرتی رہی تھی۔

مہر اب مسز داؤد سے کچھ کھنچ گئی تھی۔ ایک تو انہوں نے اسے گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی، دوسرے وہ اس کے ایج گروپ کی نہیں تھیں۔ مہر پہلے بھی اپنی عمر سے کم ہی دکھائی دیتی تھی لیکن فٹنس سینٹر میں آنے کے بعد وہ پہلے سے بھی کم عمر اور تر و تازہ نظر آنے لگی تھی۔ جن خواتین نے اسے پہلے نظر انداز کر دیا تھا، اب وہ بھی اس کے آگے پیچھے ہونے لگی تھیں۔

ان میں سے کچھ مہر سے کم عمر تھیں لیکن اس سے خاصی بڑی نظر آتی تھیں۔ وہ مہر پر رشک کرتی تھیں اور یہی چیز انہیں مہر کے قریب لانے کا سبب بنی تھی۔ ان میں ایک صائمہ شاہ بھی تھی۔ وہ ایک وڈیرے سبحان شاہ کی تیسری یا چوتھی بیوی تھی۔ خود اس کا کہنا تھا کہ اپنی شادیوں کی صحیح تعداد سبحان شاہ کو بھی یاد نہیں۔ اس کا زیادہ وقت اپنی حویلی میں گزرتا تھا اور کراچی میں وہ مشکل سے تین چار مہینے رہتا تھا۔ صائمہ تقریباً پینتیس برس کی خوب صورت عورت تھی۔ سبحان شاہ کے اس سے چار بچے تھے۔ اس نے صائمہ کو یہاں بنگلا لے کر دیا تھا اور ماہانہ خرچ دیتا تھا۔ وہ مزے سے زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے لیکن اب صائمہ کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ بے فکری کی زندگی اور بڑھتی عمر نے اس کے جسم اور چہرے پر اثر ڈالا تھا۔ جسم بے ڈول ہو رہا تھا اور چہرہ بڑھتی عمر کی چغلی کھانے لگا تھا۔ اس نے وقت کے سامنے بند باندھنے کے لیے جم جوائن کیا تھا مگر اسے اب تک کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ایک دن اس نے نہایت فکر مندی سے مہر کو بتایا۔

"شاہ جی اب کم آتے ہیں اور آتے ہیں تو مجھ سے زیادہ بچوں کو توجہ دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے اب ان کا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔"

مہر نے اس سے کہا نہیں کہ وڈیرے کا دل تو پہلے بھر جانا چاہیے تھا۔ وہ شاید بچوں کی ماں سمجھ کر اسے برداشت کر رہا تھا ورنہ صائمہ نے اپنا حلیہ تباہ کر لیا تھا۔ وہ چار مہینے سے جم آ رہی تھی لیکن کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ [illegible] خوراک اور لائف اسٹائل بدلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ البتہ اس کی کئی خواتین سے دوستی ضرور ہو گئی تھی اور وہ اب ان سے ملنے سینٹر آتی تھی۔ مہر سے وہ بے تکلف تھی، شاید اس لیے کہ وہ دل جمعی سے اس کی باتیں سنتی تھی اور اس کی کسی بات کی تردید نہیں کرتی تھی۔ مہر کو یوں زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا کہ صائمہ شاہ کا زیادہ وقت کینٹے ٹیریا میں گزرتا تھا اور وہاں وہ کھانے پینے کے ساتھ لوگوں کا دماغ بھی کھاتی تھی۔ مہر صرف فارغ ہو کر سستانے کے لیے وہاں آتی تو صائمہ کی باتیں بھی سن لیا کرتی تھی۔ اس دن مہر جم سے آئی تو کینٹے ٹیریا میں خاصی خواتین موجود تھیں۔ ایک طرف مسز داؤد بیٹھی اپنے دکھڑے رو رہی تھیں کہ کاروباری حالات بہت خراب ہیں اور شاید سیٹھ داؤد پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں۔

"ہر وقت حالات کا رونا روتی ہے۔" صائمہ شاہ نے مہر سے کہا۔ "اتنی دولت ہے، پر خرچ کرنے کے بجائے دونوں میاں بیوی کو بس بزنس کی پڑی رہتی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو لاکھ کے بجائے ننانوے ہزار ملنے کو نفع نہیں بلکہ ہزار کا نقصان سمجھتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے بھی کہہ رہی تھیں کہ ہماری کمپنی نقصان میں جا رہی ہے۔"

"اس بے چاری کو آج کل ہر طرف نقصان ہی نقصان نظر آرہا ہے۔" صائمہ نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔ "سنا ہے سیٹھ داؤد نے ایک پرکشش سیکریٹری رکھ لی ہے اور شاید وہ اس کی دوسری بیوی بن جائے۔"

"اب تو مسز داؤد [illegible] رہی ہے۔ اسے بزنس کے بجائے شوہر کی فکر کرنی چاہیے [illegible] وہ اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔"

"وہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ [illegible] بے چاری میں رہ گیا ہے۔" صائمہ نے مسز داؤد کی طرف دیکھا جو انہی کی طرف [illegible] رہی تھیں۔ مسز داؤد نے پاس آکر کہا۔

"میرے بارے میں [illegible] ہو تم دونوں؟"

"ٹھیک تھے۔" مہر نے نہ چاہتے ہوئے بھی مروتاً کہا۔ "آپ کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہوں۔" مسز داؤد نے سرد آہ بھری۔ "بس صاحب اب یہاں سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔"

"[illegible] کیا بات ہو گئی؟" صائمہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "کیا سیٹھ داؤد دوسری شادی کرنے جا رہے ہیں؟"

"باتیں کرتے ہیں لوگ۔" مسز داؤد گرم ہو گئیں۔ "[illegible] مجھ سے ... کیونکہ داؤد مجھے چاہتے ہیں۔ ہمارا [illegible] ساتھ ہے۔"

''ٹھیک کہا آپ نے۔'' صائمہ پھر ہنسی۔ ''سیٹھ صاحب واقعی آپ کے دیوانے ہیں۔ لوگ تو بکواس کرتے تھے، ایسے ہی اس کا سیکریٹری سے افیئر چلواتے ہیں۔''

مسز داؤد کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ مہر کو ان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ صائمہ حد سے گزر گئی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''چھوڑیں مسز داؤد... اللہ نے چاہا تو جلد حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔''

مسز داؤد نے خود پر قابو پا لیا اور مہر کی طرف دیکھا۔ 'مجھے تو تم لوگوں سے ہمدردی ہو رہی ہے۔''

مہر کا جذبۂ ہمدردی فوراً غائب ہو گیا۔ ''مسز داؤد اللہ کا شکر ہے، ہمارے حالات بالکل ٹھیک ہیں۔''

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میں بھی لوگوں سے یہی کہتی ہوں لیکن لوگ سب جانتے ہیں کہ آج کل بزنس کیسا جا رہا ہے۔''

''مگر ہمارا بزنس ٹھیک ہے۔ ظفر ان دنوں دبئی میں ایک بڑی شپ منٹ کا سودا کرنے والے ہیں۔''

''بڑی شپ منٹ؟'' مسز داؤد نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ ''آج کل یہاں خریدار کہاں ہیں جو وہ بڑی شپ منٹ کا سودا کر رہا ہے؟''

''ہمارے پاس خریداروں کی کمی نہیں ہے۔'' مہر نے بے پروائی سے کہا۔

مسز داؤد کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ ظفریاب تمہیں حقیقت نہیں بتا رہا ہے۔''

مہر کھڑی ہو گئی۔ ''اب میں اجازت چاہوں گی۔''

''مسز ظفریاب...'' مسز داؤد نے اسے پکارا لیکن وہ ان سنی کر کے وہاں سے نکل آئی۔ اس بار اس کا غصہ بے قابو ہو رہا تھا اور اسے ڈر تھا کہ وہ کوئی سخت بات نہ کہہ بیٹھے۔ اس کی جگہ صائمہ ہوتی تو یقیناً مسز داؤد کو کھری کھری سنا چکی ہوتی لیکن اسے لحاظ آ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسز داؤد اپنی لایعنی بات پر کیوں اڑی تھیں اور اب انہوں نے ظفریاب کو صاف جھوٹا قرار دے دیا تھا۔ بھلا ظفریاب کو اس سے کمپنی اور بزنس کے حالات چھپانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ اسے اپنا بزنس پارٹنر بھی بنا چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ مسز داؤد سے بات نہیں کرے گی اور نہ اس جگہ بیٹھے گی جہاں مسز داؤد ہوں گی۔ اگر وہ موجود ہوئیں تو وہ گھر کا رخ کرے گی۔ اسے امید تھی کہ اس کے رویّے سے وہ جلد سمجھ جائیں گی اور اس کی جان چھوڑ دیں گی۔ وہ اگلے دن سینٹر نہیں گئی اور اس سے اگلے دن ظفریاب واپس آ گیا۔ وہ خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی مہر کو خوش خبری سنائی۔

''سودا ہو گیا ہے۔ قیمت بھی توقع سے کم لگی ہے۔''

''یہ تو اچھا ہو گیا۔'' مہر بھی خوش ہوئی۔ ''شپ منٹ کب آئے گی؟''

''ایک ہفتے بعد آئے گی۔ پرسوں شپ پر آ جائے گی اور دو دن بعد شپ یہاں ہو گا۔ کلیئرنس اور دوسرے معاملات سے نمٹ کر ایک ہفتہ لگ جائے گا۔''

مہر کو مسز داؤد کی بات یاد آئی کہ مقامی مارکیٹ میں اب خریدار کہاں ہیں۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ظفریاب سے کہا۔ ''اس شپ منٹ کے خریدار مل جائیں گے؟''

ظفریاب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیوں نہیں ملیں گے؟ ہمارے طے شدہ گاہک ہیں اور جب ہم انہیں مارکیٹ سے دس فیصد کم قیمت آفر کریں گے تو وہ دوڑ کر آئیں گے کیونکہ ان کیمیکلز کی قیمت مزید بڑھنے والی ہے۔''

مہر نے سکون محسوس کیا اور ایک بار پھر دل ہی دل میں مسز داؤد کو ستائش جو بلاوجہ اس کا دماغ خراب کرتی تھیں۔ ظفریاب اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''کوئی بات ہوئی ہے؟''

مہر نے اسے مسز داؤد کے بارے میں بتایا، وہ مسکرانے لگا۔ ''وہ بے چاری سٹھیا گئی ہیں۔ ان کی باتوں پر توجہ مت دیا کرو اور پھر سیٹھ داؤد پرانے اسٹائل میں کام کرنے والے آدمی ہیں۔ آج کل یہ اسٹائل نہیں چلتا۔ اسی وجہ سے وہ پیچھے رہ گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سب ان کی طرح پیچھے رہ جائیں گے۔''

''میں اب ان بڑی بی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی انہوں نے میرا بہت دماغ خراب کر دیا ہے۔''

''توجہ مت دیا کرو۔'' ظفریاب نے مشورہ دیا۔

''میں نہیں دینا چاہتی لیکن وہ خود سر پر سوار ہوتی ہیں اور پھر ایسی باتیں کرتی ہیں جیسے جلد ہم فٹ پاتھ پر آنے والے ہیں اور ہمارے پاس ایک وقت کے کھانے کو بھی نہیں رہے گا۔''

''کم آن ڈیئر! اگر کوئی سائیکو ہے تو آدمی اس کے ساتھ سائیکو نہیں بنتا۔'' ظفریاب نے اس کا معائنہ کیا۔ ''ویسے تمہارے فٹنس سینٹر جانے سے میرا فائدہ ہو رہا ہے۔''

''کیسا فائدہ؟'' مہر انجان بنی۔ حالانکہ وہ سمجھ رہی تھی کہ ظفریاب کا اشارہ کس طرف تھا۔

مہر سینٹر جاتی تو جان بوجھ کر اس جگہ جانے سے گریز کرتی تھی جہاں مسز داؤد کے پائے جانے کا امکان ہوتا تھا اور اگر ان سے سامنا ہو جاتا تو وہ انہیں نظر انداز کر دیتی۔

ایک دن وہ ایکسر سائز کر رہی تھی۔ اس کی ٹرینر لڑکی نے کہا۔ ''آپ نے مسز داؤد کے بارے میں سنا؟''

''کیا؟'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

''انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے، ہاسپٹل میں داخل ہیں۔''

''اوہ۔'' مہر اپنی خفگی بھول گئی۔ ''کب کی بات ہے؟''

''دو دن ہوئے ہیں۔'' ٹرینر نے کہا۔ ''کل مسز شاہ بھی ان سے ملنے گئی تھیں۔ اب حالت ٹھیک ہے۔'' مسز شاہ اس فٹنس سینٹر کی مالکن تھی۔

مہر نے اس سے اسپتال کا پوچھا۔ ابھی اس نے اسپتال جانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا مگر معلوم کر لینے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ اسپتال بھی نزدیک ہی تھا۔ اگلے دن وہ فٹنس سینٹر سے نکلی تو غیر ارادی طور پر اس نے کار اسپتال کی طرف موڑ دی۔ مسز داؤد پرائیویٹ روم میں تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ ''میں سوچ رہی تھی کہ شاید تم نہیں آؤ گی لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔''

مہر ان کے گلے لگی۔ ''وہ الگ بات ہے لیکن آپ کی طبیعت کا سن کر افسوس ہوا۔ اب کیسی ہیں؟''

''تمہارے سامنے ہوں۔ مائنر اٹیک تھا، کل گھر چلی جاؤں گی۔''

کچھ دیر دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک مسز داؤد نے کہا۔ ''مہر، تم سمجھتی ہو کہ میں غلط کہہ کر تمہیں گمراہ کرتی رہی ہوں۔''

''نہیں، اس کے برعکس میں سمجھتی ہوں کہ آپ خود غلط فہمی کا شکار رہی ہیں اور سیٹھ صاحب کے بزنس کو دیکھ کر سب کے لیے یہی سمجھ رہی ہیں۔''

''یہ تم سے کس نے کہا کہ میں سب کے لیے یہ سمجھ رہی ہوں۔'' مسز داؤد کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''ٹھیک ہے، عام حالات خراب ہیں لیکن میں تو ہمیشہ خاص طور سے تمہارے بارے میں بات کرتی تھی۔''

مہر الجھ کر رہ گئی۔ مسز داؤد کے انداز میں کوئی خاص بات تھی۔ اس نے الجھ کر کہا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''مہر! تم ایک اچھی عورت ہو اور ان تمام عورتوں سے بہت مختلف ہو جو سینٹر میں آتی ہیں۔ پھر تم ایک بچے کی ماں بھی ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کسی دھوکے میں رہو یا بعد میں پچھتاؤ کہ تم بے خبر کیوں رہیں۔''

''مسز داؤد! میں ایک بار پھر کہوں گی کہ آپ کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہماری کمپنی کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''تم مسئلے کی بات کر رہی ہو، مہر النسا! تمہاری فیکٹری جس میں تم اب نصف کی مالک ہو، تقریباً بند ہو چکی ہے۔ اب وہاں کوئی پروڈکشن نہیں ہو رہی ہے۔ کچھ معمولی سا پیکنگ کا کام ہے۔ اسّی فیصد عملہ نکالا جا چکا ہے اور سیٹھ صاحب کا کہنا ہے کہ ایک دو مہینے میں فیکٹری میں تالا لگ جائے گا۔''

مہر کو لگا جیسے یہ بوڑھی عورت پاگل ہو گئی ہے، کیسی لایعنی باتیں کر رہی ہے؟ بھلا ان کی فیکٹری کیوں بند ہونے لگی؟ ان کا بزنس اتنا اچھا جا رہا تھا، جلد نئی شپ منٹ آنے والی تھی۔ مہر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بے خیالی میں کہا۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں۔''

''مہر! میری بات سنو۔ بے وقوف مت بنو، ظفریاب اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں اس کے بارے میں اور بھی جانتی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں تم خود اس کو پہچانو۔ کم سے کم بزنس کے معاملے میں وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔''

''آپ کے مشورے کا شکریہ۔'' مہر نے تلخی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے میں نے یہاں آ کر غلطی کی۔''

''تم نہیں مانو گی۔'' مسز داؤد نے افسردگی سے کہا۔ ''اللہ کرے تم ٹھوکر کھانے سے پہلے سنبھل جاؤ۔''

مہر ان کی بات پوری طرح سنے بغیر ہی کمرے سے نکل گئی۔ اب اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اسے یہاں آنے اور اس پاگل بڑھیا کی باتیں سننے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ فٹنس سینٹر آئی لیکن مسز داؤد کی باتوں نے اسے اتنا ڈسٹرب کیا کہ وہ وہاں بھی زیادہ دیر نہیں رکی... اور ایکسر سائز ادھوری چھوڑ کر گھر روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

ظفریاب ٹی وی دیکھ رہا تھا اور مہر ایک میگزین کے ورق پلٹ رہی تھی۔ اچانک ظفریاب نے کہا۔ ''کیا بات ہے، میں محسوس کر رہا ہوں دو تین دن سے تم چپ چپ ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' مہر نے میگزین رکھ دیا۔ ''آج کل آپ خود اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ مجھ سے بات کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔''

ظفریاب مسکرایا۔ ''لو، الٹی ٹوپی میرے سر رکھ دی۔ بھئی آج کل مصروفیات زیادہ ہیں۔ شپ منٹ آ چکی ہے اور اس کے آرڈرز بھی ملنا شروع ہو گئے ہیں اس لیے فیکٹری میں کام زیادہ ہے۔''

''کیا فیکٹری میں اتنے لوگ ہیں کہ کام زیادہ آ جائے تو وہ اسے ہینڈل کر سکیں؟''

''ہاں، ہمارے پاس مکمل عملہ ہے۔'' ظفریاب نے جواب دیا۔ ''اگر کام کم ہو تب بھی میں ملازموں کو رکھتا ہوں ورنہ عین موقع پر ملازم نہیں ملتے اور اس سے کام متاثر ہوتا ہے۔''

مہر کو مسز داؤد کی بات یاد آئی کہ فیکٹری میں صرف بیس فیصد لوگ رہ گئے ہیں اور اسی فیصد عملہ فارغ کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے یہ جھوٹ تھا۔ نہ جانے کیوں یہ عورت اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ظفریاب کو اس سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو مہر سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس کے بیٹے کو سگی اولاد کی طرح پال رہا تھا اور اس نے مہر کے مطالبے بلکہ اس کی طرف سے انکار کے باوجود اسے اپنے بزنس میں پارٹنر بنا لیا تھا۔ پھر مہر کو اپنا اولین موقع یاد آیا جب وہ فیکٹری میں انٹرویو کے لیے گئی تھی اور اس نے وہاں بہت کم لوگوں کو دیکھا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا لیکن شاید کوئی وجہ تھی کہ فیکٹری میں زیادہ لوگ نہ آئے ہوں یا وہ اپنے اپنے شعبوں میں مصروف ہوں۔ وہ وہاں کام کرنے آتے تھے، گھومنے پھرنے نہیں۔

وہ ظفریاب کی آواز پر چونکی۔

"کہاں گم ہو، میں دو بار پوچھ چکا ہوں۔"

"سوری۔" اس نے خفت سے کہا۔ "آپ کیا پوچھ رہے تھے؟"

"میں کامی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اس کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟ مصروفیت کی وجہ سے میں اس سے پوچھ نہیں سکا۔"

"ٹھیک جا رہی ہے۔ کل میری اس کے ٹیوٹر سے بات ہوئی ہے، وہ مطمئن ہے۔"

"وہ تو مطمئن ہوگا لیکن تم بھی نظر رکھو۔ ایک مہینے بعد اسے اس اسکول میں داخل کرانا ہے۔ اگر وہ رہ گیا تو اسے کسی دوسرے اسکول میں داخل کرانا پڑے گا۔"

"نہیں، مجھے یقین ہے وہ کلیئر کرلے گا۔" مہر نے یقین سے کہا۔ "میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی انگلش اور میتھ بہت اچھا ہو گیا ہے۔"

"گڈ۔" ظفریاب نے کہا۔ "شاید کل میں اسے شام کو لے کر جاؤں۔ اسپتال میں اس کا چیک اپ کراؤں گا۔"

مہر چونکی۔ "چیک اپ... وہ کس لیے؟"

"جنرل چیک اپ ہوگا۔" ظفریاب نے اسے تسلی دی۔ "فکر کی بات نہیں ہے۔ ہر چھ مہینے بعد جنرل چیک اپ کراتے رہنا چاہیے۔ جسم میں کوئی مسئلہ یا کسی چیز کی کمی یا زیادتی ہو رہی ہو تو پہلے پتا چل جانا ٹھیک ہوتا ہے۔ میں خود ہر چھ مہینے بعد چیک اپ کراتا ہوں۔ تمہارا انشورنس کے سلسلے میں ہو گیا ہے ورنہ تمہارا چیک اپ بھی کراتا۔"

"ٹھیک ہے۔" مہر نے کہا تو ظفریاب نے ایک طویل سانس لی اور دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مہر نے محسوس کیا کہ اس بار اس نے کامی کی تعلیم کے معاملے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔ جب سے وہ دبئی سے آیا تھا، ایک بار بھی کامی کو لے کر نہیں بیٹھا تھا۔ بس اس سے آتے جاتے ہیلو ہائے کر لیتا تھا اور نہ ہی اسے کہیں باہر لے کر گیا تھا۔

سوچتے ہوئے مہر چونک گئی۔ وہ ظفریاب کے بارے میں منفی انداز میں سوچ رہی تھی اور یہ شاید مسز داؤد کی باتوں کا اثر تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ظفریاب کئی دن سے دیر سے گھر آ رہا تھا اور جب وہ آتا تو بہت تھکا ہوتا تھا، کھانا کھا کر وہ کمرے میں آ جاتا۔ ایسے میں آدمی معمولات پر کہاں توجہ دے سکتا ہے؟ مہر کو شرمندگی ہونے لگی کہ وہ ظفریاب جیسے آدمی کے بارے میں اس طرح سوچ رہی تھی جس نے اب تک اسے اور اس کے بیٹے کو دیا ہی دیا تھا اور جواب میں اس سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ حد یہ کہ ظفریاب نے اس سے اولاد کے موضوع پر بھی کبھی بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ دونوں اس قابل تھے کہ ماں باپ بن سکتے۔ مگر ساتھ ہی وہ کوئی احتیاط بھی نہیں کرتا تھا شاید اس نے مزید اولاد کا معاملہ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔

اگلی صبح مہر دیر سے بیدار ہوئی۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ کامی اور ظفریاب ناشتے کے بعد اسکول اور دفتر جا چکے تھے۔ مہر نے ناشتے سے پہلے گرم پانی سے غسل کر کے چائے کے ساتھ پین کلر لی۔ دس بجے تک اس کی حالت اتنی بہتر ہوئی کہ وہ فٹنس سینٹر روانہ ہوئی۔ گھر میں اسے بوریت ہو رہی تھی اور وہ سوچوں سے بھی بچنا چاہتی تھی جو رہ رہ کر اس کا دماغ خراب کر رہی تھیں۔ اسے مسز داؤد کی باتیں اور ان کا لہجہ اب تک پریشان کر رہا تھا۔ وہ خود کو بار بار یقین دلا رہی تھی کہ مسز داؤد کی باتوں میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ وہ ظفریاب کے بارے میں جھوٹ کہہ رہی ہیں لیکن وہ خود کو مطمئن نہیں کر پا رہی تھی۔ آخر مسز داؤد کو یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی یا سیٹھ داؤد کی ظفریاب سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور ان میں کبھی بھی کوئی کاروباری تعلق نہیں رہا تھا بلکہ ان میں تو میل ملاقات بھی بہت کم تھی۔ سالوں بعد کسی تقریب میں وہ ملتے تھے۔ جب تعلق نہیں تھا تو دشمنی یا مخاصمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خود مہر کی مسز داؤد سے سلام دعا زیادہ پرانی نہیں تھی۔

وہ گھر آئی۔ اس نے کمپیوٹر پر ظفریاب کا ای میل اکاؤنٹ کھولنے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ اس کا پاس ورڈ بدل گیا ہے۔ ظفریاب نے پاس ورڈ کیوں بدلا جبکہ وہ صرف مہر کے علم میں تھا؟ مہر نے سوچا۔ وہ اپنے دل کی تسلی کرنا چاہتی تھی۔ ظفریاب نے دبئی میں جو سودا کیا تھا، اس سے متعلق کوئی نہ کوئی ای میل اس کے اکاؤنٹ میں ہونی چاہیے تھی۔ یہی سوچ کر مہر نے اس کا ای میل چیک کرنا چاہا۔ اسے مسز داؤد کی وہ بات سب سے زیادہ کھٹکی تھی، جب اس نے کہا کہ وہ ایک بچے کی ماں ہے اور اسے ہوشیار رہنا چاہیے۔ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ اس نے سوچا اور پھر مسز شاہ کو کال کی۔ "مسز شاہ! میں مہر ظفریاب بات کر رہی ہوں... مجھے مسز داؤد کا نمبر چاہیے۔"

"خیریت؟"

"ہاں، میں ان کی خیریت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"

"ویسے تو مسز داؤد کی طرف سے منع کیا گیا ہے لیکن آپ کی ان سے بھی سلام دعا ہے اس لیے نمبر دے رہی ہوں۔"

مسز شاہ سے نمبر لے کر مہر نے نمبر ڈائل کیا۔ مسز داؤد نے کال ریسیو کی تو اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مسز داؤد! میں مہر بات کر رہی ہوں۔"

"مہر ظفریاب۔" مسز داؤد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کلب سینٹر...؟"

"نہیں کہیں اور۔"

"اچھا۔" مسز داؤد نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تب ایسا کرو میرے گھر آ جاؤ۔" اس نے اپنا پتا بتایا تو مہر نے نوٹ کر لیا۔

"میں کچھ دیر میں آ رہی ہوں۔"

"کیا تمہیں میری بات کا یقین آ گیا ہے؟"

"میں آ کر بات کرتی ہوں۔"

سیٹھ داؤد کا بنگلہ ڈیفنس میں تھا۔ اگرچہ ظفریاب یہیں سے دور تھا مگر مہر کو اسے تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پرانی طرز کے اس بنگلے سے کہنہ سالی عیاں تھی اور صاف ظاہر تھا کہ عرصے سے اس پر رنگ و روغن اور مرمت کا کام نہیں ہوا۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ مہر نے کال بیل بجائی تو ایک ملازمہ باہر آئی۔ مہر نے اپنا نام بتایا۔ "مجھے مسز داؤد سے ملنا ہے۔"

"اندر آ جائیے، بیگم صاحبہ آپ کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔"

مسز داؤد بھاری فرنیچر سے آراستہ نشست گاہ میں اس کی منتظر تھیں۔ مہر کو دیکھ کر وہ طنزیہ انداز میں مسکرائیں۔ "میرا خیال ہے کہ اب تمہیں میری بات کا یقین آ گیا ہے؟"

"مجھے یقین نہیں آیا ہے اور میں اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"خیر بیٹھو... یقین بھی آ جائے گا۔"

مہر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ "شکریہ۔"

"کیا پیو گی ٹھنڈا یا گرم؟"

"کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور میں آپ کا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گی۔"

مسز داؤد نے ملازمہ کو اشارہ کیا تو وہ چلی گئی۔ "ہاں بولو۔"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ ظفریاب کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتی ہیں؟"

"ہاں، میں جانتی ہوں اور اسی لیے تمہیں خبردار کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

"دیکھیں، اعتبار باتوں سے نہیں ثبوت سے آتا ہے۔ آپ ظفریاب کے خلاف جو کہیں گی، کیا آپ کے پاس ان کا ثبوت ہے؟"

"ثبوت نہیں ہے لیکن میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں۔"

مہر کا دل چاہا کہ اٹھ کر وہاں سے چلی جائے مگر وہ اٹھی نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ باتیں مستقل اس کے ذہن میں رہیں گی اسی لیے وہ معاملہ صاف کرنے آئی تھی۔ یا تو مسز داؤد اسے ظفریاب کے خلاف ثبوت دے دیں یا پھر وہ جھوٹی ثابت ہو جائیں۔ اس نے سر ہلایا۔ "آپ بتائیں میں سن رہی ہوں۔ آج میں یہ قصہ ختم کر کے جاؤں گی۔"

مسز داؤد مسکرائیں۔ "اس کا مطلب ہے تم مجھے جھوٹا ثابت کرنے آئی ہو لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب نہ سہی کچھ عرصے بعد تمہیں خود پتا چل جائے گا۔"

"دیکھیے مسز داؤد! میں ایک عام سی غریب عورت تھی۔ ایک وقت تو مجھے اور میرے بچے کو فاقوں کا سامنا بھی تھا۔ پھر ظفریاب نے مجھے اپنی کمپنی میں جاب دی۔ میرے حالات بہت بہتر ہو گئے۔ پھر ظفریاب نے مجھے شادی کی پیشکش کی۔ شادی کے بعد اس نے مجھے اور میرے بیٹے کو پورے آرام اور آسائش سے رکھا۔ اس نے مجھے اپنے بزنس میں برابر کا شریک بنا لیا۔ ظفریاب نے مجھے دیا ہی دیا ہے۔ اس نے آج تک مجھ سے کچھ مانگا نہیں۔ حد یہ کہ اولاد کا بھی نہیں کہا۔ کیا ایسے شوہر کے بارے میں میں کچھ سن سکتی ہوں اور اس پر یقین کر سکتی ہوں؟"

"تم سن سکتی ہو اگر یقین نہیں کیا تو آنے والا وقت تمہیں خود یقین دلا دے گا۔ بات یہ ہے بیٹی کہ ہو سکتا ہے ظفریاب تم سے مخلص ہو لیکن آدمی کو اپنے طور پر ہوشیار رہنا چاہیے اور تمہیں خبردار کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ نہ جانے کیوں تمہیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ تم بہت سادہ عورت

ہو اور ظفریاب نے کسی خاص وجہ سے تمہیں منتخب کر کے تم سے شادی کی ہے۔ وہ تمہیں کہیں استعمال کرنا چاہتا ہے۔“

”آپ مجھے ظفر کے بارے میں بتا رہی تھیں۔“ مہر نے انہیں ٹوکا۔

”ہاں، یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت داؤد کیمیکلز کے حالات بہت اچھے تھے۔ یہاں ہمارے تو ڈ کیمیکلز کی اتنی مانگ تھی کہ ہم پورا نہیں کر پا رہے تھے۔ انہی دنوں ظفریاب داؤد سے ملا۔ اس نے انہیں پیشکش کی کہ وہ جو کیمیکلز تھرڈ پرایز پر چیبل منگواتے ہیں، وہ انہیں یہی کیمیکلز ساٹھ فیصد قیمت پر منگوا کر دے سکتا ہے۔“

”ظفریاب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس طرح منگوا کر دے سکتا ہے؟“

”نہیں لیکن یہ بات تو معمولی سا بچہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ ڈیوٹی سے بچ کر اسمگل کیا ہوا کیمیکل ہی اتنا سستا پڑ سکتا ہے۔ ظفریاب چاہتا تھا کہ یہ اسمگل شدہ کیمیکلز ہماری کمپنی کی مدد سے تقسیم کرے کیونکہ داؤد کیمیکلز کی ایک ساکھ ہے اور اس کے کیمیکلز خریدار آنکھ بند کر کے لیتے ہیں۔ ظفریاب منافع میں سے نصف چاہتا تھا۔ سرمایہ کاری وہ اپنی کرتا لیکن داؤد نے آج تک غلط کام نہیں کیا۔ وہ رشوت نہیں دیتے، چاہے ان کا کام مہینوں میں جا کر ہو۔ اس لیے انہوں نے ظفریاب کو بھی انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے داؤد سے رابطہ نہیں کیا۔“

مہر نے کہا۔ ”مسز داؤد! یہ تو ایک کاروباری حربہ ہے جو اکثر امپورٹرز اپناتے ہیں۔ کچھ مال قانونی طریقے سے اور کچھ اسمگلنگ کی مدد سے منگوا کر آگے فروخت کرتے ہیں۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ظفریاب مجھے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔“

”میں نے کہا نا، یہ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔ ظفریاب منفی سوچ کا مالک ہے اور جو شخص منفی سوچ کا مالک ہو اس کے بہ ظاہر اچھے کام میں بھی کوئی نہ کوئی برائی ہوتی ہے۔ اس لیے میں تمہیں ہوشیار کرنا چاہتی ہوں۔“

”آپ کا شکریہ مسز داؤد۔“ مہر کھڑی ہو گئی۔

”لگتا ہے تمہیں میری بات کا پھر یقین نہیں آیا ہے؟“

”بات کا تو یقین آ گیا ہے لیکن ظفریاب مجھے دھوکا دے سکتا ہے، اس کا میں اس وقت تک یقین نہیں کروں گی جب تک ایسا سچ سامنے نہیں آ جاتا۔“

”خدا نہ کرے ایسا وقت آئے۔“ مسز داؤد نے خلوص سے کہا۔ ”ہر آدمی کو اپنے طور پر ہر مشکل وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ایک سوال ہے، اگر تم چاہو تو جواب دینے سے انکار کر سکتی ہو۔“

”کیسا سوال مسز داؤد؟“

”کیا ظفریاب نے تمہارا انشورنس کرایا ہے؟“

مہر چونکی۔ ”میرا تو نہیں لیکن بزنس انشورنس ہے۔“

”اگر اس نے بزنس انشورنس کرایا ہے تو لازمی تمہارا انشورنس بھی ہوگا اور شاید تمہارے بیٹے کا بھی۔ دیکھو، یہ جاننا کوئی مشکل نہیں ہے۔ تم اس انشورنس کمپنی سے بھی معلوم کر سکتی ہو۔ جب انشورنس کا معاملہ ہو رہا تھا تو کیا تمہارا میڈیکل چیک اپ ہوا تھا؟“

”ہاں ہوا تھا۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”تمہارے بیٹا کا بھی ہوا تھا؟“

”نہیں اس کا نہیں ہوا لیکن آج...“ مہر بولتے بولتے رک گئی۔

”آج کیا؟“ مسز داؤد اس کے پاس آ گئیں۔

”آج ظفریاب کامی کو میڈیکل چیک اپ کے لیے لے جائے گا۔“

”اس نے کیا کہا ہے؟“

”یہی کہ وہ کامی کا جنرل چیک اپ کرانا چاہتا ہے۔“

”بس تو پھر بہت آسان ہے۔ وہ کامی کو جہاں چیک اپ کے لیے لے جائے، وہاں سے تم معلوم کر سکتی ہو۔“

مہر، مسز داؤد کے بنگلے سے نکلی تو اسے لگا جیسے وہ مشکلات سے نکلی نہ ہو بلکہ اس نے مشکلات کے نئے بھنور میں قدم رکھ دیا ہو۔ وہ جلس آئی تو کامی اسکول سے آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کا ٹیوٹر آ گیا اور وہ پڑھنے چلا گیا۔ مہر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کا ذہن ابھی تک منتشر تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے وارڈ روب میں آج تک ظفریاب کی الماری چیک نہیں کی۔ ان دونوں کی الماریاں الگ الگ تھیں۔ مہر وارڈ روب میں آئی۔ اس نے ظفریاب کی الماری کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ لاک تھی۔ چابی یقیناً ظفریاب کے پاس تھی۔ وہ مایوس ہو کر باہر آئی تو ظفریاب کو کمرے میں پا کر اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔

”آپ کب آئے؟“

”تقریباً دس منٹ ہو گئے۔“ ظفریاب نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم اتنی دیر سے وارڈ روب میں کیا کر رہی تھیں؟“

”کچھ نہیں، ایسے ہی کپڑے سیٹ کر رہی تھی۔“ مہر نے گھبرا کر کہا تو ظفریاب سر ہلاتا ہوا وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا۔ مہر کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے خدشہ ہوا کہ شاید اس کی بے خبری میں ظفریاب نے وارڈ روب میں جھانکا ہو اور اسے اپنی الماری کھولنے کی کوشش کرتے دیکھ لیا ہو۔ مگر اس کے انداز سے تو نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا لہجہ نارمل تھا۔ وہ چند منٹ بعد ہی کپڑے بدل کر آ گیا۔ مہر نے پوچھا۔

”آج آپ جلدی آ گئے؟“

”ہاں... کامی کو پانچ بجے لے جانا ہے، اس کا اپائنٹ منٹ ہو چکا ہے۔“

”کہاں لے جا رہے ہیں؟“

”وہیں جہاں تمہیں لے گیا تھا۔“ ظفریاب نے بے پروائی سے کہا۔ ”میرا واقف کار ہے۔“

”میں بھی چلوں؟“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کامی کو اکیلے ہی اندر لے جائیں گے۔ میں اسے چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے جاؤں گا اور جب تک آؤں گا، اس کا چیک اپ مکمل ہو جائے گا۔“ ظفریاب نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

”شپ منٹ کا کام کیسا چل رہا ہے؟“

”ٹھیک ہے، چالیس فیصد بک ہو چکی ہے اور اس میں سے بیس فیصد ڈلیور بھی ہو چکی ہے۔ امید ہے یہ شپ منٹ ایک ہفتے میں نمٹ جائے گی لیکن ہمیں اتنا دے جائے گی جو ہم چھ مہینے میں کماتے ہیں۔“

”کیا ہمارا بزنس مکمل انشورڈ ہے؟“

”ہاں لیکن اگر بزنس لاس میں جا رہا ہو، اس کی کوئی ریکوری نہیں ہوگی۔“

”کس چیز کی ریکوری ہے؟“

”فیکٹری تباہ ہو جائے، کسی زلزلے سے، آگ سے یا کسی اور وجہ سے تو اس نقصان کی ادائیگی ہوگی۔“

”اس میں انسانی جان کا انشورنس بھی شامل ہے؟“

ظفریاب جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ ”ہاں، اگر تمہیں یا مجھے کچھ ہو جائے تو انشورنس کمپنی اس کا معاوضہ بھی ادا کرے گی۔“

”فیکٹری کتنے میں انشورڈ ہے؟“

”دس ارب روپے میں۔“

مہر حیران ہوئی۔ ”دس ارب روپے... کیا اتنی مالیت ہے فیکٹری کی؟“

”بالکل... وہاں جو مشینری لگی ہے اور پھر کیمیکلز اسٹور کی ہوتی ہے ان کی مالیت اس سے زیادہ ہی ہوگی۔“

”جانی نقصان کی صورت میں کیا ملے گا؟“

”لگتا ہے اب تمہیں بھی بزنس سے دلچسپی ہونے لگی ہے۔“ ظفریاب مسکرایا تو مہر کو لگا جیسے وہ زبردستی مسکرایا ہو۔ ”جانی نقصان کی صورت میں انشورنس کمپنی دو ارب روپے کی ادائیگی کرے گی۔“

مہر یہ سن کر بھی حیران ہوئی۔ ایک انسان کی اتنی قیمت بھی ہو سکتی ہے؟ پھر اسے خیال آیا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی انشورنس اربوں ڈالرز میں ہوگی۔ اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”کیا کامی کی انشورنس بھی ہوئی ہے؟“

ظفریاب چونکا۔ ”کامی کی... اس کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو ہم دونوں کی انشورنس ہے۔ اصل میں فیکٹری کی انشورنس میں ہی ہماری بھی انشورنس شامل ہے اور اس کے لیے کمپنی کو الگ سے کوئی ادائیگی نہیں کرنا پڑے گی۔“

”دس ارب روپے کی انشورنس کا مطلب ہے کہ ہمیں کمپنی کو بھاری ادائیگی کرنا پڑتی ہوگی؟“

”ہاں کرنی تو پڑتی ہے۔“ ظفریاب نے بے پروائی سے کہا۔ ”لیکن فیکٹری تو سیکیور ہو جائے گی۔“

”کامی سے کہہ دوں کہ تیار ہو جائے؟“

”ہاں، آج ٹیوٹر سے کہو چھٹی کرے۔ پانچ بجے تک وہاں پہنچنا ہے۔“

”واپسی کب تک ہوگی؟“

”دو ڈھائی گھنٹے تو لگ سکتے ہیں۔“

ظفریاب کامی کو لے کر ساڑھے چار بجے تک چلا گیا۔ اس نے لنچ نہیں کیا۔ وہ دفتر سے لنچ کر کے آیا تھا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی مہر نے فون ڈائریکٹری اٹھائی اور اس انشورنس کمپنی کے نمبرز نکالے جس نے ان کی فیکٹری کو انشورڈ کیا تھا۔ اس نے یونیورسل نمبر پر کال کی اور کسی ایسے ماہر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی جو انشورنس پریمیم کے سلسلے میں اس کے سوالوں کا جواب دے سکے۔ کچھ دیر بعد کمپنی کا ایک ماہر لائن پر تھا۔ مہر نے کہا۔ ”مجھے معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی فیکٹری دس ارب روپے میں انشورڈ ہو تو اس کا کم سے کم پریمیم کتنا جائے گا۔“

ماہر نے اس سے کچھ سوالات کیے اور پھر اسے بتایا کہ اس صورت میں پریمیم کم سے کم تیس لاکھ روپے ماہانہ ہوگا اور یہ ماہانہ یا سہ ماہی بنیادوں پر وصول کیا جائے گا۔ ماہانہ اور سہ ماہی قسط میں فرق آ سکتا ہے۔ مہر حیران ہوئی تھی، یعنی ظفریاب کم سے کم تیس لاکھ روپے ماہانہ دے رہا تھا۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔ ”کیا اس انشورنس میں کمپنی مالکان کا بیمہ بھی شامل ہو سکتا ہے؟“

”بالکل ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے الگ سے پریمیم

قابل ہوئی تو اسے مسز داؤد کا خیال آیا۔ اس نے ان کا نمبر ملایا۔ ''مسز داؤد! میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''
''کیا کوئی نئی بات سامنے آئی ہے؟''
''ایسا ہی سمجھ لیں۔ مجھے آپ کے مشورے کی اشد ضرورت ہے۔''
''ایسا کرو گھر آجاؤ، لنچ بھی میرے ساتھ کرنا۔''
''میں آرہی ہوں۔'' مہر نے فون بند کر دیا اور مسز داؤد کے بنگلے کی طرف روانہ ہوگئی۔ کچھ دیر میں وہ بنگلے پر تھی۔ مسز داؤد گرم جوشی سے ملیں۔
''مجھے یقین ہے کہ تم نے کچھ نہ کچھ حقیقت جان لی ہوگی۔''
''کچھ سے زیادہ جان لی ہے۔'' مہر نے گہری سانس لی۔ مسز داؤد اسے اندر لے آئیں۔
''تم پریشان ہو، ایک منٹ... پہلے کچھ پی لو پھر بات کرتے ہیں۔''
مسز داؤد کی ملازمہ چائے لے آئی۔ چائے پی کر اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ اس نے دھیمے لہجے میں مسز داؤد کو سب بتا دیا۔ کامی کے انشورنس کا سن کر وہ اچھل پڑیں مگر کچھ کہا نہیں۔ وہ پہلے مہر سے تمام تفصیل سننا چاہتی تھیں۔ جب مہر فیکٹری کی حالت بتا کر چپ ہوئی تو مسز داؤد نے کہا۔
''مہر! یہ شخص نہ صرف تمہیں دھوکا دے رہا ہے بلکہ مجھے اس کے عزائم بھی خطرناک لگ رہے ہیں۔ آخر اس نے کامی کا انشورنس کیوں کرایا ہے؟''
''اسی وجہ سے تو مجھے شک ہو رہا ہے ورنہ فیکٹری کی حالت کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ ظفر مجھے پریشانی سے بچانے کے لیے بھی یہ بات چھپا سکتا تھا۔''
''تم نے ابھی تک ظفریاب سے کچھ کہا تو نہیں؟''
''نہیں، میں سیدھی آپ کے پاس آئی ہوں۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ مجھے مشورہ دیں۔''
''مہر! بہت محتاط رہو۔ دوسرے اس سے کھل کر بات مت کرنا ورنہ وہ کوئی اور چال چلے گا یا تم دونوں کو کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ اس لیے صبر سے اس کی چال دیکھو اور پھر اس کے مطابق عمل کرو۔ اگر اس سے کھل کر بات کرنی ہے تو پہلے خاموشی سے الگ ہو جاؤ۔''
''مجھے تو اب اس گھر میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔''
''ہمت کرو۔'' مسز داؤد نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ''ظفریاب سازشی ہے اور ہر سازشی بزدل ہوتا ہے۔ وہ کھل کر تمہارے خلاف کچھ نہیں کرے گا بلکہ اسے شک ہو جائے کہ تم کچھ جان گئی ہو تو وہ اپنے عزائم سے باز بھی آسکتا ہے۔''
اچانک مہر رونے لگی۔ ''آپ نہیں جانتیں میں نے کڑا وقت دیکھا ہے۔ پھر ظفریاب نے مجھے پسند کیا اور مجھ سے شادی کی تو مجھے لگا جیسے میرا کڑا وقت گزر گیا ہے۔ مگر اب لگ رہا ہے کہ یہ سب سراب تھا۔''
مسز داؤد دکھی ہو گئیں۔ انہوں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''میری بچی... آدمی قسمت سے نہیں لڑ سکتا۔ اس میں جو ہوتا ہے، وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔''
''مسز داؤد! میں اکیلی ہوتی تو مجھے اتنی فکر نہ ہوتی لیکن میں کامی کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتی۔''
''تم کیا کرو گی؟''
''میں ظفریاب سے کھل کر بات کروں گی اور اگر وہ مجھے مطمئن نہ کر سکا تو میں اس سے الگ ہو جاؤں گی۔''
''یہ حماقت مت کرنا۔ اوّل تو تم اس سے الگ نہیں ہو پاؤ گی... پھر وہ سازش سے مکر جائے گا۔''
''لیکن میں اس کا انتظار نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی سازش کو عملی جامہ پہنائے اور میرے بچے کو اس سے کوئی نقصان ہو۔'' مہر نے کہا پھر ملتجی نظروں سے مسز داؤد کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتیں؟''
''کیوں نہیں، اگر تم خاموشی سے ظفریاب کو چھوڑنا چاہتی ہو تو میں تمہاری مدد کروں گی، میں تمہیں پناہ دے سکتی ہوں لیکن ظفریاب کو پتا نہ چلے ورنہ وہ دشمنی پر اتر آئے گا۔ پھر کسی وکیل کی مدد سے بزنس میں تمہارا حصہ تمہیں دلایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد تم اس سے خلع لے لو گی۔''
مہر نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''
''بس تو تم ظفریاب سے کوئی بات کرنے کے بجائے خاموشی سے کامی کو لے کر وہاں سے نکل آؤ۔ اس کے بعد ظفریاب سے بات کرتے ہیں، آؤ لنچ لگ گیا ہے۔''
مہر یہی سوچ کر مسز داؤد کے بنگلے سے نکلی کہ ظفریاب کے آنے سے پہلے وہ کامی اور اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے نکل آئے گی۔ اس کے پاس ظفریاب کی دی ہوئی خاصی جیولری تھی۔ حق مہر کے پانچ لاکھ روپے اور مزید دو لاکھ روپے اس کے پاس تھے۔ وہ مسز داؤد پر بوجھ نہیں بنتی۔ وکیل کی مدد سے بزنس میں اپنا حصہ حاصل کر کے وہ آرام سے زندگی گزار سکتی تھی۔ مگر جب وہ بنگلے میں داخل ہوئی تو وہاں ظفریاب کی کار دیکھ کر اس کی جان نکل گئی۔ کیا اسے پتا چل گیا تھا کہ مہر فیکٹری کی طرف گئی تھی۔ اور وہ فوراً گھر آ گیا تھا

وہ ڈرتے ڈرتے واپس آئی تو ظفریاب کمرے میں موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرایا تو مہر کی جان میں جان آئی۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”خیریت... آج آپ جلدی آگئے؟“

”ہاں کام نہیں تھا اور پھر تمہاری یاد آئی تو تمہارا یہ خادم گھر چلا آیا۔ کیا تمہیں اچھا نہیں لگا؟“

”نن... نہیں، اچھا لگا۔ بس میں حیران ہوئی تھی۔ کامی آگیا سکول سے؟“

”ہاں، اپنے کمرے میں ہوگا۔“

”میں ذرا اسے دیکھ کر آتی ہوں۔“ مہر نے کہا اور ظفریاب کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ اس کی اچانک آمد نے مہر کو مشکل میں ڈال دیا تھا اور اب اسے انتظار کرنا تھا کہ ظفریاب کہیں باہر نکلے تو وہ بھی کامی کو لے کر نکل جائے۔ وہ کامی کے کمرے میں آئی تو وہ ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔ مہر نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور کامی کے پاس آئی۔ ”کامی! میری بات سنو۔“

”جی مام۔“ اس نے گیم سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

مہر نے اس سے گیم چھین لیا۔ ”کامی! میری بات غور سے سنو۔“

کامی نے کسی قدر حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”جی مام؟“

”کامی! ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن تمہارے ظفر انکل یا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔“

”مگر کیوں مام... کیا آپ انکل ظفر سے ناراض ہو گئی ہیں؟“

”ایسا ہی سمجھو۔“ مہر نے کہا۔ ”میں جا رہی ہوں، تم خاموشی سے اپنے سارے کپڑے اور دوسری چیزیں بیگ میں رکھو۔“

مہر نے الماری سے بیگ نکال کر بستر پر رکھا۔ ”صرف کپڑے اور جوتے وغیرہ رکھنا... اپنے کھلونے اور گیم چھوڑ دو۔“

”مام پلیز۔“ کامی نے التجا کی۔

”اچھا اگر گنجائش ہو تو رکھ لینا لیکن سارا کام بالکل خاموشی سے کرنا اور کسی ملازم کو بھی پتا نہ چلے۔ خود بھی تیار ہو جانا۔“

کامی ہراساں ہوگیا۔ ”مام! ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”بس ایک جگہ ہے، ہم وہاں جائیں گے۔ اپنا بیگ تیار کرکے بستر کے نیچے چھپا دینا۔“ مہر نے کہا اور کامی کے کمرے سے نکل آئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ظفریاب کہیں باہر نہیں گیا تو وہ اور کامی کیسے نکلیں گے گھر سے جبکہ اسے ابھی

بہت سی چیزیں بھی سمیٹنا تھیں۔ ان میں رقم، چیک بک اور دوسرے ضروری کاغذات شامل تھے۔ اگر وہ کپڑے اور دوسری چیزیں چھوڑ بھی دیتی تب بھی یہ لے جانا لازمی تھا۔ وہ کمرے میں واپس آئی۔ ظفریاب نے اسے غور سے دیکھا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“

”ہاں، کچھ تھکن ہو رہی ہے۔“ مہر نے جواب دیا اور بستر کی طرف آنے کے بجائے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”شاید آج میں نے زیادہ ایکسرسائز کرلی۔“

”کھانا کھایا؟“

”ہاں، بہت بھوک لگ رہی تھی اس لیے وہیں کیفے ٹیریا میں لنچ کرلیا تھا۔“ مہر نے بہانہ بنایا۔

”اچھا کرو، غسل کرکے آرام کرو۔“

”آپ کیا کریں گے؟“

”میں شام کو باہر جاؤں گا۔“ ظفریاب نے کہا۔ ”مجھے کچھ کام ہے لیکن جلدی آجاؤں گا۔“

مہر، خود ظفریاب کے سامنے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ ظفریاب کے شام کو باہر جانے کی بات اس کے لیے خوش خبری تھی۔ وہ واش روم میں آگئی۔ حسب معمول اس نے دروازہ بند کیا لیکن اندر سے لاک نہیں کیا۔ لباس اتار کر وہ شاور کے نیچے آئی اور پانی کھول دیا۔ پانی گرا تو اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ پانی گرنے کے شور میں اسے پتا نہیں چلا۔ اچانک اسے محسوس ہوا تو اس نے مڑ کر دیکھا اور ظفریاب کو دیکھ کر سمٹ گئی۔ ”آپ...“

”ہاں۔“ ظفریاب نے جواب دیا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ پشت پر تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ سامنے آیا اور تیزی سے مہر کی گردن پر لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی باریک چیز اس کی گردن میں اتر گئی ہو۔ یہ باریک چیز سرنج کی سوئی تھی۔ اس میں موجود دوا جھٹکے سے مہر کی رگ میں اتر گئی اور فوراً ہی اس کا ذہن چکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے گرتی ظفریاب نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور اس کے کان میں دھیمی آواز میں کہا۔ ”آرام سے میری جان... میں اتنا بے خبر نہیں تھا جتنا تم سمجھ رہی تھیں۔“

مہر صرف اتنا سن سکی اور پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ بستر پر بندھی حالت میں پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں ٹیپ سے بندھے ہوئے تھے اور منہ پر بھی ٹیپ لگا تھا۔ ظفریاب نکل کر سامنے آگیا تھا اور مہر کو اس کا آخری جملہ یاد آیا کہ وہ سب جانتا تھا... اس سے بے خبر نہیں تھا۔ مہر

طرح قطعی بے بس تھی۔ اپنی مدد کے لیے کسی کو بلا بھی نہیں سکتی تھی۔ کمرے میں روشنیاں جل رہی تھیں اور کھڑکیوں پر پردے تھے اس لیے اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ دن کا وقت ہے یا رات ہوگئی ہے۔ اس نے بمشکل گھوم کر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج کر بارہ منٹ ہو رہے تھے۔ وہ کوشش کرکے اٹھ بیٹھی اور مسہری کی پشت سے ٹیک لگالی۔ مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے دروازہ کھلا اور ظفریاب اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جو اس نے میز پر رکھ دی۔ مہر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے تعجب ہوا۔ اس کے چہرے پر مکارانہ اور سفاک تاثرات تھے۔ مہر کو تعجب اس بات پر تھا کہ آج تک وہ اسے نرم خو اور مہذب سمجھتی آئی تھی۔ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”کیا حال ہیں مہر النسا میڈم؟“

مہر اسے خاموشی سے دیکھتی رہی، بولتی بھی کیسے؟ گر اس کا منہ کھلا ہوتا تو یقیناً وہ اسے کھری کھری سناتی۔ ظفریاب بولا۔ ”اوہ... میں بھول گیا، تمہارا تو منہ بند ہے۔“ اس نے مہر کے ہونٹوں سے ٹیپ اتار دیا۔

”بچاؤ... بچاؤ۔“ منہ کھلتے ہی مہر نے چلا کر کہا۔

”ہاں، کوئی آکر بچاؤ۔“ ظفریاب نے اس کی آواز کی نقل اتاری۔ ”میرا ظالم شوہر مجھ پر ظلم کر رہا ہے۔“ پھر وہ سنجیدہ ہوگیا۔ ”یہاں تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں ہے۔ میں نے تمام نوکروں کو چھٹی دے دی ہے۔ صرف گیٹ پر چوکیدار ہے لیکن وہ یہاں سے بہت دور ہے۔“

مہر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”تم ایسا کیوں کر رہے ہو، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ ظفریاب نے تسلیم کرنے کے انداز میں کہا۔

”پھر یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”جلدی نہیں... ذرا صبر کرو، سب تمہارے سامنے آجائے گا۔“

”تم نے مجھے کیوں باندھا ہے؟“ مہر ہاتھ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی پھر اسے کامی کا خیال آیا اور وہ چلا اٹھی۔ ”کامی... کامی کہاں ہے؟“

”وہ اپنے کمرے میں ہے اور سکون سے سو رہا ہے۔“

مہر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”وہی جو تمہارے ساتھ کیا ہے۔“ ظفریاب نے انجکشن لگانے کا اشارہ کیا۔ ”اسے ذرا دیر سے دیا تھا اس لیے ابھی وہ دو تین گھنٹے اور سوئے گا۔“

”ظفر! وہ بچہ ہے کہیں اسے کچھ...“

”اسے کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے مقدار اتنی رکھی تھی جتنی ایک دس گیارہ سال کے لڑکے کے لیے مناسب ہوتی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم بھول رہی ہو کہ میں کیمیکلز کا بزنس کرتا ہوں اور فارماسیوٹیکل کمپنیوں کو بھی کیمیکلز سپلائی کرتا رہا ہوں۔“

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

ظفر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ ٹرے اٹھا کر لے آیا۔ اس میں ایک بڑے پیزا کے ٹکڑے تھے اور ساتھ میں سافٹ ڈرنک کا گلاس تھا۔ اس نے ایک ٹکڑا اٹھا کر مہر کی طرف بڑھایا۔ ”تمہیں بھوک لگی ہوگی۔“

مہر نے منہ پھیر لیا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”اگر تم سکون سے پیزا کھا لو تو میں کامی کو بھی یہاں لے آؤں گا۔“

”تم وعدہ کرتے ہو؟“

”ہاں، وعدہ کرتا ہوں۔“

مہر جلدی جلدی کھانے لگی۔ اسے بھوک نہیں تھی لیکن وہ دل پر جبر کرکے کھاتی رہی۔ درمیان میں ظفریاب اسے سافٹ ڈرنک بھی پلاتا رہا۔ نصف پیزا کھا کر اس نے کہا۔ ”بس اب میں مزید نہیں کھا سکتی۔ میرا پیٹ بھر گیا ہے۔“

ظفریاب نے اصرار نہیں کیا اور ٹرے واپس میز پر رکھ دی۔ مہر نے کہا۔ ”تم نے کامی کو یہاں لانے کا وعدہ کیا ہے۔“

”اتنی جلدی کیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”کچھ دیر میں لے آتا ہوں۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”کس بات کا؟“

”یہی کہ میں فیکٹری گئی تھی۔“

ظفریاب کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ”تم صرف فیکٹری نہیں گئی تھیں بلکہ تم نے ڈاکٹر ثاقب حسن کو بھی کال کرکے معلوم کرلیا تھا کہ کامی کا میڈیکل چیک اپ اصل میں انشورنس کے سلسلے میں ہے۔“

”تم نے مجھ سے مسلسل جھوٹ بولا۔“ مہر نے نفرت سے کہا۔ ”فیکٹری بند ہونے والی ہے اور تم کہتے رہے کہ بزنس بہت اچھا جا رہا ہے۔ جب فیکٹری میں کوئی کام نہیں تو اس کی اتنی بھاری رقم کی انشورنس کیوں کرائی؟“

"تاکہ جب فیکٹری میں آگ لگے تو میں دس ارب روپے کا انشورنس لے سکوں۔" ظفریاب نے اطمینان سے جواب دیا۔

"آگ...!" مہر چونکی۔ "وہاں آگ کیسے لگے گی؟"

"آگ لگے گی نہیں بلکہ لگائی جائے گی لیکن تفتیش سے یہی سامنے آئے گا کہ بجلی کے شارٹ سرکٹ کی وجہ سے آگ لگی اور پھر کیمیکلز کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے پوری فیکٹری میں پھیل گئی۔ اندر موجود کسی فرد کو بچ کر باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا۔"

"اندر موجود فرد...؟ فیکٹری میں تو گنتی کے چند لوگ ہوں گے اور جب آگ لگے گی تو وہ جان بچانے کی کوشش کریں گے۔"

"کوشش کریں گے لیکن بچ نہیں سکیں گے کیونکہ سب سے پہلے دفتر اور باہر نکلنے کے راستے آگ کی زد میں آئیں گے۔ اندر موجود افراد اندر رہ جائیں گے۔"

مہر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ظفریاب! تم اتنے سفاک ہو سکتے ہو، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ تم بے گناہ انسانوں کو زندہ جلانے کا منصوبہ بنا رہے ہو اور وہ بھی صرف دولت کے لیے۔"

"صرف دولت نہیں... دس ارب روپے کے لیے۔" ظفریاب نے تصحیح کی۔

"ان بے گناہ لوگوں کا کیا قصور ہے؟" مہر بے چین ہو گئی۔

"کچھ نہیں۔ وہ فیکٹری ملازمین ہیں اور ان کی موجودگی ثابت کرنے کے لیے کافی ہو گی کہ فیکٹری میں کام ہو رہا تھا جب آگ لگی۔ وہاں اربوں روپے کا کیمیکل تھا اور اس سے زیادہ مالیت کی مشینری تھی جو سب جل کر برباد ہو گئی۔ تم شاید جانتی نہیں ہو، کیمیکل کی آگ اتنی خطرناک ہوتی ہے کہ لوہا تک پگھلا دیتی ہے۔ وہاں کوئی ثبوت اور کوئی چیز باقی نہیں رہے گی جس سے پتا چلے کہ اصل میں آگ کیسے لگی تھی۔"

مہر کا دل ڈوبنے لگا۔ "فیکٹری میں کتنے لوگ ہوں گے؟"

"ڈیڑھ سو سے زیادہ لوگ ہوں گے۔ ابھی تو وہ چھٹی پر ہیں لیکن کل انہیں کام پر بلا لیا جائے گا۔ بہانہ یہی ہو گا کہ ایک دو دن میں فیکٹری میں کام شروع ہو جائے گا اور سب اپنے اپنے شعبوں کو کام کی حالت میں لائیں گے کیونکہ کیمیکلز کی نئی کھیپ آ چکی ہے۔"

"کیمیکلز؟"

"ہاں، آگ لگانے والا کیمیکل۔" ظفریاب نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن انوینٹری کے کاغذات بتائیں گے کہ یہ اربوں روپے مالیت کا قیمتی کیمیکل تھا جو آگ لگنے سے تباہ ہو گیا۔"

"سنو، تمہیں انشورنس کی رقم چاہیے تو آگ رات میں لگ سکتی ہے۔ جب فیکٹری میں کوئی نہ ہو۔" مہر نے کہا۔ "اتنے غریبوں کا خون کیوں اپنے سر لیتے ہو؟"

"اس کی ایک خاص وجہ ہے۔" ظفریاب نے کہا۔ "جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔"

"کیا تم ہم ماں بیٹا کو بھی مار دو گے؟"

"نہیں... یہ صرف حفاظتی تدبیر ہے۔" ظفریاب نے مکاری سے کہا۔ "جب تک میرا منصوبہ مکمل نہیں ہو جاتا تم دونوں ماں بیٹے اسی طرح بند رہو گے۔"

"اور اس کے بعد؟"

"اس کے بعد میں کامی کو ایک اور جگہ رکھوں گا۔ تم میرے ساتھ رہو گی جب تک انشورنس کی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد میں اپنا سب فروخت کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"اور ہم...؟"

"تم دونوں آزاد ہو گے۔" ظفریاب نے بے پروائی سے کہا۔ "فکر مت کرو، میں تمہیں اتنا دے کر جاؤں گا کہ اپنی باقی زندگی سکون اور آرام سے گزارو گی۔"

"ظفر! تم نے شروع سے پلان بنا کر مجھ سے شادی کی نا... تمہیں ایک ایسی غریب عورت کی تلاش تھی جس کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ وہ تمہیں میری صورت میں مل گئی۔" مہر نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"تم اب بھی مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔" مہر بولی۔ "اگر تمہارا ارادہ ہمیں چھوڑ کر جانے کا ہے تو تم نے میرا اور کامی کا لائف انشورنس کیوں کرایا؟"

ظفریاب کا چہرہ سپاٹ ہو گیا پھر اس نے سفاک لہجے میں کہا۔ "تم میرے اندازے سے زیادہ ذہین عورت ہو۔" کہتے ہوئے اس نے اچانک مہر کے منہ پر دوبارہ ٹیپ لگا دیا۔ اس نے مزاحمت کرنی چاہی لیکن وہ بندھی ہونے کی وجہ سے بے بس تھی۔ ظفریاب نے پھر اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اس کا کامی کو یہاں لانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک ڈوری لا کر مہر کی گردن میں باندھی جیسے جانور کو باندھتے ہیں اور ڈوری مسہری کے پائے سے باندھ دی۔ اب مہر کوشش کر کے مسہری سے اتر بھی جاتی تو وہ اس سے دور نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے فون سمیت ہر ایسی چیز وہاں سے ہٹا دی تھی جس سے مہر خود کو آزاد کرا سکتی تھی یا مدد حاصل کر سکتی تھی۔ جاتے ہوئے وہ لائٹس بھی بند کر گیا تھا۔

مہر کی جنت ایک سراب ثابت ہوئی تھی۔ اس کی خوش فہمی تھی کہ وہ جہنم سے نجات حاصل کر چکی ہے۔ وہ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں داخل ہو گئی تھی۔ پہلے وہ مشکل میں تھے لیکن زندہ تو تھے لیکن یہاں ان کی زندگی ختم ہونے والی تھی۔ ظفریاب انہیں اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا رہا تھا۔ مسز داؤد نے ٹھیک کہا تھا، وہ منفی سوچ رکھنے والا شخص تھا اور اس کے درست کام میں بھی خرابی پوشیدہ ہوتی۔ لیکن یہ خرابی اس کی نہیں بلکہ مہر اور کامی کی تھی۔ وہ کامیاب ہو جاتا، اسے انشورنس کلیم سے اربوں روپے مل جاتے اور وہ دونوں ماں بیٹا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ کسی کو پتا نہیں چلتا، ورنہ کوئی ان کے لیے پولیس یا عدالت تک جانے کی زحمت کرتا۔ ظفریاب روپے سے سب کا منہ بند کر سکتا تھا۔ ایک بار وہ دولت سمیٹ کر اس ملک سے فرار ہو جاتا تو پھر اسے کون پکڑ سکتا تھا؟

مہر کو کامی کا خیال تڑپا رہا تھا۔ اسے اپنی فکر نہیں تھی لیکن ظفریاب کے عزائم جان کر وہ کامی کے لیے پریشان تھی۔ مگر وہ یہاں بے بس بندھی ہوئی تھی، کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے مسز داؤد کا خیال آیا۔ اس نے ان سے کہا تھا کہ وہ کامی کو لے کر ان کے گھر آ جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی اسے ذرا امید ہوئی کہ جب وہ اور کامی مسز داؤد کے بنگلے تک نہیں پہنچیں گے تو شاید وہ کچھ کریں۔ ممکن ہے ظفریاب سے پوچھے یا پولیس کو کال کر دے۔ اگر مسز داؤد ظفریاب کو کال کریں تو نہایت اطمینان سے کہہ دے گا کہ مہر اور کامی ٹھیک ہیں اور اگر وہ زیادہ اصرار کریں گی تو ظفریاب صاف کہہ سکتا ہے کہ وہ اس کے معاملے میں مداخلت کی مجاز نہیں تھیں۔ پولیس سے توقع نہیں تھی کہ وہ ایک دولت مند آدمی سے پوچھ سکے کہ جناب، آپ کی دوسری بیوی اور اس کا بچہ صحیح سلامت تو ہیں یا نہیں۔

مہر کو نہیں معلوم کہ اس بے بسی کی حالت میں کتنی دیر گزر گئی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور کمرا روشن ہو گیا۔ ظفریاب وہاں موجود تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا جیسے تھکا ہوا ہو اور رات بھر سو نہ سکا ہو۔ وہ رات بھی نہیں سویا تھا۔ وہ مہر کے پاس آیا اور اس کے منہ سے ٹیپ اتار دیا۔ "رات کیسی گزری؟"

"یہ رات گزر گئی ہے؟"

"پوری رات... ابھی سورج نکلنے میں کچھ وقت ہے۔"

مہر نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ پھر اس نے لجاجت سے ظفریاب سے کہا۔ "ظفر! کامی کو چھوڑ دو، اسے کچھ مت کہو۔ میرے ساتھ تم جو چاہے سلوک کرو۔"

"دل تو میرا بھی یہی چاہ رہا ہے۔" ظفریاب نے سر ہلایا۔ "لیکن اب دیر ہو گئی ہے۔ اگر تم خاموشی سے غائب ہو جاتیں تو کامی کو پتا نہ چلتا لیکن اسے معلوم ہے کہ اس کی ماں بھی اس کی طرح قیدی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ پہلے بھی تمہارا ہمیں چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" مہر رو دی۔ "تم بہت سفاک آدمی ہو۔ کاش میں اس ملازمت کے لیے انٹرویو دینے نہ آتی۔"

"یہ تمہاری قسمت میں تھا۔" ظفریاب کھڑا ہو گیا اور اس نے جیب سے ایک سرنج نکالی۔ مہر خوف زدہ ہو گئی۔ ظفریاب نے سرنج کا کیپ ہٹایا۔

"نہیں پلیز۔" مہر نے کہنا چاہا لیکن ظفریاب اس کے شانے میں سرنج گھونپ چکا تھا۔ دوا گوشت میں گئی تھی اس لیے اس نے فوری اثر نہیں کیا۔ اپنا کام کر کے ظفریاب نے اسے بتایا۔

"اب میں تمہیں اور کامی کو فیکٹری لے جاؤں گا۔"

مہر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "فیکٹری کیوں؟"

"تاکہ آگ لگنے سے ہلاک ہونے والوں میں فیکٹری کا ایک مالک اور ایک اس کا وارث بھی شامل ہو۔ افسوس تم نے انشورنس کے کاغذات پڑھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کے مطابق اگر مالک کا فیکٹری میں حادثاتی انتقال ہو تو انشورنس کی رقم دگنی ہو جائے گی۔ یعنی چار ارب روپے۔"

"تو کامی کا انشورنس کیوں کرایا؟"

"وہ معمولی سا ہے، صرف دس کروڑ روپے کا اور ابھی پالیسی کارآمد بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"پھر اسے کیوں...؟"

"ایک تو مجھ پر شک نہیں جائے گا، دوسرے وہ تمہارا وارث ہے۔ وہ زندہ رہے گا تو انشورنس پالیسی اور فیکٹری کی پالیسی کا بڑا حصہ اسے ملے گا۔ اس لیے اب وہ بھی تمہارے ساتھ ہی جائے گا۔"

مہر کا سر چکرانے لگا۔ اس نے سرگوشی میں التجا کی۔ "پلیز۔"

"اب تم آرام سے سو جاؤ۔" ظفریاب نے اسے دھکا دے کر بستر پر گرا دیا اور مہر کو ہوش نہیں رہا۔ اگلی بار اسے ہوش آیا تو وہ فیکٹری میں ظفریاب کے دفتر میں تھی اور دفتر کا یہ حصہ فیکٹری سے بالکل ملا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے

وہ بے جانور سے بھی پیار کرنے لگتا ہے۔ وہ اس کی بیوی تھی، کافی اس کا بیٹا نہ سہی ایک بچہ ضرور تھا لیکن ظفریاب نہایت مشینی انداز میں ان کی موت کا سامان کر رہا تھا۔ اپنا کام مکمل کر کے اس نے کہا۔

”اب میں جا رہا ہوں، کچھ دیر بعد دفتر کے لوگ آنا شروع ہو جائیں گے۔ پھر ایک بجے یہاں آگ لگے گی لیکن اس وقت تک میں ہیڈ آفس میں ہوں گا اور مجھے دوسروں سے پتا چلے گا کہ یہاں آگ لگ گئی ہے اور میں روتا پیٹتا یہاں آؤں گا۔ اپنی فیکٹری کو آگ میں گھرا دیکھ کر اور یہ جان کر کہ اندر میری پیاری بیوی اور بیٹا بھی ہے، میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ تین چار دن اسپتال میں رہوں گا۔ اس کے بعد تین چار مہینے مزید یہاں رہنا ہوگا۔ جیسے ہی مجھے انشورنس کی رقم ملے گی، میں اس ملک سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ فیکٹری کی زمین اور بنگلہ بھی فروخت کر دوں گا۔ ان کے بھی مجھے دو ارب روپے مل جائیں گے۔ سو ارب روپے کافی ہوں گے اور میں بغیر کچھ کیے عیش سے زندگی گزاروں گا۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے مہر کے رخسار کی طرف منہ کیا تو اس نے نفرت سے چہرہ پیچھے کر لیا۔ ظفریاب نے شانے اچکائے۔ ”مرضی تمہاری۔“

مہر کمزور عورت تھی لیکن اگر اس وقت اس کے ہاتھ آزاد ہوتے تو وہ ظفریاب کو قتل کرنے کی کوشش ضرور کرتی۔ وہ اب کامی کا معائنہ کر رہا تھا۔ اسے بغور دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر جانے سے پہلے اس نے مہر کی طرف دیکھا، مسکرایا اور باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے اندر سے بٹن دبا دیا تھا۔ اب باہر سے چابی کے بغیر اسے نہیں کھول سکتا تھا اور چابی یقیناً مہر کے پرس میں تھی۔ اس کے جاتے ہی مہر کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کس صورت حال سے دوچار ہے۔ سامنے لگی گھڑی میں ابھی بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ ملازمین بارہ بجے آتے اور اس کے بعد صرف ایک گھنٹا رہ جاتا۔ اسے، کامی اور ڈیڑھ سو بے گناہ افراد کی جان بچانے کے لیے جو کرنا تھا، اسی دوران میں کرنا تھا۔

لیکن یوں بے بسی کی حالت میں بندھے ہوئے وہ کیا کر سکتی تھی؟ ظفریاب نے اس کے لیے کوئی موقع نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے پورا خیال رکھا تھا کہ مہر خود کو کسی طرح آزاد نہ کرا سکے کیونکہ وہ خود کو آزاد کرا لیتی تو ظفریاب کا پورا منصوبہ ہی ناکام ہو جاتا۔ اس کے ہاتھوں، پیروں اور منہ پر بندھا ٹیپ نہایت مضبوط تھا۔ اسے زور لگا کر کھولنا تقریباً ناممکن تھا۔ ہاں

کوئی نکیلی یا دھار والی چیز مل جاتی تو وہ ٹیپ کاٹ سکتی تھی لیکن جہاں وہ کھڑی تھی، وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی کمر پر لکڑی کا چینل تھا اور چوٹی اتنی بلندی پر بندھی تھی کہ اس کے ہاتھ آزاد ہو جاتے، تب بھی وہ کسی چیز پر چڑھے بغیر چوٹی نہیں کھول سکتی تھی۔ اس نے سر جھکا کر اندازہ کرنا چاہا کہ چوٹی کتنی مضبوطی سے بندھی ہے لیکن جھٹکے اور اس سے ہونے والی تکلیف نے اسے سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ظفریاب نے چوٹی اس طرح باندھی تھی کہ اس کے کھلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ مہر کی نظر گھڑی پر مرکوز تھی۔ بارہ بجنے والے تھے اور اسے امید تھی کہ دفتر میں آنے والے شاید اس طرف بھی آئیں، تب وہ انہیں متوجہ کرنے کے لیے کچھ کر سکتی تھی۔ گھڑی نے جیسے ہی بارہ بجائے، مہر کے کان دفتر سے باہر متوقع آہٹوں پر مرکوز ہو گئے۔ مگر یہاں سناٹا ہی طاری رہا۔ کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ دفتر میں لوگ آچکے تھے۔ تب مہر کو خیال آیا کہ یہ جگہ ائرکنڈیشنڈ ہے اور تقریباً ساؤنڈ پروف بھی ہوگی اس لیے نہ یہاں کی آواز باہر جائے گی اور نہ باہر کی آواز یہاں آئے گی، جب تک کہ وہ آواز بہت بلند نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اب اگر وہ لوگ آ بھی گئے اور وہ کوشش کر کے کوئی آواز بھی پیدا کر لے تو وہ ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مہر احساسِ بے بسی سے رو دی۔

موت اس کے سر پر تھی اور اس کا بیٹا اس کے قدموں میں بے ہوش پڑا تھا لیکن وہ اسے اور خود کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایسی بے بسی کی کیفیت میں انسان کو اللہ یاد آتا ہے۔ مہر کو بھی یاد آیا۔ وہ گڑگڑائی۔ ”یا اللہ! مجھ پر اور میرے بچے پر رحم ... ہمیں اس اذیت ناک موت سے بچا... ظفریاب کو ناکام بنا... وہ تیرے اتنے بندوں کی جان لینا چاہتا ہے... صرف دولت کی خاطر... ہمیں اس سے بچا...“ دل ہی دل میں دعا کرتی ہوئی مہر شدت سے رو دی۔

سوا بارہ بجنے والے تھے اب صرف پون گھنٹا رہ گیا تھا۔ مہر نے ایک بار ہمت کر کے ہاتھوں کو زور لگا کر خود کو آزاد کرانا چاہا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ چوٹی بھی مضبوطی سے بندھی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی طرح خود کو آزاد نہیں کر سکتی تھی جب تک اسے کہیں سے مدد نہ ملتی... اور یہاں مدد ملنے کے بھی آثار نہیں تھے۔ فیکٹری میں لوگ آچکے تھے۔ وہ بے خبر تھے کہ اسی فیکٹری میں موت خاموشی سے ان کی گھات میں بیٹھی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ فیکٹری کی

مالکن اپنے بیٹے کے ساتھ ان سے بھی زیادہ بے بسی کی حالت میں ہے۔ وہ آزاد تھے اور بے خبری کے باوجود لگنے والی آگ سے بچ سکتے تھے لیکن دو افراد اندر بے بس بندھے پڑے تھے۔ وہ جانتے تھے لیکن ان کے بچنے کی کوئی راہ نہیں تھی۔

مہر مایوس ہو کر پیچھے ہوئی اور دیوار سے زور سے ٹیک لگائی تو کوئی چیز اس کی کلائی میں چبھی۔ یہ اتنی زور سے چبھی تھی کہ وہ باقاعدہ اچھل پڑی۔ شاید کلائی سے خون نکل پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ ذرا اوپر کر کے اس جگہ کو ٹٹولا اور جلد اس نے لکڑی کے چینل سے نکلی کیل کی نوک تلاش کر لی۔ یہ بہت معمولی سی نکلی ہوئی تھی، شاید کام کے دوران یہ لکڑی میں رہ گئی تھی اور کارپینٹر کو اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ یا پھر یہ غلطی سے رہ گئی تھی اور معمولی سی باہر ہونے کی وجہ سے کسی کی نظر بھی نہیں گئی تھی۔ ہاں، کوئی لکڑی پر ہاتھ پھیرتا تو اسے کیل کی نوک محسوس ہوتی۔ یہ اندر کی طرف سے لگائی گئی تھی۔ چینل کو بے داغ جوڑنے کے لیے بغیر سرے والی کیل استعمال کی گئی تھی، یہ اس کا سرا بھی ہو سکتا تھا۔

اس دریافت سے مہر کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اس نے کیل کی نوک پر ہاتھ کا ٹیپ پھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ نوک تک پہنچ ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ٹیپ بالکل چینل کے ساتھ چپک جاتا، تب ہی وہ اس کیل سے رگڑ کھا سکتا تھا لیکن وہ جس طرح بندھی تھی، اس میں ٹیپ چینل سے پوری طرح نہیں چپک پا رہا تھا۔ کئی ناکام کوششوں کے بعد وہ ہانپنے لگی۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اسے کلائیاں اوپر کرنا پڑ رہی تھیں اور دیوار سے لگانے کے لیے بڑا عجیب زاویہ بنانا پڑ رہا تھا۔ کیل کی نوک شاید ایک دو ملی میٹر سے زیادہ باہر نہیں تھی۔ مہر نے دوبارہ کوشش کی لیکن اس بار بھی ٹیپ نوک تک نہیں پہنچ سکا۔ چند منٹ بعد وہ پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔ بند کمرے میں اے سی بھی بند تھا اور اتنی دیر میں یہاں حبس ہو گیا تھا۔ ذرا سی محنت سے پسینا آجاتا بلکہ اب تو بغیر محنت کے بھی پسینا آ رہا تھا۔

مہر نے جھنجلا کر دیوار پر پشت ماری۔ لکڑی کا پتلا چینل تھا۔ اس نے دوبارہ کیل کی نوک ٹٹولی تو وہ اسے کسی قدر زیادہ باہر محسوس ہوئی۔ شاید اس کے ٹکرانے سے کیل مزید باہر نکل آئی تھی۔ مہر نے ایک بار پھر پوری قوت سے جسم چینل سے ٹکرایا۔ اسے چوٹ آئی لیکن وہ اس کی پروا کیے بغیر مسلسل جسم کو چینل سے ٹکراتی رہی۔ حتیٰ کہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ بہرحال ایک نرم و نازک عورت تھی۔ اس کی پشت

رکھے گئی تھی۔ اس نے ہانپتے ہوئے کیل ٹٹولی اور اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کیل سب چار پانچ ملی میٹر باہر نکلی ہوئی تھی اور اب اس سے ٹیپ کاٹنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ ایک بار ٹیپ کٹ جاتا تو اس کے ہاتھ آزاد ہو جاتے اور پھر وہ اپنی چوٹی بھی آزاد کرا سکتی تھی۔

اس نے کوشش کر کے ہاتھ اوپر کیا اور کلائیوں کے درمیان والا ٹیپ نوک پر رگڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ اب بھی ٹیپ مشکل سے نوک سے لگ رہا تھا مگر اب لگ رہا تھا۔ کیل کی نوکیلی نوک اس پر رگڑ کھا رہی تھی۔ ایک بار یہ کہیں سے پھٹ جاتا تو اس کے بعد کام آسان تھا مگر اس مضبوط ٹیپ کو کہیں سے پھاڑنا بھی آسان نہیں تھا۔ مہر کوشش کرتی رہی اور جب تھک جاتی تو چند لمحے کے لیے ستانے لگتی۔ اس کی نظر گھڑی پر مرکوز تھی۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ اب صرف آدھا گھنٹا رہ گیا تھا لیکن اسے ظفریاب کی بات کا یقین نہیں تھا۔ وہ نہایت عیار اور دھوکے باز نکلا تھا۔ ایسے شخص کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا، اس نے وقت کے بارے میں بھی جھوٹ بولا ہو۔ آگ لگانے والے بم وقت سے پہلے پھٹ جاتے تو اس کی کوشش رائیگاں جاتی اس لیے وہ پسینے میں تربتر اور سانس پھولنے کے باوجود کوشش کیے جا رہی تھی۔

بالآخر اسے ٹیپ کہیں سے پھٹتا ہوا محسوس ہوا کیونکہ کلائی پر اس کی گرفت کمزور ہوئی تھی۔ وہ دیکھ نہیں سکتی تھی کہ ٹیپ کہاں سے پھٹا ہے، بس محسوس کر سکتی تھی۔ اس کامیابی نے اس کا حوصلہ دوچند کر دیا۔ وہ زیادہ زور لگا کر ٹیپ کو کیل کی نوک پر رگڑنے لگی۔ ظفریاب نے اس کی کلائیوں کے گرد اسے شاید درجن بار لپیٹا تھا تاکہ وہ کسی صورت اسے نہ کھول سکے۔ اسی وجہ سے پھٹنے میں دیر لگ رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیوں کو جیسے پر لگ گئے تھے اور وہ اڑی جا رہی تھیں۔ اب ایک بجنے میں بیس منٹ رہ گئے تھے۔ مہر دیوانہ وار ہاتھ رگڑنے لگی اور اب اسے کلائی کے زخمی ہونے کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ کیل جہاں اس کی کھال پر لگتی، ایک کھرونچ چھوڑ جاتی تھی اور کئی جگہوں پر باقاعدہ زخم بن گئے تھے جن سے خون رس کر پسینے میں مل رہا تھا اور پسینہ زخموں پر لگتا تو ان میں مرچیں سی لگ جاتی تھیں۔

اچانک اسے جھٹکا لگا۔ وہ آگے آئی۔ دراصل ٹیپ نصف سے قریب پھٹ گیا تھا اور اس کا ایک ہاتھ تقریباً آزاد ہو گیا تھا اور زور آزمائی کرتے ہوئے اچانک گرفت ڈھیلی ہوئی تو اسے جھٹکا لگا۔ اگر اس کی چوٹی اوپر نہ بندھی ہوتی تو وہ منہ کے بل نیچے گرتی۔ جھٹکے سے اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے اور اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے کوشش کر کے آزاد ہو جانے والا ہاتھ پھنسے ہوئے ٹیپ سے نکالا اور پھر ہاتھ سامنے لاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بندھا ٹیپ بھی اتار پھینکا۔ منہ سے ٹیپ اتارتے ہی اس نے گہری سانس لی اور پھر چلائی۔ ”کوئی ہے... ہم یہاں قید ہیں۔“

آواز بڑی کمزور سی نکلی تھی۔ اس کا گلا بری طرح خشک ہو رہا تھا اور نکلنے والی آواز کھرکھراتی ہوئی تھی۔ مہر نے گلا تر کیا اور دوبارہ چلائی۔ اس بار آواز بلند تھی۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ اوپر کر کے چوٹی کو آزاد کرانا چاہا لیکن وہ اس کے ہاتھ کی حد سے باہر تھی۔ مہر کو اپنے لمبے اور گھنے بال بہت پسند تھے اور وہ ان پر جان دیتی تھی لیکن اس موقع پر اس کے لیے بال مصیبت بن گئے تھے ورنہ ظفریاب کو اس کی چوٹی باندھنے کا موقع نہ ملتا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چوٹی تھام کر زور لگایا مگر وہ جس کھونٹی میں بندھی تھی، وہ بہت مضبوطی سے دیوار میں گڑی ہوئی تھی اور اس کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب یا تو وہ کسی طریقے سے کھونٹی تک جاتی لیکن آس پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس پر کھڑے ہو کر وہ کھونٹی تک پہنچتی۔ اسی وجہ سے وہ اچھل کر بال نہیں کھول سکتی تھی۔ پہلے چوٹی آزاد کرانا ضروری تھا۔

گھڑی کی سوئیاں پونے ایک تک پہنچ گئی تھیں۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ مہر نے چوٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور لگایا اور جب اس طرح بھی چوٹی نہیں نکلی تو وہ چوٹی کے بل لٹک گئی۔ اب اس کا سارا وزن اس کے بالوں پر آ رہا تھا۔ درد کی [illegible] بال اس کے ہاتھوں سے پھسلنے لگے اور جب مہر [illegible] آیا تو وہ پاؤں فرش پر لگانے پر مجبور ہو گئی۔ اس دوران میں وہ وقفے وقفے سے مدد کے لیے بھی پکار رہی تھی لیکن ابھی تک اس کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ صاف ظاہر تھا، اس ساؤنڈ پروف کمرے سے اس کی آواز باہر نہیں جا پا رہی تھی۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ خود کو آزاد کرا کے اپنی اور کامی کی مدد آپ کرے۔ چوٹی مضبوطی سے تھام کر وہ دوبارہ لٹکی تو جھٹکے سے ہی کھونٹی سے بندھا چوٹی کا آخری حصہ ٹوٹ گیا اور وہ دھڑام سے نیچے گری۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔

اسے چوٹ آئی تھی لیکن آزاد ہونے کی خوشی میں وہ چوٹ بھول گئی۔ اس نے جلدی سے پاؤں سے ٹیپ کھولا اور کامی کی طرف لپکی۔ اسے جھنجوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کی بے ہوشی گہری تھی، جھنجوڑنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ایک بجنے میں اب دس منٹ رہ گئے تھے۔ وہ کامی کو چھوڑ

کر دروازے کی طرف لپکی۔ اندر سے لاک تھا، گھماتے ہی لاک کھل گیا اور دروازہ بھی کھل گیا۔ سامنے وہ چھوٹا سا ہال تھا جس میں ظفریاب کا ذاتی اسٹاف بیٹھتا تھا لیکن اب وہاں کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ ظفریاب بھی کم یہاں آتا تھا۔ وہ کامی کو گھسیٹ کر ہال تک لائی۔ چند مہینوں میں اس کا وزن خاصا بڑھ گیا تھا۔ اس نے ہال والا دروازہ کھولا تو سامنے راہداری میں ایک بائیں کمرے تھے جن میں فیکٹری کا کلریکل اسٹاف بیٹھتا تھا۔ مہر چلائی۔

”کوئی ہے یہاں...؟“

اس بار اس کی پکار کا جواب ملا اور فوراً ہی کئی مرد باہر نکل آئے۔ ان میں فیکٹری کا منیجر بھی شامل تھا اور وہ مہر کو پہچانتا تھا۔ وہ جلدی سے آگے آیا۔ ”میڈم! آپ یہاں... آپ کب آئیں؟“

”سنو، یہاں فیکٹری میں کچھ دیر بعد بم بلاسٹ ہوں گے اور آگ لگ جائے گی۔“ مہر جلدی جلدی کہنے لگی۔ ”فوراً ہنگامی سائرن بجواؤ تاکہ تمام لوگ فیکٹری سے نکل جائیں۔“

”لیکن میڈم...“ منیجر نے کہنا چاہا۔

”جلدی کرو۔“ مہر چلائی۔ ”بم ایک بجے پھٹ جائیں گے میں اور میرا بیٹا یہاں قید تھے۔ پلیز! کوئی اسے اٹھا کر باہر لے جائے، وہ بے ہوش ہے۔“

بم اور ایک بجے کا سنتے ہی وہاں سراسیمگی پھیل گئی۔ کچھ لوگ تو فوراً ہی باہر نکل گئے۔ منیجر مہر کے ساتھ ہال تک آیا اور جب اس نے بے ہوش کامی کو وہاں دیکھا تو اسے بھی صورت حال کی سنگینی کا یقین آ گیا۔ اس نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔ ”فوراً [illegible] ہنگامی سائرن چلا دو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کامی کو اٹھا کر اپنے شانے پر ڈالا اور باہر کی طرف بڑھا۔ اسی وقت دفتر کی جانب سے ہلکے سے دھماکے کی آواز آئی اور فوراً ہی اس طرف سے شعلے بھڑک اٹھے۔ وہاں لگایا ہوا بم ایک بجنے میں پانچ منٹ پر پھٹ گیا تھا۔ مہر چلائی۔ ”نکلو، جلدی نکلو... سب داخلی دروازوں پر لگے بم [illegible] ہوں گے۔“

اس اعلان نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور سب دفتر سے [illegible] باہر بھاگ رہے تھے۔ منیجر اچھا آدمی تھا۔ اس نے کامی کو اٹھا لیا تھا ورنہ باقی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے۔ گزشتہ چند عرصے میں فیکٹریوں میں آگ لگنے کے واقعات تواتر سے پیش آ رہے تھے اور ان میں جل کر مرنے والوں کی لاشیں ٹی وی اور میڈیا پر دکھائی گئی تھیں کہ لوگوں کو ازبر ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ آگ کا سن کر سب دہشت زدہ ہو گئے اور جلد از جلد اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ اس دوران میں ہنگامی سائرن بجنے لگا اور اس کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ ایک بجنے میں دو منٹ رہ گئے تھے۔ جیسے ہی مہر اور منیجر باہر آئے، گیٹ پر موجود چوکیدار انہیں دیکھتے ہی بھاگا۔ مہر چلائی۔

”اسے مت بھاگنے دینا، یہ بھی سازش میں شامل ہے۔“

منیجر کو کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی، چند افراد فوراً ہی چوکیدار کے پیچھے بھاگے تھے۔ اس دوران میں فیکٹری سے ورکر نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ خود کو اور کامی کو محفوظ پا کر مہر کا حوصلہ لوٹ آیا تھا اور وہ فیکٹری کے داخلی دروازے کے پاس آ گئی۔ وہ اندر رہ جانے والوں کو باہر نکلنے کو کہہ رہی تھی۔ فیکٹری کی مالکن کو دیکھ کر لوگوں کو احساس ہو رہا تھا کہ خطرہ واقعی موجود ہے۔ منیجر کامی کو گیٹ کے پاس کیبن میں لٹا کر واپس آیا اور اس نے مہر سے کہا۔ ”میڈم! یہ سب کیا ہے؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تمام افراد کو باہر نکالیں۔ بم کسی وقت بھی بلاسٹ ہو سکتے ہیں اور فیکٹری میں ایسا کیمیکل موجود ہے جو آگ کو تیزی سے پھیلا دے گا۔ اس کے بعد کسی کو بچ کر نکلنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

منیجر خود ورکرز کو باہر نکالنے لگا۔ نکلنے والوں کو ہدایت تھی کہ وہ فوری طور پر گیٹ سے بھی نکل جائیں۔ دفتر میں لگنے والی آگ کے شعلے اب باہر سے بھی محسوس کیے جا سکتے تھے۔ کھڑکیوں اور روشن دانوں سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ مہر باہر آئی۔ اس نے کامی کو بھی اٹھوایا تھا۔ جیسے ہی وہ گیٹ سے باہر آئے، دفتر کے داخلی دروازے پر موجود بم بھی پھٹ گیا اور اس نے اتنی تیزی سے آگ لگائی کہ چند سیکنڈ کے اندر کسی کا باہر آنا ممکن نہیں رہا۔ اگر کوئی اندر ہوتا تو دردناک موت اس کا مقدر بن جاتی۔ فیکٹری کے اکثر ورکرز بھی باہر آ چکے تھے لیکن ابھی کچھ اندر تھے کہ وہاں نصب بم بھی پھٹ گیا اور آگ ہال میں پھیلنے لگی۔ مہر نے اپنا پرس اٹھا لیا تھا۔ اس میں اس کا موبائل موجود تھا۔ اس نے ایمرجنسی نمبر پر کال کر کے فائر بریگیڈ اور پولیس بھیجنے کو کہا۔ فیکٹری میں آگ لگنے کے بعد اب کسی کا اندر رکنا ممکن نہیں تھا اس لیے جو بھی باہر تھے، وہ گیٹ سے باہر آ گئے۔ منیجر ایک ایک آدمی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ تقریباً ایک درجن افراد اب بھی اندر تھے۔ منیجر مہر کے پاس آیا۔

”میڈم! یہ سب کیا ہے؟“

مہر اسے دوسروں سے دور لے گئی۔ ”یہ سب ظفریاب کی سازش ہے۔ وہ انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے اتنے لوگوں کی جان سے کھیلنا چاہتا تھا۔“

”ظفریاب صاحب؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"صرف تم لوگوں کو نہیں، اس نے مجھے اور میرے بیٹے کو بھی مارنا چاہا۔ اس لیے پہلا بم میرے دفتر میں بلاسٹ ہوا۔ میں مرتی تو وراثت کا مسئلہ ختم ہو جاتا اور میری انشورنس کی رقم بھی اسے ملتی۔ وہ بارہ بجے سے ذرا پہلے یہاں سے نکلا تھا۔ چوکیدار اس کا آدمی ہے، وہ ایک بجے یہاں سے غائب ہو جاتا۔"

چوکیدار کو فیکٹری ورکر پکڑ لائے تھے اور اب اس کی مرمت کر رہے تھے۔ کچھ دیر میں اس نے ہتھیار ڈال دیے اور سچ بتانے لگا۔ یہ سچ سن کر فیکٹری ورکر مشتعل ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ مہر کی طرف آئے لیکن منیجر نے انہیں سمجھایا کہ مہر تو خود اس سازش کا شکار ہونے والی تھی اور یہ اسی کی کوشش تھی کہ وہ سب بچ گئے ورنہ وہ انہیں خبردار نہ کرتی تو وہ مارے جاتے۔ منیجر نے فیکٹری سے اٹھتے شعلوں کی طرف اشارہ کیا۔ "تم سوچ سکتے ہو اس صورتِ حال میں اندر موجود کوئی شخص بچ نہیں سکتا۔ یہ میڈم کی مہربانی ہے۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر ہم سب کو بچایا ہے۔"

اب ورکرز مہر کو شکر گزار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مہر کے ذہن میں ایک خدشہ تھا کہ ظفریاب کے پاس دولت کی طاقت تھی، وہ پولیس کو خرید سکتا تھا اور الٹا دوسروں کو اس کیس میں پھنسا سکتا تھا۔ مہر نے ہیلپ لائن پر کال کر کے مختلف ٹی وی چینلز کے نمبرز لیے اور باری باری انہیں کال کرنے لگی۔ میڈیا کے لوگوں سے پہلے فائر بریگیڈ اور پولیس والے آگئے۔ ایک ایمبولینس بھی آئی تھی جس میں کامی کو اسپتال روانہ کیا گیا۔ منیجر پولیس کو لے کر ظفریاب کے ہیڈ آفس کی طرف روانہ ہوا اور مہر کامی کے ساتھ اسپتال گئی۔ اسے یقین تھا کہ اب ظفریاب نہیں بچ سکے گا کیونکہ اس نے اسپتال جانے سے پہلے ظفریاب کی سازش کی تفصیل میڈیا کے سامنے بیان کر دی تھی۔

☆☆☆

مگر ظفریاب اتنی آسانی سے نہیں پکڑا گیا۔ مہر کے خدشے کے عین مطابق اس نے پولیس کو خرید لیا تھا اور پولیس نے اس کے خلاف سازش اور ایک درجن افراد کو قتل کرنے کا مقدمہ درج کرنے سے گریز کیا۔ مگر ظفریاب کی بدقسمتی تھی کہ فیکٹری میں مارے جانے والے ایک درجن ورکرز کے گھر والوں نے مل کر اس کے خلاف مقدمہ کر دیا اور پھر ہائی کورٹ نے ایکشن لے کر کیس کی سماعت شروع کر دی۔ مہر، مسز داؤد کے پاس تھی اور انہوں نے اس کی پوری مدد کی۔ جیسے ہی ظفریاب عدالت کی گرفت میں آیا، مہر بھی اس کے خلاف میدان میں آگئی۔ مہر کی وجہ سے سازش منظرِ عام پر آگئی تھی اور انشورنس کمپنی نے ادائیگی سے انکار کر دیا تھا۔ مہر نے عدالت میں ظفریاب کی دولت اور جائداد میں اپنے حصے اور اس سے طلاق کا مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ اسے شریک بنا کر ظفریاب خود پھنس گیا تھا اور چند ہی پیشیوں میں صورتِ حال واضح طور پر اس کے خلاف جانے لگی۔ جانب دار پولیس کی رپورٹ مسترد کرتے ہوئے جج نے ایک قابل اور نیک پولیس افسر کو اس کیس کی تفتیش کا حکم دیا جس نے ایک ہفتے میں متعدد ثبوتوں اور چوکیدار کی گواہی کے ساتھ عدالت میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

تین مہینے بعد عدالت نے مہر کے حق میں خلع اور ظفریاب کی دولت و جائداد کی تقسیم کا فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے کی رو سے ایک کسٹوڈین مقرر کیا گیا جو دولت اور جائداد کی تقسیم کا فیصلہ کرتا۔ اس نے بنگلا اور ہیڈ آفس کی جگہ مہر کے نام منتقل کر دی۔ فیکٹری کی عمارت جو اصل میں اب صرف پلاٹ رہ گیا تھا، وہ ظفریاب کے حصے میں آگئی۔ نقد رقوم اور دوسری فوری کیش ہو جانے والی چیزوں میں مہر کو تقریباً بیس لاکھ روپے ملے تھے۔ اس نے بنگلا اور ہیڈ آفس والی جگہ فروخت کر دی اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سے اس نے کی ڈی اے میں ایک چھوٹی دو منزلہ کوٹھی لے لی۔ یہاں سے کامی کا اسکول بھی پاس تھا۔ اس نے کامی کو اسی اسکول میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اوپر والی منزل اس نے سیما کو کرائے پر دے دی۔ کرایہ مارکیٹ سے خاصا کم تھا اور مہر کا اصل مقصد تو اپنی تنہائی دور کرنا تھا۔ ظفریاب کی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی بھی اسے ملی تھی۔ باقی رقم اس نے ڈپازٹ کرا دی جہاں سے اسے ہر مہینے اتنی رقم مل جاتی تھی جو اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔

ظفریاب پر اب دہشت گردی ایکٹ کے تحت مقدمہ چل رہا تھا۔ اگرچہ اس کے وکیل اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن صاف لگ رہا تھا کہ ایک درجن بے گناہ افراد کا خون بالآخر رنگ لائے گا اور ظفریاب کو سزائے موت نہ بھی ہوئی تو اسے زندگی بھر جیل سے باہر آنا نصیب نہیں ہوگا۔ مہر کو اس سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی زندگی میں بدقسمتی کا کوئی دور نہیں آئے گا۔ قدرت اس پر مہربان تھی ورنہ وہ اس خوفناک سازش سے کیسے بچ پاتی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ کوئی سہارا تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرے گی بلکہ اپنے بازو پر بھروسا کرے گی اور کامی کو اس مقام پر پہنچائے گی جہاں وہ اس کا سہارا بن سکے۔ اس کا بھیانک خواب ختم ہو گیا تھا اور روشن صبح طلوع ہو گئی تھی۔

کوئی ایک بات... یا فقرہ جی کا جنجال بن جائے تو پھر اس سے نجات کا کوئی نہ کوئی طریقہ تلاش... کرنا پڑتا ہے... وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے نالاں تھے... اور ہر بات ایک دوسرے کی مخالفت میں کرتے تھے... زندگی کے لیے مصیبت و آلام بن جانے والے افراد سے فرار حاصل کرنے کا انوکھا طریقہ دریافت کرنے والوں کی کتھا...

راہِ نجات

سلیم انور
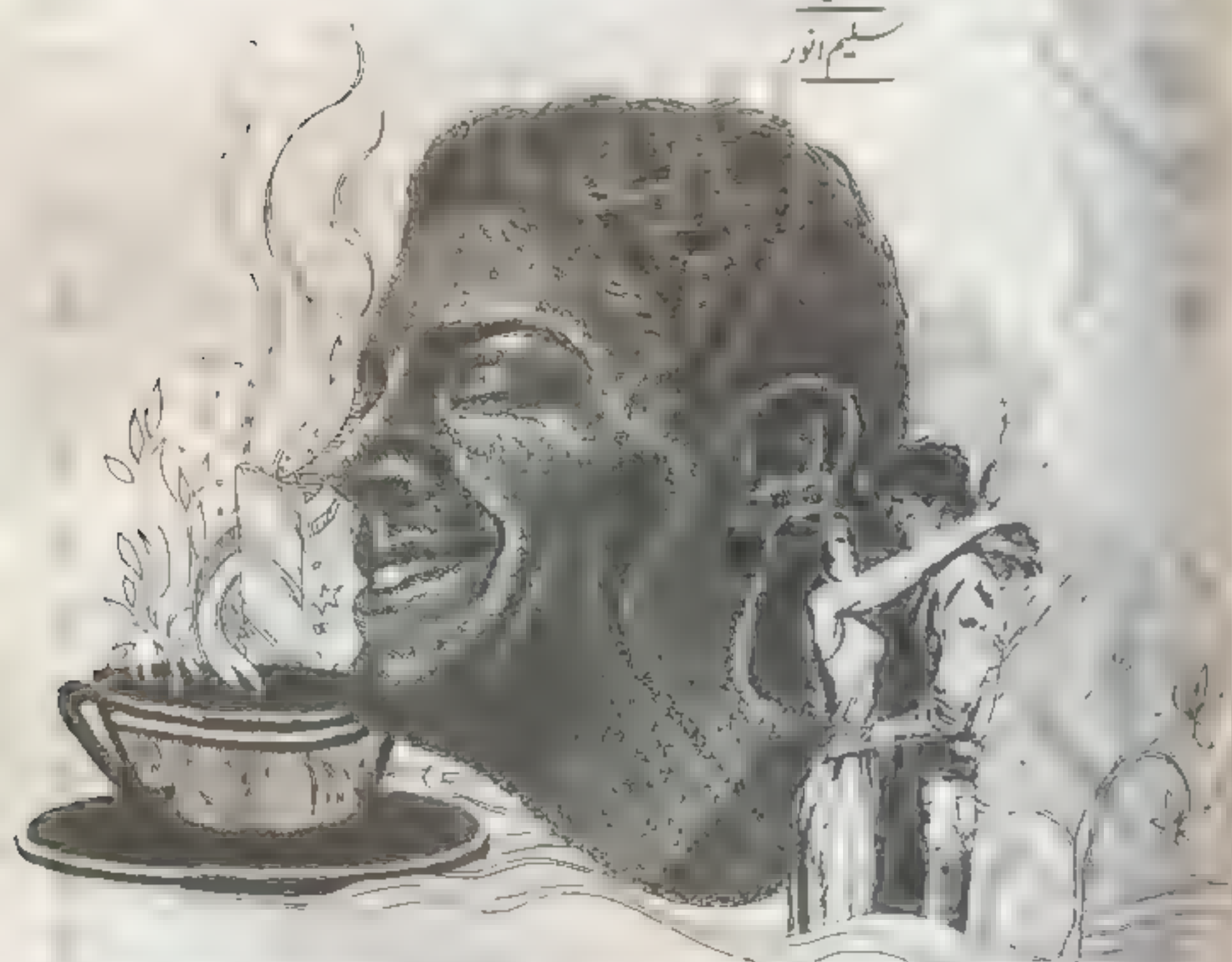
ڈاکٹر بنجامن تیز تیز قدم اٹھاتا گھر میں داخل ہوا اور اپنی بیوی کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس نے اپنا بیگ اور ہیٹ کرسی پر رکھ دیا اور سیدھا اس الماری کی طرف چلا گیا جس میں شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔

آج کل ان کے درمیان جھڑپیں روز کا معمول بن چکی تھیں۔ یہ چپقلش گزشتہ کئی دنوں سے جاری تھی۔ اس تکرار میں کبھی بھی اس کی فتح نہیں ہوتی تھی اور اکثر اسے ہی پسپا ہونا

پڑتا تھا۔

"لیکن اب ایسا نہیں ہوگا..." اس نے دل ہی دل میں تہیہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ زندگیاں بچانے کا عادی تھا، زندگیاں لینے کا نہیں لیکن ان چند لمحات میں جب وہ گھر میں داخل ہوا تھا، اس نے ایک حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔

بنجامن کو اپنی بیوی کی گول چھوٹی چمکیلی آنکھیں اپنی کھوپڑی کی پشت میں کسی تیر کے مانند چبھتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ اس کا غصہ اس کے وجود کے گرد اس طرح منڈلا رہا تھا جیسے کنارے پر بلند ہوتی موجوں کا وزن ہوتا ہے۔ وہ ان لہروں کے کنارے پر ٹکرانے کا شور اور بجلی کے کوندے کی کڑک پہلے سے محسوس کررہا تھا۔

لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنی بیوی کو اپنی کوفت سے سرشار ہونے کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا... کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک وہ اپنے لیے وسکی اور سوڈے کا جام تیار کرکے حلق سے نیچے نہ انڈیل لے۔

اور پھر اس کے بعد ہی وہ اپنی بیوی کی جانب پلٹا جو اب اس کے عقب میں ایک صوفے کے ہتھے پر کمر ٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ "خدا کے لیے روزیلی۔" وہ غرایا۔ "کاش تمہارے اندر اتنی شائستگی ہوتی کہ اپنی تکرار شروع کرنے سے پہلے مجھے گھر میں اندر قدم رکھنے تو دیتیں۔"

"اگر تم اتنے ہی احساس کرنے اور خیال رکھنے والے ہوتے تو شاید میرے پاس اس کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ تم ہمیشہ دیر سے گھر واپس آتے ہو اور تمہیں پتا ہے کہ مجھے اکیلے پن سے کتنی نفرت ہے۔" روزیلی نے بحث شروع کرتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ وجہ نہیں ہوتی تو تم کسی اور وجہ سے اپنا دکھڑا بیان کرنا شروع کردیتیں۔" بنجامن نے دل ہی دل میں کہا۔

"تمہیں اس بات کا کوئی خیال نہیں کہ یہاں دن بھر اکیلے رہنے سے میں کتنی تنہائی محسوس کرتی ہوں اور کتنی بور ہوتی ہوں۔" وہ اسی طرح شروع ہوگئی جیسے اس نے بنجامن کا ذہن پڑھ لیا ہو۔ "میرے پاس یہاں معروفیت کی کوئی چیز نہیں ہے اور تم بھی مجھے کبھی کہیں نہیں لے جاتے۔"

"میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میرے پاس مریض ہوتے ہیں۔ میں کسی ٹائم کلاک میں کارڈ پنچ نہیں کرتا کہ ایک طے کردہ مقررہ وقت پر چھٹی کرلوں۔ جب تک تمام مریضوں کے معائنے سے فارغ نہ ہوجاؤں، میں اٹھ نہیں سکتا۔" بنجامن نے کہا۔

"کاش تمہیں میری اتنی ہی پروا ہوتی جتنی کہ تم اپنے مریضوں کی پروا کرتے ہو..."

ملامت، ملامت، ملامت۔

بنجامن نے اپنے لیے ایک اور جام تیار کیا۔ وہ مشروب کے گھونٹ لینے کے ساتھ ساتھ چوری چھپے اپنی بیوی کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ وہ حیران ہورہا تھا کہ کس طرح اس دکھڑا رونے والی بدزبان عورت نے اسے شادی کی بھیانک غلطی کی ترغیب دے کر اسے رضامند کرلیا تھا؟

روزیلی ایک مریضہ کی حیثیت سے اس کے پاس آئی تھی۔ وہ ہائپر ٹینشن کا شکار تھی۔ بنجامن کو اب اس بات کا احساس ہوا تھا کہ یہ اس کی بدمزاج فطرت کی علامات تھیں جس نے اسے ہائپر ٹینشن کی مریضہ بنادیا تھا۔

بنجامن کو اس کی تنہائی اور بیوگی کی فریاد سن کر اس سے ہمدردی ہوگئی اور اپنی سادگی اور بھولپن میں وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ کیونکہ وہ خود بھی کنوارہ تھا اسی لیے روزیلی کی طرح اسے بھی اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔

اس قیاس کردہ مشترکہ کمی کو غلط سمجھتے ہوئے وہ یہی سمجھا تھا کہ وہ اس کے لیے تسکین قلب کا باعث رہے گی، اسے سپورٹ کرے گی، اس کی دلچسپیوں میں اس کا ساتھ دے گی اور اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھردے گی۔

اس کے بجائے اس نے خود کو ایک ایسے فرد کے ساتھ بندھن میں جکڑا ہوا پایا جو نہ صرف اس کے امن و سکون کو برباد کرنے کا باعث بنی ہوئی تھی بلکہ جس کے خلاف اس کی نفرت بھی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔

"میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں چاہتی۔" وہ اب یہ کہہ رہی تھی۔

"نہ ہی میں چاہتا ہوں۔"

"اگر ہم شہر میں ہی رہ رہے ہوتے..." بنجامن نے ایک سرد آہ بھری۔

اگر وہ شہر میں رہ رہے ہوتے تو وہ اب تک دیوالیہ ہوچکا ہوتا۔ وہ پیسہ اتنی ہی تیزی سے خرچ کرتی تھی جتنی تیزی سے وہ کماتا تھا۔ اس کی اپنی پریکٹس شہر سے دیہی علاقے میں منتقل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی... وہ اسے شاپنگ مالز سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

بنجامن کو یہاں رہنے سے عشق تھا۔ یہاں زندگی کی رفتار زیادہ پرسکون تھی۔ یہاں اسے چہل قدمی کرنے، پرندوں کو دیکھنے اور ان کی چہچہاہٹ سننے، باغبانی کرنے اور اس خوب صورت قدیم گھر کی تعمیر نو کرنے کا وقت مل جاتا تھا۔

لیکن روزیلی کو ان تمام چیزوں سے نفرت تھی۔

ایک بار بنجامن نے طلاق کا موضوع چھیڑ دیا تھا پھر کیا تھا۔ یوں ہوا جیسے کسی طوفان کو ہوا مل گئی ہو۔ یہ ہلچل کئی دنوں تک جاری رہی۔ وہ بار بار اسی دھمکی کو دہرایا کرتی تھی کہ اگر اس نے اسے طلاق دینے کی احمقانہ کوشش کی تو وہ اسے پائی پائی کو محتاج کردے گی۔

غیر شعوری طور پر ڈاکٹر بنجامن کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں چلا گیا۔ اس کی انگلیاں اس چھوٹی سی شیشی سے ٹکرائیں جو اس کی جیب میں پڑی ہوئی تھی۔

اسے تاسف تو ضرور تھا لیکن نجات حاصل کرنے کا اسے دوسرا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے مسئلے کا ایک حل تلاش کرلیا ہے۔" روزیلی نے کہا۔

"ہوں۔"

"ایک ایسا حل جو ہم دونوں کے لیے ایک بار پھر خوشی کا باعث ہوگا۔"

"کیا کبھی ہم خوش بھی رہے ہیں..." بنجامن نے اپنے آپ سے کہا۔

روزیلی مسکرانے لگی۔ اس کی یہ مسکراہٹ اس مگرمچھ کی مسکراہٹ کی طرح تھی جو اپنے شکار کو اپنے جبڑوں میں جکڑنے کی تیاری کررہا ہو۔ "تم نے کھانا تو نہیں کھایا، ہے نا؟"

"نہیں، یقیناً نہیں۔"

"ڈائننگ روم میں آجاؤ۔ میں نے تمہارے لیے گرم ڈنر تیار رکھا ہوا ہے۔ جب تم کھا رہے ہوگے تو میں تمہیں اپنا سرپرائز بتاؤں گی۔" روزیلی نے کہا۔

بنجامن اس کے پیچھے چلتا ہوا ڈائننگ روم میں آگیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ کب آخری بار روزیلی نے اس کے لیے اس طرح کھانا تیار رکھا تھا۔

کھانا میز پر چنا ہوا تھا۔ ساتھ ہی میں سلاد بھی رکھا ہوا تھا۔ روزیلی اسے کھانا کھانے کی تلقین کرتے ہوئے برابر کچن میں غائب ہوگئی۔

بنجامن کو زوردار بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً ہی سلاد

پر ٹوٹ پڑا۔ کچن کی جانب سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور اوون کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی ترغیب دلانے والی خفیف سی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

اتنے میں روزیلی کچن سے آکر اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ ''بس چند منٹ اور لگیں گے۔'' اس نے کہا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' بنجامن نے پوچھا۔ ''تم کس کام میں لگی ہوئی ہو؟''

''ویل، اگر تم جاننا چاہتے ہو...'' روزیلی نے اپنی چھوٹی سی چٹیا کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پاس شہر واپس جانے کا ایک اچھا موقع ہے۔'' پھر وہ جھک کر بوسا کور نقش ہوئی جیسے کسی چھوٹی بچی کو اس کا کوئی پسندیدہ تحفہ مل گیا ہو۔

''ہوں؟''

''میں تمہیں فی الوقت کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی، بعد میں بتاتی لیکن تم اتنے بے صبرے ہو رہے ہو اور میں بھی اب اس بات کو خود تک محدود نہیں رکھنا چاہتی۔ میں نے اس سپتال میں فون کیا تھا جہاں تم کام کیا کرتے تھے۔ وہاں اسٹاف کے لیے گنجائش نکل آئی ہے۔ اسپتال کے انچارج ڈاکٹر لیڈ بیٹر کا کہنا ہے کہ اگر تم انہیں فون کر لو تو وہ پوسٹ تمہارے لیے مختص کر دی جائے گی۔''

بنجامن دانت پیس کر رہ گیا اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ لیکن روزیلی اس کی اس کیفیت پر توجہ نہ دے سکی کیونکہ وہ دوبارہ تیزی سے کچن میں جا چکی تھی۔

روزیلی نے اسے جو ڈش سرو کی تھی، وہ کوئی اسپینش ریسیپی تھی جو اس نے خدا جانے کہاں سے سیکھی تھی۔ اس ڈش کے اجزا میں بچھڑے کا گوشت، ابلے ہوئے انڈے، زیتون، کالی مرچ اور رس دار ناشپاتی کا گودا شامل تھے۔ اسے شبہ تھا کہ شاید اور جنگل ڈش میں ہنجنا کی جڑ بطور گارنش شامل تھی یا نہیں لیکن اسے یہ ڈش بے حد پسند تھی اور اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اسپین کے باشندے اس ڈش کی گارنشنگ کے لیے کیا استعمال کرتے تھے۔

بنجامن چٹخارے لیتے ہوئے یہ ڈش کھانے میں مگن رہا۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

جب روزیلی نے پہلی بار یہ ڈش بنائی تھی تو بنجامن نے اسے بھرپور داد دی تھی۔ اسے یہ ڈش حد سے زیادہ پسند آئی تھی۔ پہلے روزیلی نے یہ ڈش اس سے قبل صرف چند مرتبہ بنائی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس ڈش کی تیاری میں خاصا وقت لگتا ہے۔

آج روزیلی کا اس ڈش کو تیار کرنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ حقیقت میں شہر واپس جانا چاہتی ہے... بنجامن نے سوچا۔

ویل، وہ اس کی یہ رشوت تو قبول کر رہا ہے لیکن وہ اس کی خواہش کے سامنے سر تسلیم ہرگز نہیں کرے گا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

''تم نہیں کھا رہیں؟'' بنجامن نے پوچھا۔

''میں نے کھانا پہلے ہی کھا لیا تھا۔ میں بس ایک کپ چائے پیوں گی۔ میں نے پانی رکھ دیا تھا جو ابل رہا ہوگا۔'' روزیلی نے جواب دیا۔

بنجامن نے کھانے کی چھری اور کانٹا واپس پلیٹ میں رکھ دیے۔ وہ اپنے ارادے کو ملتوی نہیں کرنا چاہتا تھا اور اب اسے یہ موقع مل رہا تھا۔

''میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں، روزی۔ پھر تم مجھے بتانا کہ ڈاکٹر لیڈ بیٹر نے مزید اور کیا کہا تھا۔ اس دوران میں یہ لذیذ ڈش کھاتا بھی جاؤں گا۔''

''اوہ!'' روزیلی کے ہونٹ خوشی سے کھل پڑے اور وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم نے برسوں کے بعد مجھے روزی کہہ کر پکارا ہے۔''

''ویل، ہم دونوں معاملات کو واپس اسی جگہ لے جانا چاہتے ہیں جہاں بھی وہ ہوا کرتے تھے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟'' بنجامن نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کچن میں پہنچ کر اس نے وہ چھوٹی شیشی جیب سے نکالی جو وہ ہفتوں سے اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ یہ چھوٹی سی شیشی اس کے پرابلم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیتی۔ اسے استعمال کرنے کی شدید خواہش رہی تھی لیکن وہ ہمیشہ تذبذب میں رہ جاتا تھا۔

لیکن اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اب اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ روزیلی اب حد سے بہت زیادہ آگے نکل چکی تھی۔

پھر بنجامن نے یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں اس کا ارادہ بدل نہ جائے، تیزی کے ساتھ چائے کی کیتلی میں قلب کے عضلات کو مہمیز کر دینے والی دوا ڈیجیٹلو کی چند گرام کی مقدار شامل کر دی جو حرکتِ قلب بند کر دینے کے لیے کافی تھی۔ یہ مہلک چائے پینے کے بعد روزیلی کو زیادہ تکلیف نہیں ہوتی اور خود بنجامن کا درد بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رفع

ہو جاتا۔

بنجامن نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے پہلے ہی گاؤں میں بار ہا یہ بات پھیلا دی تھی کہ روزیلی کی صحت ٹھیک نہیں رہتی اور اس کا دل کمزور ہو چکا ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ بھلا اس کی تشخیص پر کون اس سے پوچھ گچھ کر سکتا تھا؟

بنجامن نے چائے کی کیتلی، دو کپ اور طشتریاں ایک ٹرے میں رکھیں اور ٹرے لے کر واپس ڈائننگ روم میں آ گیا۔

''جلدی کرو۔'' روزیلی نے کہا۔ ''تمہارا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

بنجامن کو اب کوئی فکر نہیں تھی۔ یہ خصوصی ڈش اسے ٹھنڈی ہو کر بھی اتنی اچھی لگتی تھی جتنی کہ گرما گرم۔ اور اب اسے میٹھے کی خواہش بھی ہو رہی تھی۔ وہ تجسس میں تھا کہ روزیلی نے میٹھے میں کیا پکایا ہے۔

لیکن یہ کیا؟ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا۔ اس کے منہ اور حلق میں جلن سی مچ رہی تھی۔ اس کی پسلیوں میں سنسنی سی پھیل گئی اور ہاتھ یوں محسوس ہونے لگے جیسے ان پر فر کے دستانے چڑھے ہوئے ہوں۔ اس کے کھانے کا کانٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ سے ٹکراتا ہوا نیچے گر پڑا۔

بنجامن نے دھیرے دھیرے اپنی نظریں اٹھائیں تو اس کے جسم نے ایک جھرجھری سی لی اور خوف کی ایک سرد لہر پورے وجود میں پھیل گئی۔ روزیلی کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے میز پر آگے کی جانب جھکی اور بولی۔ ''تم نے تو میرا کام بے حد آسان کر دیا۔''

بنجامن نے بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان الفاظ کی تشکیل کرنے سے قاصر رہی۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن اٹھ نہ سکا کیونکہ اس کے جسم پر اس کے دماغ کا کنٹرول بھی دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔

''میں جانتی تھی کہ تم کبھی بھی شہر واپس نہیں جاؤ گے۔'' روزیلی نے اس سے کہا۔ ''اس لیے میں تمہارے بغیر واپس جا رہی ہوں۔''

بنجامن نے اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہی لیکن اس کے کانوں میں روزیلی کی آواز بمشکل ترنم سنائی دے رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے روزیلی اس کے برابر میں موجود ہونے کے بجائے میلوں دور ہو۔

''تم نے حقیقت میں اپنے احمقانہ لیکچروں کی مدد سے مجھے یہ راستہ دکھایا۔'' روزیلی کہہ رہی تھی۔ ''او، تمہارا اتنا وسیع مطالعہ ہے... اور اس کے باوجود تم اتنے احمق ہو۔ یاد ہے جب تم نے اناج کی کوٹھری کے باہر مجھے اس پودے کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا جو وہاں اگا ہوا ہے؟''

میٹھ تیلیا!

بنجامن کو یہ سب معاملہ سمجھنے میں قدرے جدوجہد سے کام لینا پڑا۔ اب اسے احساس ہوا کہ اپنی تباہی کا ذمے دار وہ خود ہی ہے۔

او، تو! اس کی نگاہیں اپنی پلیٹ پر جم گئیں۔ اس نے ہی روزیلی کو یہ بتایا تھا کہ لوگ سینجنا کی جڑ کے دھوکے میں میٹھے تیلیا کی جڑ کو کدوکش کر کے کھا لیتے ہیں جس سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

اکونائن زہر سے بھری اس جڑ کی دو سے چار گرام مقدار ہی ایک مہلک خوراک کا کام کرتی ہے... اور وہ نہ جانے اس جڑ کی کتنی مقدار کھا گیا ہے؟

''میں نے آج سہ پہر خود اس جڑ کو کدوکش کیا تھا۔'' روزیلی کہہ رہی تھی۔ ''میں جانتی تھی کہ تم کتنے بسیار خور اور سینجنا کی جڑ کے کتنے دیوانے ہو۔ میں جانتی تھی کہ تم اس جڑ کو دیوانہ وار کھانے سے خود کو نہیں روک سکو گے۔''

بنجامن نے اٹھنے کی جدوجہد کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی نظر دھندلا رہی تھی۔ جب نظر قدرے صاف ہوئی تو اسے اشیا غلط رنگوں میں دکھائی دینے لگیں۔ درد کی ایک شدید لہر اس کے سر، گردن اور سینے کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔

''اب یہ سب کچھ میرا ہوگا، بنجامن۔'' روزیلی نے کہا۔ اس بات سے قطعی بے پروا کہ وہ اس کی آواز سن سکتا ہے یا نہیں۔ مسکراہٹ بدستور اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ ''میں اس پرانے مکان اور تمہاری پریکٹس کو فروخت کر دوں گی۔ تمہارے بیمے کی رقم وصول کر لوں گی۔ مجھے بہت سی رقم مل جائے گی۔ اس سے بھی کہیں زیادہ جو مجھے اپنے سابقہ شوہر کی طرف سے ملی تھی۔''

بنجامن تیزی سے ڈھلک رہا تھا۔ زہریلی جڑ کا اثر اس کے جسم میں دورانِ خون کو مفلوج کر رہا تھا۔ اس کا ذہن بھی کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے قاصر ہو رہا تھا۔

پھر اس سے قبل کہ اس کا وجود کرسی سے پھسل کر فرش پر ڈھیر ہو جاتا، اسے یہ دیکھ کر قرار آ گیا کہ روزیلی اپنے لیے کپ میں چائے انڈیل رہی تھی۔

[illegible]

قاتل کی تلاش

مریم کے خان

بعض اوقات آنکھوں دیکھی حقیقت پر سب یقین کر لیتے ہیں... پس منظر جانے بغیر انجانے میں وہ کچھ ہوتا چلا جاتا ہے... جس کا خمیازہ فردِ واحد کو نہیں پورے معاشرے کو اٹھانا پڑتا ہے... ایک قاتل اور کئی زندہ انسانوں کی باہمی کشمکش کا سنسنی خیز قصہ... حالات انہیں انوکھے انجام کی جانب لے جا رہے تھے۔

لیفٹیننٹ چارلس بین اچانک نیویارک کا سب سے مشہور پولیس افسر بن گیا تھا کیونکہ اس نے مشہورِ زمانہ قاتل کو گرفتار کر لیا تھا جو لوگوں کو قتل کرتا پھرتا تھا اور گزشتہ چار سالوں میں آٹھ خواتین و مردوں کو قتل کر چکا تھا اور اس کام کے لیے وہ کلہاڑی استعمال کرتا تھا۔ پریس نے اسے ''سر کاٹنے والے'' کا خطاب دیا تھا۔ اپنے پچھلے سات قتل اس نے اتنی صفائی اور مہارت سے کیے کہ پولیس اس کا نام و نشان بھی نہیں پا سکی تھی، وہ سر کاٹنے والے کے بارے میں

مکمل تاریکی میں تھے۔ پریس، عوام اور شہر کی انتظامیہ پولیس کی اس ناکامی پر چراغ پا تھے اور ہوم سیکریٹری کے افسران پر دل کھول کر تنقید کی جا رہی تھی۔ ہر دوسرے قتل کے بعد پولیس کیپٹن ایڈگر مولر نے تفتیشی افسران تبدیل کر دیے تھے لیکن نتیجہ حسبِ سابق رہا یعنی پولیس سر کاٹنے والے کا پتا چلانے میں قطعی ناکام رہی۔ وہ اسے مزید قتل کرنے سے بھی نہیں روک سکی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے سات افراد جن میں چار عورتیں اور تین مرد تھے، دنیا سے گزر گئے۔ پولیس ان سات افراد کا آپس میں کوئی ربط تلاش کرنے میں بھی ناکام رہی تھی۔ یہ بیس سال سے پچاس سال کی عمروں کے لوگ تھے۔ ان میں کروڑ پتی بھی تھے اور ایک معمولی ڈلیوری بوائے بھی تھا۔ وہ شہر کے مختلف حصوں میں رہتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ قاتل کے ہاتھ جو لگ جاتا وہ اسے قتل کر دیتا تھا مگر اتنی صفائی اور خاموشی سے کہ بعض اوقات مرنے والے کو بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ قاتل کو رقم یا مرنے والے کی چیزوں سے بھی کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہیں ہاتھ نہیں لگاتا تھا اور نہ ہی اس نے عورتوں کے ساتھ کوئی غلط سلوک کیا۔ اسے صرف لوگوں کے سرتن سے جدا کرنے سے دلچسپی تھی۔ قتل کے اوقات بھی مختلف تھے، کچھ رات میں ہوئے اور کچھ دن میں مگر تمام کیسز میں ایک چیز مشترک تھی کہ قاتل نے اپنا معمولی سا سراغ بھی نہیں چھوڑا تھا۔

پھر بدقسمتی نے اسے یوں گرفتار کرایا کہ وہ اپنے جرم سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا، اگرچہ اس نے بعد میں عدالت میں جرم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن تمام شواہد مع گواہی کے اس کے خلاف جا رہی تھیں۔ اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا۔ جب اس نے ایک معروف بزنس بلڈنگ کی لفٹ میں اسی عمارت کی ایک فرم میں ایچ آر کے اعلیٰ عہدے پر کام کرنے والی شیلی جونسن کو ہنگامی حالات میں کام آنے والی کلہاڑی سے وار کر کے قتل کر دیا۔ وہ شیلی کے خون میں نہایا ہوا تھا اور کلہاڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ شیلی لفٹ کے فرش پر اس طرح پڑی تھی کہ اس کا سر جسم سے تقریباً الگ ہو گیا تھا۔ دو عینی گواہوں نے گراؤنڈ فلور پر لفٹ رکنے کے بعد اسے اسی حالت میں دیکھا تھا۔ شور شرابے کے باوجود قاتل نے فرار کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی طرح کلہاڑی تھامے کھڑا رہا حتیٰ کہ لیفٹیننٹ چارلس نے آ کر اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے نہایت آرام سے کلہاڑی پولیس والوں کے حوالے کر دی حالانکہ موقعِ واردات پر آنے والے نصف درجن مسلح پولیس والے اس سے خائف تھے۔ اس لیے جب وہ آسانی سے قابو میں آ گیا تو چارلس کو تعجب ہوا تھا۔

پریس نے سر کاٹنے والے کی گرفتاری کا سہرا چارلس اور پولیس کے محکمے پر نچھاور کر دیا اور دھڑا دھڑ خصوصی ضمیمے شائع کر دیے۔ ظاہر ہے یہ معمولی واقعہ نہیں تھا۔ چارلس کی واہ واہ ہونے لگی اور چوبیس گھنٹے کے اندر وہ امریکا کے دس مقبول ترین لوگوں میں شامل ہو گیا۔ اس واقعے سے سب اس سے بہت خوش تھے، سوائے ریڈ بورمین کے۔ سر کاٹنے والے کا نام ریڈ بورمین تھا اور وہ اسی عمارت میں واقع ایک بڑی فرم میں منیجر کے عہدے پر کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھیوں اور فرم کی انتظامیہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ ریڈ ہی قاتل ہے۔ وہ ذرا سخت گیر اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص ضرور تھا لیکن اس کے ساتھی ماننے کو تیار نہیں تھے کہ وہ اتنا سفاک قاتل ہو سکتا ہے۔

ریڈ تقریباً پچاس برس کا دبلا لیکن صحت مند شخص تھا۔ وہ اکیلا رہتا تھا، اس نے شادی نہیں کی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس کا باپ جرمنی سے امریکا چلا آیا تھا۔ اس نے یہاں شادی کی اور ریڈ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دونوں میاں بیوی دنیا سے گزر چکے تھے اور تب سے ریڈ اکیلا زندگی بسر کر رہا تھا۔ اپنے سیاہ بالوں، آنکھوں اور چونچ نما ناک کی وجہ سے وہ سخت گیر نظر آتا تھا۔ ایک ایسا شخص جسے سوائے اپنے کام کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہ ہو۔ وہ دفتر سے سیدھا گھر جاتا اور پھر وہاں سے اگلی صبح دفتر جانے کے لیے برآمد ہوتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور نہ ہی وہ پیٹ پالنے کا شوقین تھا، اس لیے کسی بار میں اس کا حلقۂ احباب بھی نہیں تھا۔ دفتر والوں سے بھی اس کی صرف کام کی حد تک بات چیت ہوتی تھی اور کسی سے اس کی گپ شپ نہیں تھی۔ فرم مالکان کا کہنا تھا کہ ریڈ اپنے کام میں ماہر تھا اور اپنا کام خوش اسلوبی سے کرتا تھا۔

بہرحال اب ریڈ ایک تقریباً تسلیم شدہ قاتل تھا۔ کیونکہ پولیس کے پاس اس کے خلاف سابق سات قتل کے کیسز میں کوئی ثبوت یا گواہی نہیں تھی اس لیے اس پر صرف شیلی کے قتل کا مقدمہ چلا۔ ریڈ نے اپنے مختصر بیان میں شیلی کے قتل سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ دوسرے فلور پر لفٹ رکی کیونکہ شیلی کو اترنا تھا لیکن دروازہ کھلتے ہی ایک نقاب پوش نے جو کلہاڑی سے مسلح تھا، شیلی کی گردن پر وار کیا۔ وہ سیدھی گر کر واپس لفٹ میں آ گری اور اس کی گردن سے اچھلتے ہوئے خون نے ریڈ کو لہولہان کر دیا۔ وہ سخت دہشت زدہ اور حواس باختہ تھا۔ نقاب پوش قاتل نے کلہاڑی اس کی طرف بڑھائی تو اس نے کلہاڑی تھام لی اور اسی لمحے لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا اور وہ گراؤنڈ فلور کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب گراؤنڈ فلور پر لفٹ رکی تو وہاں دو عینی گواہ پہلے سے موجود تھے۔ ان کے واویلے پر پہلے عمارت کے سیکیورٹی گارڈز اور پھر پولیس آ گئی اور ریڈ کو گرفتار کر کے لے گئی۔

مگر تمام ثبوت اور گواہیاں ریڈ کے خلاف تھیں، حد یہ کہ اس کا وکیل بھی اسے قاتل سمجھ رہا تھا۔ جیوری نے متفقہ طور پر اسے قاتل قرار دیا۔ فرسٹ ڈگری مرڈرر قرار پانے کے بعد جج کے لیے اسے عمر قید کی سزا دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سب خوش تھے کہ بالآخر ایک درندہ صفت قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا اور اب اسے جیتے جی آزاد فضاؤں میں آنا نصیب نہیں ہوگا۔

☆☆☆

روبیلا برٹن چوبیس برس کی خوب صورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن کچھ عرصے سے اس کا خراب دور چل رہا تھا۔ جب وہ شیلی مرڈر کیس کی عینی گواہ بنی تو اس کے بعد سے اس کی توجہ اپنے کام پر نہیں رہی۔ وہ اکثر دیر سے دفتر جاتی تھی اور وہاں بھی کام کرنے کے بجائے بیٹھی سوچتی رہتی تھی۔ ایک مہینے پہلے اس کے باس نے اسے بلایا اور ملائمت سے کہا۔ ”روبیلا! ہم محسوس کر رہے ہیں کہ آج کل تمہیں سوچنا اچھا لگتا ہے۔ تم جانتی ہو کمپنی اپنے ملازموں کے جذبات و احساسات کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ اس لیے کمپنی نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اچھی طرح سوچنے کا موقع دیا جائے۔“

روبیلا سمجھ گئی کہ باس کیا کہنے والا ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”سوری سر! آئندہ میں اپنے کام پر پورا دھیان دوں گی۔“

”سوری مس برٹن، فیصلہ ہو گیا ہے تم گھر جاؤ اور دل بھر کر سوچو۔“

کساد بازاری کے اس دور میں دوسری ملازمت ملنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ روبیلا کو بے روزگار ہونے کے بعد پتا چلا۔ اس نے بے شمار جگہوں پر سی وی بھیجی لیکن جب آخری ملازمت کا جواب آیا تو اس کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی [illegible] نہیں تھا اس لیے کہیں سے بھی جواب نہیں آیا۔ ایک [illegible] سے [illegible] خرچ کیا لیکن پھر وہاں سے بھی معذرت کر لی گئی۔ اس رات روبیلا بس سے اتری [illegible] اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ آج تمام [illegible] ہوا ہو چکی تھی اور اسے امید تھی کہ کہیں نہ کہیں [illegible] بات ضرور بن جائے گی اس لیے وہ کچھ خوش تھی۔

تیز ہواؤں کے شور میں اسے سنائی نہیں دیا لیکن جب عقب سے آنے والا بالکل پاس آ گیا تو اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر اسی لمحے ایک ہاتھ آ کر اس کے منہ پر جم گیا۔ اس میں موجود رومال سے تیز بو اٹھ رہی تھی جو سانس کے راستے اس کے دماغ پر چڑھی اور چند لمحوں میں وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

روبیلا کو ہوش آیا تو وہ ایک کرسی پر پڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر فولادی زنجیر تالے کی مدد سے بندھی ہوئی تھی اور یہ زنجیر کرسی کی ہتھیوں کے نیچے سے بھی گزر رہی تھی۔ گویا وہ کرسی کی قیدی تھی اور اس سے اٹھ نہیں سکتی تھی۔ پھر وہ چونک گئی کیونکہ اس کے سامنے اور برابر میں اس بڑی سی آفس ٹیبل کے ساتھ کرسیوں پر چار افراد اور تھے اور وہ ان سب کو پہچانتی تھی۔ ان میں سے ایک پولیس افسر چارلس تھا۔ دوسرا ریڈ بورمین کے مقدمے میں سرکاری وکیل گریگ ولیم تھا۔ تیسرا فرد ایک اور عینی گواہ میک شا تھا۔ اس نے بھی روبیلا کے ساتھ ہی لفٹ میں ریڈ بورمین کو خون آلود کلہاڑی سمیت دیکھا تھا اور اس کی گواہی بھی اہم تھی۔ چوتھی فرد سامنتھا بیکر تھی۔ سامنتھا کا مقدمے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ خود کو روحانی پریکٹیشنر قرار دیتی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ کسی بھی واقعے کی سچائی جان سکتی ہے اور وہ مستقبل بھی جان سکتی ہے۔ اس نے کیس کے دوران اخبارات میں کالم لکھے تھے اور ان میں ریڈ بورمین کو شیلی کا قاتل قرار دیا تھا۔ وہ مقدمے کی پیشیوں میں بھی باقاعدگی سے شریک ہوتی تھی۔

چارلس پہلے سے ہوش میں تھا۔ روبیلا کے بعد یکے بعد دیگرے باقی سب کو بھی ہوش آ گیا۔ پہلے تو سب بدحواس رہے اور مجنونانہ انداز میں خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرتے رہے مگر زنجیریں بہت مضبوط تھیں اور کرسی کا فریم بھی دھات کا بنا ہوا تھا، اس کے نیچے چھوٹے پہیے تھے جیسا کہ آفس چیئر کے نیچے ہوتے ہیں۔ کرسی بھی ایک چھوٹی زنجیر کی مدد سے میز سے... بندھی ہوئی تھی اور میز کے پائے فرش میں نصب تھے۔ وہ اسے بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ میک شا گلا پھاڑ کر چلایا۔ ”یہ کیا ہے... کس نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے؟“

”خود پر قابو رکھو۔“ چارلس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہمارے ساتھ سنگین صورتِ حال ہے۔ پانچ افراد کو اس طرح اغوا کر لینا مذاق نہیں ہے۔ کسی نے بہت ہوشیاری سے یہ کام کیا ہے۔“

”کس نے؟“

”ریڈ بورمین نے۔“ چارلس نے کہا تو سب نے

ساتھ فولڈرز کے کورز میں دو عدد سی ڈیز بھی تھیں جن میں گنتی کو ہوں اور عدالت میں کی جانے والی گفتگو کی ریکارڈنگ موجود تھی۔ سامنتھا سہمے ہوئے آہستہ سے بولی۔ "یہ پاگل پن ہے... یہ شخص ہمیں قتل کر دے گا۔"

"پلیز، ایسی باتیں مت کرو۔" رویلا روہانسی ہو گئی۔ "میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔"

"ہم میں سے کوئی مرنا نہیں چاہتا۔" چارلس نے کہا۔ "مگر یہ حقیقت ہے۔ ہم ایک دیوانے کے قبضے میں ہیں اور وہ ہمارے ساتھ سب کرنے کے لیے آزاد ہے اور ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"کیا ہم اس پر قابو نہیں پا سکتے؟" میک نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"ان زنجیروں کے ساتھ؟" کریگ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "نہیں دوست، ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جب تک ہم یہاں بندھے ہوئے ہیں۔"

"جب ہم واش روم جاتے ہیں تب تو آزاد ہوں گے۔" رویلا کو خیال آیا۔ چارلس، کریگ اور میک چونک گئے۔ میک نے کہا۔

"ہاں، اس وقت ہم کچھ کر سکتے ہیں۔"

لیکن اس وقت ان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب ریڈ انہیں دوپہر میں واش روم لے جانے آیا اور جب اس نے میک کی زنجیر کھولی تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے بعد میک کچھ کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ باقی سب بھی شرافت سے واش روم سے ہو کر واپس آ گئے تھے۔ ریڈ ان کی توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ اس نے رویلا کے لیے پستول نہیں نکالا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ اسے یا سامنتھا کو وہ خالی ہاتھ سے بھی قابو کر لے گا۔ مگر مردوں سے وہ پوری طرح محتاط تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہاتھوں سے زنجیریں اترنے کے بعد مرد اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے پہلے ہی پستول نکال لیا تھا۔ جب وہ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا تو چارلس نے دبی آواز میں کہا۔ "یہ شیطانی دماغ والا شخص ہے۔ اس نے کوئی کونا خالی نہیں چھوڑا ہے ہمارے لیے۔"

"اس کے باوجود ہمیں آزاد ہونے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔" میک نے اصرار کیا۔ "ہم خود کو اس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

"ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔" سامنتھا بولی۔ "اور یہ کسی پر رحم کھانے والا شخص نہیں ہے۔"

"فرض کرو کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔" رویلا نے کہا تو سب نے یوں اس کی طرف دیکھا تو اسے شرمندگی ہونے لگی کہ اس نے کیسی احمقانہ بات کی ہے۔ وہ ہکلائی۔ "میرا مطلب ہے کہ..."

"ریڈ بورمین سیریل کلر نہیں ہے؟" کریگ نے بے یقینی سے کہا۔ "تمہارے خیال میں ہم لوگ پاگل ہیں جو اس کیس پر اتنی محنت کی۔ دن رات ایک کیے اس شخص کو قاتل قرار دلوانے اور سزا دلوانے میں۔ اور تم کہہ رہی ہو کہ شاید وہ سچ کہہ رہا ہے۔"

"میں نے صرف ایک مفروضے کی بات ہے۔"

"تم اپنا مفروضہ اپنے پاس رکھو۔" سامنتھا نے تند لہجے میں کہا۔ "اس میں ایک فیصد شبہ نہیں ہے کہ یہ قاتل ہے۔"

رویلا جھنجلا گئی۔ "تم لوگ میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔ میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ ہم اس کے سامنے بے بس ہیں اور اسے ہمارے سامنے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اس کی بات کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔"

"تمہارے سامنے اس کا سارا ریکارڈ موجود ہے۔" سامنتھا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم ثابت کر دو کہ وہ بے گناہ ہے۔"

"یہ اس دیوانے کی باتوں میں آ رہی ہے۔" میک تمسخرانہ انداز میں بولا۔ "وہ ہم سے کھیل رہا ہے اور بس..."

رویلا نے جھنجلا کر کمپیوٹر میں سی ڈی لگائی اور ہیڈ فون کانوں سے لگا لیا۔ وہ عدالت میں ہونے والی کارروائی سن رہی تھی۔ اس نے خاص طور سے وہ حصہ نکالا جس میں ریڈ اپنا بیان دے رہا تھا۔ رویلا غور سے سنتی رہی اور نوٹ پیڈ پر اہم نکات اتارتی رہی۔ اس نے نوٹ کیا کہ ریڈ نے عدالت میں اپنا بیان جامع اور مختصر رکھا تھا۔ اس نے بنا کسی جذباتیت کے اپنی بات مکمل کی اور خاموش ہو گیا۔ اس نے کریگ کے تمام سوالوں کے جوابات بھی سکون سے اور بغیر جوش میں آئے ہوئے دیے تھے۔ وہ اپنے جرم سے مکمل انکاری تھا۔ جب جیوری نے اسے مجرم قرار دیا تب بھی وہ اپنی بے گناہی کے موقف پر ڈٹا رہا حالانکہ اس کے وکیل کا خیال تھا کہ اسے اپنا جرم تسلیم کرتے ہوئے عدالت سے رحم کی اپیل کرنی چاہیے۔ مگر اس نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اس نے قتل ہی نہیں کیے تو رحم کی اپیل کیوں کرے۔

ریڈ نے شام چھ بجے چھٹی کا اعلان کیا۔ اس نے ان سب کو واش روم بریک دیا اور باری باری سب کو واش روم لے گیا۔ اس کے بعد ڈنر دیا جو تیار کھانے پر مشتمل تھا۔ وہ اسے گرم کر کے لایا، ساتھ میں کافی تھی۔ کھانے اور کافی پینے کے بعد ان سب کو نیند آنے لگی تھی اور انہیں پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کب اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ ان کے سونے کے بعد ریڈ نے ہال کی لائٹس بند کر دیں اور وہاں سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ راہداری کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی بند کر گیا اور اب اندر گھپ اندھیرا تھا۔ صبح ٹھیک آٹھ بجے میز کے اوپر کی اسپاٹ لائٹ آن ہو گئی۔ اس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ وہ سوتے میں چونک گئے۔ پھر دروازہ آواز کے ساتھ کھلا اور ریڈ ایک ٹرالی کے ساتھ اندر آیا، اس پر ان کے لیے ناشتہ تھا۔ گزشتہ روز رویلا کے علاوہ باقی لوگ اس کے آنے پر خود کو کام میں مگن ظاہر کرتے رہے تھے اس لیے ان کو کھانا دیا جا رہا تھا۔ وہ سب آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے کہ ریڈ بورمین کو کیسے بے وقوف بنایا جائے۔

جبکہ رویلا کا خیال تھا کہ وہ خود کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ وہ سب نہایت سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے مگر اس قید سے چھٹکارے کے لیے ان کا انداز سنجیدہ نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد وہ انہیں باری باری واش روم لے گیا۔ اس بار رویلا نے وقت کا پورا خیال رکھا تھا کیونکہ بارہ گھنٹے سے زیادہ واش روم سے دوری اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے کوشش کی، ورنہ اسکروز میں سے ایک کو کسی قدر نرم کر لیا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ تین یا چار بار میں اس اسکرو کو کھول لے گی۔ اس کے بعد آخری اسکرو رہ جائے گا۔ اس کے نزدیک یہ آزادی کا ایک راستہ ہو سکتا تھا مگر وہ ابھی اسے سب سے چھپا رہی تھی۔ اپنے ساتھیوں سے بھی کیونکہ ان کا رویہ اسے غیر سنجیدہ لگ رہا تھا۔ جیسے ہی ریڈ اپنے دفتر میں گیا، وہ سب ہاتھ روک کر بیٹھ گئے لیکن رویلا فائل کا معائنہ کرتی رہی۔

اس نے نوٹ کیا کہ آلۂ قتل یعنی کلہاڑی اصل میں ہنگامی حالات میں کام آنے والی کلہاڑی تھی اور یہ تیسرے فلور سے آگ بجھانے والے یونٹ کی الماری کا شیشہ توڑ کر نکالی گئی تھی۔ ریڈ کا بیان تھا کہ وہ بارھویں فلور سے لفٹ میں سوار ہوا تھا جبکہ شیلی دسویں فلور سے لفٹ میں آئی تھی۔ اس وقت لفٹ میں بس وہی دونوں تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا ریڈ نے تیسرے فلور پر لفٹ روکی، باہر آیا اور تقریباً بیس گز کی دوری پر موجود آگ بجھانے کے یونٹ کی الماری کا شیشہ توڑ کر واپس لفٹ میں آیا اور شیلی کی گردن اڑا دی؟ شیلی نے اتنی دیر لفٹ روکے رکھی تھی؟ کیونکہ خود ریڈ یہ دونوں کام نہیں کر سکتا تھا، یعنی لفٹ بھی روکے رکھے اور جا کر کلہاڑی بھی لے آئے۔ رویلا نے یہ نکتہ چارلس کے سامنے رکھا۔ "تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "ممکنہ طور پر ریڈ نے پہلے ہی کلہاڑی حاصل کر لی تھی۔"

"اس صورت میں اسے پہلے سے علم ہونا چاہیے تھا کہ شیلی اسی وقت لفٹ سے نیچے جائے گی۔ ریڈ کے دفتر والوں کا بیان ہے کہ وہ صبح اپنے دفتر سے پہلی بار نکلا اور نیچے گیا تھا۔ اسے اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے کیسے پتا چلا کہ شیلی کس وقت نیچے جائے گی اور وہ بھی اس کے پیچھے گیا۔"

"ممکن ہے اسے کسی طریقے سے پتا چل گیا ہو۔"

رویلا نے فائل کے صفحے پلٹے۔ "پولیس انکوائری کے مطابق شیلی دوسرے فلور پر واقع ویٹر لابی میں کسی سے ملنے گئی تھی۔ پولیس ملاقاتی کے بارے میں نہیں جان سکی کیونکہ ویٹر لابی میں اسے کوئی نہیں ملا تھا۔ یہ سنسان فلور ہے جس پر دوپہر کے بعد رونق ہوتی ہے۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ قتل کے بعد ریڈ دوسرے فلور پر کیوں نہیں اتر گیا جہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے بجائے وہ گراؤنڈ فلور تک چلا آیا جہاں چہل پہل تھی اور بے شمار لوگ آ جا رہے تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم... یہ تم ریڈ سے معلوم کرو۔"

"چارلس! تم اس کیس کے انکوائری آفیسر تھے اس لیے تم جواب دینے کے پابند ہو۔" رویلا نے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔ "اس بارے میں ریڈ کا بیان ہے کہ وہ شاک کی کیفیت میں تھا اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئی۔"

"وہ بکواس کرتا ہے۔ خود کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ قتل اسی نے کیا ہے۔"

"تمہیں تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔" سامنتھا نے طنز کیا۔

"اگر قتل اسی نے کیا اور وہ ہمارے ساتھ کھیل رہا ہے تو ہمیں مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔" رویلا نے سرد لہجے میں کہا۔ "صرف ایک مفروضہ ہماری جان بچا سکتا ہے کہ قاتل ریڈ بورمین نہیں ہے۔"

"اگر وہ قاتل نہیں ہے اور شیلی کا قاتل کوئی اور ہے، تب ہم اس بات کو کیسے ثابت کر سکتے ہیں؟" کریگ نے کہا۔

"اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس کیس کی تفتیش درست انداز میں نہیں ہوئی ہے، بہت سی باتیں قابلِ غور تھیں لیکن انہیں صرف اس لیے نظرانداز کر دیا گیا کہ پریس، عوام اور پولیس نے طے کر دیا تھا کہ قاتل ریڈ ہے۔"

"یہ بکواس ہے۔" چارلس غرایا۔ "تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو کہ میں نے درست طریقے سے تفتیش نہیں کی۔"

"میں نے صرف نشان دہی کی ہے، کوئی الزام نہیں لگایا ہے۔"

"اب تم یہ رپورٹ اس کے سامنے پیش کرو گی جس نے آٹھ زندہ انسانوں کو قتل کیا ہے۔" سامنتھا بھی بولی۔

"دیکھو، اس نے ہمارے سپرد ایک کام کیا ہے جو ہمیں بہر صورت کرنا ہے۔ انکار کی سزا تم لوگ دیکھ چکے ہو، اب عمل نہ کر کے بھی دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے وہ آگے سے کچھ اچھا نہیں کرے گا۔"

"ظاہر ہے اس جیسے سفاک اور نفسیاتی قاتل سے ہم کوئی اچھی توقع نہیں لگا سکتے۔"

"میں صرف زندہ رہنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گی۔"

"چاہے وہ ہمیں مار دے؟"

"یہ تم لوگوں پر ہے، خود کو بچانے کی کوشش کرو لیکن میں دیکھ رہی ہوں، تم لوگ اسے بالکل بھی سنجیدہ نہیں لے رہے ہو۔"

"ہم بے بس ہیں۔" میک نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ہم بھلا اسے کس طرح سنجیدہ لے سکتے ہیں؟"

"میں اس سے صاف کہہ دوں گی کہ میں کچھ نہیں کر سکتی اور میں اسے قاتل سمجھتی ہوں۔" سامنتھا بولی۔

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔" روبیلا گھبرا گئی۔ "وہ تمہیں سزا دے سکتا ہے۔"

"کیا کرے گا وہ؟ کھانا بند کر دے گا... واش روم نہیں جانے دے گا؟" سامنتھا نے حقارت سے کہا۔ "اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"تم بھول رہی ہو، تمہارے یقین کے مطابق وہ سیریل کلر ہے اور کلہاڑی سے آٹھ افراد کی گردنیں کاٹ چکا ہے۔ وہ صرف کھانا اور واش روم بند کرنے کی سزا نہیں دے گا۔"

روبیلا کی بات پر ان کے چہرے سفید پڑ گئے۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ "ہمیں کم سے کم اس پر یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ ہم کام کر رہے ہیں اور انتظار کرنا چاہیے۔ شاید کہیں سے مدد آ جائے یا ہمیں کوئی موقع مل جائے آزاد ہونے کا۔"

"ہم آزاد نہیں ہو سکتے۔" سامنتھا بولی۔ "اس نے ہمارے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ ہمیں موقع ملے گا۔"

اسی لمحے منیجر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ریڈ باہر آیا۔ اسے دیکھتے ہی سب اپنے مانیٹرز پر جھک گئے، سوائے سامنتھا کے۔ وہ سیدھی بیٹھی تھی اور اس کے چہرے کے تاثرات سخت تھے۔ ریڈ نے سامنتھا کی طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ "خوب، لگتا ہے آج مس سامنتھا کا کام کرنے کا موڈ نہیں ہے۔"

ریڈ کے طنزیہ انداز پر سامنتھا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تم ڈراما کر رہے ہو، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ قاتل تم ہی ہو۔"

"ہاں، تم نے بہت پہلے اپنی روحانی آنکھ سے دیکھ لیا تھا کہ قاتل میں ہوں۔" ریڈ ٹہلتا ہوا سامنتھا کے عقب میں آیا۔ روبیلا کو اس کے تاثرات خطرناک لگ رہے تھے۔ اس نے سامنتھا سے کہا۔

"سامنتھا تم بیکار کی بحث کر رہی ہو۔ ہمیں کام کرنا ہے اور قاتل کو تلاش کرنا ہے۔"

"قاتل۔" وہ حقارت سے بولی۔ "یہی قاتل ہے۔ اس نے ٹھیک کہا ہے، میں نے پہلے ہی جان لیا تھا کہ قاتل یہی ہے۔"

ریڈ نے اچانک سامنتھا کے بال پکڑ کر اس کا سر پیچھے کھینچا اور غرایا۔ "تم آنے والے وقت کے بارے میں اتنا ہی جانتی ہو تو کیا تمہیں پتا نہیں تھا تم پر اور ان سب لوگوں پر یہ وقت بھی آئے گا... بولو؟" اس نے سامنتھا کو جھٹکا دیا جو کراہ رہی تھی اور اپنے بال چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ریڈ کی گرفت بہت سخت تھی۔ "بولو، تمہیں نہیں معلوم تھا کہ تمہاری موت کس طرح ہو گی اور تم میرے بارے میں سب کو بتا رہی تھیں کہ میں قاتل ہوں؟"

"پلیز مسٹر بورمین۔" چارلس نے التجا کی، باقی سب بھی اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روبیلا منہ پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔ ریڈ، سامنتھا کا سر پیچھے جھکا رہا تھا۔ گردن پر دباؤ آنے سے اس کی سانس رک رہی تھی اور منہ کھل گیا تھا۔ وہ ہاتھ مار رہی تھی اور ریڈ کو روکنا چاہتی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ سامنتھا کا سر کرسی کی پشت پر جھکا رہا تھا، اس کی گردن مڑتی جا رہی تھی۔ اچانک خشک ٹہنی جیسی چٹخنے کی آواز آئی اور سامنتھا کا سر غیر معمولی حد تک پیچھے مڑ گیا۔ اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں اور جسم ڈھیلا پڑنے لگا تھا۔ روبیلا کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ کریگ کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ یوں پیچھے ہٹ گیا جیسے ریڈ سے دور ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ جبکہ ریڈ اطمینان سے اپنے کوٹ کے کف ٹھیک کر رہا تھا جیسے اس نے کسی کو قتل نہ کیا ہو بلکہ کوئی چھوٹا موٹا کام کیا ہو۔ چارلس اور میک ساکت بیٹھے تھے۔ سامنتھا کا جسم ساکت ہو گیا تھا اور اس کی گردن بدستور پیچھے کی طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ ریڈ نے ان سب کو دیکھا۔

"میں اپنے ماتحتوں سے کام پر توجہ چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے اب تم لوگ کام پر توجہ دو گے۔" اس نے کہا اور اطمینان سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا، روبیلا چلا اٹھی۔

"میں نے تم لوگوں سے کہا تھا، اسے سنجیدگی سے لو لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔"

"اگر ہم تمہاری بات مانتے تو تمہارے خیال میں یہ قتل نہ ہوتا؟" چارلس نے سامنتھا کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک طرف اس شخص کا اصرار ہے کہ قاتل یہ نہیں ہے اور دوسری طرف اس نے کتنے سکون سے سامنتھا کو مار دیا۔ کوئی شخص جو قاتل نہ ہو کسی کو اس طرح قتل کر سکتا ہے؟"

کریگ نے چارلس کی تائید کی۔ "قتل کرنے کے بعد وہ اتنا پرسکون کیسے رہ سکتا ہے؟"

"میری بات سنو، وہ قاتل ہے یا نہیں... مسئلہ ہمارا ہے ہمیں زندہ رہنا ہے ورنہ اس سے ڈر کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ سامنتھا کی لاش اس کا ثبوت ہے۔"

چارلس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بہرصورت ہمیں قتل کرے گا، ہم اسے روک نہیں سکتے۔"

"ہم اسے روک نہیں سکتے لیکن ہمیں اسے موقع بھی نہیں دینا چاہیے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" میک نے کہا۔ "ہمیں اسے موقع نہیں دینا چاہیے۔ وہ جیسا کہتا ہے، ویسا ہی کرنا چاہیے۔"

سامنتھا اور میک ایک طرف تھے جبکہ روبیلا، کریگ اور چارلس دوسری طرف تھے۔ کریگ، روبیلا اور چارلس کے درمیان میں تھا۔ اس شام جب ریڈ نے ڈنر ان کے سامنے رکھا تو سامنتھا کی لاش وہیں موجود تھی اور انہوں نے بڑی مشکل سے کھانا حلق سے اتارا تھا۔ کھاتے ہی وہ حسبِ معمول سو گئے۔ اگلی صبح روشنی ہوئی اور پھر ریڈ ناشتے کی ٹرالی کے ساتھ نمودار ہوا تو ان کی آنکھ کھلی۔ اس روز روبیلا نے ایک سخت اسکرو کھولنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ یہ اس کی توقع سے

زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ اسے کھولنے کی کوشش میں اس کے دو ناخنوں کے سرے ٹوٹ گئے اور وہ ریڈ کی موجودگی میں ان کو چھپاتی تھی ورنہ ٹوٹے ناخن دیکھ کر اسے شک ہو سکتا تھا۔ اب ایک آخری اسکرو رہ گیا تھا اور یہ سب سے مشکل تھا۔ روبیلا کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جس سے اس اسکرو کو کم سے کم ڈھیلا کر سکے مگر اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

ناشتے کے بعد وہ کام میں لگ گئی۔ ریڈ بورمین نے ایک جگہ اور بیان دیا تھا۔ اگرچہ پولیس نے اس پر پہلے سات قتل کا کیس نہیں چلایا تھا لیکن پریس اور عوام اسے سر کاٹنے والا ہی قرار دے رہے تھے اس لیے ریڈ بورمین نے ایک بوڑھی عورت کے قتل کے حوالے سے بتایا کہ جس روز وہ اپنے گھر میں شام کے ساڑھے سات بجے قتل ہوئی، اس دن وہ فوڈ پوائزننگ کی وجہ سے اسپتال میں داخل تھا۔ وہ دوپہر دو بجے اسپتال پہنچا تھا کیونکہ آفس بلڈنگ کے کیفے ٹیریا میں کھانا کھاتے ہی اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور وہ نو گھنٹے اسپتال میں داخل رہا تھا جہاں اس کے معدے کی صفائی کی گئی تھی اور اسے رات گیارہ بجے اسپتال سے گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ یہ سب اسپتال کے ریکارڈ پر موجود تھا۔ اس صورت میں وہ اس بوڑھی عورت کا قاتل نہیں ہو سکتا تھا مگر پولیس نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی اور یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ وہ قتل سے پہلے خاموشی سے اسپتال سے نکلا اور اپنا کام کر کے واپس آ گیا۔ اتفاق سے جائے واردات اسپتال سے صرف نصف کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ ریڈ دس منٹ میں اپنا کام کر کے آ سکتا تھا۔ پولیس کے مطابق قاتل اچانک ہی بوڑھی عورت کے گھر میں داخل ہوا اور اسے مدافعت کا موقع دیے بغیر قتل کر دیا اور واپس چلا گیا۔ عدالت نے بھی ریڈ کے اس بیان کو اہمیت نہیں دی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ یہ کیس سرے سے عدالت میں پیش ہی نہیں ہوا تھا۔

"مسز ٹموتھی کو جس وقت قتل کیا گیا، ریڈ اسپتال میں داخل تھا۔"

چارلس سر تھامے بیٹھا تھا۔ "اس سے کوئی بعید نہیں ہے۔ اس نے جان بوجھ کر کوئی غلط سلط چیز کھائی اور پھر اسپتال سے نکل کر اس عورت کو قتل کر کے واپس آ گیا۔ وہ اسپتال میں جہاں داخل تھا، وہاں عملے کی کمی تھی اور مریضوں کو صرف ایمرجنسی کی صورت میں دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے کسی کو اس کی عدم موجودگی کا پتا بھی نہیں چلا ہو گا۔"

روبیلا نے اس سے بحث نہیں کی لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ چارلس نے اس کیس میں وہ محنت نہیں کی جو اسے کرنی

چاہیے تھی۔ اسے پکا پکایا کیس مل گیا اس لیے اس نے زیادہ زحمت نہیں کی۔ ثبوت اور گواہیاں سب پکی تھیں۔ اس نے میک کی طرف دیکھا۔ ”قتل کے فوراً بعد ریڈ کو میں نے اور تم نے دیکھا تھا۔ ہم دونوں لفٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ میں پہلے آئی تھی اور تم لفٹ آنے سے بس چند سیکنڈ پہلے آئے تھے۔“

”یہ درست ہے۔“ میک نے کہا۔

”مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جیسے ہی لفٹ کا دروازہ کھلا، میری نظر فرش پر پڑی شیلی کی لاش اور خون میں نہائے ریڈ پر گئی۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ میں آنکھیں بند کر کے چیخیں مارنے لگی تھی۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا تھا؟“

”میں نے بھی وہی دیکھا تھا۔“ میک بولا۔

”ریڈ کے تاثرات کیا تھے؟“

میک نے سوچا اور پھر کہا۔ ”وہ کانپ رہا تھا اور شاک کی کیفیت میں لگ رہا تھا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ میں لرز رہی تھی اور وہ اس وقت تک اسی طرح کھڑا رہا جب تک مسٹر چارلس نے آکر اس سے کلہاڑی نہیں لے لی۔“

”وہ شاک کی کیفیت میں تھا۔“ چارلس نے تائید کی۔ ”میرے کہنے پر اس نے کلہاڑی آرام سے میرے حوالے کر دی تھی اور پھر گرفتاری میں بھی کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔“

رویلا نے ان کی طرف دیکھا۔ ”سوال یہ ہے کہ اتنا منجھا ہوا قاتل اپنا آٹھواں قتل کر کے اس طرح شاک میں کیوں آگیا کہ نہ فرار ہوا حالانکہ اس کے پاس موقع تھا اور نہ ہی اس نے گرفتاری میں مزاحمت کی؟“

”ممکن ہے اس قتل کے بعد اس کے اعصاب جواب دے گئے ہوں۔“ چارلس نے توجیہہ پیش کی۔ ”قاتل کتنا ہی سفاک کیوں نہ ہو، قتل اس کے اعصاب پر بوجھ ضرور بنتا ہے۔“

”مگر اس نے سمنتھا کو کتنے سکون سے قتل کیا ہے؟“ گریگ تلخی سے بولا۔ ”مجھے نہیں لگ رہا کہ اس کے اعصاب پر کوئی بوجھ ہے۔“

”کیونکہ وہ ہمیں اپنی سزا کا قصوروار سمجھ رہا ہے۔“ رویلا بولی۔ ”اس لیے وہ ہمیں بنا کسی بوجھ کے قتل کر سکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ شیلی کو اس نے ایسے ہی قتل کیا تھا اس لیے یہ قتل اس کے اعصاب پر بوجھ بن گیا اور وہ شاک کی کیفیت میں گرفتار ہو گیا؟“ میک نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ رویلا بولی پھر اس نے چونک کر باری باری ان تینوں کو دیکھا۔ ”سنو، تم لوگوں کی شیو بنی ہوئی ہے؟“

وہ بھی چونک گئے۔ سب نے باری باری اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرا، سب کی شیو بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے غور نہیں کیا تھا۔ گریگ نے کہا۔ ”کیا یہ کام ریڈ نے کیا ہے... لیکن کس وقت؟“

”رات کسی وقت جب ہم سو رہے ہوں گے۔“ گریگ نے کہا۔

”کیا ہم سب اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ کوئی ہماری شیو بنا جائے اور ہمیں پتا نہیں چلے؟“

”وہ رات کے کھانے میں ہمیں کوئی دوا دیتا ہے۔“ رویلا بولی۔ ”ہم بے خبر سو جاتے ہیں اور ہمیں پتا نہیں چلتا کہ وہ ہمارے ساتھ کیا کر رہا ہے۔“

”یہی بات ہے لیکن وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟“ میک نے پوچھا۔

”وہ نفسیاتی مریض ہے اور ایسے لوگوں کے کسی فعل کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ جو ان کے دل میں آتا ہے، وہ کرتے ہیں۔“

رویلا نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”مجھے کنگھی، برش کیے ساتھ گھنٹے گزر چکے ہیں لیکن میرے بال ایسے لگ رہے ہیں جیسے انہیں برش کیا گیا ہے۔“

”وہ ہمارے ساتھ کھیل رہا ہے۔“ میک تند لہجے میں بولا۔ ”جیسے بلی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے۔“

”زیادہ جوش میں مت آؤ۔“ گریگ نے اسے گھورا۔ ”سمنتھا کا انجام سامنے رکھو۔ رویلا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہمیں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ پھر ہم میں سے کسی کو قتل کر سکے۔“

”ہم موقع دیں یا نہ دیں لیکن وہ موقع نکال لے گا۔“ میک بولا۔

رویلا جواب دینے کے بجائے کام میں لگ گئی۔ شام کے وقت ریڈ نے انہیں ڈنر کرایا اور اس سے پہلے واش روم لے گیا۔ رویلا نے محسوس کیا کہ کافی پینے کے بعد اسے نیند آنے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں دوا کافی میں دی جاتی تھی۔ صبح روزانہ سونے اور آوازوں سے ان کی آنکھ کھلی تو سمنتھا کی لاش غائب تھی۔ رات کسی وقت ریڈ اسے لے گیا تھا۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ اب لاش سے بو آنے لگی تھی۔ اس دوران رویلا نے اسکرو کھولنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بہت سخت ثابت ہوا تھا اور کسی چیز کی مدد کے بغیر اسے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ رویلا کو کسی ایسی سخت چیز کی تلاش تھی جسے وہ اسکرو کے کھانچے میں پھنسا کر اسے کھول سکے۔ مگر ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اگلی صبح جب ریڈ اسے واش روم لے گیا تو اس نے وہاں ایسی کسی چیز کی تلاش کی۔ وہاں

کسی بھی کوئی سی چیز نظر نہیں آئی جس سے وہ اسکرو کھول سکتی۔ واش روم سے آنے کے بعد ریڈ نے ان سے کہا۔ ”اب تم لوگ کام شروع کر دو۔ جتنی جلدی تم اصل قاتل کا پتا چلا لو گے، اتنی ہی جلدی تم اپنے گھروں کو جا سکو گے۔“

”بکواس کرتا ہے یہ۔“ اس کے جاتے ہی میک نے کہا۔ ”یہ ہمیں کبھی آزاد نہیں کرے گا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

رویلا اس کی باتیں سنتے ہوئے بے خیالی میں اپنے اسکرٹ پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اچانک اسے اسکرٹ پر لگے بٹن کا خیال آیا۔ یہ دھات کے بنے ہوئے اور باریک سے بٹن تھے۔ اگر وہ اسے اسکرو کھولنے کے لیے استعمال کرتی تو وہ کھل سکتا تھا۔ مگر اس میں دو مسئلے تھے کہ وہ بٹن نکالے گی کیسے اور بٹن نکالنے سے اسکرٹ ڈھیلا پڑ جاتا۔ ایسے میں وہ کیا کرتی؟ پہلے مسئلے کا حل فوراً اس کے ذہن میں آگیا۔ اسکرٹ پر ایک پہلو میں اندر کی طرف ایک اضافی بٹن لگا ہوا تھا، وہ اسے نکال سکتی تھی۔ یہ اضافی بٹن اس لیے تھا کہ اگر کوئی بٹن ٹوٹ کر غائب ہو جائے تو وہ اس کی جگہ یہ بٹن ٹانک لے۔ دوپہر میں جب ریڈ اسے واش روم لے گیا تو اس نے اندر جاتے ہی سب سے پہلے اسکرٹ اتار کر اندر والا بٹن نکالنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے وہ دانتوں سے اسے نکالنے میں کامیاب ہوئی مگر بٹن نکلنے میں پانچ منٹ کا وقت پورا ہو گیا تھا اس لیے اسے بٹن آزمانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ اسے جیب میں رکھ کر واپس آگئی۔ ریڈ جیسے ہی واپس گیا، میک چارلس سے الجھنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”یہ سب تمہارا قصور ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے وہ بے گناہ ہے اور میں نے اسے قاتل بنا دیا؟“

”تب وہ مطمئن کیوں نہیں ہے؟“

”میک ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم نے اسے پھنسایا ہے۔“ رویلا بولی۔ ”آج ہم تمہاری وجہ سے اس مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میک بولا۔ ”ثبوت [illegible]...؟“

”میں قاتل نہیں ہوں۔“ چارلس غرایا۔

”ہاں تم قاتل نہیں ہو لیکن تم نے تفتیش درست طریقے سے نہیں کی۔“

چارلس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آنے لگے۔ رویلا اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”چارلس تم ہم سے کچھ چھپا رہے ہو۔“

”میں کیا چھپاؤں گا؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”جب تک میں تفتیش کا آغاز کرتا، پریس نے ریڈ کو سیریل کلر قرار دے کر مجھے اس کی گرفتاری کا ہیرو بنا دیا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ سیریل کلر نہیں ہے مگر تب تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے معاملہ عدالت پر چھوڑ دیا۔“

”اور عدالت نے مجھے قاتل قرار دے دیا۔“ ریڈ کی آواز آئی تو وہ سب چونک گئے۔ نہ جانے کس وقت وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر ان کی باتیں سننے لگا تھا۔ ان کے چہرے سفید ہو گئے۔ خاص طور سے چارلس کا خوف سے برا حال تھا۔ اس نے ہکلا کر کہنے کی کوشش کی۔

”وہ میں... عوام اور پریس کے دباؤ...“

”تم نے اپنے فرض سے غفلت برتی۔“ ریڈ ٹہلتا ہوا اس کے قریب آنے لگا۔ ”بجائے اس کے کہ تم اس کیس کی درست طریقے سے تفتیش کرتے، تم نے جان چھڑائی کیونکہ میرے گلے میں پھندا فٹ کرنا آسان تھا۔“

”ریڈ! میں معافی چاہتا ہوں۔“ چارلس نے بمشکل کہا۔ اس کے چہرے پر پسینہ نمودار ہو رہا تھا۔

”کیا تمہارے معافی مانگنے سے میری سزا معاف ہو جائے گی؟ نہیں، میری سزا صرف اس صورت میں معاف ہو گی جب تم لوگ اصل قاتل تلاش کرو گے۔ مسٹر لیفٹیننٹ! یہ اصل میں تمہاری ذمے داری ہے لیکن تم نے پہلے بھی اپنے فرض کو ادا نہیں کیا اور اب بھی تم کام پر بالکل توجہ نہیں دے رہے ہو، اس لیے میں تمہیں فائر کر رہا ہوں۔“

ریڈ، چارلس کے بالکل عقب میں تھا اس لیے وہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن رویلا نے دیکھ لیا تھا۔ ریڈ نے اچانک ایک پلاسٹک شاپر نکالا اور چارلس کے سر پر ڈال کر اسے کھینچ لیا۔ شاپر اس کے چہرے پر فٹ ہو گیا اور اب وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور پاؤں چلا رہا تھا مگر ریڈ پوری قوت سے شاپر کو کھینچے ہوئے تھا اور اسے ذرا موقع نہیں دے رہا تھا کہ وہ سانس لے سکے۔ میک اور گریگ چلا چلا کر ریڈ سے اس کی جان بخشی کی التجا کر رہے تھے۔ رویلا رو رہی تھی۔ ریڈ کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سختی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ چارلس کی جان لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چارلس منہ سے شاپر ہٹانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن یہ مضبوط قسم کی پلاسٹک کا تھا۔ چارلس اسے پھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا مگر شاپر کی مضبوطی کے آگے اس کی کوشش بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ میک اور گریگ بھی اب چپ کر کے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

چارلس نے ایک آخری کوشش کی اور پھر اس نے دم توڑ دیا۔ اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ شاپر کے پیچھے سانس کے لیے اس کا کھلا منہ بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ ریڈ نے ایک جھٹکا دے کر شاپر چھوڑ دیا اور اپنا بے ترتیب ہو جانے والا کوٹ درست کرنے لگا۔ آخر میں اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا اور یوں مطمئن نظر آنے لگا جیسے کوئی بہت ضروری کام کامیابی سے انجام دے چکا ہو۔ روبیلا بدستور منہ چھپائے رو رہی تھی۔ ریڈ نے انہیں سخت نظروں سے دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب تم لوگوں کو اصل قاتل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ورنہ تم سب ایک ایک کر کے اسی طرح فائر ہوتے رہو گے۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ روبیلا کا جسم ہچکولے لے رہا تھا، وہ اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میرے خدا... چارلس۔"

"تم نے اسے نااہل ثابت کیا تھا۔" کریگ تلخی سے بولا۔ "یہ تو ہونا تھا۔ اسے موقع مل گیا چارلس کو قتل کرنے کا۔"

"یہ قاتل ہے... ہم سب کو ایک ایک کر کے اسی طرح مار دے گا۔" میک کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "تم نے سنا، اس نے اصل قاتل نہ تلاش کرنے کی صورت میں ہم سب کو باری باری فائر کرنے کی دھمکی دی ہے۔"

روبیلا نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ وہ اب فولڈر کے کاغذات پلٹ رہی تھی لیکن اس کا انداز کام کرنے والا نہیں تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دھیان بٹانے کے لیے کاغذ پلٹ رہی ہے۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ ہمیں کافی میں نیند کی دوا دیتا ہے۔ آج رات ہم کافی نہ پییں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، وہ ہمارے سروں پر سوار رہتا ہے جب تک ہم ڈنر مکمل نہیں کر لیتے۔" کریگ نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر ہم نے کافی نہیں پی تو وہ ہمیں کسی اور طریقے سے سلا دے گا۔" میک نے اس کی تائید کی۔

"ویسے اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اگر ہم جاگتے بھی رہیں تو کیا کر سکتے ہیں؟ ہم اسی طرح زنجیروں سے بندھے ہوں گے اور رات بے سکون گزریں گے۔ دوا سے کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ بارہ گھنٹے سکون سے سو کر گزر جاتے ہیں۔"

"جب ہم اس طرح بے بسی سے بندھے ہوتے ہیں تب وہ دوا دے کر کیوں سلاتا ہے؟" روبیلا نے اسی طرح سرگوشی میں کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی آواز ریڈ تک نہ پہنچ جائے۔ میک اور کریگ بھی اب دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ریڈ دفتر سے نکلا تو وہ تینوں فولڈرز پر جھک گئے۔ ریڈ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "گڈ ورک۔"

وہ چارلس کی کرسی کے پاس آیا، اس نے اس کی زنجیر کھولی اور اسے دھکیلتا ہوا ہال سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کریگ نے آہستہ سے کہا۔ "یہ اسے کہاں لے گیا ہے؟"

"کہیں ٹھکانے لگانے۔" روبیلا بولی۔

"کچھ اندازہ ہے یہ جگہ کہاں ہو سکتی ہے؟" میک نے سوال کیا۔

"یہ کوئی متروک دفتری عمارت ہے اور اس طرح کی عمارتیں شہر میں ہوتی ہیں۔" کریگ بولا۔

"لیکن یہ بالکل ویران ہے۔" روبیلا نے کہا۔ "یہ تو شہر کے کسی ایسے حصے میں ہے جو اب ویران ہو گیا ہے۔"

نیویارک میں کئی علاقے ایسے تھے جو چند دہائی پہلے تک بارونق اور آباد تھے لیکن پھر کسی وجہ سے وہ متروک اور ویران ہوتے چلے گئے اور اب وہاں بہت کم لوگ رہتے تھے۔ عمارتیں خالی ہو گئی تھیں اور ان میں موجود دفاتر بند کر دیے گئے تھے۔ یہ عمارت یقیناً ایسے کسی علاقے میں تھی۔ روبیلا نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ عمارت کسی آباد جگہ ہو لیکن ہم اس کے بہت اندر والے حصے میں ہوں اس لیے کوئی آواز نہیں آ رہی ہو۔"

روبیلا نے کاغذات میں سے وہ حصہ نکالا جس میں اس کے اور میک کے عینی گواہ کی حیثیت سے بیانات تھے۔ میک شیلی کی فرم میں کام کرتا تھا اور وہ ڈیوٹی پر آ رہا تھا۔ وہ لابی میں اندر آیا اور روبیلا سے پیچھے لفٹ کے سامنے رک گیا۔ پھر لفٹ کا دروازہ کھلا اور ان دونوں نے ایک ساتھ ہی اندر کا منظر دیکھا۔

ریڈ آدھ گھنٹے بعد واپس آیا تو خوشگوار موڈ میں تھا۔ "آج تم اسپیشل ڈنر دو گے لیکن پہلے واش روم بریک..."

واش روم کا دروازہ بند ہوتے ہی روبیلا تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس نے بٹن نکالا اور اس کی مدد سے جالی کا آخری اسکرو کھولنے کی کوشش شروع کی۔ اسے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، بٹن اسکرو کے کٹ میں آ رہا تھا۔ اس نے اسے گھمایا اور اسکرو کھلنے لگا۔ اگرچہ یہ آسانی سے نہیں کھل رہا تھا لیکن کھل رہا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پانچ منٹ سے زیادہ رکے گی تو بہ صورت دیگر اس کا واش روم بریک بند ہو جائے گا۔ اسکرو تقریباً نصف کھل چکا تھا جب وقت پورا ہونے لگا اور مجبوراً وہ باہر آ گئی۔ اس۔

بعد ریڈ، کریگ اور میک کو باری باری واش روم لے گیا۔ پیشل ہنز بیز، اور کولڈ ڈرنک پر مشتمل تھا اور وہ جو کھاتے آئے تھے، اس کے مقابلے میں یہ سچ مچ اسپیشل تھا۔ اس بار کافی تھیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ نیند کی دوا کولڈ ڈرنک میں تھی۔ ریڈ حسب معمول ان کے سر پر سوار تھا۔ وہ ٹہل رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی پشت روبیلا کی طرف ہوئی، اس نے تیزی سے کولڈ ڈرنک کا گلاس نیچے کر کے نصف کولڈ ڈرنک فرش پر گرا دی۔ ریڈ چونک کر مڑا لیکن اتنی دیر میں روبیلا نے گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ اسے شک نہیں ہوا ورنہ وہ میز کے نیچے دیکھ سکتا تھا۔

کریگ اور میک کولڈ ڈرنک ختم کرتے ہی اونگھنے لگے تھے اور روبیلا کا سر بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور جاگنے کی کوشش کرتے ہوئے نہ جانے کس وقت وہ سو گئی۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے بال کھینچ رہا ہے۔ وہ نیند سے چونکی تھی۔ کوئی اس کے عقب میں کھڑا تھا اور اس کے بالوں میں برش پھیر رہا تھا۔ جاگنے کے بعد روبیلا ساکت ہو گئی۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ جاگ گئی ہے۔ اس کے بالوں میں برش کرنے کے بعد ریڈ کریگ کی طرف آیا اور اس کے چہرے پر فوم لگا کر استرے سے اس کی شیو بنانے لگا۔ روبیلا کچھ دیر ساکت پڑی رہی پھر اس نے سر ہلانا شروع کر دیا۔ ریڈ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم جاگ رہی ہو؟" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"ہاں... مجھے واش روم جانا ہے۔" روبیلا نے غنودہ لہجے میں کہا۔

"نہیں واش روم بریک صبح ہوگا، ابھی سو جاؤ۔"

"پلیز... پلیز۔" روبیلا نے رک رک کر کہا۔ "میں بہت ضرورت محسوس کر رہی ہوں، میں صبح تک انتظار نہیں کر سکتی۔"

ریڈ کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر وہ اس کی طرف آیا کرسی کی زنجیر کھولی اور کرسی کو دھکیلتا ہوا واش روم تک لایا۔ اس نے روبیلا کے ہاتھ آزاد کیے اور خبردار کرنے والے انداز میں بولا۔ "تمہارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔"

"میں ابھی آتی ہوں۔" روبیلا نے کہا اور اندر آ گئی۔ عقب میں دروازہ بند ہوتے ہی وہ تیزی سے حرکت میں آ گئی تھی۔ اس نے پن نکالا اور جالی کا آخری اسکرو کھولنے لگی۔ اب کام مشکل نہیں تھا، اسکرو کھل گیا تو اس نے باقی تین اسکرو انگلیوں سے کھولنا شروع کیے۔ وہ ڈھیلے تھے اس لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئی، صرف وقت لگا تھا۔ آخری اسکرو نکلتے ہی اس نے جالی اتار کر احتیاط سے نیچے رکھی۔ یہ ٹین جیسی کسی چمکیلی دھات کا بنا ہوا چوکور خانہ تھا جو اندر سے صاف ستھرا لیکن کسی قدر تنگ تھا۔ جب ریڈ نے پہلی بار دروازے پر دستک دی تو روبیلا اپنے جوتے اتار کر خانے میں داخل ہو رہی تھی۔ دستک سنتے ہی اس نے رفتار تیز کی۔ وہ اتنی دور نکل جانا چاہتی تھی کہ ریڈ اسے پکڑ نہ سکے۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آ سکتا تھا کیونکہ خانہ مختصر تھا اور اس میں روبیلا جیسی مختصر جسامت کی لڑکی ہی آ سکتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ خانہ کہاں جا کر کھلے گا۔ وہ بس ریڈ کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے عقب میں ریڈ کی دھاڑ سنائی دی۔ وہ اس کے فرار سے آگاہ ہو گیا تھا۔ روبیلا نے رفتار تیز کر دی۔

اچانک ٹین کا خانہ اس کے بوجھ سے دبا اور پھر نیچے گرنے لگا۔ اس کی چادر ایک طرف سے پھٹ گئی اور روبیلا کسی پر جا گری۔ اسے ایسا ہی لگا تھا کہ وہ کسی پر گری ہے۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور پہلے تو اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، تب اسے چارلس دکھائی دیا۔ وہ باتھ ٹب میں یوں پڑا تھا کہ اس کے منہ پر ٹیپ تک لپٹا ہوا تھا۔ روبیلا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی تھی کہ کسی اور سے ٹکرائی۔ یہ سمانتھا کی لاش تھی۔ وہ ٹب کے دوسرے سرے پر تھی۔ روبیلا ان دونوں کے درمیان گری تھی۔ اس بار اس نے چیخ روک لی۔ اسے احساس تھا کہ اس کی چیخ سن کر ریڈ جان جائے گا کہ وہ یہاں ہے اور وہ آ کر اسے پکڑ لے گا۔ وہ لرزتے ہاتھ پیروں کے ساتھ ٹب سے باہر آئی۔ یہ خاصا بڑا باتھ روم تھا لیکن بہت گندہ ہو رہا تھا دیواروں اور فرش پر میل جما ہوا تھا۔ روبیلا نے آس پاس دیکھا۔ ایک کونے میں پانی کا پائپ نچلے حصے سے الگ ہو رہا تھا۔ روبیلا نے اسے پکڑ کر کھینچا تو وہ اوپر والے حصے سے بھی نکل آیا۔ اب اس کے پاس ایک ہتھیار تھا۔ وہ باتھ روم سے باہر آئی تو اس نے خود کو اسی راہداری میں پایا جس سے ریڈ اسے اور دوسروں کو واش روم کی طرف لے جاتا تھا۔ ریڈ نہ جانے کہاں تھا۔ وہ محتاط قدموں سے واش روم کی طرف بڑھی۔ ریڈ اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا۔

"تم چالاک لڑکی..." اس نے دانت پیس کر کہا اور اس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب کی طرف چلا گیا لیکن اس سے پہلے ہی روبیلا نے پائپ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ کراہ کر جھکا تو روبیلا نے ایک وار اور کیا۔ وہ فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ روبیلا نے جلدی سے اس کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، اس میں تمام تالوں کی چابیاں تھیں۔ وہ بھاگتی ہوئی واپس آئی۔ میک اور کریگ سو رہے تھے، اس نے کریگ کو ہلایا۔

"اٹھ جاؤ... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

کریگ بڑی مشکل سے جاگا تھا لیکن جب روبیلا نے اس کی زنجیروں کے تالے کھولے تو اسے بڑی تیزی سے ہوش آ گیا۔ اسے کھول کر روبیلا، میک کو جگانے اور کھولنے لگی۔ ایک منٹ کے اندر وہ بھی جاگ گیا تھا۔ روبیلا انہیں جلدی جلدی ریڈ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ "وہ مسلح ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہوش میں آ کر ہمارا راستہ روکے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

وہ باہر آئے، ریڈ اسی جگہ پڑا ہوا تھا۔ ان میں سے کسی کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اس کی تلاشی لے کر پستول نکال لیتے۔ وہ دبے قدموں اسے پھلانگ کر آگے چلے گئے۔ راہداری واش روم کے بعد دائیں طرف مڑ رہی تھی۔ راستے میں ایک کھلا ہوا کمرا دکھائی دیا جو شاید اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ اس میں گھسے، میک نے ایک پیپر کٹر اٹھا لیا۔ بٹن دبانے سے اس کا ایک انچ لمبا کٹر باہر نکل آتا تھا۔ کریگ نے ایک پیپر ویٹ اٹھا لیا۔ اپنے طور پر مسلح ہو کر وہ باہر آئے۔ روبیلا نے راہداری کے سرے کی طرف دیکھا تو وہاں ریڈ کھڑا تھا۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا اور بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ روبیلا کے حلق سے چیخ نکلی۔ "بھاگو۔"

وہ تینوں بھاگے۔ ریڈ ان کے پیچھے آنے لگا۔ ایک چھوٹی سی راہداری میں لفٹ تھی لیکن یہ آگے سے بند تھی۔ وہ تینوں مل کر لفٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ نہ جانے کب سے بند تھا اور جام ہو گیا تھا۔ اتنے میں ریڈ وہاں پہنچا۔ کریگ نے کہا۔ "میں اسے روکتا ہوں۔"

میک اور روبیلا مل کر زور لگا رہے تھے۔ بالآخر دروازہ کھل گیا اور وہ اندر گھس گئے۔ روبیلا نے گراؤنڈ کا بٹن دبایا۔ دروازہ بند ہو گیا اسی سمے انہوں نے کریگ کی چیخ اور پھر فائر کی آواز سنی۔ روبیلا چلائی۔ "اس نے کریگ کو مار دیا۔"

"ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ اپنی جان بچائیں۔"

لفٹ گراؤنڈ فلور تک پہنچی اور اس کا دروازہ کھلا تو روبیلا کو وہ منظر یاد آیا جب وہ لفٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ تب شیلی سیڑھیوں کی طرف سے آیا تھا اور اس کے عقب میں غائب ہو گیا تھا۔ وہ چونکی اور اس نے میک کو دیکھا جو اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اگر میک کا بیان درست تھا تو اسے دوسری طرف سے آنا چاہیے تھا۔ وہ اوپر سیڑھیوں سے یہاں پہنچا تھا۔ "میرے خدا... ریڈ ٹھیک کہہ رہا تھا۔" روبیلا بولی۔ "وہ قاتل نہیں ہے۔"

"او نہیں۔" میک کراہا پھر اس نے اچانک آگے بڑھ کر پیپر کٹر روبیلا کی گردن میں اتار دیا۔ کٹر نے شہ رگ کو کاٹ دیا تھا اور اس سے خون ابل پڑا تھا۔ روبیلا نے بے اختیار بایاں ہاتھ گردن پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے پائپ گھما کر میک کو مارا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا، پائپ گھما کر وہ نیچے گرا تو روبیلا اسے پھلانگ کر لفٹ سے باہر آ گئی۔ اس نے ہاتھ سختی سے زخم پر جما رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر خون بہتا رہا تو وہ کچھ دیر میں مر جائے گی۔ وہ ایک ہال میں آئی جہاں ہر طرف پلاسٹک کے پردے لٹک رہے تھے۔ وہ ان پردوں کے پیچھے ہو گئی۔ اسی لمحے اسے عقب سے میک کی آواز آئی۔

"میں جانتا ہوں تم یہاں ہو... تم نے ٹھیک پہچانا... شیلی کو میں نے قتل کیا... وہ کتیا مجھے فائر کرنا چاہتی تھی... میں نے اسے زندگی سے فائر کر دیا۔"

روبیلا بے آواز حرکت کر رہی تھی۔ اس کی طرف سے آہٹ ہوتی تو میک جان جاتا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی طرف سے جواب نہ پا کر میک پھر بولنے لگا۔ "مجھے معلوم تھا وہ نیچے ویٹنگ لابی میں آئے گی... میں سیڑھیوں سے نیچے آیا۔ ایک جیکٹ اور سر پر نقاب پہنا... کلہاڑی نکال کر لفٹ کے سامنے آ کھڑا ہوا... جیسے ہی لفٹ رکی اور شیلی باہر آئی، میں نے کلہاڑی کے وار سے اس کی گردن اڑا دی۔ وہ واپس لفٹ میں جا گری اور اس کا خون ریڈ پر آ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے کیوں نہ پھنسا دوں۔ میں نے کلہاڑی اس کی طرف بڑھائی تو اس نے تھام لی۔ میں نے گراؤنڈ فلور کا بٹن دبایا اور تیزی سے نیچے آیا، نقاب اور جیکٹ اتار کر سیڑھیوں کے ساتھ موجود گاربیج شوٹ میں پھینک دیں اور خود لفٹ کے نیچے آنے سے پہلے آ کھڑا ہوا۔ اس طرح میں عینی گواہ بن گیا۔"

روبیلا راستہ ٹٹولتی ہوئی ایک دروازے تک آ پہنچی تھی جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، خود کو عمارت کے سامنے والے حصے میں پایا۔ وہاں پولیس موجود تھی۔ کسی نے پولیس کو اس ویران عمارت میں فائرنگ کی اطلاع دی تھی۔ روبیلا سیڑھیوں سے نیچے اتری اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ پولیس نے اسے فوری طور پر اسپتال روانہ کیا اور پھر عمارت کی تلاشی لی تو وہاں سوائے تین لاشوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ ریڈ اور میک غائب تھے۔

☆☆☆

روبیلا کی آنکھ موبائل کی بیل سن کر کھلی تھی۔ اس نے دیکھا اس کے پبلشر اسمتھ آرمر کی کال کی تھی۔ اس نے روبیلا کی کتاب

"جو مجھ پر گزری" شائع کی تھی۔ تین ہفتے میں اس کتاب کی ایک ملین کاپیاں بک گئی تھیں اور یہ امریکا کی بیسٹ سیلرز میں شامل ہوگئی تھی۔ اس پہلے ایڈیشن سے رویلا کو سات لاکھ ڈالرز ملے تھے۔ اب اسمتھ چاہتا تھا کہ وہ دوسرا ایڈیشن بھی اسے شائع کرنے کی اجازت دے۔ ساتھ ہی وہ کوشش کر رہا تھا کہ رویلا کو زیادہ رقم ادا نہ کرنی پڑے۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ اس نے کتاب میں وہ سب لکھا تھا جو اس ویران عمارت میں اس پر اور اس کے ساتھیوں پر گزری تھی لیکن اس نے ایک بات چھپالی تھی۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ شیلی کا اصل قاتل میک تھا اور شاید وہی سر کاٹنے والا سیریل کلر تھا۔

رویلا کو اب کسی ملازمت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنا اپارٹمنٹ بھی بدل لیا تھا اور لگژری فلیٹ میں آگئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ آج ہی ایک نزدیکی سپر بک اسٹور میں اس کی کتاب کے سلسلے میں ایک تقریب ہو رہی تھی اور اسے بھی مدعو کیا گیا لیکن اس کا جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ سوگئی کیونکہ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنے لیے کافی بنائی اور ابھی پی رہی تھی کہ کال بیل بجی۔ وہ دروازے تک آئی اور کیٹ آئی سے باہر جھانکا تو اسے اسمتھ آرمر کھڑا دکھائی دیا۔ وہ ڈھیٹ آدمی تھا۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی تو وہ خود چلا آیا۔ اس نے گہری سانس لے کر دروازہ کھول دیا۔ اسمتھ یوں اندر آیا جیسے اسے کسی نے دھکا دیا ہو۔ پھر اس کے پیچھے سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس میں دبا خنجر اسمتھ کی گردن میں اتر گیا۔ رویلا کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ پیچھے ہٹی۔ اسمتھ اپنی گردن دباتے ہوئے فرش پر گرا تو اس کے پیچھے موجود میک اندر آگیا اور دروازہ بند کردیا۔ وہ رویلا کو دیکھ کر مسکرایا۔ "تم مجھے بھولی تو نہیں ہوگی؟"

رویلا چیخ مار کر بھاگی اور واش روم میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ میک نے باہر سے ٹکر ماری مگر دروازہ بند ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "رویلا! تم نے اچھا کیا جو اپنی کتاب میں میرا ذکر نہیں کیا، میں تمہارا شکریہ ادا کرنے اور تمہیں قتل کرنے آیا ہوں۔"

رویلا کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر ٹب کے ساتھ لگے پردے کا ڈنڈا کھینچ لیا۔ اگرچہ یہ ہلکی دھات سے بنا ہوا تھا لیکن زور سے مارا جاتا تو کارآمد ہوسکتا تھا۔ میک اب دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ رویلا نے اچانک لاک کھول دیا۔ میک جو ٹکر مارنے آرہا تھا، سنبھل نہ سکا اور تیزی سے اندر آیا۔ رویلا نے ڈنڈے سے اس پر وار کیا اور پھر باہر کی طرف بھاگی۔ وہ دروازے پر اسمتھ کی لاش اٹکی ہوئی تھی۔ وہ بہ مشکل اسے ایک طرف دھکیل کر باہر نکل آئی۔ اس کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر تھا اور اس کا دروازہ براہ راست باہر کھلتا تھا۔ باہر تیز بارش جاری تھی۔ رویلا مدد کے لیے چلاتی ہوئی سنسان سڑک پر دوڑ پڑی۔ میک بھی باہر آگیا تھا۔ آواز سن کر وہ اس کے پیچھے لپکا۔ رویلا پوری قوت سے بھاگی تھی کہ اسے سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ وہ نزدیک آیا تو رویلا لڑکھڑا گئی۔ وہ ریڈ تھا۔ وہ دونوں طرف سے گھر گئی تھی۔ اچانک ریڈ نے کہا۔ "میرے پیچھے آجاؤ۔"

رویلا جلدی سے اس کے پیچھے آگئی۔ میک نے ریڈ کو سامنے دیکھا تو مسکرایا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ "اب پہلے تم مسٹر بورمین..." یہ کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے ریڈ پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے وار بچایا اور اپنا ہاتھ گھما کے میک کی گردن پر مارا۔ اس میں دبے لمبے چھرے نے چشم زدن میں میک کی گردن اڑادی۔ رویلا کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر پڑی۔ ریڈ اس کی طرف گھوما تو وہ چلائی۔ "میرے پاس مت آنا۔"

ریڈ مسکرایا۔ "گڈ جاب مس رویلا... تم نے اپنا کام کردیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مڑا اور چلتا ہوا تاریکی میں غائب ہوگیا۔

چند منٹ بعد رویلا پانی میں شرابور اس سپر بک اسٹور میں داخل ہوئی جہاں اس کی کتاب کے سلسلے میں تقریب ہو رہی تھی اور بہت سارے لوگ موجود تھے۔ ایک طرف ڈائس پر سپر بک اسٹور کی منیجر تقریر کر رہی تھی، اس کی نظر رویلا پر گئی تو اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "اب وہ خود آگئی ہے۔"

لیکن پھر وہاں موجود لوگ رویلا کا حلیہ دیکھ کر چونکے اور جب ان کی نظر اس کے ہاتھ پر گئی تو وہ بدک کر اس سے دور ہوگئے۔ رویلا سیدھی ڈائس پر پہنچی اور میک کا کٹا ہوا سر سامنے رکھ دیا۔ سب لوگوں کے منہ کھلے ہوئے تھے اور وہ بہ خود میک کا سر دیکھ رہے تھے جس سے اب بھی خون ٹپک رہا تھا۔ رویلا نے ان سب کو دیکھا اور بولی۔ "یہ ہے اصل سر کاٹنے والا سیریل کلر اور شیلی کا قاتل..." کسی نے پوچھنا نہیں چاہا تو وہ بولی۔ "کوئی سوال...؟"

یہ سنتے ہی وہاں موجود پریس والوں نے اس پر یلغار کردی اور وہ ان کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے بعد وہ میک کے بارے میں حقیقت بیان کرے گی۔

موت کا ہرکارہ

جمال دستی

[illegible] بعض اوقات اتنی گنجلک اور الجھی ہوئی [illegible] جسے سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں... [illegible] مگر مسلسل کہانی کے پیچ و خم۔

[illegible]

"لوگ کہتے ہیں کہ زندہ مسٹری رائٹرز میں تم سب سے بہترین رائٹر ہو۔" بھرائی ہوئی آواز والے شخص نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے دستخط کے لیے میرے ناول "موت کا ہرکارہ" کی جلد میری جانب بڑھادی۔ تب میں نے دیکھا کہ [illegible] پر ورم آیا ہوا تھا۔

میری نگاہ اس پر اس وقت بھی پڑی تھی جب وہ اس قطار میں کھڑا اپنی باری آنے کا انتظار کر رہا تھا جو مجھ سے کتاب پر دستخط کرانے والوں نے بنائی ہوئی تھی۔ وہ بار بار [illegible] رہا تھا کیونکہ میں ہر ایک فرد سے کچھ وقت کے لیے گپ شپ بھی کر رہا تھا جو میری میز تک پہنچ جاتا تھا۔

"اسے مبالغہ آمیز شہرت کہہ سکتے ہیں۔" میں نے اس شخص کو جواب دیا۔ "پبلشر کتاب بیچنا چاہتا ہے اس لیے اس قسم کے دعوے کرتا ہے۔ میں تمہیں ایسے درجن بھر نام بتا سکتا ہوں جو مجھ سے کہیں زیادہ بہتر مسٹری رائٹرز ہیں۔"

"یعنی تمہارا آگاتھا کرسٹی اور آرتھر کانن ڈائل سے موازنہ کرنا..."

"کچھ اور ہے۔" میں نے جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ اوریجنل رائٹرز تھے۔ میں تو بس ایک اچھا رائٹر ہوں۔ انہوں

نے ٹھوس اور اہمیت کی حامل کتابیں تحریر کی ہیں جو ابھی تک بار بار شائع ہو رہی ہیں۔ میں نے صرف ایک ناول لکھا ہے۔ میں اپنے ناول کی تشہیری مہم کے سلسلے میں مختلف شہروں کے دورے اور دستخط کے کام سے فراغت کے درمیان ایک اور ناول لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"لیکن تبصرہ نگار تو تمہارے ناول کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔" اس کا لہجہ روہانسا ہو گیا۔

"یہ عارضی رجحان ہے۔" میں نے کہا۔ "میں وعدہ نہیں کر سکتا کہ میرا اگلا ناول بھی اتنی ہی کامیابی حاصل کرے گا۔ اور میں یہ وعدہ بھی نہیں کر سکتا کہ میرا اگلا ناول ضرور آئے گا۔"

"واقعی؟"

"'گون ود دہ ونڈ، ڈاکٹر ژواگو اور بلیک بیوٹی' کے رائٹرز نے دوسرا ناول کبھی نہیں لکھا۔ اگر میں نے دوسرا ناول لکھا تو ہو سکتا ہے کہ یہی ناقدین میرے اس ناول سے نفرت کرنے لگیں۔ لوگ آپ کو بام عروج تک پہنچا دیتے ہیں تاکہ آپ کے زوال سے حظ اندوز ہو سکیں۔"

"یہ سچ نہیں ہے۔" اس شخص نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری تقریر کے دوران سکون سے بیٹھا رہا۔ تقریر زیادہ بری نہیں تھی۔ پھر اس کے بعد میں نے تمہارے شیدائیوں کے سوالات سنے جو وہ تم سے کر رہے تھے۔ اس کے بعد لوگ قطار میں شامل ہونے کے لیے لپکے۔ مجھے قطار میں سب سے آخر میں جگہ ملی اور میں اپنے تکلیف زدہ پیروں کے ساتھ قطار میں باری آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے... دو کتابیں خریدنی تھیں تاکہ میں بعد میں انہیں زیادہ رقم کے عوض فروخت کر سکوں۔"

"تم انہیں فروخت کر کے زیادہ رقم حاصل کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ اس ناول کے پہلے ایڈیشن کا پہلا پرنٹ ہے۔ اور جب میں ان پر اپنے دستخط کر دوں گا تو ان کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ ان پر کور چڑھا دینا اور انہیں دھوپ سے بچا کر کسی ٹھنڈی خشک جگہ پر رکھ دینا۔ پھر چند برس تک انتظار کرنا۔ انہیں کبھی بھی پڑھنے کی کوشش مت کرنا۔ اسی طرح بالکل چھوئے بغیر سنبھال کر رکھنا۔"

"بیس بال کارڈز کے مانند؟ اگر انہیں بھی چھوا نہ جائے تو ان کی اہمیت بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک!" میں نے سر ہلایا۔

"ہو سکتا ہے کہ تمہاری یہ ایک تحریر ہی تمہارے لیے سونے کی کان بن جائے۔"

"ہو سکتا ہے۔ ناول نویسی ایک عجیب پیشہ ہے۔ اچھی خبر یہ ہے کہ اگر میں نے مزید بہت سے ناول لکھ لیے تب بھی پہلا ناول سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہے گا۔" میں نے بتایا۔

پھر میں نے اس کے خریدے ہوئے اپنے دونوں ناولوں پر آٹوگراف دے دیے۔ وہ لنگڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں قطار میں موجود سب سے آگے والے فرد کی جانب دیکھ کر مسکرا دیا۔

میرا اپنے ناولوں پر دستخط کرنے کا شیڈول شام ساڑھے چھ بجے تک کا تھا۔ میں کتابوں پر آٹوگراف دیتا رہا اور قطار میں آنے والے ہر فرد کے ساتھ ہنسی مذاق اور گپ شپ بھی کرتا رہا۔

اس بک اسٹور کی مالکن شائقین کی ایک بڑی تعداد کے جمع ہونے پر بے حد خوش تھی۔ ہم پبلشنگ کی دنیا کے غیر منظم ہونے پر اظہار افسوس کرنے لگے۔

پھر سات بجنے کے کچھ دیر بعد اس نے اپنے بک اسٹور کا دروازہ مقفل کر دیا۔ میں باہر اندھیرے میں اپنی کار کی جانب چل دیا جو پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔

اچانک اندھیرے سے وہی بھرائی ہوئی آواز والا شخص میرے سامنے آ گیا۔ "ایک سوال تو رہ ہی گیا۔" اس نے کہا۔ "وہ مسٹری رائٹر جو بلا جواز قتل کر دیا جائے اس کے لکھے ہوئے اکلوتے ناول کا پہلا دستخط شدہ ایڈیشن کتنی مالیت کا ہو سکتا ہے؟"

تب میری نگاہ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو پر پڑی جس کا پھل چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا، میں نے پلک جھپکنے میں اسے غیر مسلح کر دیا اور اس کا بازو توڑ دیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا خون اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی کتاب پر بہنے لگا۔

"تم نے میرے ناول کے عنوان کو نہیں سمجھا۔ میرا اندازہ ہے کہ تم ملٹری کی عام بول چال سے واقف نہیں ہو۔" میں نے افسردگی کے اظہار کے طور پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نے جتنی دیر میرے باہر نکلنے کا انتظار کیا، اس دوران میں ناول کے اندرونی کور پر رائٹر کی مختصر سوانح عمری ہی پڑھ لی ہوتی! ملٹری کی عام بول چال میں 'موت کا ہرکارہ' کا مطلب ... سپاہی ہے!'

مختار آزاد

کٹھن اور جاں لیوا لمحات کی مدت اگرچہ مختصر ہوتی ہے... مگر تکلیف کی شدت ان گھڑیوں کو صدیوں پر محیط کر دیتی ہے... وہ بھی بچپن سے ان آزار کی قیمت چکا رہا تھا... جو اس نے سا کسی جرم کے جھیلے تھے... بالآخر اس کی زندگی میں وہ لمحہ بھی آیا... جب وہ ان مشکل گھڑیوں کی قیمت وصول کر سکتا تھا...

لیوائن اسٹیوارٹ ایک وکیل تھا اور سان فرانسسکو کی بدنام زمانہ جیل میں قتل کے نوجوان مگر خطرناک ملزم سے ملنے آیا تھا جو اسے وکیل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس پر قتل کا الزام پہلی بار نہیں لگا تھا۔ وہ سات آٹھ برس کی عمر میں اپنے سوتیلے باپ کے سر پر فرائی پین مار کے موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اسٹیٹ نے ملزم کی خواہش پر وکیل مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تھا، تاہم اب تک وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مقدمہ لے یا نہ لے۔ تین برس پہلے بھی وہ ملزم کا ایک مقدمے میں وکیل

رہ چکا تھا۔ اسی لیے ملزم کی خواہش تھی کہ وہ اس کا کیس لڑے مگر اس بے گھر کے پاس فیس دینے کی سکت نہیں تھی۔ معاملہ سنگین تھا اسی لیے اٹارنی ڈپارٹمنٹ نے ملزم کی خواہش کے مطابق سرکاری خرچ پر وکیل مہیا کرنے کی ہامی بھرلی تھی۔

جیل کے اندر وکیل اور کلائنٹ کے درمیان ملاقات کے لیے خصوصی کمرا تھا۔ یہ کمرا دراصل دبیز اور بلٹ پروف شیشے کی بنی دو دیواریں تھیں جن کے درمیان چند فٹ کی جگہ خالی تھی۔ شیشے کی اُس دیوار کے پار فرش پر گڑے پایوں والی دھاتی کرسی پر، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اس کا ممکنہ کلائنٹ موریس ہاکس بیٹھا تھا۔

سان فرانسسکو کی جیل قیدیوں کے دنگا فساد سے لے کر وکیلوں پر حملہ کرنے تک، بہت ساری وجوہات کی بنا پر امریکا بھر میں بدنام تھی۔ وکیل اور ان کے کلائنٹ کے درمیان ملاقات کا یہ اہتمام پہلے نہیں تھا تاہم کئی بار ایسا ہوا کہ جب مقدمہ ختم ہونے پر اپیل کا مرحلہ آیا تو غصے میں بھرے، تازہ تازہ سزا یافتہ قیدیوں نے اپنے ہی وکیل پر جان لیوا حملہ کر دیا۔ اکثر سزا یافتہ مجرموں کو اپنے وکیلوں سے ہی شکوہ ہوتا ہے کہ وہ ان کا کیس زیادہ اچھی طرح نہیں لڑ سکے تھے۔

ان حملوں میں جب تواتر سے اضافہ ہونے لگا، تب جیل انتظامیہ نے ان کے درمیان ملاقات کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔

اس وقت اسٹیوارٹ کانوں پر ہیڈ فون لگائے، اپنے ممکنہ کلائنٹ سے بات چیت کر رہا تھا۔ بیس منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور اب وہ کیس تقریباً سمجھ چکا تھا لیکن موریس کو اب تک یہ یقین نہیں تھا کہ وہ اس کا وکیل بننا پسند کرے گا یا نہیں۔ گفتگو تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ اسٹیوارٹ سر جھکائے کیس پر سرسری غور کر رہا تھا۔ موریس اسے غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ کئی منٹ اس خاموشی کی نذر ہو چکے تھے۔ آخر موریس نے خود پہل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھا اور پھر بھاری آواز میں کہنے لگا۔ ”تو کیا تم میرا وکیل بننے کا فیصلہ کر چکے یا اب تک یہ ایک چانس ہے؟“

یہ سن کر اسٹیوارٹ نے سر اوپر اٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ گزشتہ بارہ برس سے وکالت کر رہا تھا لیکن پہلی بار اسے کیس دینے کے خواہش مند کسی کلائنٹ نے یہ سوال کیا تھا۔ اس کا یہ کہنا اسے بہت عجیب لگا۔ وہ اور جج اب تک میں سامنے بیٹھے ملزم کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ جس لہجے میں وہ یہ بات کہہ گیا کیا کوئی ڈاکٹر سے ایسا سوال کر سکتا ہے کہ وہ اس کا علاج کرے گا؟ کیا کوئی پولیس والے سے پوچھ سکتا ہے کب تک اسے قید میں رکھا جائے گا؟ وہ ناگواری سے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا مگر موریس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

اسٹیوارٹ چند لمحوں تک سر جھکائے یونہی سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سر اوپر اٹھایا اور پوری توجہ سے سامنے بیٹھے چوڑی پیشانی والے موریس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ وہ قیافہ شناس نہیں تھا مگر پھر بھی وہ کسی حد تک لوگوں کے چہرے دیکھ کر پتا چلا لیتا تھا کہ ان کے اندر کی کہانی کیا ہو سکتی ہے۔ وہ اس وقت قانون کی نظر میں ملزم تھا اور اسٹیوارٹ کو اس کا دفاع کرنا تھا جس کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام تر حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ دوسری بار اس سے مل رہا تھا۔ پرسوں رات وہ پولیس اسٹیشن میں گرفتاری کے کچھ ہی دیر بعد اس سے ملا تھا۔ ڈپٹی اٹارنی نے ہی اسے پولیس اسٹیشن پہنچ کر کیس لینے کا مشورہ دیا تھا۔

آج صبح وہ جلد ہی اپنے آفس سے نکل کر یہاں کے لیے چل دیا تھا۔ اس وقت بھی اس کی گود میں وہ فائل تھی جس میں موریس کے جرم کی تفصیل لکھی تھی۔ بہت کچھ وہ اس کی زبان سے بھی سن چکا تھا۔ کچھ پولیس کے ذریعے اس کے علم میں تھا اور باقی اس کے ماضی کی فائل سے پتا لگ گیا تھا مگر کیس لینے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اچھی طرح فیصلہ کر لے کہ آیا یہ ایسا معاملہ تھا جس کا وہ بھرپور دفاع کر سکتا ہے۔ اس بات کا تعلق اس کی فیس سے بھی تھا۔ جب وہ اچھی طرح تسلی کر لیتا کہ کیس کو کتنی محنت اور وقت درکار ہوگا، اسی لحاظ سے وہ فیس طے کرتا، چاہے معاملہ سرکار کے ساتھ ہی طے کیوں نہ کرتا ہو۔

اسٹیوارٹ کو اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ ایک خاکہ ساز بھی ہے اور کارٹون بھی بناتا ہے۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس وقت سامنے بیٹھے اس کے کلائنٹ کے دماغ میں کس قسم کی کارٹون فلم چل رہی ہوگی۔

دوسری طرف موریس بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کئی منٹ کی خاموشی کے بعد آخر اسٹیوارٹ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس کی طرف دیکھا۔ ”اب بات لاٹری کی قرعہ اندازی کی ہو تو صرف قسمت کو ہی اس کا ذمے دار قرار دیا جا سکتا ہے مگر قتل میں انسان کا عمل دخل ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سر جھٹکا۔ اسے تین سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا تھا۔ تب وہ عدالت میں دلائل دینے کے لیے بطور وکیل دفاع، جج کے سامنے اپنے مخالف وکیل کے برابر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اس واقعے کو اپنے دماغ سے دور کرنا چاہا۔ اس وقت بھی وہ سامنے بیٹھے ملزم کا دفاع کر رہا تھا۔ یہی ملزم تین سال پہلے بھی اس کے سامنے عدالت کے

کٹہرے میں تھا اور شاید ایک بار پھر سے ہی وقت کی کوشش کر رہا تھی۔

اسٹیوارٹ نے کہا۔ ”جب تم قتل کر رہے تھے تب اس کی چیخ و پکار سنی گئی تھیں۔ گواہ موجود ہے۔ اب بتاؤ کیا کریں؟“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ موریس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اسٹیوارٹ کاؤنٹی کا واحد وکیل تھا جو نفسیاتی معاملات سے متعلق مقدمات لیتا تھا۔ وہ ایسا وکیل تھا جو نفسیاتی صحت کی بنیاد پر مقدمے کا رخ پلٹ دیتا تھا۔ اس کی فیس چھ ہزار ڈالر تھی۔ اتنی بھاری رقم کا سن کر ہر شخص چکرا جاتا تھا لیکن اسٹیوارٹ جانتا تھا کہ جب کلائنٹ ہر پہلو سے غور کرے تو اسے جیل میں سڑنے کے بجائے رقم دے کر باہر نکلنے کی امید کا سودا سستا لگتا ہے۔ اس لیے اس کا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

اسٹیوارٹ نے موریس کو مشورہ دیا کہ وہ نفسیاتی ملزم بن جائے۔ اس طرح اسے اسپتال منتقل کر کے اس کا علاج اور تشخیص کا عمل شروع ہو جائے گا مگر نہ جانے کیوں اسے اسپتال سے خوف آ رہا تھا۔ ”میں پاگل خانے نہیں جاؤں گا۔“ اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”یہی تمہارے بچنے کا راستہ ہے۔“ اسٹیوارٹ نے نرمی سے کہا۔ ”تمہارے کیس سے صاف ظاہر ہے کہ جیوری ارکان جلد ہی نتیجے پر پہنچ جائیں گے اور پھر تمہیں ساری عمر جیل میں سڑنا ہوگا کم از کم سزا تو یہی ہو سکتی ہے مگر...“

”مگر کیا...؟“ موریس چونکا۔

”یہ ثابت کر دیا جائے کہ تم نفسیاتی مریض ہو، تمہارے دماغ میں چیخیں گونجتی ہیں۔ یوں تمہیں بطور مریض پیش کر کے جیوری اور جج پر اثر انداز ہوا جا سکے گا۔ اس سے ہی جاں بخشی کا راستہ نکلے گا۔“

موریس نے خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

”قصہ یہ ہوگا کہ تمہارے کانوں میں چیخیں گونجتی ہیں۔ اس دن بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ تم پریشان تھے۔ ایسے میں کیا ہوا، کیسے ہوا، کس نے کیا... تمہیں کچھ علم نہیں۔ کوئی بات یاد نہیں۔“ اسٹیوارٹ نے بات ختم کی۔

”مگر...“ موریس نے کچھ کہنا چاہا۔

”اگر مگر کچھ نہیں۔“ اسٹیوارٹ نے اس کی بات کاٹی۔ ”بچنے کے لیے ہر حال میں تمہیں نفسیاتی اسپتال جانا ہوگا۔“

”مگر وہ پاگل خانہ ہے۔“ موریس کی آواز اونچی تھی۔

اہمیت دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ تمہیں تمہاری پسند کے مطابق وکیل دے رہے ہیں۔" اسٹیوارٹ نے جواب دیا۔

مورس نے... جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ آخر اسٹیوارٹ نے ایک آنکھ سے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے نفسیاتی اسپتال جانا تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے، بری بھی ہو سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی گود میں رکھے فائلوں کے پلندے کو سنبھالتا ہوا اٹھا۔ شیشے کے پار سے مورس نے اس کی طرف دیکھا مگر خاموش بیٹھا رہا۔

☆☆☆

اسٹیوارٹ، کیس کے تفتیش کاروں سے مل کر اب تک کی تمام معلومات جان چکا تھا۔ انہوں نے ہی اسے یہ بتایا تھا کہ مورس کے خلاف گواہی دینے والا دکان دار خوف زدہ ہے اور اب وہ اسٹار بلکس کے نام سے اپنا چلتا کاروبار بیچ کر کہیں اور جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اس کیس کا اہم گواہ تھا اور اب وہ محسوس کر رہا تھا جیسے گواہی دے کر پھنس چکا ہے۔ اسٹیوارٹ کو اندازہ تھا کہ اس جیسے سیدھے سادے دکان دار کے لیے عدالت میں پہنچنا، ملزم کو شناخت کرنا اور اس کے خلاف گواہی دینے کے بعد دو چالاک وکیلوں کے سوالوں کے جوابات دینا بہت کٹھن مرحلہ ہوگا۔ اب وہ اس جال سے نکلنے کی کوشش میں تھا اور خود مورس کیس کے تفتیشی افسر نے یہ بات اسے بتائی تھی۔

پال ریٹائرڈ پولیس افسر تھا اور اسٹیوارٹ کو اس کے ساتھ مل کر کام کرنا پسند تھا۔ پولیس ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد اب پال نجی طور پر سراغ رسانی کرتا تھا۔ اسٹیوارٹ کو اس کے ساتھ کام کرنے میں سہولت محسوس ہوتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ بات کوئی بھی ہو، وہ پال پر آنکھیں بند کر کے یقین کر سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ جو چاہتا ہے، پال کر دے گا۔

اگرچہ اسٹیوارٹ نے ایک بار تو اپنے کلائنٹ کی معصومیت پر یقین کر لیا تھا تاہم وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جب مقدمہ چلے گا تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ ملزم بری ہو سکے گا یا پھر اس کا پورا کیریئر داؤ پر لگ جائے گا۔ اسے اپنے کلائنٹ کو بچانے سے زیادہ اپنے کیریئر کے تحفظ کی فکر تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ کیس آسان نہیں تاہم اسے یقین تھا کہ وہ مضبوط کوشش کر سکتا ہے۔ اسے اس بات کی پریشانی تھی کہ اگر وہ کیس ہار گیا تو اس کی بڑی سبکی ہوگی۔ یہی بات اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔

اسٹیوارٹ عدالت کے احاطے میں ایک بینچ پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی مقدمے کی پہلی سماعت ختم ہوئی تھی۔ مورس کے ہاتھوں قتل کا یہ پہلا واقعہ نہیں تھا۔ اسی سبب اسے خطرناک قیدیوں کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ جج اور جیوری کا رویہ بھی قطعی ہمدردانہ نہیں تھا۔

مورس پر اس لیے بھی الزام سنگین تھا کہ اس نے بنا کسی وجہ کے قتل کیا۔ اسٹیوارٹ کے لیے عدالت کو یہ باور کرانا سخت مشکل لگ رہا تھا کہ قتل اتفاقی تھا۔ ملزم کا ماضی اس کی تردید کرتا تھا۔ اب بچنے کی صرف ایک ہی امید تھی کہ وہ نفسیاتی مریض ثابت ہو جائے۔ اس کے لیے تشخیص، تھراپی اور دیگر میڈیکل مراحل کے لیے وقت درکار ہوتا اور یوں اسے بھی وقت مل جاتا۔

اسٹیوارٹ کو محسوس ہوا کہ اس مرحلے پر اسے پال کی اشد ضرورت ہے۔ اس نے موبائل نکالا اور اسے فون ملانے لگا۔

"ہیلو..." دوسری طرف پال تھا۔

"مجھے تمہارے دماغ کی ضرورت ہے کچھ دیر کے لیے۔"

"اوہ... کیا بات ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "صرف دماغ کی؟ میں تو پورے کا پورا حاضر ہوں۔"

"صرف دماغ۔" اسٹیوارٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

"کہیں مورس کا معاملہ تو نہیں؟" اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"یہی بات ہے۔"

"اب کس نے اس کی ٹھکائی کر دی؟"

"تم یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ کسی نے اس کی ٹھکائی کی ہوگی؟"

"تین سال گزر چکے ہیں۔ اس وقت میں پولیس میں تھا۔ تب ہی جان گیا تھا کہ وہ زندگی بھر اسی طرح بدمعاش رہے گا۔"

"تم ہر وقت اپنی پیش گوئیاں مت کیا کرو۔" اسٹیوارٹ نے کہا۔ "اس طرح تم معاملے کو اور پیچیدہ بنا دیتے ہو۔"

"خیر بتاؤ کون ہے، مسئلہ کیا ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس بار اس پر لیونارڈو کے قتل کا الزام ہے۔"

"اوہ... معاملہ سنگین ہے۔"

"موت تمام تنازعات حل کر دیتی ہے۔" اسٹیوارٹ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"تم جس طرف بیٹھے ہو، وہاں سے دیکھو تو یہ بات ٹھیک لگے گی۔" پال نے کہا۔

"بات صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مجھے اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے، جگہ بتاؤ۔" پال نے ہتھیار ڈال دیے۔

"تو سنو..." یہ کہہ کر وہ اسے ملنے کا وقت اور مقام بتانے لگا۔

چالیس منٹ کے بعد دونوں ہنٹر پوائنٹ پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں انتہائی کنارے پر خون کے... دھبے دیکھنے کی کوشش کر چکے تھے۔ خون بارش کے باعث دھل چکا تھا البتہ بغور دیکھنے پر وہاں ہلکے کتھئی رنگ کے دھبے محسوس کیے جا سکتے تھے۔

بظاہر ان کے سامنے کچھ نہیں تھا مگر وہ یہ بات جانتے تھے کہ سڑک کے پار پرانے وکٹورین گھر کی دوسری منزل کی کھڑکی سے دو آنکھیں ان کی نگرانی کر رہی ہوں گی۔ وہ گھر کیس کے گواہ دکان دار کا تھا۔

"تم نے پولیس رپورٹ دیکھی ہے؟" پال نے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اسٹیوارٹ نے کچھ جواب دیے بغیر انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ فاصلے پر سامان ڈھونے والی ایک پرانی ویگن کھڑی تھی جو اب بے گھروں کے ایک نئے ٹھکانے میں بدل چکی تھی۔

"وہ یہاں بیٹھا تھا۔ تب مورس، لیونارڈو کے عقب سے آیا اور پیچھے سے ہی اسے مارنا شروع کر دیا۔ وہ جان چھڑا کر بچنے کے لیے بھاگا مگر مورس اس کا پیچھا کرتا رہا اور اس جگہ پر مورس نے لیونارڈو کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔" اسٹیوارٹ نے انگلی سے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ "پھر کھینچ تان میں اس کے کپڑے بھی پھٹ گئے۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا، وہ جان بچانے کی کوشش میں اسے گھونپ بیٹھا، کچھ مہلک ثابت ہوئے۔"

"اس نے یہ بیان دیا ہے؟" پال نے پوچھا۔

"یہ اڑتی اڑتی باتیں ہیں۔" اسٹیوارٹ نے کہنا شروع کیا۔ "پولیس اسے نفسیاتی ماہر کے پاس بھی لے گئی تھی، وہاں تھوڑے بہت معائنے کے بعد اسے جیل بھیج دیا گیا کیونکہ اس نے معاملے پر بات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"اپنے سارے آپشنز کھلے رکھنے کے لیے؟" پال کا لہجہ استفساریہ تھا۔

"تاکہ وہ پاگل بن سکے۔" اسٹیوارٹ نے بھی فوراً جواب دیا۔

پال نے زمین کو جوتے کی نوک سے تھوڑا سا کریدا اور آہستہ آہستہ زمین کھرچنے لگا۔ "سراغ رساں یہ کیوں سوچتے ہیں کہ مورس نے لیونارڈو کو پیچھے سے پکڑا اور مار پیٹ کرتے ہوئے نیچے دھکیل دیا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"کیونکہ یہ ان کی تھیوری پر فٹ بیٹھتا ہے۔"

پال نے چونک کر اسٹیوارٹ کی طرف دیکھا۔ "کون سی تھیوری؟"

"وہ اپنے بچپن میں قتل کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور دس سال اس نے کیلی فورنیا جیل کے اصلاحی مرکز میں گزارے۔ تین سال پہلے بھی اس پر قتل کا الزام لگا تاہم عدم ثبوت کی بنا پر وہ بچ گیا۔" یہ کہہ کر اسٹیوارٹ لمحہ بھر کو رکا۔ "پولیس سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوا۔ اس بار وہ پوری کوشش میں ہیں کہ اسے انصاف مل جائے۔" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ "اسی لیے وہ اپنی تھیوری پر مورس کو فٹ بٹھانا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھا۔

پال سنجیدگی سے کچھ سوچتا رہا۔ "تو بات یہ ہے کہ..." اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور لمحہ بھر کا توقف کیا۔ "تم سمجھتے ہو کہ ڈپٹی اٹارنی جنرل کی کوشش ہے کہ ایسا شخص جو جرم کرتا ہے مگر پھر باہر آ جاتا ہے اور ایک نیا جرم کرتا ہے اس لیے اب کی بار، اس کے باہر آنے کا راستہ ہر ممکن طور پر روک دیا جائے؟"

اسٹیوارٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "لیکن مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اس کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کرے گا یا پھر عمر قید چاہے۔"

پال نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے تقریباً بیس فٹ دور چلا گیا۔ اس کی نگاہیں سامنے باڑ کے ایک ڈنڈے پر جمی تھیں جس پر خون آلود ہاتھ کا نشان نظر آ رہا تھا۔ وہ خاصا دھندلا تھا مگر پال کی نگاہیں بہت تیز تھیں۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر تھا مگر پھر بھی اسے اچھی طرح دیکھ پا رہا تھا۔ اس نے ڈنڈے کے قریب جھاڑیوں پر نظر ڈالی۔ لگتا تھا کہ گھاس اور جھاڑیاں بھی کچھ دنوں پہلے کسی دھینگا مشتی میں بری طرح روندی گئی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ ہر شے کا بغور معائنہ کرتا رہا اور پھر پلٹ کر اسٹیوارٹ کے پاس گیا۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا؟" اسٹیوارٹ نے سوالیہ نگاہوں سے پال کو دیکھا۔

"لگتا ہے پولیس والے جائے وقوعہ پر دوسرا چپہ تو تلاش کرنا بھول گئے تھے۔" پال نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "واردات

میں ایک اور بھی چاقو استعمال ہوا ہے جس سے جھاڑیوں پر بھی وار پڑے اور وہاں کچھ خون بھی بہا جس کے ثبوت اب تک موجود ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تھیلا کھول کر اپنا ڈیجیٹل کیمرا نکالنے لگا۔ ''مجھے ان سب کی تصویریں لینی ہیں جنہیں تم عدالت کے سامنے ثبوت کے طور پر استعمال کر سکو گے۔''

اسٹیوارٹ پال کی باتوں پر غور کر رہا تھا کہ اسی دوران میں کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تو کیا آپ لوگ پولیس والے ہیں؟'' لہجہ نرم مگر شک سے بھرا ہوا تھا۔

اسٹیوارٹ چونک کر پلٹا۔ وہ سانولی رنگت کا کوئی بوڑھا شخص تھا۔ اس نے پرانی سی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سامنے کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس کا چشمہ بھی ٹوٹا ہوا تھا اور ایک طرف سے ڈنڈی کے بجائے اس میں ڈوری بندھی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر بھی کوئی ستر سال کے قریب ہوگی۔

''نہیں...'' اجنبی کی شخصیت کا گہری نظروں سے جائزہ لینے کے بعد اسٹیوارٹ نے جواب دیا۔ ''ہرگز نہیں... ہمارا تعلق قانون کے شعبے سے ہے۔''

بوڑھے نے یہ سن کر لمحہ بھر توقف کیا اور پھر ہاتھ کی ہتھیلیاں ایک دوسرے سے رگڑتے ہوئے بولا۔ ''کچھ ریزگاری ہوگی آپ کے پاس؟''

اسٹیوارٹ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ڈالر نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ ''تمہیں علم ہے یہاں دو تین رات پہلے ایک قتل ہوا تھا، کچھ سنا ہے تم نے اس بارے میں؟''

''ہاں۔'' اس نے ڈالر جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیونارڈو کا قتل ہوا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے دونوں کی طرف دیکھا۔ ''سنا ہے وہ کسی ایسے شخص سے الجھ پڑا تھا جو یہاں کا رہنے والا نہیں تھا۔''

''تم اور کیا جانتے ہو اس قتل کے بارے میں؟'' یہ کہتے ہوئے اسٹیوارٹ نے دس ڈالر کا ایک اور نوٹ جیب سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ بوڑھے کی نظر نوٹ پر جمی ہوئی تھی۔

''کس کے بارے میں؟'' اس نے اسٹیوارٹ کی طرف دیکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''مرنے والے کے بارے میں، جو کچھ بھی تم جانتے ہو۔'' اسٹیوارٹ نے نوٹ اس کی طرف لہراتے ہوئے شفقت سے ہوئے کہا۔

''میں اس رات اُدھر بیٹھا چرس پی رہا تھا۔'' بوڑھے نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہ جگہ جائے وقوعہ سے کچھ فاصلے پر تھی۔

''پھر تو تم نے کچھ ضرور سنا ہوگا؟''

''ہاں...'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ زور زور سے گالیاں بک رہا تھا۔ لگتا تھا شدید غصے میں ہے۔''

''وہ کس کی آواز تھی؟'' اسٹیوارٹ نے کہا۔

''لیونارڈو کی...'' اس نے فوراً جواب دیا۔ ''میں اس کی آواز بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ غصے میں کسی پر برس رہا تھا۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' اسٹیوارٹ نے یہ پوچھتے ہوئے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اسی دوران کوئی طاقت ور سا آدمی لیونارڈو کو گھسیٹنے لگا۔'' بوڑھے نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر دو رات پہلے پیش آنے والے واقعات کو ذہن میں دہراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''مگر کیسے؟'' اسٹیوارٹ نے پوچھا۔

''ایسے...'' بوڑھے نے دونوں بازو سامنے کیے اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر سمجھایا۔

''لیونارڈو کے ہاتھ میں کچھ تھا؟'' اس بار سوال پال نے کیا۔

''پتا نہیں...'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''ایک تو میں دور تھا، اوپر سے اندھیرا بھی تھا۔''

پال نے بھی کندھے اُچکائے۔ وہ لگ بھگ ایک اور چاقو تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اگر بوڑھے کو پتا نہیں بھی تھا تو اس سے کم از کم اُسے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے وہ دوسرا چاقو اُس کے ہاتھ میں ہوگا جو کیس کا نقشہ پلٹ سکتا ہے۔

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟'' اسٹیوارٹ نے پال کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔

''اس کے بعد کافی دیر تک ان کے درمیان ہاتھا پائی ہوتی رہی۔'' بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ ''پھر وہ دونوں گتھم گتھا ہوئے، سائڈ واک کی طرف نیچے کی سمت بڑھتے ہوئے گر گئے۔''

''اس کے بعد تم نے کچھ دیکھا یا سنا؟''

''ہاں...'' بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ ''ان کی چیخ پکار سے میرا نشہ خراب ہو رہا تھا۔ میں کہیں اور جا کر بیٹھنے کے ارادے سے اٹھا تھا۔ تب میں نے نیچے سے ایک زوردار آواز سنی...''

''کیا سنا تھا؟'' اسٹیوارٹ نے اس کی بات کاٹی۔

''لیونارڈو... تم اب نہیں رک سکتے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس کے بعد ایک زوردار چیخ سنائی دی۔ شاید وہ لیونارڈو کی آواز تھی۔ بس اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

اسٹیوارٹ سمجھ گیا کہ بوڑھا جو جانتا تھا، وہ سب کچھ بتا چکا ہے۔

اس نے پال کو دیکھا جو اسی اثنا میں ایک بار پھر لوٹ آیا تھا۔ اسٹیوارٹ نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ پال مسکرا دیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اسے سکون ملا۔ اس کے لیے یہ بہت ہی بڑی بات ہوتی کہ موریس بنا پیرول پر رہائی کی رعایت کے، ساری عمر جیل میں گزار دے۔ اسے اپنی نیک نامی کی اس سے زیادہ فکر تھی۔ اسے تو ویسے بھی چیلنج قبول کرنے والے کامیاب وکیل کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے وہ ناکامی قبول کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔

اسی دوران میں سمندری ہوا کا ایک سرد جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اسے خنکی کا احساس ہوا۔ اس نے کوٹ کو سینے کی طرف اور لپیٹنے کی کوشش کی اور چہرہ ہوا کے مخالف رخ پر کر لیا۔ وہ موسم بہار کے ابتدائی ایام تھے مگر موسم کی ٹھنڈک برقرار تھی۔ اس نے زوردار سانس لی۔ اس کا سینہ ٹھنڈک سے بھر گیا۔ اس نے ایک بار بوڑھے کی طرف دیکھا۔ ''تم رہتے کہاں ہو؟'' یہ سنتے ہی وہ بوڑھا مسکرا دیا۔ اسٹیوارٹ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ ایک بے گھر سے اُس کے گھر کا پتا پوچھ رہا ہے۔ وہ ذرا سا گڑبڑا گیا اور پھر فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا مطلب تھا کہ تم رات کو کہاں سوتے ہو؟''

''اگر کسی کے ساتھ باتیں کرنے کا موڈ ہو تو پھر ریسکیو مشنری سروسز کے شیلٹر میں ورنہ...'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''وہاں ذرا ہمارا اپنے جیسے مل جاتے ہیں نا، وقت اچھا کٹ جاتا ہے اور کھانے پینے کا انتظام بھی ہو جاتا ہے مفت میں۔'' یہ کہہ کر اُس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''اور جب تمہارا کسی کے ساتھ باتیں کرنے کا موڈ نہ ہو تو؟'' اسٹیوارٹ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''تو پھر یہیں کہیں پر، درختوں کے نیچے، اِدھر اُدھر تھیلا لیے ساتھ۔ بس جگہ مل گئی تو لیٹ گیا۔ نیند کے بعد کیا گرمی، کیا سردی۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرا دیا۔

''اور جس رات یہ قتل ہوا، اس رات تم کہاں سوئے تھے؟'' اسٹیوارٹ نے سگریٹ نکال کر ایک اس کی طرف بڑھائی۔

''شکریہ...'' اس نے سگریٹ تھامتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو میں کہہ...''

''میں کہاں سویا تھا اُس رات...'' بوڑھے نے ناک منہ سے سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ''یہی پوچھا تھا تم نے...؟''

اسٹیوارٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اُس رات مجھے کسی سے باتیں کرنے کی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔''

اسی دوران پال نے جیب سے اپنا ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر کچھ لکھ کر بوڑھے کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو...'' اس نے کہا۔ ''آج رات تمہیں کسی سے باتیں کرنے کی طلب ہو یا نہ ہو مگر کسی کو تم سے بات چیت کی طلب ضرور ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے کارڈ تھامتے ہوئے کہا۔

''روزی ان جاؤ اور یہ کارڈ مسٹر پیٹر کو دے دینا۔ وہ تمہیں وہاں آج رات رہنے کے لیے ایک کمرا دے دیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کو اُسے غور سے دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ ''تمہارے کھانے اور پینے کا بھی معقول بندوبست ہو جائے گا۔''

''سچ...'' بوڑھے کی آنکھیں پھیل گئیں، لہجے سے خوشی عیاں تھی۔

''بالکل سچ۔'' پال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اسٹیوارٹ مقررہ وقت پر عدالت پہنچ گیا۔ آج موریس کے کیس کی سماعت ہونے والی تھی۔ پال بھی کمرائے عدالت میں پہنچنے والا تھا۔ آج اسٹیوارٹ کا دل بھی سیکنڈوں کو ظاہر کرنے والی سوئی کی طرح تیز تیز دوڑ رہا تھا۔ اس نے کمرائے عدالت کے باہر لگی گھڑی دیکھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ چند منٹوں میں اس کا کیس لگنے والا ہے۔ وہ سیدھا کمرے میں داخل ہوا اور وکیل صفائی کے لیے مخصوص کرسی کی طرف بڑھا۔ اس کی میز اس کٹہرے کے قریب تھی جہاں ملزم کو بٹھایا جاتا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں فائلوں کا پلندا تھام رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر پسینا بہہ رہا تھا۔ اس نے میز پر پلندا رکھا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے ہی مارشل کی وہ اونچی میز تھی جس پر کیس سے متعلق شواہدات رکھے جاتے تھے۔ قریب ہی پال بیٹھا تھا۔

''لائن 54، کیس نمبر 187 پی سی۔ ملزم کو کٹہرے میں لایا جائے۔'' پیشکار کی آواز گونجی اور پھر چند منٹوں میں ہی

دو پولیس والے موریس کو لے کر اندر پہنچے۔ اسے کٹہرے میں رکھی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اسٹیوارٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

جج پہنچ چکا تھا۔ اسٹیوارٹ اپنے دلائل دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے ایک مبینہ قاتل کا دفاع کرنا تھا جبکہ کمرائے عدالت سے دو سو گز دور اسپتال کے مُردہ خانے میں پوسٹ مارٹم ٹیبل پر چادر سے ڈھکی ایک لاش تھی۔ وہ لاش جس کا مبینہ قاتل اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔

وہ اٹھا اور موریس کے چہرے پر نظر ڈالتا ہوا جج کے قریب پہنچا۔ اسٹیوارٹ کے ہاتھوں میں چند فائلیں تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے جج کے کلرک کو تھمایا اور اس نے اٹھ کر انہیں جج کے سامنے رکھ دیا۔

اس دوران میں اسٹیوارٹ مڑا اور موریس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ ”میں جائے وقوعہ پر گیا تھا۔“ موریس نے یہ سن کر اپنی آنکھیں پھیلائیں جیسے اسے یا تو سمجھ نہیں آیا یا پھر وہ جاننا چاہتا تھا کہ اُس کا اگلا جملہ کیا ہوگا۔ اس کے چہرے پر کسی بچے کے مانند معصومیت طاری تھی۔ ویسے بھی جہاں وہ بیٹھا تھا، اُس جگہ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا تھا۔ دو وکیل ایک جج... فیصلہ ان کے درمیان تھا۔ تین لوگوں میں اس کی امید صرف اپنے وکیل سے تھی۔

اسی دوران میں کمرائے عدالت میں جج کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ”مسٹر اسٹیوارٹ... کیا آپ ملزم کا دفاع کر رہے ہیں؟“

”جی ہاں یور آنر...“ اس نے جج کے سامنے ذرا سا جھک کر خالص پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ ”یور آنر... کیا مجھے اپنے کلائنٹ سے ایک منٹ کے لیے بات کرنے کی اجازت مل سکتی ہے؟“

یہ سن کر جج نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد کہا۔ ”اجازت ہے مگر کم از کم وقت۔“ اس کا لہجہ تنبیہ آمیز تھا۔ ”ہمیں دوسرے مقدمے بھی سننے ہیں۔“

اسٹیوارٹ، موریس کی طرف مڑا اور قدم بڑھا کر اس کے اتنے قریب آ گیا کہ انہیں ایک دوسرے کے سانس لینے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ”پُر اعتماد رہو۔ ہم نے ایسا ثبوت حاصل کر لیا ہے جسے کوئی بھی رد نہیں کر سکے گا۔“ اس نے موریس کے کان میں سرگوشی کی۔ موریس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”ویسے ثبوت رد بھی ہو سکتا ہے۔“ موریس نے یہ سنا تو اس کی نگاہوں میں جیل کا بھیانک منظر گھوم گیا۔ دیکھا جائے تو اسے جیل کے نام سے ہی خوف آنے لگا تھا۔ اسے

خطرناک قیدیوں والی بیرک میں رکھا گیا تھا۔ موریس ان کے درمیان بہت ڈرا ڈرا رہا تھا۔ اسے یہ سن کر شدید حیرت ہوئی کہ اگر اس کا وکیل ناکام رہا تو پھر نہ جانے کب تک اسے جیل کی کوٹھری میں رہنا پڑے اُن خطرناک قیدیوں کے ساتھ... شاید پوری عمر۔

”تم جیل کے مقابلے میں نفسیاتی اسپتال میں کتنا عرصہ رہ سکتے ہو؟“ اسٹیوارٹ نے سرگوشی کی۔

”شاید پوری زندگی اگر زندگی بچتی ہے تو...“ موریس کے لہجے سے خوف عیاں تھا۔ کہاں وہ نفسیاتی اسپتال کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا مگر اب جان بچانے کے لیے پوری زندگی وہیں بسر کرنے پر آمادہ تھا۔

اسٹیوارٹ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک منٹ کا وقت تھا، پچیس سیکنڈ میں بات ختم ہو گئی۔ وہ مڑا اور جج کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ”یور آنر...“ اس نے جج کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔ ”میرا کلائنٹ شدید ذہنی دباؤ یا پھر دماغی صحت کے سنگین معاملات سے دوچار ہے۔ وہ نہ تو مقدمے کی سماعت، اس کا طریقۂ کار سمجھ پا رہا ہے اور نہ ہی اپنے دفاع کی تیاریوں میں اپنے وکیل کی مدد کرنے کے قابل ہے۔“

”تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟“ جج نے پوچھا۔

”میرے کلائنٹ کو اس وقت فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ اسے دماغی صحت کے اسپتال منتقل کر دیا جائے۔“

جج نے یہ سن کر سرکاری وکیل کی طرف دیکھا۔ ”کوئی اعتراض؟“

جج کی بات سن کر وہ فائلوں کے صفحات الٹ پلٹ کر انہیں بغور دیکھنے لگا۔ اسٹیوارٹ دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ راضی ہو جائے۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ کھڑا ہوا اور جج کی طرف دیکھا۔ ”کوئی اعتراض نہیں یور آنر۔“

یہ سن کر جج نے کلرک کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آرڈر لکھواتا، اسٹیوارٹ نے مداخلت کی۔ ”یور آنر... میرے موکل کی دماغی صحت اور مقدمے کی سنگین نوعیت کے پیشِ نظر بہتر ہے کہ سماعت اگلے چھ ماہ کے لیے ملتوی کر کے اس کے بعد کی تاریخ دی جائے تاکہ مقدمے کی بہتر تیاری کی جا سکے۔“ یہ کہہ کر اس نے رحم طلب نگاہوں سے جج کی طرف دیکھا۔

جج نے اثبات میں سر ہلا کر آرڈر لکھوایا۔ کچھ ہی دیر بعد عدالتی بیلف پولیس کے ساتھ موریس کو نفسیاتی اسپتال پہنچانے جا رہا تھا۔

☆☆☆

”اے اسٹیوارٹ... رکو، ارے رکو بھی یار...“ یہ پال کی آواز تھی جو اس کے عقب سے آ رہی تھی جسے سنتے ہی وہ تیزی سے پلٹا۔ اس وقت وہ فری وے کی فٹ پاتھ پر چل رہا تھا اور گاڑیوں اور ہارن کے شور میں پال کی آواز سن لینا خود اس کے لیے بھی حیرانی کی بات تھی۔ اس نے چند سیکنڈ تک بھیڑ بھاڑ میں اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ آخر وہ اسے سامنے سے آتا نظر آ گیا۔

پال اس سے کچھ غصے پر تھا کہ اس نے وہیں سے چلانا شروع کر دیا۔ ”تم تو خوب رہے، میرے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ میں ادھر جھک مارتا رہا اور تم نے مقدمہ ہی چھ ماہ کے لیے بند کرا دیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اسے گھورنے لگا۔ ”اب بتاؤ... اس بوڑھے کا کیا کروں؟ وہ بھی خوامخواہ کمبل بن گیا ہے میرے لیے۔“ پال کے لہجے میں غصہ اور تشویش کے ملے جلے تاثرات تھے۔

”اسے واپس جا کر جھاڑیوں میں لوٹ لگانے دو۔“

”تو کیا واقعی اب تم یہی چاہتے ہو؟“ پال نے استفساریہ لہجے میں کہا۔ وہ حیران تھا کہ کہاں اسٹیوارٹ اس کیس میں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا تھا اور اب یہ بے اعتنائی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ”تو تم نے اس کا بیان ریکارڈ نہیں کرانا؟“

”نہیں۔“

”تو کیا تم واقعی ایسا چاہتے ہو؟“ اس نے حیرانی سے متفسرانہ لہجے میں کہا۔ ”جانتے ہو اس کے بیان سے کیس کا رخ پلٹ سکتا ہے۔“

”جانتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”مگر کیس چھ ماہ تک ملتوی ہو چکا اور تب تک، مجھے ہرگز امید نہیں کہ وہ جی پائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ”اس کی جسمانی حالت دیکھی ہے تم نے، لگتا ہے کہ بس چند ہفتوں کا مہمان ہے۔ اب تم نے اس کی گواہی کیا لینی اور ویسے بھی مردے بولا نہیں کرتے اور جج انہیں سنا نہیں کرتے۔“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ”ویسے بھی سچ تو یہ ہے کہ اب موریس کا مقدمہ اور نہیں چلے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب چھوڑو۔“

”ٹھیک ہے تو پھر میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے بس کا ٹکٹ اسٹیوارٹ کے سامنے لہرایا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم بنٹ ڈیوڈ کے قانون کے تحت، اگر اس کا بیان پیش کرتے تو موریس کی سزا تو عمر قید یا موت ہے۔“

”سزائے موت سے تو وہ اب بھی بچ گیا۔“ اسٹیوارٹ معنی خیز انداز میں ہنسا۔

”لگتا ہے اسے پاگل بناتے بناتے تم خود پاگل ہو گئے ہو۔“

اسٹیوارٹ کچھ نہ بولا۔

”مجھے تو لگتا تھا کہ اگر تم بوڑھے کا بیان بنیاد بنا کر سیلف ڈیفنس کا نکتہ اٹھاؤ تو کیس جیت سکتے ہو۔ ویسے بھی ہمیں دوسرا چاقو مل گیا ہے۔ اس پر لیونارڈو کی انگلیوں کے نشانات بھی ہیں اور موریس کا خون بھی لگا ہے۔ سب کچھ ڈی این اے سے ثابت ہو سکتا ہے مگر...“ پال غصے سے مڑا۔ ”لگتا ہے تم یہ کیس نہ جیت کر اپنا ریکارڈ خراب کرنا چاہتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ واپس چل دیا۔

اسٹیوارٹ پال کو آگے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کا پرانا دوست تھا۔ اسے یقین تھا کہ پال اس سے بہت زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکتا۔ ”اب موریس کو کبھی بھی کسی جج کے سامنے پیش ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“ وہ بڑبڑایا۔

وہ اس وقت نفسیاتی اسپتال سے لوٹ رہا تھا جہاں موریس داخل تھا اور اس کے علاج کی ذمے داری اس کے ایک دوست پر تھی۔ ڈاکٹر نے یقین دلا دیا تھا کہ بس دو ڈھائی مہینے کی بات ہے، پھر موریس اس قابل نہیں رہے گا کہ واپس انسانوں کی دنیا میں لوٹ سکے۔

”موریس! تم نے اپنے سوتیلے باپ کو مار کر اچھا نہیں کیا۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور آگے بڑھا۔ اس وقت اسے اپنا باپ شدت سے یاد آ رہا تھا۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں اس شخص کا سب سے بڑا بیٹا ہوں جس نے تمہاری ماں سے اُس وقت دوسری شادی کی جب تم صرف چھ ماہ کے تھے اور میں سترہ سال کا۔ تب تو تم بچپن کے باعث سزا سے بچ گئے تھے مگر اب تمہیں جیتے جی مار کر... میں نے سمجھو اپنے باپ کے قتل کا بدلہ اپنے ہی ہاتھوں سے لیا ہے۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے انگلی کی پور سے آنکھیں صاف کیں اور بدستور اپنی دھن میں آگے بڑھتا رہا۔ ”تمہیں بھلے ہی وہ پیسے مانگنے پر مارتا پیٹتا ہو مگر اس نے مجھے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے اسے اپنے دل کے قریب درد کی لہر محسوس ہوئی۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اسے اپنے مرحوم باپ سے بہت محبت تھی۔ برسوں اس نے اپنے باپ کے قاتل سوتیلے بیٹے سے انتقام لینے کا انتظار کیا تھا۔ آج اس کا انتقام منزل پر پہنچ چکا تھا۔

لاحاصل

طاہرہ وحید معل

قسط 39
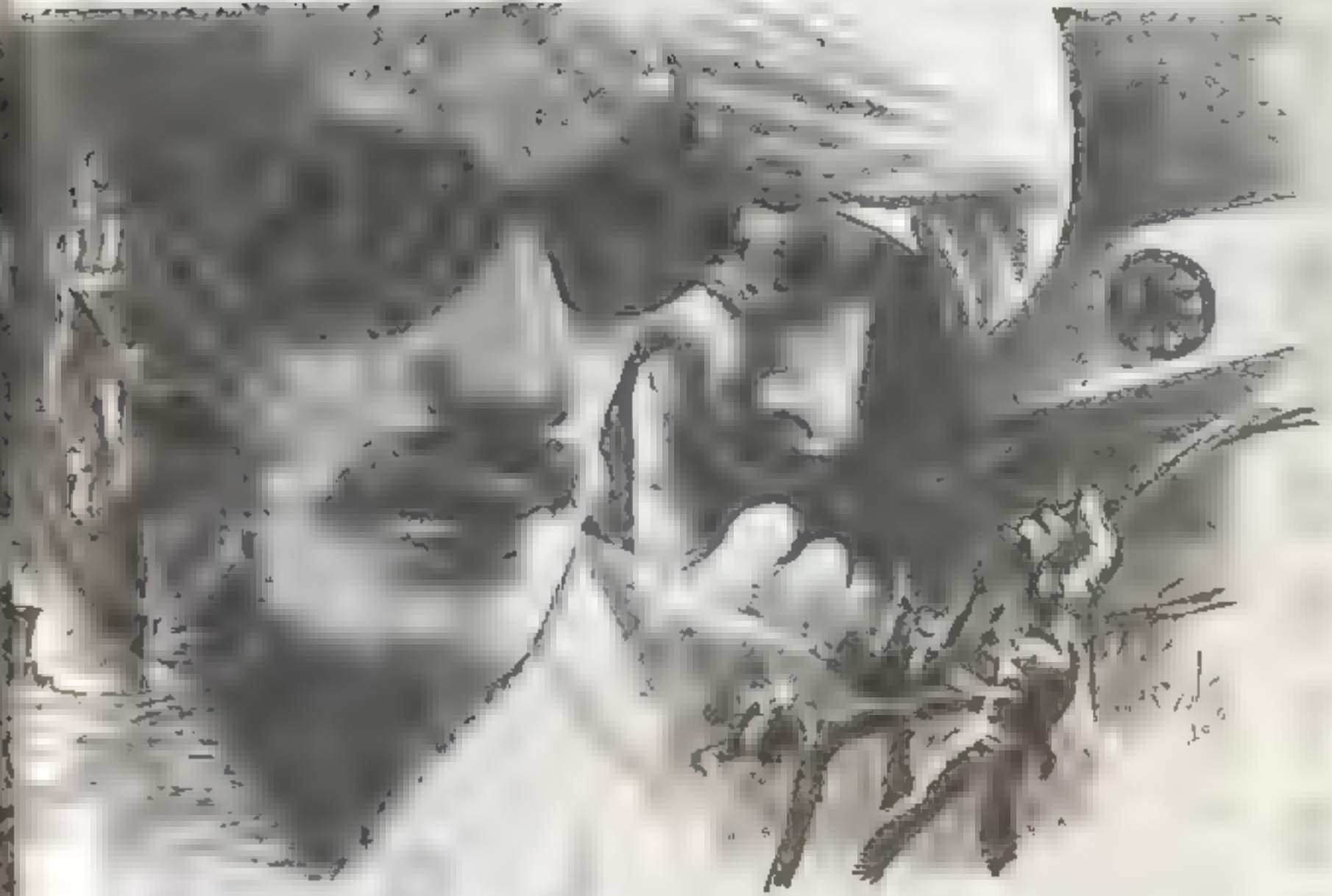
زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے۔۔ مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔ سرپھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر [illegible] و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔۔ ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان۔ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے۔ عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے۔ جبکہ دوسرے عاشق کا مطمحِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت ہے اس کے قلب و نظر عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیتا ہے۔ کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر۔۔ رہتا ہے

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو جوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واصف عرف واجی نے ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات عمران [illegible] سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج [illegible] میڈم صوفیہ کے لیے کام کرتا ہے۔ عمران کے ہاتھوں [illegible] کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اسی دوران میں ماں کی [illegible] نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں ایک راجپوت لڑکی سلطانہ نے مجھے بتایا کہ [illegible] ہوئی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے اور میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور [illegible] سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہم جوڈو کراٹے کے نامور چیمپئن جیکی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے [illegible] کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ پھر سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفاخانے میں گھس گئے۔ [illegible] نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کرکے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ پھر مقابلہ ہوا۔ ماریا ماری گئی۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں رنگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر پرانے قلعے میں آ گئے۔ [illegible] چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے رنگاں سے نکلے اور الٰہ آباد پہنچ گئے پھر ہمیں [illegible] کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ میں اور عمران [illegible] میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ ڈاکٹر مہناز سے جلالی نے خفیہ نکاح کر لیا تھا۔ مجھے [illegible] نے قید کر لیا۔ جلالی کا سیکریٹری ندیم جاوا گروپ سے ملا ہوا تھا۔ [illegible] میں وہاں سے بھاگ نکلا اور عمران تک پہنچ گیا۔ [illegible] ہوٹل میں پھر میں اور عمران فارم ہاؤس آ گئے۔ ایک رات پتا چلا کہ [illegible] فارم ہاؤس سے کسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ جلالی صاحب موت کے قریب تھے۔ انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ہم مہناز کی والدہ کو [illegible] کر کے واپس کوٹھی پر آ گئے۔ اسی دوران میں ہمیں مہناز کے حوالے سے [illegible] ملا۔ ایک دن جلالی کے [illegible] یوسف ایک بنگلے میں کسی ڈی ہیروئن کے ساتھ رات گزار رہا ہے۔ وہاں سے واپسی میں اس کا جھگڑا ہو گیا۔ [illegible] تاہم اس دوران میں یوسف زخمی ہو چکا تھا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ پھر یوسف اسپتال سے غائب ہو گیا۔ میں نے جتو عرف کرشمہ کپور کو [illegible] ایک سرحدی گاؤں [illegible] گیا جہاں حویلی تھی۔ میں حنیف نامی شخص سے معلومات لے کر آ گیا۔ پھر میں اور ثروت دوبارہ گاؤں پہنچے۔ [illegible] حنیف کی بیوی نے چودھری کو ہمارے بارے میں آگاہ کر دیا۔ ہمیں پکڑ لیا گیا تاہم [illegible] کی مدد سے ہم وہاں سے فرار ہوئے۔ راستے میں [illegible] گیا۔ ہمیں چودھری کے کارندوں نے گھیر لیا تاہم میری جوانمردی کے آگے وہ سب پسپا ہو گئے۔ ہم وہاں سے بھاگ کر ایک ٹیلے پر پہنچ گئے۔ [illegible] سنگھ نامی ایک سکھ کی مدد سے نکل کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ ہم پاکستانی بارڈر پار کر گئے تھے اور اس وقت انڈین علاقے میں تھے۔ جگت سنگھ کی مدد سے ہم نے یوسف کا سراغ لگایا جو ایک سکھ سردار کی حویلی میں قید تھا۔ میں اور ثروت [illegible] اوتار سنگھ کی حویلی میں پہنچ گئے۔ میں یوسف کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔ [illegible] جگت سنگھ کی مدد لی۔ جس رات یوسف کو خطرناک سفر پر لے جایا جانا تھا، اسی رات [illegible] کارروائی کی۔ یوسف کی گاڑی میں [illegible] علیحدہ کرنے لگا تاہم مجھے پکڑ لیا گیا۔ اوتار سنگھ [illegible] حویلی پر [illegible] جس کی وجہ سے ہم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ یوسف [illegible] ثروت میرے خلاف [illegible] وہ دونوں مجھ سے اکھڑے اکھڑے تھے۔ ایک موقع پر وہ دونوں مجھے چھوڑ کر نکل گئے۔ [illegible] ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ جگت بھی ہمارے ساتھ تھا۔ [illegible] ثروت بھاگ نکلی تاہم [illegible] بھی پکڑ لیا گیا۔ [illegible] ثروت [illegible] ساتھ تھے۔ پھر مجھے ایک پارٹی میں لے جایا گیا جہاں آگ لگنے سے بھگدڑ مچ گئی۔ [illegible] خطرناک سرکس میں حصہ لیا مگر [illegible] وہاں سے رہا کیا گیا۔ تاہم ثروت ضمانت کے طور پر وہیں رہتی۔ ہم ممبئی پہنچ گئے [illegible] وہاں سیٹھ سراج اور واجی کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ ہم نے وہاں موجود تمام لوگوں کو ختم کر ڈالا۔ واجی اور سیٹھ سراج کی [illegible] تھے کہ اچانک وہاں تیز الارم بجنے لگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اب اس کانفرنس ہال میں، عمران اور میں اکیلے تھے۔ ہمارے چاروں طرف خون کے چھینٹے تھے، گولیوں کے خول تھے اور لاشیں تھیں۔ ان میں سے دس لاشیں تو اس عارضی کیبن کے اندر تھیں جہاں ٹمپریچر آنا فانا 250 سینٹی گریڈ تک پہنچ گیا تھا اور دس افراد کو جھلسا کر مار گیا تھا۔ ان لاشوں میں اس گارڈ کی لاش بھی تھی جس کے پاؤں کا پنجہ بلٹ پروف دیوار کے نیچے آ کر کٹ گیا تھا۔ ان لاشوں پر آبلے تھے اور جلے گوشت کی سڑاند اٹھ کر پورے ہال میں پھیل رہی تھی۔

طویل میز کے اردگرد پڑی لاشوں میں سراج کے بیٹے

واجی کی لاش سب سے اہم تھی۔ وہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ حجرے سے بیٹھا مووی دیکھ رہا تھا۔ اب وہ خود ایک دردناک کہانی کے "انجام" کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ درحقیقت یہاں یہ سب کچھ آنا فانا شروع ہو کر آنا فانا ہی ختم ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ یہاں ثروت موجود ہوتی اور وہ واجی کی اس خونچکاں لاش کو دیکھتی۔

الارم مسلسل بج رہا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"یہ تو دروازہ کھول کر ہی پتا چلے گا۔ تم تیار ہو جاؤ۔" عمران نے کہا اور اپنے چہرے پر اسکائی ماسک چڑھا لیا۔

میرے چہرے پر ماسک پہلے ہی موجود تھا۔ ہم نے ہال میں موجود گن، رائفلیں، دو پستول اور کلہاڑی ایک جگہ جمع کیں اور انہیں ایک الماری کے اندر چھپا دیا۔ ہمارے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں بالکل تیار حالت میں موجود تھیں۔ احتیاط کے طور پر میں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ نکاسی کے دروازے کے پاس ہی ایک چھوٹا کنٹرول پینل موجود تھا۔ عمران نے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے، آخر مطلوبہ بٹن ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس بٹن کے دبتے ہی ہال کے مین دروازے میں تھوڑی سی حرکت پیدا ہوئی۔ عمران نے بڑی احتیاط سے بٹن دبایا اور اس سلائڈنگ ڈور کو فقط چار پانچ انچ تک ہی کھولا۔ چار پانچ انچ کی اس درز میں ڈرے ہوئے دو تین چہرے نظر آئے۔ یہ گارڈز نہیں تھے۔ یہ وومن بلڈنگ میں مختلف کام کرنے والے ملازم پیشہ لوگ تھے۔ عمران درز کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا تھا اس لیے یہ لوگ اندر کے مناظر وضاحت سے نہیں دیکھ سکے۔ یقینا عمران کے چہرے پر ماسک دیکھ کر وہ چونکے ہوں گے لیکن کسی نے بھی اس ماسک کو خاص اہمیت نہیں دی۔ عینک والا ایک شخص چلا کر بولا۔

"غضب ہو گیا ہے۔ بڑے باس... گر پڑے ہیں۔ چھت سے گرے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"پچھلے صحن میں... واجی صاحب کہاں ہیں؟ تیواری صاحب کہاں ہیں؟" عینک والا بری طرح ہکلا رہا تھا۔

عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ پھر پینل پر بٹن دبا کر دروازہ پورا کھول دیا۔ باہر تقریباً چھ سات افراد موجود تھے۔ ان میں سے کوئی مسلح نہیں تھا۔ "ہینڈز اپ۔" عمران غرایا۔ ان میں سے ایک بھاگ گیا، باقی پانچوں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

ہال کے اندر کے مناظر دیکھ کر یہ پانچوں افراد ششدر تھے۔ عمران نے انہیں دھکیل کر ایک اسٹور نما کمرے میں لاک کر دیا۔

کہیں پاس ہی دھڑا دھڑ دروازہ بجایا جا رہا تھا۔ یہ کمرا نمبر تین کا دروازہ تھا۔ یہی کمرا تھا جس میں ہم نے انوپم کے مشورے سے گارڈز کو بند کیا تھا۔ گارڈز کو اب گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ ممکن تھا کہ باہر سے کسی نے انہیں سیل فون پر بتا دیا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب وہ دروازہ کھولنا چاہ رہے تھے لیکن یہ دروازہ باہر سے لگنے والی چابی ہی کھول سکتی تھی اور یہ چابی ان دو گچھوں کے اندر تھی جو ہمارے پاس تھے۔ پھر اندر سے فائرنگ کی مدھم آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ دروازے کے لاک پر فائر کر رہے ہیں۔

"یہ تو خطرناک ہے۔ یہ باہر نکل آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں لگتا، ایسا ہو گا۔ انوپم نے کہا تھا کہ یہ دروازہ بالکل محفوظ ہے۔"

کچھ دیر تک کمرا نمبر تین کے اندر گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجتی رہی، تب ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ انوپم نے ٹھیک کہا تھا۔ گارڈز دروازہ نہیں توڑ پائے تھے۔

اچانک ایک طرف سے نیلی وردی والے دو گارڈز نمودار ہوئے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ عمران نے ان کا خطرناک انداز دیکھ کر سائلنسر لگے پستول سے گولی چلائی اور وہ دونوں سر میں گولیاں کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اس موقع پر کوئی رسک لینے کو تیار نہیں۔ گارڈز کے پیچھے تین اور افراد تھے، یہ وہی لوگ تھے جو ایک سیٹ پر شوٹنگ میں مصروف تھے۔ وہ پولیس والا بھی تھا جسے نیم عریاں لڑکیاں شراب پلانے اور گناہ پر آمادہ کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ پولیس والا بھی یقینا کوئی اداکار ہی تھا۔ دونوں گارڈز کا انجام دیکھنے کے بعد یہ تمام افراد سکتہ زدہ کھڑے رہ گئے۔

"یہاں کا منیجر کہاں ہے؟" عمران نے پولیس کی وردی والے سے پوچھا۔

"مم... مجھے نہیں پتا۔ میں تو یہاں ریکارڈنگ میں حصہ لینے آیا ہوں۔" وہ ہراساں آواز میں بولا۔

اس کے ساتھ ہی، موٹی توند والے نے کہا۔ "منیجر تو تیواری صاحب تھے۔ وہ اس سے اپنے گھر پر ہوں گے۔" اسے پتا نہیں تھا کہ تیواری اپنے جرموں کا حساب دینے کے لیے عالم بالا کی طرف پرواز کر چکا ہے۔

عمران بولا۔ "میں چھوٹے منیجر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، شاید سروش نام ہے اس کا۔"

"وہ... لاک اپ کی طرف گئے ہیں جی۔" تیسرا بندہ بولا۔

"چلو اس کے پاس۔" عمران نے سفاک لہجے میں کہا اور رائفل کو حرکت دی۔

ان تینوں افراد کا وہی حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ شاید انہیں ابھی تک اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ دو سیکنڈ کے اندر دونوں گارڈز موت کے سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ گولڈن بلڈنگ میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ہم ان تینوں افراد کو ہانک کر ایک تنگ کوریڈور میں پہنچے۔ یہاں قالین بچھے ہوئے تھے، اور چھت خاصی نیچی تھی۔ موٹی توند والا سب سے آگے تھا۔ کوریڈور کے آخری سرے پر ایک کمرا نظر آیا۔ کمرے کے اندر سے کسی کے گرجنے برسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

توند والے شخص نے انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ یہی لاک اپ ہے۔

عمران نے کوریڈور میں نظر آنے والا ایک دروازہ کھولا۔ اس طرح کے دروازے سارے کوریڈور میں موجود تھے۔ یہ ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ یہاں مساج کے لیے استعمال ہونے والے دو فٹ چوڑے کئی بیڈ پڑے تھے۔ مساج کے دیگر لوازمات بھی نظر آ رہے تھے لیکن کوئی بندی بندہ موجود نہیں تھا۔ عمران نے تینوں افراد کو کمرے میں دھکیلا۔ "چلو ایک دوجے کا مساج کرو۔ اگر نہیں کرنا تو بس چپ چاپ لیٹے رہو۔ آواز باہر آئی تو گولی اندر آئے گی۔"

تینوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور کمرے میں چلے گئے۔ عمران نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

جو شخص لاک اپ میں گرج برس رہا تھا، اس کی آواز اب کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ وہ کسی پر دہاڑ رہا تھا۔ "دے گالی... اب دے... اب دے۔"

ایک بیٹھی ہوئی سی آواز صاف سنائی دی۔ "تو کتے دا پتر..."

طمانچوں اور گھونسوں کی آوازیں آئیں۔ کسی کو بری طرح پیٹا جا رہا تھا، چند سیکنڈ بعد گرجنے والا پھر گرجا۔ "دے گالی... دے گالی۔"

بھرائی ہوئی آواز پھر ابھری۔ "کتے دا پتر..."

اس بار طمانچوں اور گھونسوں کے بجائے شڑاپ شڑاپ کی آواز ابھری۔ مجھے لگا کہ یہ چمڑی کوڑے کی آواز ہے۔ قریباً نصف منٹ تک کوڑا پھنکارتا رہا پھر مارنے والا دانت پیس کر پھنکارا۔ "نکال گالی... پھر نکال۔"

اس مرتبہ گالی دینے والے کی آواز پہلے سے بھی بلند تھی۔ وہ زہرناک لہجے میں بولا۔ "وڈے کتے دا پتر..."

یعنی اب اس نے اپنی گالی میں وڈے کے لفظ کا اضافہ کر لیا تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ یقیناً یہ تعریف اندر والے اس شخص کے لیے تھی جو سخت مار کھانے کے باوجود بھرائی ہوئی آواز میں، مارنے والوں کو مغلظات سنا رہا تھا۔

مجھے ساگوان کے چوڑے دروازے میں کی ہول نظر آیا۔ میں نے ذرا جھک کر ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر کے منظر نے مجھے بری طرح چونکایا۔ مجھے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں اپنے میزبان جگت سنگھ کو یہاں دیکھوں گا۔ جگت سنگھ کے جسم پر کئی چوٹیں تھیں اور اس کے لباس پر خون کے پرانے اور تازہ دھبے تھے۔ اس کی پگڑی غائب تھی، کیس کھلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے اور انہیں آہنی کڑوں میں کس دیا گیا تھا۔ اس کی ٹانگیں بھی دونوں اطراف میں پھیلی تھیں۔ وہ بھی کڑوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ جگت سنگھ کی طرح ایک اور جوان سال بندہ بھی لاک اپ میں بند تھا۔ اس نے بھی جگت کی طرح خون کے دھبوں والی خاکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

جگت کے سامنے ایک سوکھا سڑا لمبا سا شخص کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے باقی جسم کے مقابلے میں کافی بڑا اور کرخت بھی تھا۔ جسے ہم نے چمڑے کا کوڑا سمجھا تھا، وہ ربڑ کا ایک پائپ تھا جس کے گرد لوہے کا تار لپیٹ کر اسے مزید اذیت ناک بنا دیا گیا تھا۔

سوکھے سڑے شخص نے تیسری بار جگت سنگھ سے گندی گالی سنی تھی۔ وہ غصے سے شعلہ جوالا بن گیا۔ ربڑ کے پائپ سے جگت کو بے دریغ پیٹنے لگا۔ جگت کی برداشت قابل ذکر تھی۔ وہ تکلیف کے سبب کراہ تو رہا تھا لیکن ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مارنے والا مار کر ہانپ گیا تو چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ پھنکارا۔ "دے گالی... حرام کے جنے دے گالی۔"

جگت نے بے خوف پھر وہی گالی دہرائی اور اس کے ساتھ ہی مارنے والے کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو کر ایک بار پھر جگت پر پل پڑا لیکن اس دفعہ بس دو ضربیں لگا کر ہی رک گیا۔ اس کی اونچی ناک چمکنے لگی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ وہ ... میں ...

بولا۔ "کرتا ہوں تیرا علاج... بہت گرمی ہے نا تیرے دماغ میں... کرتا ہوں تیرا علاج... بلکہ تم دونوں کا۔"

اس نے پینٹ کی جیب سے سیل فون نکالا۔ اس پر نمبر پریس کیا۔ پھر ممبئی کے مخصوص لہجے میں بولا۔ "کالیے! ادھر ذرا آ جا ہو گیا نی... ایک بھینسے کی دم کے نیچے آگ لگ گئی ہے۔ اس کو ذرا ٹھنڈا کرنا ہے۔ ڈاکٹر ہری کو بھیجو یہاں لاک اپ میں اور اس سے کہو ذرا سرجری کا سامان بھی لے کر آئے... ہاں ہاں... بس کہہ دو تم۔ وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔"

تب اس نے جواباً جگت سنگھ کے منہ پر تھوکا اور جوتی اندر رکھتے بولا۔ "ابھی بتاتا ہوں تجھے... ابھی بتاتا ہوں۔"

جگت سنگھ کو ہم نے آخری بار کوئی دس دن پہلے فرید کوٹ کے راستے میں دیکھا تھا۔ جگت نے اپنی محبوبہ آشا اور لاڈلے بھائی گوبندر کی موت کا بدلہ لینے کے لیے بڑی بہادری سے جاوا کے قافلے پر حملہ کیا تھا۔ جگت اور اس کے ساتھی بے جگری سے لڑے تھے۔ انہوں نے ہمیں جاوا کے چنگل سے نکالنے کی سرتوڑ کوشش بھی کی لیکن ان کی کوئی پیش نہ چل سکی۔ جگت کے کئی ساتھی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اس کا ساتھی پرتاپ سنگھ گرفتار ہوا اور جگت نے چلتے پانی میں چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی۔ اور اب یہ جگت سنگھ یہاں ممبئی کی اس گولڈن بلڈنگ میں پایا جا رہا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ جاوا کے ہتھے چڑھا ہے اور پھر اس کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا یہاں گولڈن بلڈنگ تک سراج عرف ساور کے پاس پہنچ گیا ہے۔ بالکل جیسے اشوریا رائے پہنچی تھی اور اگر کرشمہ کپور (نیتو) زندہ ہوتی تو وہ بھی پہنچتی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ تو خوب صورت لڑکیاں تھیں، جگت سنگھ جیسے شخص کا یہاں کیا مصرف ہو سکتا تھا۔

میں اور عمران باری باری کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد سفید کوٹ اور عینک والا ایک ڈاکٹر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا میڈیکل باکس تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے چھوٹے منیجر سروش کمار کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا کرنا ہے اور کیوں؟

سروش کمار زہرناک لہجے میں بولا۔ "ہمیں یہاں کچھ ہیجڑوں کی ضرورت بھی ہے۔ سکھوں کو جب ہیجڑا بنایا جائے تو بڑے پیارے ہیجڑے بنتے ہیں۔ بال تو ان کے پہلے ہی بہت سے ہوتے ہیں۔ ہاتھوں میں کڑے وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ داڑھی مونچھ مونڈ کر جب ان کو سرخی پاؤڈر لگا دیا جائے تو ایک دم قیامت ڈھانے لگتے ہیں۔"

"ان کو ہیجڑا بنانا چاہتے ہیں آپ؟" ڈاکٹر ہری نے پوچھا۔ ڈاکٹر ہری کو یقیناً اس خونی ہنگامے کی کچھ خبر نہیں تھی جو اسی گولڈن بلڈنگ کے ایک حصے میں برپا ہو چکا تھا۔ وہ عام انداز میں بول رہا تھا۔

منیجر سروش نے ڈاکٹر ہری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں بندے تمہارے سامنے کھڑے تو ہیں۔"

ڈاکٹر ہری نے ذرا حیرت سے کہا۔ "لیکن ان کو تو "چابک والی" میں کام کرنا تھا۔"

"چابک والی؟ وہ کون بنا رہا ہے؟"

"ڈائریکٹر ملہوترا! تین نمبر میں اس کا سیٹ بھی لگا ہوا ہے۔ کاسٹ بھی ہو چکی ہے..."

دونوں میں جو مختصر بات ہوئی اس سے پتا چلا کہ "چابک والی" گھٹیا سوا گھنٹے کی کسی "شارٹ فلم" کا نام ہے جس میں ایک امیرزادی، دو شریف سکھ مزدوروں کو گناہ کی طرف مائل کرتی ہے اور ان کے نہ ماننے پر مار مار کر ان کی کھال ادھیڑتی ہے اور انہیں مجبور کر دیتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہاں کمرے کے اندر کی صورتِ حال بدل چکی تھی۔ جگت سنگھ اور اس کے ساتھی نے منیجر سروش کمار کو اتنا مشتعل کر دیا تھا کہ وہ انہیں ناقابلِ تلافی جانی نقصان پہنچانے پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ اس نے بے رحم لہجے میں ڈاکٹر ہری کو کہا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے۔ ڈاکٹر ہری نے اپنا میڈیکل باکس کھولا۔ منیجر سروش کا ایک کالا بھجنگ ساتھی جگت سنگھ کو بے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ عمران نے دروازہ کھلوانے کے لیے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ غیر متوقع طور پر یہ ایک آسان کام ثابت ہوا۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے والا کالا بھجنگ شخص ہی تھا۔ عمران کا دھکا کھا کر وہ ڈاکٹر پر گرا اور دونوں ماربل کے فرش پر دور تک لڑھک گئے۔ میڈیکل باکس بھی الٹ گیا اور سرجری کے اوزار بکھرے نظر آئے۔ منیجر نے لپک کر میز پر سے پستول اٹھانا چاہی۔ میری چلائی ہوئی گولی سیدھی اس کے سینے میں دل کے مقام پر لگی۔ وہ چاروں شانے چت گر گیا۔ ڈاکٹر دروازے کی طرف بڑھا۔ عمران نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ وہ دہائی مچانے لگا۔ اس کی عینک دور جا گری تھی اور وہ عینک کے بغیر قریباً اندھا نظر آ رہا تھا۔ "بھگوان کے لیے نہیں۔" اس نے عمران کے اگلے فائر سے بچنے کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے اسے دھکا دے کر کمرے کے واش روم میں گرایا۔ "اگر آواز نکالی تو مارے جاؤ گے۔" میں نے بھاری بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

کسی وقت تو جب کہیں پاس ہی سے بہت سی عورتوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں... ساتھ ساتھ دروازے بھی پیٹے جا رہے تھے۔ یوں لگا کہ یہ عورتیں کہیں پر بند ہیں۔ شاید انہوں نے یہاں اس کمرے کا منظر دیکھا تھا اور اب مدد کے لیے پکار رہی تھیں۔

گہری رنگت والا شخص دہشت زدہ کھڑا تھا۔ اس کے قدموں میں ”منیجر صاحب“ کی خون اگلتی لاش تھی۔ میں نے میز پر رکھی رائفل اٹھا کر کندھے سے لٹکالی۔

جگت سنگھ ہمارے سامنے کھڑا تھا اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہم جب سے اس گولڈن بلڈنگ میں داخل ہوئے تھے، قدرے بھاری آوازوں میں بول رہے تھے۔ ہمیں آوازوں سے پہچاننا ہرگز آسان نہیں تھا۔ جگت سنگھ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے یہ خدائی مددگار کون ہیں۔ دوسری طرف عمران بھی جگت سنگھ کی صورت سے نا آشنا تھا۔ لہٰذا جب میں نے کالے بھجنگ شخص پر رائفل تانی اور اس سے کہا کہ وہ دونوں ”سرداروں“ کے ہاتھ پاؤں کھولے تو عمران نے ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہ خاکی قمیص والا جگت سنگھ ہے۔“

عمران کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

اگلے دو منٹ میں جگت سنگھ اور اس کا ساتھی آہنی کڑوں کی بندش سے آزاد ہو چکے تھے۔ قریبی کمرے سے بلند ہونے والا عورتوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ دروازے پیٹ رہی تھیں۔ عمران نے کالے ملازم کو آگے لگایا اور اس دروازے کے سامنے لے آیا جس کے عقب سے زبردست شور بلند ہو رہا تھا۔ ”اسے کھولو۔“ عمران نے ملازم کو حکم دیا۔

”اپن کے پاس اس کی چابی نا ہیں ہے۔“

”کس کے پاس ہے؟“

”وڑی یہ چابیاں بڑے باس کے پاس ہوتی ہیں۔“

عمران نے اپنی جیب سے چابیوں کے وہ اسٹائلش گچھے نکالے جو سراج کے آفس کی الماری سے ہمیں ملے تھے۔ ”دیکھو ان میں ہے چابی؟“ عمران نے ملازم کو گچھا دکھاتے ہوئے کہا۔

اس نے چابیوں کو الٹ پلٹ کیا اور ایک چابی تھام لی۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا خلا بھی موجود تھا۔ یہ ویسی ہی مختصر کھڑکی تھی جو میں اس سے پہلے فرید کوٹ کی کوٹھی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس میں سے کمرے میں جھانکا جا سکتا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہم نے کمرے میں جھانکا۔

ہمیں یہاں بیس کے قریب لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ قریباً سب ہی اسمارٹ اور قبول صورت تھیں۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ انہیں یہاں بڑے سکون آرام میں رکھا گیا ہے مگر وہ یک دم بے چین تھیں اور باہر نکلنا چاہ رہی تھیں۔

عمران نے ان سے پوچھا۔ ”تم لوگ یہاں کیوں ہو؟“

ان میں سے ایک احتجاجی لہجے میں بولی۔ ”ہمیں فلم میں چانس کا کہہ کر دھوکے سے یہاں رکھا گیا ہے۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ تیواری صاحب نے ہم سے جھوٹ بولا ہے۔“

ایک اور بولی۔ ”ہمیں چار دن سے یہاں بندی بنایا ہوا ہے۔ ہمارے گھر والوں کو مارنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں تمہاری تصویریں کھینچیں گے۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نا ہیں چھوڑیں گے...“ وہ سسکنے لگی۔

”تم میں سے کوئی پاکستانی بھی ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں، یہاں تو نہیں ہے۔ لیکن اسی جگہ دو تین دیکھی ہیں ہم نے۔ ایک وہی ایشوریا رائے کی شکل والی ہے۔ اسے آج بہت مارا ہے انہوں نے۔ وہاں شیشے والے کمرے میں بند کیا ہے۔“

”شیشے والا کمرا؟“ عمران نے پوچھا۔

عمران کو لڑکیوں سے باتیں کرتا چھوڑ کر میں جگت کو لے کر ذرا دور ہٹ گیا۔ رائفل بدستور میرے ہاتھ میں تھی اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں جگت سے کہا۔ ”مجھے پہچانا؟“ میں اپنی اصل آواز میں بولا تھا پھر بھی جگت مجھے فوری طور پر پہچاننے میں ناکام رہا۔

”تابش ہوں میں۔“

جگت جیسے اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کے زخمی چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ میں نے کہا۔ ”بالکل شانت رہو۔ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ہلکا سا شک بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

اپنے کندھے سے جھولتی ہوئی فالتو رائفل اتار کر میں نے جگت سنگھ کو تھما دی... اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں تو بجلیاں چمکنے لگیں۔

عمران نے مختصر کھڑکی کے خلا سے لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”ہم تمہاری مدد کے لیے ہی آئے ہیں۔ تمہیں جلد یہاں سے مکتی دلائیں گے لیکن تھوڑا دھیرج رکھنا پڑے گا۔ شور ہوگا تو ہمارا کام مشکل ہو جائے گا۔“

”بھگوان کے لیے دروازہ کھول دیں۔ ہم بالکل چپ رہیں گے۔“ ایک بنگالی لڑکی فریادی انداز میں بولی۔

”سب کچھ ہوگا لیکن تھوڑا سا انتظار۔“ عمران نے ذرا تحکم سے کہا اور کھڑکی کا سلائڈنگ پینل بند کر دیا۔

میرے کہنے پر عمران نے اپنے کندھے سے جھولتی ہوئی فالتو رائفل اتاری اور جگت سنگھ کے چوڑے چکلے ساتھی کو دے دی۔ وہ بھی ہتھیار شناس بندہ تھا اور یقیناً سینے میں مردانہ حوصلہ بھی رکھتا تھا۔

”یہ شیشے والا کمرا کہاں ہے؟“ عمران نے سیاہ رنگت والے ملازم سے پوچھا، وہ بدستور میری رائفل کے نشانے پر تھا۔

اس نے اپنے موٹے کالے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ہمیں ساتھ لے کر ایک کوریڈور میں آگے بڑھنے لگا۔ فائرنگ کی آواز کے بعد گولڈن بلڈنگ میں ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔ یقیناً سراج کی لاش بھی بہت سے لوگوں نے دیکھ لی تھی اور اب ہر طرف خوف کی لہریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ مجھے درجنوں لڑکیوں کے چلانے کی سریلی آوازیں آئیں... یہ لڑکیاں سی ڈرے ہوئے ریوڑ کی طرح بیرونی حصے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ یہ وہی ڈانسرز تھیں جو ایک بڑے ہال میں کسی عریاں ڈانس کی ریہرسل کر رہی تھیں۔ ہمیں اپنے اردگرد ایک بھی مسلح گارڈ دکھائی نہیں دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ گولڈن بلڈنگ کے گارڈ اپنے ”آہنی پنجرے“ سے باہر نہیں نکل سکے۔

عمارت کے عین بیچوں بیچ جہاں کئی کوریڈورز ایک گول ہال کمرے میں ملتے تھے، ایک چوراہا سا بن گیا تھا۔ یہاں ہمیں شیشے کا بنا ہوا ایک چوکور کمرا نظر آیا۔ قریباً بارہ فٹ ضرب بارہ فٹ کا یہ کمرا مکمل طور پر مضبوط شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس میں دو لڑکیاں بند تھیں۔ دونوں کے بدن پر لباس کا ایک تار تک نہیں تھا۔ وہ سکڑی سمٹی دو کونوں میں بیٹھی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ واقعی چوراہے میں ہوں اور ہر آتا جاتا انہیں دیکھ سکے... ان میں سے ایک سونیٹی عرف ایشوریا رائے تھی۔ اس کے دودھیا بدن پر مار پیٹ کے کئی بھیانک نشان نظر آتے تھے۔ دوسری لڑکی کوئی ہندو تھی۔ اس کے ماتھے پر تلک نمایاں تھا۔ اس پر بھی تھوڑا بہت تشدد ہوا تھا۔

شیشے نما کمرے کی ایک بلوری دیوار پر ایک اسٹیکر چسپاں تھا۔ اس پر انگریزی کا فقرہ لکھا تھا۔ فقرے کا مطلب کچھ یوں تھا۔ ”جو خود کو چھپاتے ہیں، ان کی جھجک دور کرنے کے لیے۔“ شیشے کے اس کمرے کا دروازہ بھی لاک تھا۔ تاہم عمران کے حکم پر سیاہ فام ملازم نے چابیوں کے ایک گچھے میں سے اس کی چابی بھی ڈھونڈ لی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں لڑکیاں سہمی رہیں۔ جگت سنگھ نے کہیں سے دو چادریں ڈھونڈ لی تھیں۔ اس نے یہ چادریں لڑکیوں کو تن ڈھانپنے کے لیے دیں۔

عمران نے بدلی ہوئی آواز میں سونیٹی عرف ایشوریا سے پوچھا۔ ”تم پاکستانی ہو؟“ ایشوریا ذرا جھجکی پھر اثبات میں جواب دیا۔ ”کوئی اور پاکستانی بھی ہے یہاں؟“ عمران نے دریافت کیا۔

”صرف دو ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

”میرا خیال ہے وہ دس نمبر فلور پر ڈانس کی ریہرسل کر رہی تھیں۔“

اس کا مطلب تھا کہ حواس باختہ لڑکیوں کے غول کے ساتھ وہ لڑکیاں بھی یہاں سے نکل چکی ہیں۔ اچانک میری نظر ایک طرف تنگ زینوں پر پڑی۔ یہ زینے نیچے جا رہے تھے۔ آخر میں ایک آہنی دروازہ تھا جس پر ”نو انٹری“ کے الفاظ لکھے تھے۔ ہم کوئی جگہ بن دیکھے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ میں زینے اتر کر نیچے دروازے تک گیا۔ یہ اسٹیل کا عام سا دروازہ تھا۔ میں اس کی چابی ڈھونڈنے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کچھ دور ہٹ کر لاک پر برسٹ مارا۔ پھر آگے جا کر لات رسید کی۔ دروازہ کھل گیا۔ یہاں ایک نیچی چھت والا چیمبر تھا جو بالکل خالی پڑا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ اوپر گراؤنڈ فلور پر مسلسل بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پوری گولڈن بلڈنگ میں ہراس کا عالم تھا۔ سائرن بھی لگاتار بج رہے تھے۔ میں نے ایک اور دروازے کا تالا توڑا... یہ ایک چھوٹا سا اسلحہ گودام تھا۔ بہت سی چھوٹی بڑی رائفلیں، پسٹل اور مشین پسٹل نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کی پیٹیوں میں دستی بم تھے اور ڈائنامائٹ کی اسٹکس بھی۔ یہ بدمعاشی کا اڈا تھا اور یہ سارے بدمعاشی اور دہشت گردی کے لوازمات تھے۔ ایک طرف بیکار رائفلوں کو ایک بنڈل کی شکل میں رکھا گیا تھا۔ اس بنڈل پر کینوس کا ایک بڑا بیگ پڑا تھا جس میں رائفلوں کا ایمونیشن تھا۔ میرے دماغ میں آگ سی بھڑک رہی تھی اور اس کی تپش پورے جسم کو تڑخا رہی تھی۔ یہ میرے بدترین دشمن سیٹھ سراج کا ٹھکانا تھا۔ مجھے یہاں کی ہر دیوار پر سیٹھ سراج عرف سردو کی منحوس چھاپ نظر آ رہی تھی۔ میں نے بیگ پلٹ کر اسے ایمونیشن سے خالی کیا اور ان میں ڈائنامائٹ کی اسٹکس بھرنا شروع کر دیں جن پر چھوٹی چھوٹی گھڑیاں لگی ہوئی تھیں... عمران نے اپنے مجھے کافی حد تک اسلحہ شناس بنا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسٹکس کے یہ چھوٹے چھوٹے بنڈل

"ٹائم بم" کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں ذرا سی کوشش سے ACTIVE کیا جا سکتا ہے۔ پانچ چھ دستی بم بھی میں نے کینوس کے بیگ میں رکھ لیے۔ میں تیزی سے واپس پلٹا۔ اس وقت تک جگت سنگھ اور اس کا ساتھی گلاب سنگھ... عمران کی ہدایت پر لاک اپ میں موجود لڑکیوں کو آزاد کر چکے تھے۔ وہ گرتی پڑتی اور چلاتی ہوئی مین ایگزٹ کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ ان تین افراد کو بھی نکال دیا گیا تھا جنہیں ہم نے شروع میں اسٹور روم میں بند کیا تھا۔

"یہ دیکھو۔" میں نے عمران کو ڈائنامائٹ کا ایک بنڈل دکھایا۔

"زبردست، نپولین اور دادا جی کا ایک مشترکہ قول ہے، برائی کو جڑ سے اکھاڑنا چاہیے۔ ہم بھی اس گولڈن بلڈنگ کو جڑ سے اکھاڑ سکتے ہیں۔"

عمران نے کمال مہارت اور تیزی سے ساتھ آٹھ بنڈلوں پر دس منٹ کا ٹائم سیٹ کر دیا اور گھڑیاں آن کر دیں۔ بڑی پھرتی سے ہم نے یہ بنڈل گولڈن بلڈنگ کے وسطی حصے میں مختلف جگہوں پر چھپا دیے۔ گولڈن بلڈنگ تقریباً خالی نظر آ رہی تھی۔ ہم ایشوریا اور مقامی لڑکی کو لے کر گولڈن بلڈنگ کے ایک بغلی دروازے کی طرف دوڑے۔ ایک راہداری میں اناؤنسمنٹ والا مائک موجود تھا۔ عمران نے مائک آن کیا اور بدلی ہوئی آواز میں بولا۔ "بلڈنگ دھماکے سے اڑنے والی ہے۔ جو کوئی بھی یہاں موجود ہے، نکل جائے۔ میں اعلان دہراتا ہوں..."

اس نے اعلان دہرایا۔ اب صرف تین چار منٹ ہی بچے تھے۔ ہم چار دیواری سے چالیس پچاس قدم دور تھے جب سراج یا تیواری کا کوئی وفادار تیزی سے سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل بھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دبا پاتا، جگت سنگھ نے ایک للکار کے ساتھ برسٹ چلایا اور اسے ڈھیر کر دیا۔ ہم کسی کو بھی مارنے کے لیے تیار تھے۔ ہم بیرونی دروازے سے چند قدم دور تھے جب عمران ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"گارڈز وہیں بند رہ گئے ہیں۔"

میں بھی سٹپٹا گیا۔ ان کی موت یقینی تھی۔ بلاسٹ میں اب بمشکل دو ڈھائی منٹ تھے۔ "میں جاتا ہوں۔" عمران نے کہا۔

"نہیں عمران۔" میں نے اسے پکڑ لیا۔ "اب مرنے دو انہیں۔"

"نہیں... تم نکلو ان کو لے کر۔" عمران نے کہا اور خود کو چھڑا کر واپس بھاگا۔

میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ وہ حاظ پر کر کے راہداری میں گم ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اس کے پیچھے لپک جاؤں۔ جگت سنگھ نے بڑی مضبوطی سے میری کلائی پکڑ لی اور باہر کی طرف کھینچا۔ ہم گولڈن بلڈنگ کی چار دیواری سے باہر آ گئے۔ یہاں بھی افراتفری تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ میری نگاہیں مسلسل اس دروازے پر لگی تھیں جہاں سے عمران کو واپس نکلنا تھا۔ وہ نہیں نکلا... اور تب پہلا دھماکا ہوا... پھر دوسرا... آگ کے شعلے اور پرخچے جاتے نظر آئے۔ ڈائنامائٹ پھٹ رہے تھے اور پھر ہمیں اندھا دھند بھاگتے ہوئے گارڈز دکھائی دیے۔ وہ بچ کر نکل آئے تھے۔ بالکل کسی فلم کا سا منظر تھا۔ میری نگاہیں عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ عمران سب سے پیچھے تھا۔ اس نے کسی کو کندھے پر لادا ہوا تھا۔ وہ کوئی بے ہوش شخص تھا۔

مجھے اس پر غصہ آیا۔ وہ ہر جگہ خدائی فوجدار بن جاتا تھا۔ کیا ضرورت تھی اس مشکل کو مزید مشکل بنانے کی۔ یکایک ایک ساتھ کئی ڈائنامائٹ پھٹے۔ اندرونی کمروں کی کھڑکیاں اور چھتیں ہوا میں اڑتی نظر آئیں۔ عمران سب سے پیچھے تھا۔ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ کندھے پر لدے شخص کو اچھی طرح تھاما اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

میں اور جگت سنگھ لپک کر آگے گئے اور بے ہوش شخص کو سنبھال لیا۔ وہ دبلا پتلا تھا۔ اس کے جسم پر ڈرائیور کی سفید وردی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گاڑھے دھوئیں میں دم گھٹنے کی وجہ سے بے ہوش ہوا ہے۔ ہم اسے لے کر سڑک پر پہنچے۔ یہی وقت تھا جب ایک نیلی سٹیشن کار دھوئیں میں سے نکلی اور ہمارے سامنے آ کر رکی۔ کار کو دیکھتے ہی عمران نے ہمیں اشارہ کیا۔ ہم کار کی طرف لپکے اور سوار ہو گئے۔ چادر میں لپٹی ہوئی ایشوریا رائے پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔ میں جگت اور اس کا ساتھی تنگ سیٹ پر۔ عمران گھوم کر ڈرائیور کی عین پیچھے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی نیلی اسٹیشن کار کے پہیے چرچرائے اور وہ دھوئیں کے مرغولوں میں راستہ بناتی ہوئی تیزی سے ایک طرف بڑھی۔ گولڈن بلڈنگ کے اندرونی حصوں میں اب بھی دھماکے ہو رہے تھے اور دھواں سارے علاقے کو ڈھانپ رہا تھا۔ قریبی عمارتوں کے مکین نکل نکل کر بھاگ رہے تھے۔ ایک جگہ دو تین گاڑیاں آپس میں ٹکرائی ہوئی تھیں۔ یہ افراتفری ہمارے حق میں تھی... ہم

نکلتے چلے گئے۔ تب میں نے غور کیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص تو مقامی تھا لیکن اس کے برابر بیٹھا ہوا شخص میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جیلانی تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عمران کی ہدایت پر بلڈنگ کے آس پاس ہی موجود تھا اور عین وقت پر موقع پر پہنچ گیا تھا۔ ہمارے چہروں پر ابھی تک ماسک تھے۔ ایشوریا رائے دہشت زدہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں اور کہاں لے جا رہے ہیں۔ کوئی اور سچویشن ہوتی تو وہ اس طرح ہرگز ہمارے ساتھ نہ بیٹھتی لیکن ہم اسے بدترین حالات سے نکال رہے تھے لہٰذا وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔

میرے اور جگت کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ہم مقابلے کو تیار تھے۔ تاہم بڑی سڑک تک کوئی ہمارے راستے میں نہیں آیا اور نہ کسی نے پیچھا کیا۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

عمران نے جیلانی سے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے یا شیخ؟"

"زیادہ دور نہیں۔ بس پانچ منٹ کا راستہ ہے۔"

ایک ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں شور مچاتی ہوئی ہمارے قریب سے گزریں۔ ان کا رخ گولڈن بلڈنگ کی طرف تھا۔

بے ہوش شخص کو ہم تینوں نے ابھی تک اپنے زانو پر لٹا رکھا تھا۔ وہ بہت ہلکا پھلکا تھا۔ اسے طبی امداد کی ضرورت تھی مگر گاڑی کے نیم اندھیرے میں ہم اس کے چہرے پر صرف پانی کے چھینٹے ہی دے سکتے تھے اور یہ ہم نے دیے۔

"کون ہے یہ؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"یار، یہ کافی نہیں کہ یہ ایک انسان ہے؟ اگر میں اسے وہیں گیراج میں چھوڑ آتا تو یہ اب تک اللہ بیلی ہو گیا ہوتا۔"

راستے میں ایک جگہ پولیس کا ناکا نظر آیا۔ بہرحال ہم نکل گئے۔ اگر روکا جاتا تو ہم فوراً مشکوک ٹھہرتے... بہت مشکوک ترین۔ ہمارے ساتھ فقط ایک چادر میں چھپی ہوئی ایشوریا رائے تھی۔ اس کے پاؤں بھی ننگے تھے۔ ہم نے زانو پر ایک بے ہوش بندہ لٹایا ہوا تھا۔ میرا لباس خون آلود اور بٹن سے عاری تھا۔ جگت سنگھ اور اس کا ساتھی گلاب سنگھ عرف گوگا بھی زخمی تھے۔ ہمیں روکا جاتا تو یقیناً ہمیں اپنی رائفلوں کے منہ کھولنے پڑتے اور یہ سنگین صورت حال مزید سنگین ہو جاتی۔

رات کے چار بجے کا وقت تھا۔ ممبئی کی سڑکوں پر اب ٹریفک بہت کم ہو گیا تھا۔ سمندر کی طرف سے ہوا چل رہی تھی۔ رات ہر سے اور ٹھنڈی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ تقریباً پانچ چھ منٹ میں ہم ایک چھوٹی سی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔

"یہ... آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟" ایشوریا ہکلائی۔

عمران ہنستا کر بولا۔ "یہ چڑیا گھر ہے۔ یہاں تمہیں ریچھ کے ساتھ بند کریں گے۔ تم دونوں کی محبت سے جو بچہ پیدا ہوگا، وہ ہالی وڈ کی 'ایپ مینڈ' فلموں میں کام کرے گا۔"

"خدا کے لیے مجھے..."

"خاموش ہو جاؤ۔" عمران گرجا۔ "تمہیں جہاں سے نکال کر لائے ہیں، وہاں سے بری جگہ تمہارے لیے اور کوئی نہیں ہوگی۔ چلو نکلو گاڑی سے۔"

وہ سہم کر نکل آئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم کوٹھی کے اندر تھے۔ ہم نے بے ہوش بندے کو ایک بستر پر لٹا دیا۔ وہ یرقان زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال بالکل صاف تھے۔ گردن کے قریب جلنے کا پرانا نشان تھا جس کا کچھ حصہ نظر آتا تھا، کچھ قمیص کے نیچے تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے بعد کسی چیز پر گرا تھا۔ اس کا پہلو زخمی تھا اور یہاں سے اس کی سفید وردی پھٹی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی شکل کچھ پہچانی ہوئی سی لگی۔

میں نے اور عمران نے اپنے ماسک اتار دیے۔ میری صورت دیکھ کر ایشوریا رائے بھونچکی رہ گئی۔ "تت... تم... یہاں؟" وہ ہکلائی۔

عمران بولا۔ "بعد میں تسلی سے حیران ہو لینا اور 'ہک بک لا' بھی لینا۔ یہ دیکھو تمہارے کندھوں سے چادر کھسک رہی ہے۔ ابھی جا کر کپڑے پہن لو، جلدی سے۔" پھر اس نے جیلانی سے کہا۔ "یا شیخ! اس شیطان کی چیلی کو ذرا انسان کی چیلی بناؤ۔ کپڑے دو اسے۔"

جیلانی باہر گیا اور فوراً ہی ایک دو زنانہ جوڑے لے آیا۔ سویٹی عرف ایشوریا یہ کپڑے لے کر ایک قریبی واش روم میں گھس گئی۔ وہ بار بار مڑ کر میری طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ عمران نے بے ہوش شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یار! اس کا زخم دیکھو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ایک گری ہوئی موٹر سائیکل کے اوپر گرا ہے۔ یہاں پسلیوں میں پائیدان وغیرہ لگا ہے۔"

میں نے جگت کے ساتھی گوگے کے ساتھ مل کر بے ہوش شخص کی قمیص کے بٹن کھولے پھر بنیان اتاری۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ اس کے پورے جسم پر جلنے کے پرانے داغ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سر سے پاؤں تک اس کے جسم کو بار بار بڑی بیدردی سے داغا گیا ہے۔ شروع میں ہمیں گردن

کے پاس صرف ایک داغ نظر آیا تھا۔ ایسے بیسیوں داغ اس کے پورے جسم پر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نیم گول دھاتی چیز سے اس کو جگہ جگہ سے جلایا گیا تھا۔

پسلیوں کے قریب کٹ کا تازہ نشان تھا اور مسلسل خون رس رہا تھا۔ اسے ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ بہرحال مجبوری تھی۔ ہم نے وہیں پر اس کا خون بند کیا اور اچھی طرح مرہم پٹی کر کے قمیص دوبارہ پہنا دی۔ میری نگاہ بار بار بے ساختہ اس کے چہرے کی طرف اٹھ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے کچھ پہچانا سا لگ رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”یار! لگتا ہے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے۔“

”تمہاری نظر بڑی تیز ہے، ذرا اندازہ تو لگاؤ۔“

میں نے غور کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے پھر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ڈرامائی انداز میں بولا۔ ”یہ ابرار صدیقی ہے۔ جسے ہم مولانا ابرار صدیقی بھی کہتے تھے۔“

میں دنگ رہ گیا۔ ایک بار پھر بڑے دھیان سے میں نے اس کے کمزور چہرے کو دیکھا۔ جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ شاید عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ شخص ابرار صدیقی ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ابرار صدیقی تو ایک تنومند، سرخ و سپید شخص کا نام تھا۔ سیاہ داڑھی، آنکھوں میں چمک، گھنے بال... لیکن جو بندہ میرے سامنے تھا وہ بس ابرار صدیقی کا خلاصہ ہی نظر آتا تھا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے بھی یہی لگا تھا۔“ عمران نے کہا۔

”یار! یہ یہاں انڈیا میں کیسے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کہانی کے سارے کردار یہاں انڈیا میں ہی سمٹ آئے ہیں۔“

”اسی کو کہتے ہیں، کرلو تماشا۔“

”ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے ساتھ بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلا تھا اور پاکستان پہنچ گیا تھا۔“

”مجھے لگتا ہے کہ ہم ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔ یہ پاکستان چلا گیا تھا۔ شاید وہاں سے پھر واپس آیا ہے۔ اصل حقیقت تو یہ ہوش میں آنے کے بعد ہی بتا سکتا ہے۔“

”مگر اس کے ساتھ ہوا کیا ہے...؟ یہ تو وہ رہا ہی نہیں۔“ میں حیرت زدہ تھا۔

ایسی ہی حیرت عمران کی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔ اس کی بے ہوشی اب غنودگی میں بدلتی جارہی تھی اور امید تھی کہ وہ جلد ہی ہوش میں آجائے گا۔ اسی دوران میں اشوریا کپڑے پہن کر باہر نکل آئی۔ یہ ایک نارنجی ساڑی تھی۔ اسے ساڑی باندھنے کا سلیقہ بڑی اچھی طرح سکھایا گیا تھا... لیکن اتارنے کا سلیقہ شاید وہ پوری طرح نہیں سیکھ سکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اپنے چہرے پر کئی نیل لے کر اب وہ یہاں ہمارے ساتھ موجود تھی۔

اس نے میری طرف دیکھا اور رو دینے والے انداز میں بولی۔ ”پلیز مجھ پر رحم کریں۔ مجھے کسی طرح واپس پاکستان پہنچا دیں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ بہت دھوکا ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے آنکھوں دیکھ کر مکھی نگلی تھی۔ اب دوسروں کو الزام نہیں دے سکتی ہو۔ کچھ نہ کچھ تو اب تمہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔“

”میں بہت بھگت چکی ہوں۔ اب میں واپس اپنے بہن بھائیوں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ اس کی ٹھوڑی پر بھی ایک نیل تھا۔ یہ مارپیٹ یقیناً اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اس نے انکل کی کوٹھی میں ڈائریکٹر راج کو مطلوبہ شاٹس دینے سے انکار کیا تھا۔

میں نے اشوریا سے کہا۔ ”وہاں دو اور پاکستانی لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ اب کہاں ہوں گی؟“

”ہم... مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔“

”لیکن پتا چلانا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہم انہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتے... اگر تم پاکستان واپس پہنچو گی تو وہ بھی پہنچیں گی۔“ عمران نے میری تائید کی اور لڑکیوں کے حوالے سے اشوریا کو پوری تسلی دی۔

وہ ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ”ان میں سے ایک کا نمبر میرے پاس ہے۔ آپ لوگ فون کر کے دیکھ لیں۔“

عمران نے جیلانی کے سیل فون سے کال کی۔ فوراً ہی جواب آیا۔ عمران نے اسپیکر آن کر دیا تاکہ ہم بھی سن سکیں۔ ایک گھبرائی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔ ”کون ہے؟“

عمران نے فون اشوریا کو تھما دیا۔ اشوریا نے کہا۔ ”ہیلو فاخرہ! میں سویٹی بول رہی ہوں۔ کہاں ہو تم؟“

”ہم... میں اور کرن یہاں ایک بس اسٹینڈ میں بیٹھے ہوئے ہیں چھپ کے... تم کہاں ہو؟“

”یہاں کچھ پاکستانی ہیں، میں ان کے پاس آگئی ہوں۔ اچھے لوگ ہیں۔ یہ ہمیں واپس پاکستان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ تمہارے پاس اگر کوئی ٹھکانا نہیں تو یہاں پہنچو، کسی طرح۔“

”لیکن کہاں؟“

عمران نے سویٹی عرف اشوریا سے فون لے کر بات کی۔ اس نے فاخرہ نامی لڑکی سے معلوم کرلیا کہ وہ کس بس اسٹینڈ پر ہیں۔ اس نے ان سے کہا۔

”ابھی بیس پچیس منٹ تک نیلی گاڑی میں دو بندے آئیں گے۔ وہ اپنا نام جیلانی اور فہد بتائیں گے۔ سویٹی کا حوالہ بھی دیں گے۔ تم ان کے ساتھ یہاں پہنچ جاؤ۔ ہم تمہیں حفاظت سے سفارت خانے تک پہنچا سکتے ہیں۔“

عمران کے بعد پھر اشوریا نے بات کی اور دونوں لڑکیوں کو پوری تسلی دی۔

میں بار بار حیرت کے عالم میں ابرار صدیقی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ پتا نہیں اس پر کیا بیتی تھی؟ وہ کس طرح یہاں انڈیا پہنچا تھا اور اس کے داغ داغ جسم پر یہ ڈرائیور کی سفید وردی کیسے سجی تھی؟

ابرار صدیقی کے بارے میں ہمیں جو آخری معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ ہم سے پہلے ہی بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور یہ مصدقہ اطلاع بھی موجود تھی کہ وہ زرگاں کے بڑے بچھڑا میں سے آرکوئے چرا کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بعد ازاں آرا کوئے بھانڈیل اسٹیٹ سے کوئی ڈیڑھ ہزار میل دور شیخوپورہ کے ایک نواحی جنگل میں پائی گئی تھی۔ بابا جلالی کے بیان کے مطابق کچھ لوگ ایک جیپ پر اندھادھند بھاگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے کچھ گاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ جیپ والوں یا جیپ والے نے بھاگتے بھاگتے یہ نادر مورتی درختوں میں پھینک دی تھی تاکہ وہ پیچھا کرنے والوں سے محفوظ رہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ گر گئی ہو۔ جلالی نے اس مورتی کو ایک امانت کے طور پر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر جتنا کمزور تھا، ارادے کا اتنا ہی پکا تھا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اس مورتی آرا کوئے کو اس کے اصل مالک کے سوا کسی کے حوالے نہیں کرے گا... اور وہ قریب قریب بڑھاپے تک اپنے اس ارادے پر قائم تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس رات مورتی پھینک کر بھاگنے والا یہ ابرار صدیقی ہی تھا۔ ہم نے ابرار صدیقی کو بہت تلاش کیا تھا... اور پھر تھک ہار کر یہ سوچ لیا تھا کہ وہ کہیں مر گیا ہوگا۔ لیکن آج بالکل اچانک... اور بالکل غیر متوقع جگہ پر وہ ہمارے سامنے تھا۔

عمران نے مجھے ساتھ والے کمرے میں بلایا اور بولا۔ یہ ابرار صدیقی والی کہانی تو اس کے مکمل ہوش میں آنے کے بعد ہی حل ہو سکے گی۔ فی الحال ہم دونوں کو جلد از جلد ہوٹل

واپس پہنچنا چاہیے۔ جاوا کے ذہن میں ہلکا سا شک بھی نہیں جاگنا چاہیے کہ آج گولڈن بلڈنگ میں جو ہوا ہے اس میں ہمارا ہاتھ ہوسکتا ہے۔“

”یہاں کے معاملات کون سنبھالے گا؟“

”یار! جیلانی یہاں موجود ہے اور اس گھر کا مالک نصیر احمد بھی۔ وہ سب کچھ آسانی سے سنبھال سکتے ہیں۔ ہم کل موقع دیکھ کر پھر یہاں آئیں گے۔“

اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہم نے اچھی طرح منہ دھویا اور لباس تبدیل کر لیے۔ یہ سب سامان یہاں جیلانی کے پاس موجود تھا۔ ہم نے گولڈن بلڈنگ سے حاصل ہونے والی رائفلیں بھی یہیں رہنے دیں اور کینوس کا وہ بڑا بیگ بھی جس میں دستی بم اور کچھ دیگر اشیا موجود تھیں۔ یہ اشیا میں نے جگت سنگھ کو سونپ دیں اور اسے تھوڑی بہت صورتِ حال سمجھا دی... جگت سنگھ کی پُردرد کہانی ابھی سننا باقی تھی لیکن فی الحال وقت کم تھا۔ میں نے اسے گلے لگا کر بس گوبند سنگھ اور آشا کور کا پرسہ ہی دیا اور چند گھنٹوں بعد دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے باہر آگیا۔ یہاں سے ہم ایک چھوٹی جیپ میں بیٹھے۔ یہ جیپ جیلانی کا ایک ساتھی ہی چلا رہا تھا۔ نیلی اسٹیٹ کار گیراج میں موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ اشوریا کی ساتھی لڑکیوں کو لینے بس اسٹینڈ کی طرف جا چکی تھی۔ ہماری منزل گولڈن بلڈنگ کی وہ قریبی گلی تھی جہاں ہم نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ عمران ہوٹل سے جو بیگ لے کر نکلا تھا، وہ بھی اسی گاڑی میں موجود تھا۔ اس گاڑی کو گولڈن بلڈنگ کے پاس سے ہٹایا جانا ضروری تھا۔ دوبارہ اس علاقے میں جانے میں تھوڑا سا رسک تو تھا مگر یہ رسک لینے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ گولڈن بلڈنگ کا عقبی علاقہ تھا۔ ہم اندرونی گلیوں سے ہوتے ہوئے مطلوبہ جگہ تک پہنچے۔ پارک کے قریب پہنچ کر ہم نے دور ہی سے گولڈن بلڈنگ کا جائزہ لیا۔ اب بھی دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ پولیس کی گاڑیاں بھی گشت کر رہی تھیں۔ تاہم زیادہ سرگرمی بلڈنگ کے سامنے کی جانب تھی۔ یہاں بس اکا دکا لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے اور رات کے اس آخری حصے میں گولڈن بلڈنگ کی مصیبت کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

میرے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے، میں تو وہیں نصیر احمد کے ساتھ جیپ میں بیٹھا رہا۔ عمران آگے گیا۔ اس نے چند تماشائیوں سے باتیں بھی کیں۔ ان سے اس ”حادثے“ کا حال احوال پوچھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہاں جو آفت ٹوٹی ہے، اس کا اہم ترین

کرداران کے درمیان موجود ہے اور آفت کا حال احوال دریافت کررہے ہے۔ عمران ٹہلنے والے انداز میں بائیں طرف چلا گیا۔ یہاں سڑک کے کنارے اور بھی کئی گاڑیاں پارک تھیں۔ عمران ان گاڑیوں کے درمیان سے گزرا۔ دو پولیس والے یہاں موجود تھے مگر انہوں نے عمران پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ بڑے اعتماد سے گاڑی میں بیٹھا اور اسے ڈرائیو کرکے ہمارے پاس آگیا۔

میں عمران والی گاڑی میں چلا گیا۔ نصیر احمد جیپ لے کر واپس روانہ ہوگیا۔ گاڑی میں ہمارا سامان پورا تھا۔ ہم نے گولڈن بلڈنگ پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔ یہ برائی کا گڑھ تھا اور آج کی رات اس پر بڑی بھاری ثابت ہوئی تھی۔ گولڈن بلڈنگ کو جزوی طور پر تباہ ہوئی تھی لیکن اس کا سارا ڈھانچا ہل گیا تھا۔ بلڈنگ کے چاروں طرف وسیع احاطہ تھا اس لیے بلڈنگ کے اندرونی حصے میں ہونے والے دھماکوں کی وجہ سے اردگرد کی عمارتیں قریباً محفوظ ہی رہی تھیں۔ ہم واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے تھے، اہلِ محلہ؟“

”وہی جو انہیں کہنا چاہیے۔ دل ہی دل میں خوش ہیں۔ ان کی کھڑکیوں کے شیشے وغیرہ ضرور ٹوٹے ہیں لیکن ان کے دل جڑ گئے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی یہ سب جانتے تھے کہ گولڈن بلڈنگ کے اندر پروڈکشن ہاؤس کی آڑ میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ لیکن آواز اٹھانے اور لڑائی مول لینے کی ہمت کوئی نہیں رکھتا تھا۔“

جلد ہی ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور بیگ سمیت کمرے میں آگئے۔ کسی نے وہاں اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہم گئے دوسرے لباس میں تھے، آئے دوسرے میں ہیں۔ میرے چہرے کے ایک دو تل بھی کسی کے نوٹس میں نہیں آئے۔

... صبح دس بجے کے لگ بھگ عمران نے ٹی وی آن کیا تو وہاں نیوز چینلز پر گولڈن بلڈنگ والے خونی ہنگامے کی خبر چل رہی تھی۔ خبر کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جارہا تھا۔ بتایا جارہا تھا کہ دو خطرناک گروہوں میں خوفناک تصادم ہوا ہے۔ درجنوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں۔ گولڈن بلڈنگ کا بڑا حصہ تباہ ہوچکا ہے۔ دھماکوں سے اردگرد کی عمارتوں کو نقصان پہنچا ہے۔ ابھی تک گولڈن بلڈنگ میں کہیں کہیں آگ لگی ہوئی ہے۔ سارو اور تیواری وغیرہ کی ہلاکت کی خبر بھی بار بار نشر ہورہی تھی۔ سراج کی ہلاکت کی خبر میرے دل و دماغ پر عجیب اثر کررہی تھی۔ آنکھوں میں نمی جاگ رہی تھی۔ جب بوڑھی ماؤں پر ظلم ہوتا ہے تو جوان بیٹے ظالموں کے گریبان پکڑتے ہیں، بدلہ چکاتے ہیں۔ دیر سے ہی سہی لیکن میں نے بھی آج اپنی مظلوم ماں کا بدلہ چکا دیا تھا۔

ثروت سے رابطہ ہوئے قریباً تیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے اسے فون کرنا ضروری سمجھا۔ میڈم صفورا کے نمبر پر کال کی۔ فوراً ہی میڈم صفورا کی قدرے بھاری آواز سنائی دی۔ ”ہیلو بوائز! کہاں ہو تم دونوں؟“

”بس ممبئی سے نکل رہے ہیں۔“

”کہاں کے لیے؟“

”ابھی یہ نہیں بتاسکتے۔“

”وہ... عمران ادھر ہے؟“

عمران شیو کرنے کے بعد ٹھوڑی پر تولیا رگڑ رہا تھا۔ اس نے انگلی ہلا کر مجھے ”نہ“ کا اشارہ دیا۔

میں نے کہا۔ ”وہ ابھی باہر نکلا ہے۔ آجاتا ہے تھوڑی دیر میں۔“

”سنا ہے رات کو کوئی ہنگامہ بھی ہوا ہے۔ ساؤتھ ممبئی میں۔ دو گروپس میں ”کلیش“ کی نیوز آرہی تھی۔“

”یہ تو شہر ہی ہنگاموں کا ہے۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

”ثروت تمہارے لیے بڑی پریشان تھی۔ بار بار فون کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لو بات کرو اس سے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

چند سیکنڈ بعد ثروت کی آواز ابھری۔ ”ہیلو تابش آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”بالکل ٹھیک ہوں، اور تم؟ کسی طرح کی پریشانی تو نہیں۔“

”نہیں، بس آپ کی اور... عمران صاحب کی طرف سے فکر ہے۔ آپ کب تک لوٹیں گے؟“

”ابھی تو نکلے ہی ہیں ثروت! کچھ دن تو لگتے ہیں۔“

”آپ کہتے تھے کہ میں جلد جلد فون کروں گا۔ لیکن اب دیکھ لیں کتنی دیر کی ہے۔ میں نصرت کی طرف سے بھی پریشان ہوں۔ رات کو اس کا فون آیا تھا۔ وہ بتا نہیں رہی تھی لیکن آواز سے سمجھ رہی تھی... وہ بتا رہی تھی کہ پرسوں یوسف آئے تھے۔“

”یوسف... کہاں؟“

”حمد تقدنوی صاحب کے آستانے پر... نصرت سے ملنے۔ انہوں نے نصرت سے معافی مانگی ہے اور اسے واپس گھر لے آئے ہیں۔ لیکن نصرت وہاں زیادہ خوش نہیں

ہے۔ تقدنوی صاحب کو کچھ لوگ قدرت اللہ بھی کہتے تھے۔

یوسف کا فریبی چہرہ میری نگاہوں میں آیا اور دماغ میں چنگاریاں سی چمک گئیں۔ یہ بندہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے ہاتھ جوڑنے سے لے کر پاؤں پڑنے تک سب کچھ کرسکتا تھا۔ مطلب نکلنے کی صورت میں بے رخی سے آنکھیں پھیر لینا بھی اس کا شیوہ تھا۔

میں نے کہا۔ ”اور وہ گریس والا معاملہ ثروت؟ یہ بھی تو پتا چلا ہے کہ وہ پھر اس سے مل رہی ہے۔“

چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد ثروت بولی۔ ”تابش! اصل حقیقت تو مجھے وہاں جا کر ہی معلوم ہوسکتی ہے۔ نصرت بے چاری بھی تو بس اندازے ہی لگا رہی ہے۔“

میرا دل چاہا فون بند کردوں۔ شوہر پرستی میں ثروت کبھی کبھی ہر حد سے گزری محسوس ہوتی تھی۔ چند روز پہلے اس نے یوسف کے بارے میں سب کچھ اچھی طرح جان لیا تھا۔ ناکا شارپ بائی کی زبانی اسے یوسف کا سارا کچا چٹھا معلوم ہوا تھا۔ پھر ثروت نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ کس طرح اسے یہاں تنہا چھوڑ کر پاکستان جا پہنچا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کے لیے دل میں نرم گوشے رکھتی تھی۔ کیوں تھے یہ نرم گوشے؟ یہ نرم گوشے شاید یوسف کے لیے نہیں تھے، یہ ان واہموں کے لیے تھے جو ثروت نے دل و دماغ میں پال رکھے تھے۔ اس نے چھوٹی بہن کی بیماری کو یوسف سے علیحدگی کے ساتھ منسوب کررکھا تھا۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن اس کے گرد خوف نے ایک ایسا حصار بنا رکھا تھا جس سے نکلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کسی وقت ہمت ضرور کرتی تھی لیکن پھر جلد ہی ہتھیار پھینک دیتی تھی۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”پلیز تابش! آپ جلدی آنے کی کوشش کریں۔ میں نے ساری رات ڈر میں گزاری ہے۔ وہ ریچھ ابھی یہیں ہیں جو ہم نے دیکھے تھے۔ اوپر والی منزل سے ان کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ یہ ملازم نے بتایا ہے کہ یہ آدم خور جانور ہیں۔ مجھے میڈم کا حوصلہ ہے۔ ورنہ میں تو شاید اب تک مر ہی گئی ہوتی۔“

میں نے کہا۔ ”ثروت! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں تم یہاں اتنی ہی محفوظ ہو، جتنی لاہور میں اپنے گھر میں ہوتیں۔ اس بات کا بھی یقین رکھو کہ ہم جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے۔“

”میں نے ابھی ٹی وی پر ایک خبر دیکھی تھی۔ ممبئی میں کوئی ہنگامہ ہوا ہے۔ میرا دل ہول رہا تھا۔“

”نہیں ثروت، ہم شہر کے دوسرے حصے میں ہیں اور اب تو ہم ویسے ہی یہاں سے روانہ ہورہے ہیں...“

ثروت سے تسلی تشفی کی چند باتیں کرکے میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ یوسف کے حوالے سے دل پر عجیب بوجھ سا تھا۔ ہم اس شخص کی خاطر یہاں انڈیا آئے تھے اور موجودہ حالات میں پھنسے تھے۔ وہ خود لاہور جا پہنچا تھا اور وہاں اپنی خباثت دکھانے میں مصروف تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ایک دو روز میں فون پر ثروت کو بتاتا کہ انڈیا سے اس کا جانا ایک پلاننگ کے تحت تھا اور وہ وہاں لاہور میں رہ کر اس کی رہائی اور واپسی کے لیے بھرپور کوشش کررہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

”خبیث۔“ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

عمران فوراً بولا۔ ”بہت بری بات ہے تابش... ثروت تم سے محبت کرتی ہے، اور جو محبت کرتے ہیں ان کو خبیث نہیں کہا جاتا۔“

”میں اس بدذات کے لیے کہہ رہا ہوں... یوسف کے لیے۔“

”اب کیا کیا ہے اس نے؟“

”جلیبی کی طرح گول مول بندہ ہے یہ۔ پہلے نصرت سے جھگڑا کیا، اسے برا بھلا کہا ہے۔ ثروت کے بارے میں بدزبانی کی ہے۔ اب نسوے بہا رہا ہے۔ نصرت کو حمد تقدنوی صاحب کے گھر سے منت کرا اور معافی مانگ کر واپس گھر لے گیا ہے۔“

”جگر پارے! تو فکر نہ کر۔ یوسف نے یہاں سے چپ چاپ راہِ فرار اختیار کرکے ہمیں اور ثروت کو اپنی اصلیت دکھا دی ہے۔ ثروت مانے یا نہ مانے لیکن وہ اپنے عمل سے ثروت کی نظروں میں گرا ہے۔“

”تم ثروت کو نہیں جانتے عمران! وہ ارادے کی بڑی کچی ہے اور اس کے وہم اس سے بھی کچے ہیں۔ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے پھر بھی اس پر یقین نہیں کرتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یوسف کا فون دوبارہ آگیا اور اس نے معافی تلافی کی تو ثروت پھر اس کے سامنے جی جی کرنے لگے گی۔“

عمران نے عجیب انداز میں کہا۔ ”لیکن جگر! وہ تجھ سے محبت بھی تو کرتی ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا؟“ میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ اور میری بات یاد رکھ پیارے! وہم کی اپنی طاقت ہوتی ہے تو محبت کی بھی اپنی طاقت ہوتی ہے... اور محبت کی طاقت بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ دیر ہو جاتی ہے لیکن ارادہ پکا ہو تو اندھیر نہیں ہوتا۔ تو غم نہ کر... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تم سے پوچھ

کا چاچو ہوں گا بلکہ شاید میں اور شاہین دونوں چاچو چاچی بنیں گے۔"

بارہ بجے کے لگ بھگ ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور روانہ ہو گئے۔ ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی۔ ہمارے بیگ ہمارے ساتھ تھے۔ جو بندہ ہمیں ائرپورٹ سے اپنے ساتھ لے کر ہوٹل آیا تھا، اس نے ہمیں سی آف کیا۔ عمران اور جاوا کے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا، اس کے مطابق ممبئی پہنچنے کے بعد ہم بالکل آزاد تھے اور اپنی مرضی سے کہیں بھی آجا سکتے تھے۔ جاوا نے یقین دلایا تھا کہ کسی بھی طرح ہماری نگرانی نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ثروت ضمانت کے طور پر اس کے پاس تھی۔ ہاں... اگر ہمیں کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہوتی تو ہم دیے گئے فون نمبرز پر جاوا سے رابطہ کر سکتے تھے۔

ٹیکسی پر سوار ہونے کے بعد ہم کافی دیر تک ممبئی کی سڑکوں پر چکراتے رہے۔ مقصد یہ دیکھنا ہی تھا کہ ہمارا تعاقب وغیرہ تو نہیں ہو رہا۔ غالباً جاوا وعدے کی پاسداری کر رہا تھا۔ ہمیں نگرانی کے کوئی شواہد نہیں ملے۔ ممبئی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کے دوران میں ہم ایک بار پھر گولڈن بلڈنگ کے پاس سے گزرے۔ کہیں کہیں ابھی تک ملبا سلگ رہا تھا۔ بہت سے لوگ یہاں وہاں ٹولیوں میں کھڑے بلڈنگ کا بچا کھچا ڈھانچہ دیکھ رہے تھے۔ اخبار میں جو خبریں آئی تھیں، ان میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ بلڈنگ کے اندر دو بڑے گروپوں میں لڑائی ہوئی ہے۔ درجنوں مسلح نقاب پوش بلڈنگ میں گھسے اور انہوں نے تہلکہ مچا دیا۔

ہم اس مکان سے کچھ فاصلے پر اُتر گئے جہاں جیلانی موجود تھا اور اس کے ساتھ اشوریا، ابرار صدیقی اور جنت بھی موجود تھے۔ ہم پیدل چل کر مکان تک آئے۔ جیلانی نے خود ہی دروازہ کھولا۔ "یا شیخ! کیا حال ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے۔ ابرار صدیقی ہوش میں آچکا ہے۔ وہ بہت ڈرا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

جیلانی بولا۔ "ہوش میں آتے ہی اس نے واویلا شروع کر دیا۔ ہمارے سامنے ہاتھ جوڑنے اور معافیاں مانگنے لگا۔ پھر رونا شروع کر دیا۔ کہنے لگا کہ ہم اسے تکلیف دینے کے بجائے جان سے مار دیں، وہ ہمیں کچھ نہیں بتا سکتا وغیرہ وغیرہ۔ اسے سکون بخش دوا دی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سویا ہے۔"

"اپنے بارے میں کچھ بتایا ہے اس نے؟" عمران نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی تو نہیں۔"

"وہ لڑکیاں پہنچ گئی ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

جیلانی نے اثبات میں جواب دیا اور ہمیں اندر لے آیا۔ اشوریا سمیت تینوں لڑکیاں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے چائے کے کپ تھے۔ تینوں ڈری ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام فاخرہ اور دوسری کا عروج تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ دونوں باقاعدہ رونے لگیں۔ عروج ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے ہمیں کسی طرح ہمارے گھر پہنچا دیں۔ ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ پیسے اور شہرت کے لالچ میں ہم نے بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہمیں اب کچھ نہیں چاہیے۔ بس اپنے گھر پہنچ جائیں۔"

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ "اب یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تم ایک غیر ملک میں ہو۔ تمہارے پاس کوئی سفری کاغذ نہیں ہے۔ بہرحال، ہم ہر طرح تمہاری مدد کریں گے اور تم ضرور اپنے گھر بھی پہنچو گی۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔"

عروج نے الٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے۔ اس کی شکل زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت فلمی ہیروئن "تبو" سے ملتی تھی۔ وہ پاکستان میں ٹی وی اور اسٹیج پر بھی چھوٹے موٹے رول کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ ایک اسٹیج ڈرامے میں نائیکا شاربہ بائی نے اسے دیکھا اور شیشے میں اتار لیا۔ اس نے کہا کہ وہ تو بہت اچھا ڈانس کرتی ہے۔ اوپر سے اس کی شکل بھی "تبو" سے بہت ملتی ہے۔ وہ کسی طرح انڈیا چلی جائے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ وہ باتوں میں آگئی اور پھر مختلف ہاتھوں سے گزرتی ہوئی یہاں ممبئی آپہنچی۔ گولڈن بلڈنگ پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ بدترین حالات کا شکار ہے اور غلیظ ترین لوگوں میں ہے۔ جو کیمرا اس کا "عشق" تھا اسی کیمرے سے اسے گھن آنے لگی۔ اس نے ایک بار بھاگنے کی کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ اسے شرابی غنڈوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اشوریا رائے یعنی سویٹی کی کہانی بھی عروج کی کہانی سے بہت مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی نائیکا شاربہ کے ہتھے چڑھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ سویٹی کی شکل مشہور ہیروئن ایشوریا رائے سے بہت زیادہ ملتی تھی۔ اسے شاربہ اور سلطان چھابڑا وغیرہ کی طرف سے زبردست پذیرائی ملی۔ سویٹی کو بنانے سنوارنے میں بہت زیادہ روپیا بھی خرچ کیا گیا۔ اسے ڈانس اور بول چال کی خصوصی تربیت دی گئی۔ وہ اب ایشوریا رائے کی شخصیت سے اتنی قریب تھی کہ بڑے "تیز نگاہ" لوگوں کو بھی دھوکا دے سکتی تھی۔ تیسری لڑکی فاخرہ کا تعلق بھی عروج کی طرح "اس پار" سے تھا۔ وہ بھی کئی جگہ خراب ہو چکی تھی اور اب گولڈن بلڈنگ کے بدترین حالات کا شکار تھی۔

اس دوران میں جیلانی نے اطلاع دی کہ ابرار صدیقی جاگ گیا ہے۔ عمران نے لڑکیوں کو تسلی تشفی دی اور میرے ساتھ دوسرے کمرے میں ابرار صدیقی کے پاس آگیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ابرار صدیقی ہے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا... پہچانا... حیرت زدہ ہوا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ ہم دونوں سے لپٹ گیا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ہمیں یہاں دیکھ رہا ہے۔

وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ "میں تباہ ہو گیا... ختم ہو گیا... میں نے اپنی زندگی خود برباد کر لی۔"

کچھ دیر بعد جب جذبات کا چڑھا ہوا طوفان اتر گیا تو وہ بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا اور تکیے سے ٹیک لگالی۔ میں نے کہا۔ "ابرار صاحب! آپ کی چوٹ اب کیسی ہے؟"

وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔ "یہ چوٹ تو اب ٹھیک ہے لیکن دل پر جو چوٹیں لگی ہیں ان کا کوئی علاج نہیں... کوئی نہیں... مورتی کے چکر نے مجھے فنا کر دیا۔" اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ "آپ شاید آرا کوٹے کی بات کر رہے ہیں... وہ اب کہاں ہے؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں... کچھ خبر نہیں۔" اس نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ اس کا رنگ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"کچھ اندازہ تو ہوگا؟" عمران نے کہا۔

"مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ بہت برباد کرنے والی چیز ہے۔ وہ جس کے پاس بھی ہوگی، اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ بہت خطرناک لوگ اس کے پیچھے ہیں۔ وہ ہر جگہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ سایوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ وہ مجھے مار دیں گے... تمہیں بھی مار دیں گے۔ ان کی دی ہوئی موت سے بہتر ہے کہ بندہ خود کو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالے۔" ابرار صدیقی کسی بچے کی طرح سسکنے لگا۔

میں اور عمران ششدر تھے۔ اس ابرار صدیقی کو ہم نے جمشید نگر میں بڑے طمطراق میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی پانچ برس پہلے کی بات تھی۔ اس وقت ابرار صدیقی کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ لیکن اب وہ پینتالیس پچاس کا نظر آرہا تھا۔ ابرار صدیقی خوش لباس ہوا کرتا تھا۔ ہر وقت اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح نظر آتی تھی۔ تسبیح گھمانے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے تواتر سے نوادرات اور ان کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے وکالت کی ہوئی تھی اور ضرورت مندوں کو قانونی امداد فراہم کرنے کے لیے کوئی ادارہ وغیرہ بھی بنایا ہوا تھا۔ لیکن اب تو وہ خود سرتاپا امداد کا مستحق نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نادیدہ شے کا خوف جم کر رہ گیا تھا۔

ہم دیر تک اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے دل کا غبار آنکھوں کے راستے نکلتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ قدرے نارمل نظر آنے لگا۔ ہم نے اس کے ساتھ چار بجے کی چائے پی۔ وہ ہم سے جاننا چاہتا تھا کہ ہم یہاں ممبئی میں کیسے پائے جا رہے ہیں۔ وہ میڈم صفورا اور دیگر لوگوں کے بارے میں بھی جاننا چاہ رہا تھا۔ ہم نے اسے مختصر لیکن تسلی بخش جواب دیے۔ وہ یہ جان کر قدرے حیران ہوا کہ گندھارا آرٹ کا نادر نمونہ آرا کوٹے اس وقت انڈیا میں موجود ہے۔ یوں لگتا تھا کہ ابرار صدیقی کو پچھلے کچھ عرصے سے آرا کوٹے کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ جیسے اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ ہو چکا تھا۔ ہم نے جتنی بار بھی آرا کوٹے کا نام لیا، ابرار کے چہرے پر زردی سی بکھر گئی۔

پھر وہ بھانڈیل اسٹیٹ کی باتیں کرنے لگا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پانچ سال پہلے آرا کوٹے پر ہاتھ ڈالنے کے جرم میں میڈم صفورا اور میں بھی بطور سزا بھانڈیل اسٹیٹ پہنچائے گئے تھے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں جو جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں زیادہ تر باتیں ابرار کو معلوم تھیں۔

آخر میں نے ابرار سے پوچھا۔ "ابرار صاحب! کیا یہ بات درست ہے کہ چند مہینے پہلے آپ ایک بار پھر آرا کوٹے کو بھانڈیل اسٹیٹ سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟"

ابرار پہلے خاموش رہا پھر اس نے اس بات کو گول کرنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے اصرار کیا تو اس نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔ ایک طرح سے ہم نے کل رات اس کی جان بچائی تھی اور اب بھی اسے ایک محفوظ ٹھکانا مہیا کیے ہوئے تھے پھر میڈم صفورا کا حوالہ بھی موجود تھا۔ نوادرات کے حوالے سے میڈم اور ابرار صدیقی ایک دوسرے سے کاروباری تعاون کرتے رہے تھے۔ ان کا یہ تعلق پرانا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ ابرار صدیقی کو میڈم صفورا کی آواز سنا سکوں۔ میں نے سیل فون پر میڈم سے رابطہ کیا اور رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا مقصد صرف ابرار کو میڈم کی آواز سنانا تھا۔

اب ابرار صدیقی کو ثبوت مل چکا تھا کہ میڈم منصورا بھی یہاں ہمارے ساتھ ہی انڈیا میں موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ چند ماہ پہلے اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے چہرے اور سر کے بال صاف کروا دیے تھے، اب وہ یہاں دلجیت کے نام سے، ایک مراٹھی سیٹھ کا ڈرائیور ہے اور گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔ آج وہ وہاں اپنے سیٹھ کو گولڈن بلڈنگ لے کر آیا تھا۔

''لیکن آپ یہاں انڈیا کیوں آئے؟'' عمران نے پوچھا۔

''میں آیا نہیں مجھے لایا گیا۔ وہ لوگ مجھے لے آئے۔ وہ بہت خطرناک ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ وہ بندے کو دنیا کے کسی کونے سے بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ آج نہیں تو کل... کل نہیں تو پرسوں۔ میں نے آرا کوئے کو دوبارہ بھانڈیل اسٹیٹ سے نکال کر بڑی غلطی کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ لوگ آرا کوئے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ہر حد تک جا سکتے ہیں۔ یہ بات... تم لوگوں کو بھی سمجھ لینی چاہیے۔ ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے یا پھر... میری طرح سسک سسک کر جیو گے۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

مجھے اس کے جسم کے داغ نظر آئے اور دل کانپ گیا۔

عمران نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''ابرار صاحب! ہم ان لوگوں کو پہلے بھی شکست دے چکے ہیں۔ اب دوبارہ دیں گے۔ ہم میں اتنا حوصلہ ہے۔ ہم ایسا کر سکتے ہیں لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے آپ ہمیں اپنے بارے میں تو کچھ بتائیں۔ اگر آپ شروع سے بتائیں تو ہمارے لیے آسانی ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں اتنا تو معلوم ہے ابرار صاحب کہ جب زرگاں میں لڑائی زوروں پر تھی، اور ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی، آپ کو آرا کوئے سمیت وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا اور آپ پاکستان بھی پہنچ گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟''

ابرار نے رک رک کر بھرائی ہوئی آواز میں جو روداد سنائی، وہ مختصر الفاظ میں کچھ یوں تھی۔

چند ماہ پہلے ابرار صدیقی مجسمے سمیت یہاں پہنچ گیا تھا۔ نوادرات کی بھوک ابرار کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ خطرناک ترین حالات کے باوجود وہ خود کو اس ''ماسٹر پیس'' سے دور نہ رکھ سکا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے ہرکارے پھر آندھی اور طوفان کی طرح اس ماسٹر پیس یعنی آرا کوئے کے پیچھے آئے۔ اس مرتبہ ان کی تلاش کی شدت، اور سنگینی ابرار صدیقی کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے خطرناک لوگ تھے۔ وہ شکاری کتوں کی طرح ابرار صدیقی کی بو سونگھتے ہوئے پاکستان میں داخل ہو گئے... اور ان میں سے ہر ایک کی ناک بے حد تیز تھی۔ ان میں ایک ایسا کھوجی بھی شامل تھا جسے یہ دعویٰ تھا کہ وہ فاصلے سے آرا کوئے کی دھات سونگھ سکتا ہے۔ ان لوگوں نے کراچی میں ابرار صدیقی کے ساتھیوں کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ ابرار کسی طرح جان بچا کر بھاگا۔ وہ اس کے پیچھے تھے۔ ملتان اور پھر ساہیوال میں وہ ان لوگوں سے بال بال بچا۔ ملتان میں اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد ان لوگوں نے ابرار صدیقی کی تین رشتے دار خواتین کو بیدردی سے ذبح کر دیا اور کسی ''روحانی عمل'' کے لیے ان تینوں کی انگلیاں کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مارنے سے پہلے ان خواتین کو بیدردی سے داغا بھی گیا۔

ابرار صدیقی بہت خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے ساہیوال میں ہی ہڑپہ کے نزدیک آرا کوئے اپنے قریبی ساتھی عنایت کے حوالے کر دیا۔ یہی کوتاہ قامت شخص تھا جس کے ذریعے ہم ایک دفعہ نوادرات کے بیوپاری بن کر ابرار صدیقی تک پہنچے تھے۔ عنایت نامی یہ شخص ایک جیپ پر سوار ہو کر لاہور کی طرف نکل گیا اور ابرار صدیقی نے خود کو ساہیوال میں ہی روپوش کر لیا۔ عنایت بھی بھانڈیل اسٹیٹ کے خطرناک ہرکاروں سے بچ نہیں سکا۔ ان کے ایک مقامی مخبر نے عنایت کو لاہور کے نواح میں پہچان لیا۔ بھانڈیل کے ہرکارے ایک بار پھر اس کے پیچھے لگ گئے۔ عنایت لاہور سے ہوتا ہوا پہلے گوجرانوالہ کی طرف گیا پھر شیخوپورہ کی طرف بھاگا۔ وہ جان چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن جان نہیں چھوٹ رہی تھی۔ عنایت کے بارے میں ابرار کو جو آخری اطلاع ملی، وہ یہی تھی کہ وہ شیخوپورہ کے آس پاس کہیں ہے۔ تیسرے دن ابرار صدیقی کو معلوم ہوا کہ عنایت کی لاش ایک خشک برساتی نالے کے اندر سے ملی ہے۔ اس نے نالے کے اونچے پل پر سے چھلانگ لگائی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے، اور وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ ان سے بچنے کے لیے پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے کود گیا۔ عنایت کی لاش وزیر آباد کے قریب سے ملی تھی۔ اس کی جیپ بھی سکھرو کے پاس گھنے درختوں کے اندر سے مل گئی تھی۔

اس واقعے کے صرف دو دن بعد ابرار صدیقی ساہیوال سے پکڑا گیا۔ یہ ابرار کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ وہ جان بچانے کے لیے آرا کوئے پر لعنت بھیج چکا تھا۔ اب آرا کوئے بھی نہیں تھا اور ابرار کی سلامتی بھی نہیں۔

یہ انڈیل اسٹیٹ کے وحشی ہرکاروں کو عنایت ولی جیپ کے اندر سے ہی ایک ایسا ثبوت مل گیا تھا جو انہیں سیدھا ابرار صدیقی کی پناہ گاہ تک لے آیا تھا۔ ابرار کی اس بدقسمتی نے اسے زندہ درگور کر کے رکھ دیا... اگلے ڈیڑھ مہینے میں ابرار صدیقی پر جو کچھ بیتی، اسے بیان کرنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ لوگ بہاولپور میں اسے اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر لے گئے اور تشدد کی انتہا کر دی۔ ان کے پاس لوہے کا ایک خاص سانچہ سا تھا جسے وہ لوگ انگاروں پر دہکاتے تھے اور پھر اس کے جسم کو داغتے تھے۔ وہ اس سے آراکوئے کے بارے میں پوچھتے تھے اور ابرار کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ آراکوئے عنایت کے پاس تھا۔ اس نے جیپ کے اندر سیٹ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ یہ انڈیل اسٹیٹ کے ہرکاروں اور بھکشوؤں کو عنایت کی جیپ کے اندر سے کچھ نہیں ملا تھا۔ صرف عنایت بتا سکتا تھا کہ آراکوئے کہاں ہے اور وہ مر چکا تھا۔ بہاولپور میں تقریباً پندرہ روز تک اسے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد یہ لوگ اسے بہاولپور سے لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے کسی خاص طریقے سے اس پر بھی بے ہوشی طاری کی اور نہ جانے کس طرح انڈیا لے آئے۔ ابرار کے اندازے کے مطابق وہ اسے کسی خاص روحانی عمل سے گزارنے کے لیے کسی بڑے پگوڈا میں لے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں بالکل غیر متوقع طور پر ابرار کی قسمت نے یاوری کی۔ ایک طوفانی رات میں نہایت تیز بارش کے دوران میں اس کنٹینر کو حادثہ پیش آیا جس میں ابرار صدیقی کو لے جایا جا رہا تھا۔ ایک کار سے ٹکرانے کے بعد یہ کنٹینر "جیسلمیر" کے قریب الٹ گیا۔ اس خوفناک حادثے میں ایک بھکشو سمیت چار افراد ہلاک ہوئے۔ ابرار صدیقی معجزانہ طور پر بچ گیا۔ شدید زخمی حالت میں اس نے جنگل کے اندر تیس چالیس میل کا سفر طے کیا اور پھر ریل کا طویل سفر کر کے ممبئی کے مضافات میں پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ اب بھی اس کے پیچھے ہیں اور کسی بھی وقت اسے پھر پکڑ لیں گے۔ اس نے اپنے چہرے اور سر کے بال منڈوا دیے۔ اپنا پورا حلیہ تبدیل کر دیا اور ایک ہندو کی حیثیت سے انسانوں کے اس سمندر میں گم ہو گیا جسے ممبئی کہتے ہیں۔

یہ تھی ابرار صدیقی کی ساری روداد۔ پچھلے کئی ماہ سے ابرار کو کچھ پتا نہیں تھا کہ آراکوئے کے حوالے سے کیا تہلکہ مچا ہوا ہے اور کیا کیا پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔ اسے یہ خبر بھی نہیں تھی کہ آراکوئے عنایت کی جیپ سے کیسے غائب ہوا۔ وہ لاعلم تھا کہ عنایت نے تاور مجسمے کو چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا تھا۔ یہ مجسمہ سنگی بڈھے جدلی کے ہاتھ آ گیا۔ لیکن عنایت دوبارہ اس جگہ نہ پہنچ سکا جہاں اس نے مجسمہ پھینکا تھا۔ وہ موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے، آراکوئے اب کہاں ہو سکتا ہے؟" میں نے ابرار صدیقی سے سوال کیا۔

وہ بولا۔ "یہ وہ سوال ہے جس کے بارے میں، میں نے ہزار بار سوچا ہے اور کبھی بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ بس اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ عنایت سے وہ مجسمہ کسی دوسرے گروپ نے چھین لیا ہو... پھر اس نے خود ہی راستے میں کسی کو تھما دیا ہو... یا پھر کہیں پھینک دیا ہو تا کہ وہ بھکشوؤں کے ہاتھ نہ آئے اور اگر وہ زندہ بچ جائے تو بعد میں آ کر اسے ڈھونڈ لے۔ لیکن ہڑپے سے شیخوپورہ اور پھر وزیر آباد کئی سو میل کا سفر ہے۔ پتا نہیں کہ وہ مجسمہ کب اور کہاں عنایت سے علیحدہ ہوا۔"

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ فاسنگ بدھا کا مجسمہ مل چکا ہے اور اب ایک بار پھر اس کی تلاش کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اور یہ سو فیصد تصدیق شدہ خبر ہے۔"

ابرار ایک دم گم صم سا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔

عمران نے کہا۔ "مجھے یقین ہے ابرار صاحب آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مجسمہ وہاں پہنچ جائے جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔"

"کیوں چاہتے ہو تم؟ کیوں چاہتے ہو؟" وہ چلا اٹھا۔ "خدا کے لیے بھول جاؤ اسے۔ لعنت بھیجو اس پر۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ اتنے زور سے بولا تھا کہ اسے کھانسی ہونے لگی۔ وہ کتنی دیر تک کھانستا رہا۔ کھانسنے سے اس کے پہلو کا زخم تکلیف دیتا تھا اور وہ دوہرا ہو جاتا تھا۔

ہم نے بمشکل اسے پرسکون کیا۔ پانی وغیرہ پلایا۔ وہ آراکوئے کے حوالے سے کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں پوچھ رہا تھا کہ اگر مجسمہ واقعی مل چکا ہے تو کب اور کیسے ملا؟ وہ یقیناً دل ہی دل میں ہمارے "دماغ" کو کوس رہا تھا۔

عمران نے اسے بتایا۔ "ابرار صاحب! سچی بات ہے کہ ہم آپ کی طرح "اینٹیکس" کے دیوانے نہیں ہیں۔ آراکوئے میں ہماری دلچسپی کی وجہ کچھ اور ہے۔ آپ کو

سمجھیں کہ ہماری ایک بہت قریبی عزیزہ، ایک بڑے انڈین بدمعاش کے حبس بے جا میں ہے۔ اسے چھڑانے کا ہمارے پاس بس ایک ہی راستہ ہے۔ ہم کسی طرح آراکوئے تک پہنچ جائیں۔ اس کے لیے..."

"ہم... میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ "تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔ بہت زیادہ مہربانی ہو گی۔ مجھ سے اس بارے میں بات نہ کرو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" اس کے پورے جسم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا تھا۔

میں نے عمران کو اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ فی الحال ہم یہ موضوع نہ چھیڑیں۔ غالباً عمران بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ ہم نے موضوع بدل دیا۔

ٹی وی اور اخبارات میں گولڈن بلڈنگ کے حوالے سے ابھی کچھ آ رہا تھا۔ یہ بات بار بار دہرائی جا رہی تھی کہ وہاں دو گروپوں میں تصادم ہوا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ رہا تھا کہ فقط دو بندے وہاں گھسے تھے اور انہوں نے گولڈن بلڈنگ کی ملک تیسی کر دی تھی۔ گولڈن بلڈنگ میں فلم اور آرٹ کے پردے کے پیچھے جو دھندا ہو رہا تھا، اس پر بھی کھل کر بات کی جا رہی تھی۔ جرنلسٹ اسے بڑے وثوق سے فحاشی کا اڈا قرار دے رہے تھے۔ سادھو لیتی سراج اور تیواری کی موت کو بھی ڈسکس میں ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ خبروں اور تبصروں میں یہ بات بھی وضاحت سے کہی جا رہی تھی کہ گولڈن بلڈنگ والے فلم اور ٹی وی کی مشہور اداکاراؤں سے ہم شکل چہرے ڈھونڈتے تھے۔ پھر ان چہروں کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ عیاش امرا کو خطیر رقم کے عوض ان سپر اسٹارز کی نقلی قربت فراہم کی جاتی تھی، اور اکثر کیسوں میں یہ ڈراما کامیاب رہتا تھا۔

عمران چاہتا تھا کہ تینوں پاکستانی لڑکیوں کو پاکستانی ایمبیسی کے ذریعے پاکستان واپس بھجوا دیا جائے۔ اس کے سلسلے میں اس نے جیدی اور اس کے مقامی دوست نصیر احمد کو ضروری ہدایات دیں اور ان سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں معلومات حاصل کریں۔ بہرحال یہ کام فوری طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہ تینوں لڑکیاں ہمیں دیکھ چکی تھیں اور یہ بھی جان چکی تھیں کہ گولڈن بلڈنگ کا بیڑا غرق ہم نے کیا ہے۔ جب تک آراکوئے کی بازیابی اور ثروت کی رہائی کا کام مکمل نہ کر لیتے، ان لڑکیوں کو سامنے نہیں لایا جا سکتا تھا۔

ایشوریا رائے اپنے حالات اور فیصلوں پر بڑی نادم تھی۔ وہ جلد از جلد پاکستان واپس پہنچنا چاہتی تھی۔ ایشوریا رائے کو بھی راجا کی موت کا علم ہو چکا تھا اور وہ اس پر کچھ افسردہ بھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ راجا ایک بار اس کی قربت حاصل کرنے کے بعد بار بار اس کے قریب آنے کا خواہش مند تھا مگر اپنی کئی دوسری خواہشوں کی طرح وہ یہ خواہش بھی لے کر مٹی کے نیچے چلا گیا تھا۔

ایشوریا کا دل نائیکا شاربہ کی طرف سے بھی بہت کھٹا تھا۔ اس نے ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ایک بڑا کام کیا ہے مگر ایک چھوٹا کام اب بھی باقی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"شاربہ بائی... وہ بہت خبیث عورت ہے۔ شریف لڑکیوں کو اپنے چنگل میں پھنساتی ہے۔ ان کو برباد کر کے اسے خوشی ہوتی ہے۔ اب تو وہ کہیں چھپ چھپا گئی ہوگی اور ہو سکتا ہے کئی مہینوں کے لیے کہیں نظر ہی نہ آئے۔ مگر وہ بڑی ڈھیٹ ہے۔ جب معاملے ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو وہ پھر کسی بد کی طرح نکل پڑے گی۔"

"کوئی بات نہیں، نمٹ لیں گے اس سے بھی اور اچھی طرح نمٹیں گے۔" عمران نے کہا۔

ہم نے سویٹی عرف ایشوریا رائے اور دونوں لڑکیوں کو پوری تسلی دی کہ وہ جب تک یہاں رہیں گی، پوری حفاظت اور آرام کے ساتھ رہیں گی۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ یہاں اپنی موجودگی کو مکمل طور پر راز میں رکھیں۔

پلان کے مطابق اب ہمیں رتنا گری جانا تھا اور علاقے کے پگوڈاؤں کا جائزہ لینا تھا مگر ابرار صدیقی کا مل جانا بھی ایک بڑی مثبت پیش رفت تھی۔ وہ ابھی کچھ بتا نہیں رہا تھا لیکن امید تھی کہ ہم کوشش کرتے رہے تو وہ کسی حد تک اپنی زبان ضرور کھولے گا۔ اس کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے جو اس کے پیچھے پاکستان پہنچے اور پھر اسے وہاں سے اٹھا کر یہاں انڈیا لائے۔ وہ بار بار ان کی بے پناہ خطرناکی کا ذکر کرتا تھا اور یہ بھی بتاتا تھا کہ چند ماہ پہلے وہ اسے کسی روحانی عمل سے گزارنے کے لیے یہاں انڈیا میں لے کر آئے تھے۔

جب سے ہم جدا اسے رخصت ہوئے تھے اس سے ہمارا رابطہ نہیں ہوا تھا اور ہم کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ جاوا سے ٹیلی فونک رابطے میں خطرات موجود تھے۔ عین ممکن تھا کہ موبائل کال کی صورت میں ہماری لوکیشن ڈھونڈ لی جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ کل میڈم صفورا سے بات کرنے کے بعد ہم دونوں نے اپنے سیل فون بند کر دیے تھے۔ ابرار صدیقی کے حوالے سے بھی ہمارے ذہنوں میں شکوک موجود تھے۔

میں نے کہا۔ ”عمران! ہمیں ابرار کا دھیان رکھنا ہوگا۔ یہ غائب بھی ہوسکتا ہے۔“

”ابھی تو خیر یہ بہت ڈرا ہوا ہے۔ یہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بہرحال میں کسی کی ڈیوٹی لگاتا ہوں۔“

... اگلے روز ہم نے ابرار کو اچھا ماحول فراہم کیا اور اس سے پھر بات چیت شروع کی۔ عمران کی زبان دانی نے کام دکھایا۔ وہ بڑی مہارت سے ابرار کو شیشے میں اتارتا چلا گیا۔ ابرار پہلے تو آرا کوئے کے حوالے سے بات ہی نہیں کرتا تھا مگر اب وہ تھوڑا بہت کہنے اور سننے لگا۔ بہرحال اس کا خوف اپنی جگہ برقرار تھا۔ گفتگو کے دوران میں ابرار صدیقی نے دواری پگوڈا کا نام لیا۔

”یہ کیا جگہ ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

ابرار صدیقی چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد کمزور آواز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ لوگ مجھے لے جانا چاہ رہے تھے۔ اگر اس رات کنٹینر نہ الٹتا تو یقیناً میں وہاں پہنچ چکا ہوتا۔ اور لگتا تو یہی ہے کہ اب تک ختم بھی ہو چکا ہوتا۔“

”یہ دواری پگوڈا ہے کہاں؟“ عمران نے پوچھا۔

”ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن جو کچھ میرے کانوں تک پہنچا اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رتنا گری اس... کے آس پاس کا کوئی بودھ مندر ہے۔ سمندر کے کنارے بالکل ویران علاقے میں ہے۔“

رتنا گری کے نام پر میں اور عمران دونوں چونکے۔ بہرحال ہم نے اپنے تاثرات ابرار صدیقی پر ظاہر نہیں ہونے دیے۔

”آپ کا کیا خیال ہے، وہ لوگ آپ کو وہاں کیوں لے کر جا رہے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

ابرار نے ایک جھرجھری سی لی اور بولا۔ ”میں جو بھی برے سے برا خیال کرسکوں، وہ شاید ٹھیک ہی ہوگا۔ وہ بہت بے رحم لوگ ہیں۔ آپ دونوں نے میرے جسم پر جلنے کے نشان تو دیکھے ہی ہوں گے۔ یوں سمجھیں کہ وہ اس سے کہیں آگے تک جاسکتے ہیں۔ زندہ بندے کی کھال کھینچ سکتے ہیں۔ اس کے سامنے اس کے ہاتھ پاؤں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرسکتے ہیں۔ کہنے کو تو وہ بودھ بھکشو ہیں لیکن بھکشوؤں والی کوئی بات ان میں نہیں ہے یا پھر شاید انہوں نے بھکشوؤں کا روپ دھار رکھا ہے۔“

ابرار صدیقی کے چہرے پر ایک بار پھر بے پناہ خوف کے سائے لہرا گئے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہم آرا کوئے کی تلاش میں ہیں۔ ہمارے ارادے اسے اندر سے جان سے دہلا رہے تھے۔ یہ سوچ ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھی کہ آرا کوئے کو ڈھونڈا جائے۔ وہ اس معاملے پر بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں اس کا کہا ہوا کوئی لفظ اس کے لیے مصیبت بن جائے۔

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ”میرے دوستو! میں اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ ہو چکا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھوں مرنا پسند کرلوں گا لیکن یہ پسند نہیں کروں گا کہ تم مصیبت میں مجھے پھر سے گھسیٹو۔ بلکہ میرا ہمدردانہ مشورہ تمہیں اور صفورا کو بھی یہی ہے کہ آگ اور موت کے اس کھیل کو بھول جاؤ۔ وہ جنونی لوگ ہیں۔ انہوں نے مجسمے کے لیے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔“

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ابرار بھائی! ہم جانتے ہیں آپ نے اس سلسلے میں بہت تکلیف کی ہے۔ ہم آپ کو مزید مصیبت میں ڈالنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن آپ اتنا تو کرسکتے ہیں کہ ہمیں ان حالات کے بارے میں بتائیں جن سے آپ گزرے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو جن سے آپ کا واسطہ پڑا۔“

ابرار صدیقی کی باتوں سے یہی معلوم ہوا کہ ان میں سے کچھ بھکشو لگتے تھے اور کچھ کٹر قسم کے ہندو تھے۔ ان کے ساتھ کچھ مقامی لوگ بھی تھے۔ یہ مقامی بھی خطرناک غنڈے ہی تھے۔ یقیناً انہیں بھاری معاوضے دے کر اپنے ساتھ ملایا گیا تھا۔ بھکشو بھی صرف اپنے منڈے ہوئے سروں کی وجہ سے ہی پہچانے جاتے تھے ورنہ ان کا لباس اور حلیہ بھی عام انڈین اور پاکستانیوں جیسا ہی تھا۔ وہ بار بار جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے تھے اور خون کی ندیاں بہانے کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے پاس آتشیں اسلحے کے علاوہ دندانوں والے تیز دھار چھرے تھے۔ آنکھوں سے ہر وقت چنگاریاں سی چھوٹتی تھیں۔ پاکستان اور انڈیا میں عام مقامی لوگ ان کے لیے کیڑے مکوڑوں کی طرح حقیر تھے۔ وہ کسی کو بھی چیونٹی کی طرح مسل دیتے تھے۔ ابرار کے مطابق پاکستانی اور انڈین علاقے میں کم و بیش پندرہ افراد انہوں نے معمولی وجوہات پر قتل کیے۔

ابرار صدیقی سے بات چیت کے بعد میں اور عمران دوسرے کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھے۔ ابرار کی باتوں میں رتنا گری کا ذکر آیا تھا۔ اس سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کو بھی کہیں رتنا گری کے آس پاس ہی لے جایا گیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ خبر نہیں تھی کہ رتنا گری کا وہ کون سا مقام ہے جہاں ڈاکٹر مہناز پائی جائے گی۔ اب ایک نام ہمارے

سامنے آیا تھا۔ اور وہ نام تھا دواری پگوڈا کا۔ اس بات کی امید کی جاسکتی تھی کہ ڈاکٹر مہناز بھی اسی پگوڈا میں لے جائی گئی ہوگی۔

عمران نے کہا۔ ”دیکھا، راستوں سے کیسے راستے نکلتے ہیں۔ ہم نے سوہنی کی مدد کرنے کی کوشش کی اور قدرت نے ہماری مدد کردی۔ ہم رتنا گری جا کر زیادہ خجل خوار ہونے سے بچ گئے۔ اب ہمارے پاس دواری پگوڈا کا نام ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ نام ہمیں بڑا فائدہ پہنچائے گا۔“

”تم ایک دم جینئس ہو بلکہ جینئس بھی تمہارے لیے بچہ ہے۔“ میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

”تم مذاق کر رہے ہو لیکن یار! تمہیں تمہارے باوا جی کی قسم... سچ بتاؤ جب میں چیتا کوٹ پہنتا ہوں اور اس طرح ایک دم گھوم کر دیکھتا ہوں تو سین کونری نہیں لگتا، جیمز بانڈ [illegible]۔“

”اچھا بکواس بند کرو۔“

”یار! تم اسے بکواس کہہ رہے ہو، مجھے فکر پڑی ہوئی ہے۔ یہ ممبئی ہے۔ یہاں بڑی بڑی شکاری آنکھوں والے ڈائریکٹر اور فلم ساز ہیں۔ کھٹاک سے بندے کو کاسٹ کرلیتے ہیں فلم میں۔ اگر کسی نے مجھے کاجل یا پریتی زنٹا وغیرہ کے ساتھ کاسٹ کرلیا تو وہ بے چاری شاہین تو بے موت ماری جائے گی۔“

”کہیں ماری جائے گی۔ وہاں وہ دو بے وقوف خواتین ریما اور نرگس بھی تو تمہارے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔“

”یار! ان کی اور بات ہے، یہ بالی وڈ ہے۔ یہاں کی [illegible] تیز طرار [illegible] ہیں۔ اکثر اپنے ساتھی ہیرو کی عزت لوٹ لیتی ہیں۔ مجھے تو بڑی شرم آئے گی یار! میرا تو ابھی تجربہ ہی نہیں ہے ایسی بے عزتی کا۔ اور اس سے بھی [illegible] یہ کہ میں کیا منہ دکھاؤں گا شاہین کو۔ میرے کردار کو [illegible] کون قبول کرے گا مجھے؟ ساری عمر ماں باپ کی [illegible] پڑا رہوں گا۔“

”تو اندیشہ یہی ہے کہ ابھی خودکشی کرلو۔“ میں نے [illegible]

”ویسے ایک حل اور بھی ہے۔ میں کوٹ پہنے ہی [illegible]

[illegible] ہوگا یہ فلمی دنیا پر اور [illegible]

[illegible] میں جیلانی اندر داخل ہوگیا۔ وہ عمران کے پاس آیا تھا۔ عمران فوراً سنجیدہ ہوگیا۔ ”یار! مجھے ایک جگہ کے بارے میں ارجنٹ رپورٹ چاہیے۔ بس دس پندرہ گھنٹے کے اندر اندر۔“

”بتائیے جی۔“

”دواری پگوڈا یا دواری بودھ مندر۔“ عمران نے کہا۔

”یہ کس علاقے میں ہے؟“

”رتنا گری اور اس کے آس پاس کہیں۔“

”ٹھیک ہے عمران بھائی۔“

”تفصیل مکمل ہونی چاہیے پیارے۔ جگہ کا جغرافیہ، تاریخ اور حساب وغیرہ۔ نصیر احمد کو اپنے ساتھ لے لو اور ابھی کام شروع کردو۔“

رات بخیریت گزری۔ اگلے روز بارہ بجے کے قریب جیلانی نے تفصیلی رپورٹ ہمیں دے دی۔ اس وقت جگت سنگھ بھی ہمارے پاس ہی بیٹھا تھا۔ رتنا گری سے آگے بالکل سنسان علاقے میں دواری نام کا ایک پرانا پگوڈا واقع تھا۔ یہ بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن بڑا مضبوط سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دیواریں پتھریلی تھیں اور ایک سائڈ گھاٹ کی طرف تھی۔ یہ دراصل سمندر ہی کا پانی تھا جو جھیل کی صورت میں کافی آگے تک آیا ہوا تھا۔ دواری پگوڈا کی خاص بات یہ تھی کہ یہ بودھوں کے ایک تند مزاج فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ عام طور پر بودھ مت کو ماننے والوں کو امن پسند اور رقیق القلب سمجھا جاتا ہے لیکن یہ فرقہ خاصا مختلف تھا۔ ان لوگوں کا یقین تھا کہ حد سے بڑھی ہوئی نرمی اور منکسر المزاجی ان کو دھیرے دھیرے ختم کردے گی اور دوسرے مذاہب ان پر غالب آجائیں گے۔ جیسے بنگال اور بہار میں پال سلطنت کے خاتمے سے بودھ برباد ہوگئے تھے۔ یہ لوگ تشدد اور خوں ریزی سے پرہیز نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں سے کئی ایسے تھے جو اپنے مزاج کے اعتبار سے جنونی قاتل کہلائے جاسکتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس فرقے کا بانی کوئی ہندو تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کی کچھ رسوم میں ہندوؤں کی جھلک بھی پائی جاتی تھی۔ اس فرقے کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی تھی اور یہ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن جتنا محدود ہوا تھا، اتنا ہی کٹر اور جنونی ہوگیا تھا۔ دواری بودھ مندر ان لوگوں کا ہی ٹھکانا تھا۔ یہ پراسرار جگہ تھی۔ عام لوگ اس طرف جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔

عمران نے کہا۔ ”اگر وہاں گھسنا ہو تو کیا کرنا ہوگا؟“

”یہ بڑا مشکل کام ہے۔“ جیلانی نے گہری سانس لی۔

”وہاں یہ لوگ بڑا سخت پہرا رکھتے ہیں۔ [illegible] جگہ نہیں، بہرحال کم ہی جگہ ہے۔ اندرونی عمارت کے گرد پتھر [illegible]

کی ایک اونچی فصیل ہے۔ یہاں صرف ایک پھاٹک ہے اور وہ بھی سخت نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ۔۔۔۔۔"

"یار! تم ہماری طرف ہو یا ان کی طرف؟" عمران نے جیدانی کی بات کاٹی۔ "کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے ہمیں آگے بڑھنے کی راہ ملے۔"

"اب وہی بتانے جارہا ہوں۔" جیدانی مسکرایا۔ "آپ کی توقع سے زیادہ بھاگ دوڑ کی ہے ہم نے۔" اس نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہاں ایک بندہ ہے جسے بمبئی کا چور بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا نام موہن بجلی ہے۔ لڑکپن میں یہ ہاکی کا زبردست کھلاڑی تھا پھر چور اور ڈکیت بن گیا۔ اب جیل میں لمبی قید بھگت رہا ہے۔"

"ہاں، اس بندے کا نام تو میں نے بھی سنا ہوا ہے۔" جگت سنگھ بولا۔

"اس کے بارے میں ہمیں ایک خاص بات کا پتا چلا ہے۔" جیدانی نے کہا۔ "یہ شخص چھ سات سال پہلے اسی بودھ مندر میں ایک زبردست واردات کر چکا ہے۔ یہ پانی والی طرف سے بودھ مندر کی ایک سرنگ میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ سرنگ پرانے وقتوں میں پانی کے نکاس کے لیے استعمال ہوتی تھی لیکن پھر پانی چڑھ جانے کی وجہ سے بند ہو گئی۔ موہن بجلی نے یہی راستہ استعمال کیا اور مندر کے بالکل اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے تقریباً بیس کلو سونا چرایا جو مورتیوں اور مقدس باکسز کی شکل میں تھا۔ بعد میں وہ پکڑا بھی گیا اور اس سے تھوڑی بہت چیزیں واپس بھی حاصل کر لی گئیں۔ پھر وہ بھاگ بھی گیا۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ موہن نامی بندہ بودھ مندر میں گھسنے کا خفیہ راستہ جانتا ہے۔"

"تو کیا یہ راستہ اب تک ویسے ہی کھلا پڑا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ واردات کے بعد وہاں لوہے کی جالیاں لگا دی گئی تھیں لیکن وہ جالیاں برسوں سے پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یقیناً خستہ ہو چکی ہوں گی۔ ان دو تین جالیوں کو کاٹنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ مشکل صرف یہ بات ہے کہ سمندری پانی کے نیچے اس خفیہ رستے کی لوکیشن معلوم ہو اور یہ کام صرف اور صرف موہن کر سکتا ہے۔"

"اور وہ جیل میں ہے۔" عمران نے کہا۔

"کوئی طاقتور بندہ ہو تو اسے پیرول پر یا کسی اور طریقے سے عارضی رہائی بھی دلا سکتا ہے۔۔۔ مثلاً جاوا۔" جیدانی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

عمران نے چونک کر جیدانی کو دیکھا پھر تحسینی انداز میں سر ہلایا۔ جاوا نے اس "مشن" کے دوران میں ہر طرح تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے ہمیں دو تین فون نمبرز بھی دے رکھے تھے جن کے ذریعے ہم جاوا اور اس کے قریبی ساتھیوں سے رابطہ کر سکتے تھے۔ خطرہ بس یہی تھا کہ کہیں فون سے ہماری لوکیشن کا پتا نہ چل جائے۔

اس مسئلے کا حل یوں نکلا کہ عمران اور جیدانی ہوٹل میں سوار ہو کر نکلے اور انہوں نے ڈھائی تین کلومیٹر دور سے جاوا سے رابطہ کیا۔ جاوا کے ساتھ عمران کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ عمران نے جاوا کو اپنی ڈیمانڈ بتائی۔ جاوا نے خاص تردد کے بغیر ہامی بھر لی۔ ہاں، یہ کہا کہ اس کام میں تین چار روز لگ سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی زیادہ جلدی نہیں تھی۔ ہم اس دوران میں تیاری کر سکتے تھے اور مزید معلومات جمع ہو سکتی تھیں۔

☆☆☆

جگت سنگھ بالکل آگ بگولا تھا۔ اس کے سینے میں انتقام کے انگارے دہک رہے تھے۔ وہ مرنا یا مارنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جاوا بہت بڑا ڈان ہے مگر اس کے اندر وہ دیوانگی تھی جو شیشے کو پتھر سے ٹکراتی ہے اور چیونٹی کو ہاتھی سے لڑا دیتی ہے۔ اسے پتا تھا کہ اس کی محبوبہ آشا کور کو کس طرح مارا گیا اور اس کے لاڈلے بھائی کے جوان جسم سے روح کس طرح چھینی گئی۔ جگت سنگھ پنجاب کا تنڈرمنچلا تھا۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر اس کے بازوؤں میں بجلیاں کوند جاتی تھیں۔ اب یہ بجلیاں کسی کو بھسم کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ اندھا دھند شراب پیتا تھا، اپنی کرپان کی دھار پر انگلی پھیرتا رہتا تھا۔ جاوا کے لوگوں نے چند روز پہلے اسے لنگری پورہ گاؤں کے نواح سے پکڑا تھا۔ اسے فرید کوٹ لائے، وہاں بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کے منہ پر گوبر باندھ کر اسے الٹا لٹکائے رکھا۔ پھر بمبئی لے آئے۔ جاوا کے دستِ راست پریم چوپڑے نے اسے تیواری لال کے حوالے کیا جس نے اسے گولڈن بلڈنگ کے بندی خانے میں پہنچا دیا۔ یہاں اس کی اکڑ توڑنے کی بھرپور کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تھک کر یہ لوگ اسے مردانہ صفات سے محروم کرنے کا سوچ رہے تھے جب ہم وہاں پہنچے اور اسے رہائی دلائی۔

جاوا نے تین چار دن کا وقت مانگا تھا لیکن غیر متوقع طور پر دوسرے ہی روز رات گیارہ بجے کے قریب مطلوبہ شخص ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اسے لانے کے لیے میں، عمران

اور جیلانی کا دوست نصیر احمد ساحل پر گئے اور ایک نائٹ کلب کے سامنے پریم چوپڑا نے اس بندے کو ہمارے حوالے کیا۔ اس کی عمر تیس بتیس سال رہی ہوگی۔ شکل سے ہی پرلے درجے کا خرانٹ اور موقع پرست لگتا تھا۔ اسے نہلا دھلا کر لایا گیا تھا پھر بھی اس کے جسم سے بو اٹھ رہی تھی۔ پریم چوپڑا نے اسے ہماری گاڑی میں دھکیلا اور بولا۔ ''اب یہ تم لوگوں کی ذمے داری ہے۔''

''بالکل بے فکر رہو۔'' عمران نے کہا۔

ہم ہائی روف گاڑی میں واپس روانہ ہوئے۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ جعلی تھی... ہم اپنے عقب سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ بہرحال خیریت گزری، ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا۔ لیکن نئے آنے والے شخص کی طرف سے خیریت نہیں گزری۔ وہ واقعی بد کا پھرتیلا اور عیار تھا۔ ایک سنسان سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی ذرا آہستہ ہوئی تو اس نے اچانک کام دکھایا۔ ہائی روف کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اس نے اسے تیزی سے سرکا دیا اور اسے پورا کھول دیا۔ عمران کو ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو وہ کسی چھلاوے کی طرح باہر چھلانگ لگا چکا ہوتا۔ عمران کے ہاتھ میں اس کی ڈبی دار شرٹ کا کالر ہی آیا۔ عمران نے جھٹکے سے اسے پیچھے کی طرف کھینچا۔ اس نے عمران کے سینے پر ٹکر رسید کی اور مچھلی کی طرح تڑپ کر عمران کی گرفت سے نکلا۔ میں سب سے پچھلی نشست پر تھا۔ میں نے اسے باہر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ عمران نے بھی اس کے پیچھے ہی جست کی۔ اس دفعہ عمران نے اس کی کمر پر ہاتھ ڈالا۔ دونوں اوپر نیچے سڑک کے کنارے کچی زمین پر گرے۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر بھاگنا چاہ رہا تھا۔ چند سیکنڈ تک دونوں میں زبردست کشمکش ہوئی۔ پھر عمران نے اپنا پستول نکال کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ عمران کے تیور دیکھ کر اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس دوران میں، میں اور نصیر احمد بھی گاڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ عمران اسے گھسیٹتا ہوا پھر گاڑی میں لے آیا۔ اکا دکا موٹر سائیکل سوار اس منظر کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے گزرے۔ غالباً یہی سمجھا گیا ہوگا کہ کوئی واردات ہو رہی ہے۔ کسی نے رکنے یا اپنی رفتار دھیمی کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دو منٹ بعد ہم پھر اپنے مہمان موہن تکی کے ساتھ اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔ ابھی تک تو وہ قیدی ''ثابت'' ہو رہا تھا۔ اس کے چھریرے بدن میں قابل رشک تیزی تھی مگر اس کا واسطہ بھی کسی کم پھرتیلے شخص سے نہیں پڑا تھا۔ عمران نے اسے گریبان سے دبوچے دبوچے ایک زوردار جھانپڑ اس کے سر پر لگایا۔ ''ماں کے شکم میں کیسے نکار ہا تو؟''

اس نے خونی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ تو نا ہیں، تیرا یہ کتا پستول بولت ہے۔ اگر ماتا کا دودھ پیا ہے تو اس کے بغیر بات کر۔''

عمران نے ایک اور جھانپڑ لگایا۔ ''اس کے بغیر بھی بات کرلیں گے لیکن پہلے کسی ٹھکانے پر تو پہنچ دے۔''

اس نے اپنے منہ میں جمع ہونے والا خون غصیلے انداز میں گاڑی کے فرش پر تھوک دیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم نصیر احمد کے گھر پر تھے۔ موہن بدستور غصیلے موڈ میں تھا۔ عمران کا ایک گھونسا اس کے منہ پر پڑا تھا جس کی وجہ سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد عمران نے موہن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''ہاں اب بتاؤ کیا ارادے ہیں؟''

وہ خاموش رہا۔ بس گھورنے پر اکتفا کیا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے اسے اپنی تیزی پھرتی پر مان ہے۔ ہاکی شاکی اور باکسنگ بھی کھیلتا رہا ہے نا۔ سنا ہے کئی بار پولیس کی حراست سے بھی بھاگا ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' عمران نے کہا پھر قمیص کے نیچے سے اپنا پستول نکال کر دراز میں رکھ دیا۔ موہن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''لو بھیا! پستول نہیں ہے میرے پاس۔ اب اپنی کوئی حسرت نکالنی ہے تو نکال لو۔''

موہن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا۔

''چل اٹھ، تجھے مطلب بتاتا ہوں۔'' عمران نے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گھر کے عقبی لان میں تھے۔ ایک گیٹ اس طرف بھی موجود تھا۔ یہ گراسی لان کوئی بیس فٹ چوڑا اور ساٹھ ستر فٹ لمبا ہوگا۔ ایک ٹیوب لائٹ یہاں مدھم روشنی بکھیر رہی تھی۔ عمران نے گیٹ کا کھٹکا ہٹا دیا اور موہن سے بولا۔ ''لو بھیا اب بھاگ سکتے ہو تو بھاگ لو۔''

موہن کچھ دیر عمران کو گھورتا رہا [illegible] سمجھ گیا۔ عمران اسے [illegible] جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ میں نے [illegible] جیلانی اور نصیر احمد وغیرہ تماشائی کی حیثیت سے [illegible] موجود تھے۔

''[illegible] زبان پر قائم رہو گے یا پھر پستول نکال لو گے؟'' موہن نے پوچھا۔

''[illegible]... پستول نہیں نکالوں گا [illegible]

ہو سا، گیٹ سے آگے نکل جاؤ گے تو تیرا پیچھا بھی نہیں کروں گا... بلکہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں کرے گا۔''

موہن کی سیاہ آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کا سانولا چہرہ تمتما سا گیا۔ اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے ہمارے چہرے دیکھے جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ ہم کسی طرح کا مذاق تو نہیں کر رہے۔

وہ بہت تیز طرار تھا اور عیار بھی لیکن میں جانتا تھا کہ عمران اسے سنبھال لے گا۔ بالکل اچانک ہی ممبئی کے اس چور نے دوڑ لگا دی۔ اس کا رخ سیدھا گیٹ کی طرف تھا۔ عمران پہلے سے تیار تھا۔ وہ اس کے راستے میں آیا۔ ممبئی کے چور یعنی موہن نے بڑی تیزی سے اسے چکمہ دیا۔ وہ جھکائی دے کر بائیں طرف سے نکلا۔ عمران نے جست لگا کر اس کی کمر پکڑ لی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ انسان نہ ہو کوئی چکنی مچھلی ہو۔ جس طرح مگرمچھ تیزی سے پانی کے اندر پلٹنیاں کھاتا ہے، موہن نے بھی کھائیں اور نکل گیا۔ مگر اس کا ٹخنہ پھر بھی عمران کے ہاتھ میں رہا۔ ٹخنہ چھڑانے کے لیے موہن نے دوسری ٹانگ سے عمران کے چہرے پر ضرب لگانا چاہی۔ عمران کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس برق رفتار وار سے خود کو نہ بچا سکتا۔ عمران نے جھک کر خود کو بچایا اور موہن کی دوسری ٹانگ بھی تھام لی۔ تب عمران نے گھما کر اسے دور پھینکا اور پھر جست لگا کر اس پر چڑھ گیا۔ موہن نے عمران سمیت خود کو گیٹ کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت عمران کی گرفت سے نکل جائے گا۔ اس کے جسم میں بے پناہ لچک تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود کو چھڑانے اور بھاگ جانے کی خصوصی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر سابقہ عمران سے تھا۔ اس نے موہن کو فرشی ٹک لگایا اور بے بس کر دیا۔ اس نے عمران کو گھونسا جڑا تو عمران نے جوابی طور پر تین گھونسے جڑے اور اس کی گردن پکڑ کر اس کا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ اب بالکل شکنجے میں تھا۔ چند لمحے بعد اس نے ہار مان لی۔

عمران اس کے اوپر سے اٹھ گیا۔ ''دیکھ لو، پستول کے بغیر بھی تمہیں ''دان حاضر'' کیا ہے۔''

وہ شکست خوردہ نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے گھاس کی ہریالی پکڑ چکے تھے۔ قمیص سامنے سے دو ٹکڑے ہو گئی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''چلو ایک اور چانس دیتا ہوں اور یہ بھی پستول کے بغیر۔ ایک دفعہ اور زور مار کر دیکھ لو۔''

وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا فوراً ایک پڑا۔ اس مرتبہ اس نے تیزی سے عمران کے سینے پر ٹکر ماری کہ عمران لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپا اور گیٹ کی طرف بھاگا۔ عمران اس کے پیچھے گیا۔ یہ مختصری دوڑ عمران نے ہی جیتی۔ اس نے بھاگتے بھاگتے جست کی اور گیٹ سے فقط آٹھ دس فٹ کی دوری پر موہن کو چھاپ لیا۔ پندرہ بیس سیکنڈ تک زبردست کشمکش ہوئی۔ آخر عمران نے اس کی پشت کی طرف آ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے ہوا میں اٹھا لیا۔ اب وہ ہاتھ پاؤں چلانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ عمران اسے اسی طرح اٹھائے اٹھائے برآمدے کی طرف لے آیا اور پھر پختہ فرش پر پٹخ دیا۔

''بند کر دو گیٹ۔'' عمران نے پھنکار کر کہا۔

موہن اسی طرح فرش پر پڑا ہانپتا رہا۔ عمران کا پارا چڑھا ہوا تھا۔ اس نے موہن کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''اب بھاگو گے تو پستول سے روکوں گا اور سیدھی تیرے ناریل میں گولی ماروں گا۔''

☆☆☆

اگلے دس بارہ گھنٹے میں یہ موہن نامی شخص غیر متوقع طور پر نارمل نظر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر اپنی ہار مان لی ہے اور اب مزید کوئی چکما نہیں دے گا۔ ناشتے کے بعد اس نے عمران سے طویل مشورہ بھی کیا۔ یہ مشورہ دواری مندر کے اندر جانے کے حوالے سے ہی تھا۔ بعد میں، میں اور جیلانی بھی اس مشورے میں شریک ہو گئے۔ موہن نے تصدیق کی کہ اس بودھ مندر کے اندر گھسنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے پانی کے راستے سے۔ اس نے کہا کہ اس کے لیے پانی میں اترنے والوں کو ایک طویل ڈبکی لگانا ہوگی۔ اس کے لیے غوطہ خوری والا سلنڈر اور ماسک ضروری ہے۔ اس کے علاوہ واٹر پروف تھیلے جن میں اسلحہ اور ایمونیشن وغیرہ محفوظ رہ سکے۔ مندر کا اندرونی نقشہ موہن کے ذہن میں کسی فوٹو اسٹیٹ کی طرح محفوظ تھا۔ ہم نے اس حوالے سے بھی تفصیلی بات کی اور پلان ترتیب دیا۔

آخر میں موہن کہہ ر بولا۔ ''یہ خطرناک کام ہے۔ اس میں ہم مارے بھی جا سکتے ہیں۔ تم لوگوں کا تو اپنا لوبھ (لالچ) ہے۔ میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟''

''جن لوگوں نے تمہیں جیل سے نکالا ہے، انہوں نے کچھ نہ کچھ فائدہ تو بتایا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''صرف یہ بتایا کہ اگر میں مدد کروں گا تو میری قید میں سے دو چار سال کم کر دیے جاویں گے۔ لیکن مجھے اس سے کچھ زیادہ فائدہ ہونے والا ناہیں۔ میری قید بیس سال سے چند مہینے زیادہ ہی ہے۔''

عمران بولا۔ ''تمہارے لیے مزید کوشش کریں گے۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ جیل میں تمہاری مشقت ختم کرا دیں یا تمہیں بی کلاس وغیرہ دے دی جائے اور اس سے زیادہ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔''

''مثلاً کیا؟''

''تم یہ کام ختم ہونے دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے لیکن فی الحال مجھے کیا مل سکتا ہے؟ میں کم از کم چوبیس گھنٹے اچھی طرح آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''اگر تمہاری ڈیمانڈ ہے تو اس کا انتظام ہو جاتا ہے۔'' جیلانی نے کہا۔

زیادہ تر جرائم پیشہ لوگوں کی طرح موہن کمار بھی شراب اور عورت کا رسیا تھا۔ جیلانی کے مقامی دوست نصیر احمد نے اس کے لیے یہ سہولتیں فراہم کر دیں۔ گھر کی بالائی منزل کا ایک کمرا اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ وہ ایک نوخیز پری طوائف اور شراب کباب کے ساتھ وہاں موجود رہا۔ تاہم ہم اس کی طرف سے ذرا سی بھی غفلت نہیں برت سکتے تھے۔ میں خود بھی بالائی منزل پر رہا اور مسلسل اس کی نگرانی کی۔

اگلے روز دوپہر کے وقت ہم رتناگری جانے کے لیے تیار تھے۔ عمران، میں، جگت سنگھ اور موہن کمار عرف موہن بجلی۔ جیلانی اور اس کے دوست نصیر احمد نے ہمارے لیے پانی میں ایک مختصر غوطہ مارنے کا انتظام کر دیا تھا۔ اس مختصر غوطے کے لیے ہمیں کسی خاص ٹریننگ کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اچھی طرح تیرنا جانتے تھے حتیٰ کہ جگت سنگھ بھی اپنے گاؤں کی نہر میں لمبی ڈبکیاں لگاتا رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ اس کی پشت پر سلنڈر نہ باندھا جائے۔ وہ پانچ چھ منٹ آسانی سے پانی کے نیچے گزار سکتا ہے لیکن یہ خطرہ مول لینا درست نہیں تھا۔

روانگی سے دس پندرہ منٹ پہلے میں نے اپنا سیل فون آن کیا اور ثروت کو کال کی۔ حسب سابق پہلے میڈم صفورا ہی بولی۔ وہ بڑے مزے میں تھی۔ شاید، میور برانڈ سگریٹ پھونک رہی تھی اور اس کا ہلکا سا اثر اس کی آواز میں موجود تھا۔ اس نے اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ کوڈیا کے ریچھوں کی آوازیں اکثر رات کو پریشان کرتی ہیں۔ ''وہ جوکر کدھر ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اشارہ یقیناً عمران کی طرف ہی تھا۔

''ہم ممبئی سے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ سامان وغیرہ باندھ رہا ہے۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

''تم دونوں ایک نمبر کے جھوٹے ہو، ایک دم لائر۔''

''ایک نمبر کا جھوٹا تو ایک ہی ہو سکتا ہے میڈم اور وہ عمران ہی ہوگا۔''

''یعنی تم دو نمبر بھی ہو اور جھوٹے بھی۔'' میڈم نے فقرہ چست کیا۔ ''چلو اس ایک نمبر یے کو بتانا کہ اب دو نمبر یا نہ بنے۔ اس نے مجھ سے فون پر بات کرتے رہنے کا پرامس کیا تھا۔''

''اوکے، میں کہہ دوں گا۔''

''لو بات کرو، ثروت سے۔'' اس نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد ثروت کی مدھم پریشان آواز ابھری۔ ''ہیلو تابش! کیسے ہیں آپ؟ اتنی دیر بعد فون کیوں کیا؟''

''بس ایک مجبوری آڑے آئی ہوئی ہے۔ میں پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔''

''تو آپ آ رہے ہیں؟''

''ابھی تو جا رہے ہیں ثروت! بس دعا کرنا۔''

وہ گم صم سی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ ''تابش! نصرت کا فون آیا تھا... اسے آج کل ہلکا بخار ہو رہا ہے۔ اسی سے یوسف نے بھی بات کی۔'' وہ ذرا اٹک کر بولی۔

میرے سینے پر گھونسا سا لگا۔ مجھے پہلے ہی لگتا تھا کہ وہ ضرور ثروت کو منانے کی کوشش کرے گا۔ ''اب کیا کہہ رہے ہیں یوسف صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، وہ اس بات پر بڑے شرمندہ ہیں کہ انہوں نے نصرت کے ساتھ سخت لہجے میں بات کی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ... انہوں نے معافی مانگی ہے نصرت سے۔ وہ... مجھ سے بھی... معافی مانگ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں تھے۔ پتا نہیں غصے میں کیا کیا کہہ دیا۔ آپ پر... گولی چلانے کا پچھتاوا بھی ہر وقت ان کے دماغ میں رہتا ہے۔''

''چلو کسی بات پر تو پچھتاوا ہوا ان کو۔'' میں نے کہا۔

جواب میں ثروت بالکل خاموش رہی۔ میں نے کہا۔ ''یہاں سے اچانک چلے جانے کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں؟'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔

''وہ کہتے ہیں، میں اس لیے گیا تھا کہ پاکستان جا کر زیادہ اچھے طریقے سے تم دونوں کے لیے کچھ کر سکوں۔''

''تم دونوں... کون؟''

''میں اور آپ... وہ وہاں ایمبیسی کے ذریعے کوشش کر رہے ہیں۔ انٹرپول کا ایک بڑا افسر بھی ان کا قریبی دوست ہے... برلن میں ان کا ہمسایہ تھا۔ وہ مسلسل یوسف سے رابطے میں ہے۔ آج کل انڈیا میں ہی موجود ہے۔ اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا۔ ایک ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔''

''پوچھو۔''

''یوسف... کہہ رہے تھے کہ کسی طرح ہماری لوکیشن کا پتا چل جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے... میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میڈم کو کچھ اندازہ ہے لیکن وہ اصرار کر رہے تھے۔''

''نہیں ثروت! یہ غلطی کبھی نہ کرنا۔ میں نے شروع میں ہی تاکید کر دی تھی۔ اس میں فائدے کی امید ایک فیصد بھی نہیں۔ نقصان کا خطرہ ایک سو دس فیصد ہے... جادا کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ بڑا زہریلا ناگ ہے۔ اس نے جو کہا ہے، کر دکھائے گا۔''

''ٹھیک ہے تابش! آپ جیسا کہتے ہیں... آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

میں نے قریباً پانچ منٹ مزید لگائے اور ثروت کو قائل کیا کہ وہ اس طرح کی سوچ بھی ذہن میں نہ لائے۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ جادا نے فون کی سہولت دیتے وقت یہی شرط رکھی تھی کہ صفورا اور ثروت کسی کو اپنی لوکیشن سے آگاہ نہیں کریں گی۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی جان کی ضمانت یکسر ختم ہو جائے گی۔

ثروت سے بات ختم کر کے میں دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ یوسف وہی کچھ کر رہا تھا جس کے اندیشے میرے ذہن میں موجود تھے۔ یہاں انڈیا سے اپنے بزدلانہ فرار کا جواز پیش کرنے کے لیے اس نے ثروت کے سامنے بہانہ گھڑا تھا کہ وہ وہاں لاہور میں بیٹھ کر بہت ڈوریاں ہلا رہا ہے اور ثروت کو بحفاظت پاکستان لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر رہا اور اگر کچھ تھوڑا بہت کر بھی رہا تھا تو اس کا نقصان ہی ہونا تھا فائدہ نہیں۔

عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''اٹھ جا جگر! وہ کیا کہتے ہیں شیکسپیئر صاحب، پنجابی میں... تھڑا بندھ مرکے ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔''

... ہم ممبئی سے نکلے اور ہائی روف گاڑی کے ذریعے بذریعہ سڑک رتناگری .... کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑی کے پچھلے شیشوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ نصیر احمد کر رہا تھا۔ ہمارے پاس وہ اسلحہ موجود تھا جو لنڈن بلڈنگ سے حاصل ہوا تھا۔ ان میں رائفلوں کے علاوہ دستی بم بھی موجود تھے۔ جگت سنگھ انہیں کالے انار کہتا تھا اور ان کالے اناروں سے اسے خاصی رغبت تھی۔ جگت سنگھ پہلے بھی ایک نڈر شخص ہی تھا لیکن اب اپنی محبوبہ اور چھوٹے بھائی کے قتل کے بعد وہ شعلہ جوالا بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک آگ سی دہکی رہتی تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ہم جادا کی شان اور دہشت کے سامنے جھکیں گے نہیں اور اس سے بدلہ چکانے کی اپنی سی پوری کوشش کریں گے، اور میں نے صدق دل سے یہ وعدہ کیا تھا۔

راستے میں سج گڑھ کے قریب ایک جگہ ہمیں روکا گیا۔ یہ پولیس ناکا تھا۔ گاڑی کے کاغذات پورے تھے۔ تلاشی میں کچھ برآمد نہیں ہوا کیونکہ اسلحہ سیٹوں کے نیچے محفوظ خانے میں تھا۔ کہیں، بریٹا پسٹل کی ایک گولی سیٹوں کے نیچے پڑی رہ گئی تھی۔ ناکے والوں نے سوال جواب شروع کر دیے اور ہم سے شناختی کارڈز طلب کیے۔ نصیر اور جگت سنگھ کے پاس تو شناختی کارڈ تھے لیکن میرے، عمران اور موہن کے پاس نہیں۔ یہاں پر جادا کے دیے ہوئے فون نمبرز میں سے ایک نمبر کام آیا۔ میں نے فون کیا۔ کسی نامعلوم شخص نے ریسیو کیا اور فون بند کرنے کو کہا۔ دو تین منٹ بعد میرے فون پر بارعب آواز والا کوئی شخص بولا اور ناکے کے انچارج انسپکٹر سے بات کرانے کو کہا۔ انچارج نے بات کی اور اس کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے فوراً ہم سے معذرت... کی اور بڑی عاجزی کے ساتھ جانے کی اجازت بھی دی۔

راستے میں، میں نے عمران سے کہا۔ ''جادا کو اب کم از کم یہ پتا تو چل ہی گیا ہوگا کہ ہم رتناگری یا اس کے قریب کہیں جا رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ انڈیا دل کے لحاظ سے چھوٹا لیکن رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔ اس رخ پر ہم سیکڑوں میل آگے تک سفر کر سکتے ہیں۔''

''پھر بھی تعاقب کی طرف سے مسلسل ہوشیار رہنا ہوگا۔''

''تو ہوشیار رہو نا تم۔ میں ذرا شیطین سے لڑائی کر لوں۔'' اس نے آنکھیں بند کیں اور سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

''یہ لڑائی کا کون سا طریقہ ہے؟''

''اس کو تصوراتی طریقہ کہتے ہیں اور اس طریقے سے لڑ کر میں ہمیشہ کامیاب ہوتا ہوں۔ ہر منگیتر اور شوہر وغیرہ کو اسی طرح لڑنا چاہیے۔''

☆☆☆

وہ رتناگری اور اس کے آس پاس کہیں ایک ویران علاقہ تھا۔ سمندر یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا لیکن

سمندری پانی ایک چھوٹی کھاڑی کی شکل میں کافی آگے تک آچکا تھا۔ چاروں طرف کھجور، بام اور دیگر خودرو درخت تھے۔ درختوں کے نیچے زرد جنگلی گھاس حدِ نگاہ تک نظر آتی تھی۔ اس گھاس کے درمیان ایک نیم پختہ راستہ کسی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا آگے تک جاتا تھا۔ اس راستے کے آخری سرے پر اونچے پیڑوں کے درمیان ایک پرانا بودھ مندر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ مندر کو حصار میں لینے والی بلند پتھریلی دیوار بہت دور سے بھی صاف نظر آتی تھی۔ عمران نے اپنا بیگ کھولا اور طاقتور ٹیلی اسکوپ نکال لی۔ اس ٹیلی اسکوپ نے ہمیں مندر کے مناظر وضاحت سے دکھائے۔ بلند پتھریلی دیوار کے اوپر زرد کپڑوں والے بھکشو چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مندر کے اکلوتے دروازے کا کچھ حصہ بھی نظر آرہا تھا۔ یہاں یقیناً کڑا پہرا تھا۔ یہ جگہ مندر سے زیادہ ایک چھوٹے قلعے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

اپنے پلان کے مطابق ہم نے قرب و جوار کا جائزہ لیا اور درختوں کے ایک جھنڈ میں اپنا فالتو سامان چھپا دیا۔ ہم کل چار افراد تھے۔ موہن کے سوا ہم تینوں کے پاس چھوٹی نال کی رائفلیں تھیں۔ موہن کے پاس شکاری چاقو تھا۔ بوقتِ ضرورت اسے پستول بھی مہیا کیا جاسکتا تھا۔ میرے پاس بھی ایک چاقو تھا جس کی پشت پر آری کی طرح دندانے تھے۔ عمران کے پاس سائلنسر لگا پستول بھی موجود تھا۔ راشن کے طور پر ہمارے تھیلوں میں بسکٹ، چنے اور پانی موجود تھا۔

اپنا اپنا ایمونیشن پلاسٹک کے تھیلوں میں ہمارے پاس تھا۔ اس کے علاوہ آٹھ دستی بم تھے۔ چار جگت سنگھ کے پاس اور دو دو میرے اور عمران کے پاس۔ موہن کے پاس ریگ زین کا ایک لمبوترا بیگ تھا۔ اس میں پانی کے اندر کام دینے والی واٹر لائٹ، لوہا کاٹنے والا مشینی کٹر، چند چھوٹے اوزار اور تالا کھولنے کے لیے دو مڑے تڑے تار موجود تھے۔ ہمیں تاریکی پھیلنے کا انتظار تھا۔ جونہی تاریکی گہری ہوئی اور درختوں کی بلند شاخوں سے اوپر تاریک آسمان پر تارے اپنی چمک دکھانے لگے، ہم اپنی جگہ سے حرکت میں آگئے۔ ہم نے مکمل ریہرسل پہلے ہی کر رکھی تھی۔ پشت پر سلنڈر باندھ کر ہم نے ماسک چہروں پر چڑھائے اور کھاڑی کے پانی کے ساتھ ساتھ بودھ مندر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا... سانپ کی طرح بل کھاتے رستے پر چلنے کے بجائے ہم نے درختوں کے نیچے چلنا مناسب سمجھا۔ یہاں زمین کیچڑ زدہ تھی۔ ہم سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ میرے پاس ایک بڑی ٹارچ موجود تھی لیکن ٹارچ کا استعمال خطرے سے خالی نہیں تھا۔ عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا اور ہر سب کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ قریباً دو کلومیٹر سے زائد فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم بودھ مندر کے کافی قریب پہنچ گئے۔ اب ہمیں پانی کی دوسری جانب بودھ مندر کی زرد روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ کبھی کبھی اندر سے ڈھول بجنے کی مدھم صدا بھی سنائی دے جاتی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں سے مندر کی بیرونی دیوار کا فاصلہ سو فٹ سے زائد نہیں تھا۔ درمیان میں کھاڑی کا تاریک پانی تھا جس میں نباتات کی موجودگی بھی نظر آتی تھی۔

موہن کمار نے سرگوشی کی۔ ''شروع میں پانی اتھلا ہے، ہم چل کر جاسکتے ہیں۔ آخری بیس تیس فٹ ایک دم گہرا پانی ہووے گا۔ ہم کو ایک دوجے کا ہاتھ پکڑ کر ڈبکی لگانا ہووے گی اور ہم دیوار کی طرف بڑھیں گے۔''

ہم نے اثبات میں سر ہلائے۔ بہت آہستہ سے ہم پانی میں داخل ہوئے اور بغیر آواز پیدا کیے آگے بڑھنے لگے۔ پانی سرد اور بے حرکت تھا۔ کہیں کہیں کوئی زیرِ آب پودا بھی ٹانگوں سے ٹکراتا تھا۔ پہلے پانی پنڈلیوں تک تھا پھر گھٹنوں تک آیا اور دھیرے دھیرے اونچا ہونے لگا۔ ہم نے گیس ماسک چڑھا لیے۔ عمران نے اپنا پستول واٹر پروف تھیلی میں ڈال لیا۔ موہن نے لمبوترے تھیلے میں سے اسپیشل واٹر لائٹ نکال لی۔ اس کی روشنی کسی سرچ لائٹ کی طرح تھی۔ پتھریلی دیوار اب ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ اس کے اوپر گھومنے پھرنے والوں کی مدھم آواز بھی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ یہ نازک صورتِ حال تھی۔ کوئی نیچے جھانک لیتا اور ہمیں دیکھ لیتا تو تہلکہ مچ جاتا۔ ہم اس وقت نہتے تھے۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہوتا کہ خود کو پانی میں چھپانے کی کوشش کرتے۔ بہرحال خیریت گزری۔ ہم اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ہمیں ڈبکی لگانا تھی۔ اب پانی ہماری تھوڑیوں کو چھو رہا تھا۔ ڈبکی لگانا بالکل مشکل نہیں تھا۔ سلنڈرز کا وزن ہمیں بہ آسانی نیچے لے جاسکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ ہم گہرے تاریک پانی میں اترتے چلے گئے۔ ہمارے جسموں پر عام لباس تھے اس لیے پانی کی ٹھنڈک بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ شروع میں ہم نے سانس باہر نکال دیے تھے، سلنڈرز کا وزن ہمیں بتدریج نیچے لیتا چلا گیا۔ موہن سب سے آگے تھا۔ عمران نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ عمران کا ہاتھ میں نے اور میرا ہاتھ جگت نے پکڑا ہوا تھا۔ واٹر لائٹ کی تیز روشنی راہنمائی کر رہی تھی۔ اچانک مجھے لگا کہ جگت کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ میں نے عمران

کے ہاتھ کو جھٹکا۔ اس نے موہن کو روکا۔ ہم پلٹے، جگت سنگھ کی ایک ٹانگ بری طرح ایک بیل میں الجھی ہوئی تھی۔ میں نے شکاری چاقو کی مدد سے یہ بیل کاٹی اور جگت کی ٹانگ آزاد کی۔ اگلے تین چار منٹ خاصے دشوار تھے۔ موہن کمار پتھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ سرک رہا تھا اور اس راستے کو تلاش کر رہا تھا جو چند برس قبل اسے اس بودھ مندر کے اندر لے گیا تھا۔ آخر وہ کامیاب ہوا۔ یہاں تقریباً تین فٹ قطر کا ایک سرنگ نما راستہ موجود تھا۔ راستے پر ایک زنگ آلود گول جالی تھی۔ یہ گرل نما جالی کئی جگہ سے زنگ آلود تھی۔ موہن نے تھیلے سے وہ کٹر نکالا۔ جو طاقتور بیٹری سے کام کرتا تھا۔ کٹر آن ہوتے ہی جالی کٹنا شروع ہوگئی۔ ہمیں کٹر کا بہت زیادہ استعمال نہیں کرنا پڑا۔ کافی کام نمکین سمندری پانی اور زنگ کی وجہ سے ہو چکا تھا۔ صرف دو تین منٹ کے اندر موہن نے گول جالی راستے کے دہانے سے علیحدہ کر دی۔ ہم ترتیب وار اندر داخل ہوئے۔ راستے کی گول دیوار کھردری تھی۔ اسے پکڑ پکڑ کر آگے بڑھنے میں ہمیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں سب سے پیچھے تھا۔ میرے آگے جگت سنگھ تھا۔ اب مندر کا فرش ہمارے اوپر تھا۔ ہم اس مندر میں آرا کوبے کی کھوج میں جا رہے تھے اور ڈاکٹر مہناز کی تلاش میں جا رہے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں چیزیں یہاں موجود ہیں یا نہیں... کون موجود ہے اور کون غیر موجود۔

ہم مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ مزید آگے جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ موہن کا ساتھ کتنا ضروری تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے راستے میں سے کئی دیگر راستے پھوٹ رہے تھے۔ یہ تنگ تھے اور الجھا دینے والے تھے۔ موہن اپنی یادداشت کے زور پر آگے بڑھتا رہا۔ آخر ہم ایک اور جالی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ جالی ایک قفل کے ذریعے بند تھی۔ قفل نے زیادہ دیر نہیں لی اور ہم پانی سے نکل کر ایک ایسی جگہ آگئے جسے چھوٹا سا تہ خانہ کہا جاسکتا تھا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ مختلف جگہوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور وہی پانی بہہ کر مندر کے نیچے بنی جگہوں پر جمع ہوتا ہے۔

موہن کمار نے ماسک اتارتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''اب ہم یہ سلنڈر اتارنے ہوویں گے۔''

ہم نے سلنڈر اور ماسک اتار دیے۔ عمران نے کہا۔ ''انہیں یہیں چھپا دیتے ہیں۔''

''بس ٹھیک ہے یہاں۔'' موہن بولا۔

تہ خانے کے ایک کونے میں ایک پانچ چھ فٹ اونچا پتھر پڑا تھا۔ اس کے عقب میں خلا سا بن گیا تھا۔ ہم نے سلنڈر، ماسک، واٹر لائٹ اور کٹر وغیرہ یہاں چھپا دیے۔ ہمارے کپڑے گیلے تھے۔ ہم نے رائفلیں، واٹر پروف تھیلوں سے نکال لیں اور چھوٹے بیگ کمر کے پیچھے فکس کر لیے۔

موہن کمار نے کہا۔ ''اب ایک پستول مجھے دو۔ ہو سکت ہے کہ اس کی ضرورت پڑ جاوے۔''

''ابھی نہیں۔ پہلے گراؤنڈ فلور پر پہنچ جائیں۔'' عمران نے کہا۔

سامنے ہی ایک پتھریلی سیڑھی کے آٹھ دس زینے تھے جن پر بڑے سائز کے تین چار مینڈک پھدک رہے تھے۔ زینوں کے آخری سرے پر ایک چوکور آہنی تختہ تھا۔ یہ زنگ آلود تختہ دراصل باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ اس میں ایک بڑے قفل کا سوراخ تھا... موہن کے لمبوترے بیگ میں موجود مڑے تڑے تار یہاں کام آئے۔ ممبئی کے اس چور نے تار نکالے اور بیس تیس سیکنڈ کی کوشش میں ہی تالا کھول لیا۔

ہم نے فوراً پلان بنایا۔ پلان کے مطابق مجھے اور عمران کو باہر جانا تھا۔ جگت سنگھ کو یہیں پر رہنا تھا اور موہن کی نگرانی بھی کرنا تھی۔ موہن کو یہ پلان پسند نہیں آیا لیکن وہ کوئی رکاوٹ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مندر کے اندر کا نقشہ ہم پہلے ہی اس سے اچھی طرح معلوم کر چکے تھے اور سمجھ بھی چکے تھے۔ جگت سنگھ کے ہاتھ میں رائفل تھی، اور ہمیں اس کی ہوشیاری پر پورا بھروسا تھا...

سیڑھیاں چڑھ کر عمران نے آہنی ڈھکنے کو ذرا سا اٹھایا۔ یہ پتھریلی دیواروں والا ایک طویل کمرا تھا۔ یہاں لوبان سلگ رہا تھا اور کچھ فاصلے پر ایک بھکشو کے گیروا رنگ کے کپڑے نظر آرہے تھے۔ اس کی قسمت بُری تھی کہ اس نے مڑ کر ہماری طرف رخ کر لیا۔ اس کی نظر ڈھکنے پر پڑی جو ایک دو انچ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ وہ ذرا چونکا اور ہماری طرف آیا۔ ہم بالکل ساکت رہے اور ڈھکنے کو بھی ساکت رہنے دیا۔ وہ نوجوان شخص تھا، تجسس کے عالم میں ہمارے بالکل قریب چلا آیا۔ اس نے جھک کر ڈھکنے کو دیکھا، اس سے پہلے کہ اسے کسی خطرے کا احساس ہوتا اور وہ پکارتا یا شور مچاتا، میں نے تیزی سے ڈھکنا اٹھایا اور پلک جھپکتے میں اس کا بازو پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ وہ ایک ''وہ'' کے سوا کوئی آواز نہیں نکال پایا اور سر کے بل زینوں پر لڑھکتا ہوا جگت سنگھ کے قدموں میں جا گرا۔ اس کو اندر کھینچتے ہی ہم نے ڈھکن بند کر دیا تھا۔ مضروب بھکشو کو مزید کوئی چوٹ لگانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

"اس کا بھی دھیان رکھو۔" میں نے جگت سے کہا۔
"آپ فکر ہی نہ کرو بادشاہ زادے۔ یہاں سب کچھ ایک دم بھلا چنگا رہے گا۔"

ہم نے ایک بار پھر ڈھکنا اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل آئے۔ عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا اور میرے ہاتھ میں شکاری چاقو۔ رائفلیں ہمارے کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ ہم کسی بھی صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھے۔ بودھ مندر کے اندر کی مخصوص خوشبوؤں نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ہم مندر کے مرکزی حصے کی طرف جانا چاہ رہے تھے جب بھکشوؤں کی ایک ٹولی دکھائی دی۔ ان میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ وہ بڑے بڑے تھالوں میں کچھ لیے آرہے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے ہم تیزی سے ایک دروازے میں داخل ہوگئے... یہ بھی ایک لاؤنج نما جگہ تھی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ مہاتما بدھ کے ایک پتھریلے مجسمے کے سامنے موم بتیاں اور دیے وغیرہ ٹمٹما رہے تھے۔ ہم چند سیکنڈ یہاں رکے۔ یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور اس بات کا امکان موجود تھا کہ بھکشوؤں کی وہ ٹولی اسی جگہ آجاتی۔ یہاں ایک اور دروازہ بھی نظر آرہا تھا، ہم نے اسے کھولا اور ایک کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہ کمرا بھی خالی تھا۔ یہ کسی شخص کا بیڈ روم لگتا تھا۔ لکڑی کا چوڑا پلنگ، شیشم کی بہت بڑی الماری، شمع دان... پتھر کی دو تین مورتیاں، مٹی کا مٹکا جس کے منہ پر باریک کپڑا باندھا گیا تھا اور ایسی بہت سی اشیا یہاں نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک ایسی چیز بھی تھی جو عام طور پر بودھوں کے رہن سہن کا حصہ نہیں ہوتی۔ یہ ایک تلوار تھی جو پتھریلی دیوار پر ایک کھونٹی سے لٹک رہی تھی۔ تلوار کے ساتھ ہی خشک لکڑی کا ایک پانچ چھ فٹ چوڑا مجسمہ تھا۔

اس کمرے میں پہنچتے ہی ہمیں کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے بہت سے لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہوں۔ یہ آوازیں کسی قریبی کمرے سے آرہی تھیں۔ ہم جس کمرے میں گھسے تھے، اس کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور آوازوں پر کان لگا دیے۔ گرما گرمی بڑھتی جارہی تھی۔ کسی وقت بہت سے افراد ایک دم بولنے لگتے تھے۔ تب ایک دو افراد بارعب لہجے میں بول کر انہیں چپ کراتے تھے۔ گفتگو میں تھوڑی دیر دھیما پن رہتا تھا تب ایک بار پھر غصیلی آوازیں بلند ہونے لگتی تھیں۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے پھر یہ آوازیں تھم گئیں۔ اندازہ ہوا کہ بحث کرنے والے اب تتر بتر ہورہے تھیں۔ قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ ہم دونوں نے خود کو الماری کے ساتھ رکھے گئے چوڑے چکلے چوبی مجسمے کے پیچھے چھپا لیا۔ یہ ایک بالکل تاریک گوشہ تھا۔ جب تک کوئی اس جانب آ کر مجسمے کے پیچھے نہ جھانکتا، ہم محفوظ ہی تھے۔

چند سیکنڈ بعد تیس بتیس سال کا ایک تنومند بھکشو اندر داخل ہوا۔ اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور صاف چمکتے چہرے پر پسینا تھا۔ سر کے بال بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔

بھکشو نے غصیلے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ بے وقوف اپالی سب کو لے ڈوبے گا۔ سب کچھ ملیامیٹ ہوجاوے گا۔ اس میں اتنی بدھی ناہیں کہ حالات کو سمجھ سکے اور نہ ہی اتنی شکتی ہے کہ دھرم کو بچا سکے۔ یہ بس ہر مشکل کے سامنے لمبا لیٹ جانا جانت ہے اور دوسروں سے بھی کہوت ہے کہ لمبے لیٹ جاویں۔ آنکھیں بند کرلیں... بس کیچوے بن جاویں۔ جس کا من چاہے پاؤں کے نیچے مسل دے۔ جس کے جی میں آئے کاٹ کر ٹکڑے کردے لیکن ہم یہ ناہیں ہونے دیویں گے۔ اگر ان کو دوسرں نے مارنا اور کاٹنا ہے تو پھر ہم اپنے ہاتھوں سے کاٹ دیویں گے..."

جواں سال لڑکی نے بھکشو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ دھیرج رکھیں سوامی! خوامخواہ اپنا خون نہ جلائیں۔ یہ لوگ بولنے اور بحث کرنے کے سوا اور کچھ ناہیں کرسکتے۔ آخر میں تو وہی ہوتا ہے جو ہم چاہیں گے۔ آپ اپنی پوری تیاری رکھیں۔"

بھکشو نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے دوجوں کی تو کوئی پروا ناہیں۔ لیکن یہ اپالی بڑا خچر بندہ ہے۔ یہ عین موقع پر بھی کوئی چال چل سکت ہے۔ اس نے چھوٹی سے چھوٹی کوئی حرکت کی تو سب کچھ برباد ہوجاوے گا۔"

"ناہیں سوامی! میں ناہیں سمجھتی کہ اپالی یا اس کے ساتھی کوئی ایسی جرأت کرسکت ہیں۔"

بھکشو ہنکارا کر بولا۔ "تمہیں ناہیں پتا۔ جرأت آتے آتے آہی جاوت ہے۔ یہ تو ہم کو بھی معلوم ہے کہ ان کی گنتی زیادہ ہے۔ گنتی کا زیادہ ہونا بھی جرأت پیدا کردیوت ہے۔"

"اچھا آپ اس بارے میں سوچنا بند کردیں۔ پرسوں تک سب ٹھیک ہوجاوے گا۔ آپ بیٹھ جاویں، میں آپ کے سر پر استرا چلا دوں۔"

سوامی بھکشو ایک گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے گھڑے پر سے کپڑا ہٹا کر پانی کا ایک کٹورا بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تکیے پر ٹیک لگائی۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ بستر کے نیچے یہ

سلیپ ہی بھی خاموش بیٹھی ہے۔ اس کے سامنے دودھ کی پلیٹ تھی۔ اس دوران میں جواں سال عورت پیتل کے ایک کٹورے میں پانی اور صابن وغیرہ لے کر اس کے قریب بیٹھ چکی تھی۔ سوامی یا گرو بھکشو نے آنکھیں بند کرلیں۔ لڑکی نما عورت نے بے تکلفی سے اس کے چہرے پر صابن ملا اور استرے کی مدد سے اس کی شیو کرنے لگی۔

پتا نہیں دونوں کے درمیان کیا رشتہ تھا۔ یہاں بہت کچھ بھکشوؤں کے عام رہن سہن سے مختلف نظر آرہا تھا۔ ان میں یہ خوب صورت جوان عورت بھی شامل تھی۔ وہ جس طرح گرو بھکشو کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ چلا رہی تھی، واضح ہورہا تھا کہ دونوں میں کوئی قریبی تعلق موجود ہے۔ کچھ دیر بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ چہرے کے بعد عورت نے گرو بھکشو کا سر مونڈنا شروع کیا۔ اسی دوران میں بھکشو کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے عورت کو آغوش میں کھینچ لیا۔ اس کے چہرے اور سر پر لگا ہوا تھوڑا صابن عورت کے چہرے پر بھی لگ گیا۔ بھکشو نے اسے چھوڑا تو وہ مسکرانے لگی۔ اس نے کپڑے سے اپنا منہ صاف کیا اور بولی۔ "آپ کو ایسا ناہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کیوں دھرم کے لحاظ سے تم میری پتنی ناہیں ہو؟"

"وہ تو ہوں لیکن... آپ کے سر پر چیرا آگیا ہے۔" وہ پھر مسکرائی۔

گرو بھکشو کا آدھا منڈا ہوا سر ایک طرف سے خون آلود ہورہا تھا۔ عورت نے اپنی چادر سے اس کا خون صاف کیا پھر لکڑی کی الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے الماری کھولی، ہم اس سے صرف چھ سات فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ ہم نے اپنی سانس تک روک لی۔ عورت نے الماری سے سبز پتھر جیسی ایک چیز نکالی۔ یہ پتھر ایک طرف سے گھسا ہوا اور ملائم تھا۔ اس نے پتھر کو دو تین بار بھکشو کے سر کے کٹ پر رگڑا... اور پھر واپس الماری میں رکھ دیا۔ بھکشو نے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ خون بالکل بند ہوچکا تھا۔ "یہ واقعی کمال کی چیز ہے۔" بھکشو نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"جی ہاں، بالکل چمتکار جیسی۔" عورت نے کہا اور ایک بار پھر بھکشو کا سر مونڈنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر مونڈ کر استرا ایک طرف رکھ دیا۔

ہم زیادہ انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ ہم نے آنکھوں آنکھوں میں حرکت میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔ عمران نے میرے کان کے اندر مدھم سرگوشی کی۔ "تم عورت کی طرف جانا ہوسکتا ہے وہ شور مچا دے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا۔ ”خبردار، آواز نہ نکالنا۔“ عمران پھنکارا۔

بھکشو نے پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ عورت کے چہرے پر بھی ایک دم دہشت نے یلغار کی۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا۔ میں عین اس کے عقب میں موجود تھا۔ میں نے اس کا منہ ہاتھ سے ڈھانپ کر اس کو جکڑ لیا۔ اس نے زور مارا لیکن صرف اپنی ٹانگیں ہی چلا سکی۔ بھکشو سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ اسے جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ”آؤٹ سائیڈر“ اس طرح اس کے بیڈروم میں آپہنچے گا۔

عمران نے پستول بھکشو کے تازہ منڈے ہوئے چٹیل سر سے لگا دیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ”اس میں سے گولی چلے گی اور آواز بھی نہیں آئے گی۔ بس خاموشی سے ایک سوراخ ہو جائے گا تمہارے کھوپڑے میں۔“

بھکشو جو شاید قریب ہی لٹکی ہوئی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا، یک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ عمران کے پاس منہ پر چپکانے والی کیمیکل ٹیپ موجود تھی۔ اس نے ٹیپ کا قریباً چھ انچ لمبا پیس بھکشو کے موٹے ہونٹوں پر چپکا کر اس کی بولتی بند کر دی۔

میں نے اپنا ہاتھ بدستور عورت کے منہ پر جما رکھا تھا۔ اس کی کمر بھی مکمل طور پر میری گرفت میں تھی۔ اس کی نازک گردن ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ اچانک مجھے وہ منظر یاد آگیا جو چودھری انور گیجے کی حویلی میں پیش آیا تھا۔ راجا نے نینو عرف کرشمہ کپور کو صرف خاموش رکھنے کے لیے اس کا منہ دبایا تھا اور وہ دم گھٹ کر سورگ باشی ہو گئی تھی۔

میں نے ایک فٹ لمبا شکاری چاقو عورت کی گردن پر رکھا اور سرگوشی کی۔ ”اگر آواز نکالی تو تمہیں لٹا کر بکری کی طرح کاٹ ڈالوں گا۔“ وہ اب تھر تھر کانپ رہی تھی۔ چہرے سے خون نچڑ کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گی۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹایا۔ عمران پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے پھرتی سے ٹیپ عورت کے ہونٹوں پر چپکا دیا۔

گرو بھکشو کے تاثرات اب بھی اچھے نہیں تھے۔ خدشہ تھا کہ وہ کسی بھی وقت پنگا کر سکتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس کے تکیے کے نیچے ہی کوئی پستول وغیرہ ہوتا۔ میں نے عورت و بھکشو کے پاس بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ فوراً بیٹھ گئی۔ عمران نے لکڑی کی دیوار گیر الماری میں سے وٹ کی ایک مضبوط ڈوری ڈھونڈ لی۔ اس نے اس ڈوری سے پہلے بھکشو کے ہاتھ پشت پر باندھے پھر عورت کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ اب وہ دونوں مکمل طور پر ہمارے بس میں تھے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ شمع دان میں موجود چار عدد شمعیں کمرے میں ایک پُراسرار سی روشنی بکھیر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اب بھکشو اور بھکشن کو ڈسٹرب کرنے اس کمرے کی طرف کوئی نہیں آئے گا۔ اگر کوئی آتا بھی تو ہم دروازہ کھولنے کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

ہم دونوں نے بھکشو سے بازپرس شروع کی۔ عام بھکشوؤں کے برعکس یہ شخص کرخت اور ہٹ کا بڑا پکا تھا۔ اس کا نام دستھا تھا اور یہ اس دواری مندر کے تین بڑے بھکشوؤں میں سے ایک تھا۔ شروع میں تو اس نے ہمیں کچھ بتا کر نہیں دیا۔ عمران نے دو تین بار اس کے منہ پر ٹیپ لگایا اور اتارا۔ آخر عمران کا پارا چڑھ گیا۔ وہ بولا۔ ”دیکھو دستھا! میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے آراکوئے کا پتا چاہیے اور اس لڑکی کا جو آراکوئے کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ بھی آراکوئے کے ساتھ یہیں موجود ہے۔“

”میں بڑی سے بڑی سوگند کھا سکتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

”یہ بھی معلوم نہیں کہ آراکوئے یہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے اتنی سی جانکاری ضرور ہے کہ آراکوئے کو ڈھونڈنے میں کوئی تھوڑی سی سپھلتا (کامیابی) ملی ہے لیکن کیسے اور کیا، یہ میں نہیں جانتا۔ شاید اوش کو پتہ معلوم ہے۔“ اوشا، دستھا کی ساتھی عورت کا نام تھا اور وہ اسے جتنی بتا رہا تھا۔

”تو پھر کون جانتا ہے؟“

”مہا پجاری صاحب ہی جانتے ہوں گے۔“ وہ ڈھیٹ لہجے میں بولا۔

”اور مہا پجاری کون ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”میں ... میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں اور میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہاں کسی کو پتا نہیں کہ مہا پجاری کون ہیں۔ دراصل ہم تین بڑے بھکشوؤں میں سے ہی کوئی ایک ہیں لیکن وہ سامنے نہیں آتے۔ بس ہم کو پرچوں پر ان کے لکھے ہوئے ملتے ہیں، ان کی مہر کے ساتھ۔“

”پرچے کون دیتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی بھی نہیں۔ ہر روز صبح کی پوجا کے بعد ہم سب بڑے بھکشو گیان والے کمرے میں جاتے ہیں اور مقدس چوکی کی لکڑی پر ایک ایک سفید لفافہ رکھتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک لفافے پر سارے دن کے لیے ہدایتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی مہا پجاری کا لفافہ ہوتا ہے۔“

”یہ کون ہو سکتا ہے، تمہیں کچھ اندازہ تو ہوگا؟“

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”میں تو نہیں جانتا ہوں۔ کون ہے؟ یہ مہاتما جانتے ہوں گے یا پھر وہ جو اس سنسار کو چلاتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اچھا، یہاں تھوڑی دیر پہلے جو جھگڑا ہو رہا تھا وہ کس بات پر تھا؟“

گرو بھکشو پہلے تو اس موضوع پر بات کرنے سے کترایا، میرے اصرار پر بولا۔ ”یہ ہمارا آپس کا ہی تنازعہ تھا۔ بس سمجھو کہ پوجا پاٹ کا طریقہ ہے۔ کچھ ایک طرح سے کرنا چاہتے ہیں، کچھ دوسری طرح سے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ راستہ کوئی بھی ہو منزل تو نروان ہی ہے اور شریر کی شانتی ہی ہے۔“

”تم کسی چبوترے کی بات کر رہے تھے اور کسی ایسے کام کی جو پرسوں یہاں اس پگوڈے میں ہونا ہے۔“

بڑے بھکشو نے ایک بار پھر آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی لیکن جب عمران کا لب و لہجہ سخت ہوا تو اس نے بتایا کہ پرسوں چاند کی چودھویں رات ہے۔ خاص پرارتھنا ہوگی جس میں باہر کے کچھ لوگ بھی حصہ لیں گے۔ اب پتا نہیں کہ وہ درست کہہ رہا تھا یا غلط۔ اس کی بات کی تصدیق فی الحال ممکن نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں میرے ساتھ ساتھ عمران کو بھی یہ شک ہو رہا تھا کہ یہ خرانٹ بھکشو بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اسے آراکوئے اور ڈاکٹر مہناز کے بارے میں بھی معلوم ہو۔ لیکن وہ سارا وزن مہا پجاری پر ڈال رہا تھا... اور مہا پجاری کے بارے میں اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ ان کے درمیان رہتا ہے لیکن اس کے بارے میں کوئی جانتا نہیں۔

اس کی ہٹ دھرمی دیکھتے ہوئے عمران نے تازہ ٹیپ اس کے ہونٹوں پر چپکا دی اور وہی استرا تھام لیا جس سے تھوڑی دیر پہلے جواں سال اوشا اس کی شیو بنا رہی تھی۔ عمران نے استرا بھکشو دستھا کے بائیں کان پر رکھا۔ اس کے حد تو ہو، مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ شاید کسی کو نہیں تھی۔ عمران نے ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے بھکشو دستھا کا کان اس کی کنپٹی سے علیحدہ کر دیا۔ دستھا کربناک آواز میں چلایا لیکن منہ پر ٹیپ تھی۔ آواز اس کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ یقیناً اوشا بھی چلانے میں پیچھے نہیں رہی ہوگی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی کیمیکل ٹیپ تھی۔ وہ بری طرح مچلی۔ دستھا بھی پھڑک رہا تھا۔ کان والی جگہ خون سے بھر گئی تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے نہ ہوتے تو وہ پتا نہیں کیا کر گزرتا۔ عمران نے بڑی بے رحمی سے کٹا ہوا خون آلود کان پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ کونے میں بیٹھی ہوئی سفید بلی حرکت میں آئی۔ چند سیکنڈ تک خون آلود کان کو سونگھتی رہی۔ پھر اسے منہ میں دبا کر پلنگ کے نیچے تاریکی میں گم ہو گئی۔ یہ بڑا لرزہ خیز منظر تھا۔ دستھا کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ کرب کے عالم میں بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ عمران نے بلا تردد تیز دھار استرا اس کے دوسرے کان پر رکھ دیا۔ ”ہاں، کچھ بتاؤ گے یا تمہارے تھوبڑے کی دونوں سائیڈیں ایک جیسی کر دوں۔“

گرو بھکشو دستھا نے منہ سے غوں غاں کی زوردار آوازیں نکالیں۔ یوں لگا کہ وہ کچھ بتانا چاہتا ہے۔ عمران نے استرا پیچھے ہٹا لیا۔ الماری سے وہی سبز رنگ کا ملائم پتھر نکالا۔ یہ واقعی خاص قسم کی چیز تھی۔ پتھر کے بجائے اسے سخت قسم کی مٹی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے ایک صاف کپڑے سے دستھا کے زخم کا خون صاف کیا۔ عمران نے یہ سبزی مائل ڈلی کچھ دیر تک زخم پر رگڑی۔ ایک چپکیلی تہ سی بن گئی۔ حیرت انگیز طور پر اس کاری زخم سے خون کا اخراج فوراً ہی رک گیا۔

عمران نے دستھا کے منہ سے ٹیپ اتار دی۔ عمران کا سوال وہی تھا۔ ”آراکوئے کہاں ہے اور ڈاکٹر مہناز سے کیسے ملا جا سکتا ہے؟“

اندازہ ہوا کہ شدید جسمانی نقصان اٹھانے کے باوجود اس ”گرو“ کی ڈھٹائی ختم نہیں ہوئی۔ وہ ایک بار پھر وہی رام کہانی دہرانے لگا۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید اسے یہ امید تھی کہ کوئی اس کی مدد کو آجائے گا یا پھر کوئی اور کرشمہ رونما ہو جائے گا۔ اس کی بے پناہ ڈھٹائی پر عمران کو ایک بار پھر تاؤ آگیا۔ اس نے گرو کو ایک آخری وارننگ دی اور ایک بار پھر اس کے منہ پر ٹیپ چڑھا دی۔ وہ عجیب انداز سے اپنے سر کو ہلانے لگا اور بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ہمیں قدرت کے عذاب سے ڈرا رہا ہو۔

وہ ہندو نہیں تھا کیونکہ اس نے گیروا کپڑے پہن رکھے تھے اور پگوڈا میں بیٹھا تھا... اور وہ بودھ بھی بھکشو بھی نہیں تھا کیونکہ اس نے کمرے میں تلوار لٹکا رکھی تھی اور ایک کنار جیسی عورت اس کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھی۔ آفت کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے دھرم یاد آگیا تھا۔ عمران نے پھر استرا

تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں سفاک چمک بتا رہی تھی کہ دوری مندر کا یہ گرو بھکشو اپنے دوسرے کان سے بھی محروم ہونے والا ہے۔ عمران کے اشارے پر میں ایک دو لمحے تو تذبذب میں رہا پھر میں نے وستھا کا سر اور گردن کا بالائی حصہ اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ وستھا اب اپنے سر کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ لیکن اس حال میں بھی اس کے چہرے پر طیش دلانے والی ضد تھی۔ عمران کے استرے نے پھر حرکت کی اور کان وستھا کی کنپٹی سے علیحدہ ہو گیا۔ خون تیزی سے اُمڈا اور وستھا کی گردن کو بھگونے لگا۔ وستھا مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ عمران نے انگلیوں میں دبے ہوئے زرد کان کو دیکھا۔ یہ کچھ ہی دیر پہلے گرو بھکشو کے جسم کا حصہ تھا۔ بے پروائی سے عمران نے پھر یہ کان پلنگ کی طرف پھینک دیا۔ اس مرتبہ سفید بلی نے بھی کوئی جھجک نہیں دکھائی اور خون آلود کان منہ میں دبا کر پلنگ کے نیچے لپک گئی۔ اوشا جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

سبزی مائل ڈلی ایک بار پھر وستھا کے کاری زخم پر رگڑی گئی۔ یہ جادوئی خاصیت رکھتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وستھا کے زخم سے بہنے والا خون بس معمولی رساؤ میں بدل گیا... اپنے دونوں کانوں سے محروم ہونے کے بعد وستھا کی حالت دیدنی تھی۔ کبھی اس کی آنکھوں سے طیش کی چنگاریاں چھوٹنے لگتیں، کبھی دہشت اور اذیت سے اس کا صفاچٹ چہرہ زرد رنگ اوڑھ لیتا۔ گرو وستھا کے چہرے پر سب سے نمایاں تاثر ڈھٹائی کا ہی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بندہ ہٹ کا چیمپئن ہے اور بنا ہی ''ڈھیٹ پنے'' کے لیے ہے۔ اس کے چہرے کا یہی تاثر مجھے اور عمران کو مشتعل بھی کر رہا تھا۔

عمران نے اس کے ہونٹوں کے ایک حصے سے ٹیپ ہٹائی تو وہ کچھ بتانے کے بجائے گالی گلوچ کرنے لگا۔ عمران نے فوراً ٹیپ چڑھا کر اس کی بولتی بند کی اور اسے فرش پر گرا کر اپنا گھٹنا اس کی چربی دار گردن پر رکھا اور استرا ناک پر رکھ دیا۔ ''تمہاری بلی کو آج کافی گوشت ملنے والا ہے۔'' وہ پھنکارا۔

اوشا نے زور زور سے سر ہلایا۔ ایسے لگا کہ وہ کچھ بتانا چاہ رہی ہے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی سوال جواب کیے تھے لیکن اپنے گرو کی طرح وہ بھی بس گول مول جواب ہی دیتی رہی تھی۔ لیکن اب لگتا تھا کہ صورتِ حال کی سنگینی دیکھ کر اس نے اپنے رویے پر نظرِ ثانی کی ہے۔ عمران کے اشارے پر میں نے اس کے ہونٹوں سے ٹیپ اتار دی۔ اس کے دودھیا رخساروں پر ٹیپ نے گہرا نشان چھوڑا تھا۔ اس کے نازک ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔ میں نے اپنا شکاری چاقو اس کی ملائم گردن پر رکھ دیا تاکہ وہ اچانک شور مچانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''آپ وچن دیں کہ مجھے اور گرو کو کچھ ناہیں کہیں گے... مم میں... آپ کے سوال کا جواب دوں گی۔''

زخمی گرو ایک بار پھر مچلنے لگا۔ وہ منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اوشا کو لب کشائی سے روکنا چاہتا ہے۔ اوشا اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً وہ جنونی گرو وستھا کی نسبت عقل مندی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''ہاں بتاؤ، آرا کوٹے کہاں ہے؟''

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''میں ساکھیہ منی کی سوگند کھاوت ہوں، ہمیں اس بارے میں کچھ جانکاری ناہیں ہے۔ اس کی جانکاری اگر ہووے گی تو صرف مہا پجاری کو ہووے گی۔''

''اور مہا پجاری کون ہے؟''

''میں سوگند کھاوت ہوں، وہ تین گروؤں میں سے ہی کوئی ایک ہے۔''

''اور تمہیں اس کا پتا نہیں؟'' عمران کا لہجہ پھر سفاک ہو گیا۔

''میں جھوٹ ناہیں بول رہی۔'' وہ پوری جان سے لرز گئی۔

''چھا بتاؤ وہ ڈاکٹر کہاں ہے جو آرا کوٹے کے ساتھ یہاں لائی گئی ہے؟'' میں نے اوشا سے پوچھا۔

''ہاں... میں اس کے بارے میں آپ کو بتا سکت ہوں۔ وہ یہیں اس مندر میں ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔''

''کیا تم اس سے ملا سکتی ہو؟''

وہ ذرا جھجکی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں آپ کو دکھا سکت ہوں لیکن اس سے ملنا خطرے سے خالی نہیں ہووے گا۔ آپ کسی کی نظر میں آگئے تو بہت خون خرابہ ہو جاوے یہاں۔''

''چلو تم اس سے ملواؤ پھر ہم دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم نے ہاتھوں کے علاوہ گرو وستھا کے پاؤں بھی اچھی طرح باندھ دیے۔ اسے صاف بتا دیا کہ اس نے کوئی بھی حرکت کی تو مزید کوئی موقع دیے بغیر اسے فوراً گولی مار دیں گے۔ کن کٹے گرو کی حالت پتلی تھی۔ وہ کسی مزاحمت کے قابل نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بس آنکھیں بند کر کے ناک سے دبی دبی آواز میں کراہتا رہا۔

عمران اور میں اوشا کے ساتھ چل دیے۔ تیز دھار چاقو میری جیکٹ کی جیب میں تھا اور میں نے اوشا کو سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو یہ چاقو اس کے پہلو میں گھس جائے گا۔ وہ ہمیں لے کر کمرے سے باہر آئی۔ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر ہم ایک اور کمرے میں آگئے۔ پہلے کی طرح یہ کمرا بھی خالی تھا۔ فرش پر آسنی چادر کا ایک حصہ ہلکا سا اٹھا ہوا تھا۔ اوشا کی گہری گلابی چادر کے نیچے چوبی تختیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک چابی کی مدد سے تہ خانے کا آہنی قفل کھولا اور ڈھکنا جو زیادہ وزنی نہیں تھا، اوپر اٹھا دیا۔ نیچے لکڑی کے خوب صورت زینے تھے۔ ہم زینے اتر کر ایک تہ خانے میں پہنچے۔ یہاں اگربتیوں کی ہلکی مہک تھی اور قالین بچھا ہوا تھا۔ تاہم روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اوشا ہمیں ایک روشن کھڑکی کے سامنے لے گئی۔ کھڑکی کے اندر پردہ سرکا ہوا تھا۔ ہم اندر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ ایک بہت آرام دہ کمرا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کو دیکھا۔ وہ ایک گلابی گاؤن پہنے ایک پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ خوش نظر آتی تھی۔ بودھ مندر کی تین داسیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے گہری گیروا ساڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ایک داسی ڈاکٹر مہناز کے بالوں میں کنگھی کرنے میں مصروف تھی۔ دوسری اس کے پاؤں پر کسی ہربل آئل کی مالش کر رہی تھی۔ قریب ہی ایک تپائی پر تروتازہ موسمی پھل رکھے تھے۔ ظاہر ہوتا تھا کہ مہناز یہاں بہت عیش آرام سے ہے۔ ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں وہ معمول سے زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

ڈاکٹر مہناز کو کہاں کہاں تلاش نہیں کیا گیا تھا۔ اب بھی جلالی صاحب اور دیگر لوگ مہناز کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور وہ یہاں لاہور اور شیخوپورہ سے سیکڑوں میل دور بحرِ ہند کے کنارے اس بودھ مندر کے تہ خانے میں موجود تھی۔

مہناز کو دیکھنے کے بعد ہم زینے طے کر کے اوپر آئے اور پھر اسی کمرے میں پہنچ گئے جہاں گرو بھکشو نیم مردہ پڑا تھا۔ کانوں کے بغیر اس کی شکل عجیب ہولناک ہو چکی تھی۔ میرا ذہن الجھا ہوا تھا اور یقیناً عمران بھی میری ہی طرح سوچ رہا تھا۔ ہم نے مہناز کو یہاں خوش و خرم دیکھا تھا۔ اس کی صحت بھی پہلے سے بہتر نظر آرہی تھی۔ اگر وہ ان لوگوں کی جبراً مہمان تھی تو ایسا کیوں تھا؟ کہیں وہی بات تو درست نہیں تھی کہ ڈاکٹر مہناز خود چاہتی تھی کہ وہ آرا کوٹے سمیت کہیں غائب ہو جائے... اور اس نے جلالی صاحب کو بھی دھوکے میں رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن پھر فوراً یہ بات ذہن میں آئی کہ اگر ایسا ہی تھا تو پھر پروفیسر اویس کو تو بنگم میں ڈاکٹر مہناز کی فون کال کیوں موصول ہوئی؟ وہ فون کال غالباً ڈاکٹر مہناز نے اسی بودھ مندر کے اندر سے کی تھی۔ اس نے انہیں اور جلالی صاحب کو مدد کے لیے بلایا تھا۔

اگلے آٹھ دس منٹ میں اوشا کے ساتھ کافی محنت کرنا پڑی۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ جو کچھ بتا رہی ہے، اس سے زیادہ چھپا رہی ہے۔ جب گرو وستھا کی طرح تیز دھار استرا اوشا کے اپنے کان پر آیا تو اس کا پتا پانی ہو گیا۔ وہ سرتاپا لرزنے لگی۔ وہ گھگیائی۔

''میرے لوگن مجھے زندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ میری ہتھیا بڑی دردناک ہووے گی۔''

عمران نے کہا۔ ''خود ان لوگوں کے ساتھ بہت کچھ دردناک ہونے والا ہے۔ تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہمارے سوالوں کے جواب دو یا اگلے دس پندرہ منٹ کے اندر کن کٹی اور نک کٹی کہلانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''مم... میں نے سب کچھ تو بتا دیا۔ اب کیا رہ گیا ہے؟'' وہ ہکلائی۔

''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر مہناز کو یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟'' عمران نے دریافت کیا۔

وہ سسک کر بولی۔ ''اس کو... مار دیا جاوے گا... اس کی بلی دے دی جاوے گی۔''

''کب؟''

''پرسوں...''

''اچھا تو تم لوگ پرسوں کی جس پوجا پاٹ کی بات کر رہے ہو وہ یہی خون خرابا ہے؟''

اوشا نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیسے دی جائے گی بلی؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی ساری انگلیاں کاٹ دی جاویں گی۔ اس کا خون آرا کوٹے پر چھڑکا جاوے گا۔ ہمارا دھرم کہوت ہے کہ آرا کوٹے کو چرانے والے کا خون اگر اس پر چھڑک دیا جاوے تو وہ ہمیشہ کے لیے سلکشت (محفوظ) ہو جاوے گا۔''

''لیکن پانچ سال پہلے بھنڈیل اسٹیٹ والے واقعے میں تو ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ مورتی چرانے والوں کو صرف بندی بنایا گیا تھا اور انہیں کچھ ڈے میں مشقت کی سزا دی گئی تھی؟'' میں نے کہا۔

"گرو کہت ہیں اسی لیے تو مورتی (آراکوٹے) دوبارہ چوری ہوئی۔ اگر تب من گڑا کر کے یہ سزا دے دی جاتی تو یہ آفت نہ پڑتی۔"

"کیا یہاں سب لوگ اس سزا پر... میرا مطلب ہے اس بلی پر اتفاق کر رہے ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

وہ چند لمحے چپ رہ کر بولی۔ "ناہیں... یہاں بھی تو جھگڑا پڑا ہوا ہے۔ دوسرے سنگھ (گروہ) کے مکھیا گرو ایالی ہیں۔ یہ لوگن ناہیں چاہتے کہ آراکوٹے کی حفاظت کے لیے کسی کی ہتھیا کر دی جاوے۔ ان لوگوں کا وچار ہے کہ لڑکی کی ہتھیا ضروری ناہیں۔ اس کے لہو کی بس دو تین بوندیں ہی آراکوٹے پر ڈال دی جاویں اور خاص پوجا کر لی جاوے تو مطلب پورا ہو سکت ہے۔"

"پھر ان لوگوں کی بات مانی جائے گی یا تمہاری؟" عمران نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو وہ لوگن اپنی بات ناہیں منوا سکیں گے۔ وہ گنتی میں تو زیادہ ضرور ہیں لیکن بیس گروؤں کے پاس شکتی زیادہ ہے۔ بیس گرو اور ان کے دھرمی ساتھی اپنے زور سے سب کچھ کر سکت ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ پرسوں جو پوجا ہوگی، اس میں ڈاکٹر کی انگلیاں کاٹ کر اس کا خون آراکوٹے پر بہایا جائے گا اور ڈاکٹر کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا؟"

"ایسا ہی ہووے گا۔" اوشا نے کہا اور سر جھکا لیا۔

میں نے کہا۔ "لیکن ابھی ہم نے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر کو بڑے آرام اور سکون سے رکھا گیا ہے اور وہ خوش بھی بہت ہے۔"

"وہ انجان ہے۔ اس کو جانکاری ناہیں۔ اس کو یہی بتایا گیا ہے کہ پرسوں اس کو مکتی مل جاوے گی۔ اسے رہا کر دیا جاوے گا۔ وہ آج اپنی رہائی کے خیال سے خوش ہے ورنہ تو اس کا حال اچھا ناہیں تھا۔"

"پوجا پرسوں کس وقت ہوگی؟" میں نے دریافت کیا۔

"پرسوں سے مطلب یہ ہے کہ آدھی رات کے فوراً بعد۔ ہم یہ کہہ سکت ہیں کہ کل رات۔"

"کیا گرو دستھا کا پوجا میں شریک ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں جی، یہ ضروری ہے۔ رسم کے مطابق بلیدان دینے والے کی بیس انگلیاں کاٹی جاوت ہیں۔ بیسوں گرو ایک ایک انگلی کو پوترا گنی کے اوپر رکھتے ہیں جلنے کے لیے۔"

"اگر کسی وجہ سے کوئی گرو رسم میں شامل نہ ہو سکے تو پھر؟"

"ہم... مجھے اس کے بارے میں جانکاری ناہیں۔ میں کسی سے پوچھ کر بتا سکت ہوں۔"

ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ پھر چالاکی دکھا رہی ہے۔ عمران نے شکاری چاقو پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اوشا پر کچھ اور دباؤ ڈالا گیا تو وہ پھر سے رونے لگی اور سچ بولنے لگی۔

اس نے بتایا۔ "اگر کوئی گرو کسی رسم کے سمے بیمار ہو جاوے یا اسے کوئی بہت ضروری کام ہووے تو اس کی جگہ اس کی ماتا یا دھرم پتنی رسم میں حصہ لے سکت ہے۔"

"یعنی کل رات، تم اس کن کٹے گرو کی خالی جگہ پُر کر سکتی ہو؟" عمران نے کہا۔

"لیکن یہ تو تب ہو سکت ہے جب یہ بہت بیمار ہوں یا کہیں گئے ہوں۔"

"تم سمجھو کہ یہ کہیں گیا ہوا ہے۔ چار پانچ دن سے پہلے نہیں آ سکتا۔" عمران نے سکون سے کہا۔

اگلے ایک گھنٹے میں عمران نے بڑی چابک دستی سے ساتھ اوشا کو اپنے ذہن پر کر لیا۔ اب وہ پوری طرح تعاون پر آمادہ تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ گرو کی جان وہ ایک ہی صورت میں بچا سکتی ہے۔ ہماری بات مانے اور ہماری مدد کرے۔

گرو بڑا ڈھیٹ تھا لیکن اوشا کسی نہ کسی طرح اسے بھی سمجھانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے گرو سے ایک خط لکھوایا۔ اس خط میں گرو نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اسے سنگھ (جماعت) کے ہی ایک خاص کام سے مندر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ اگر وہ فوری طور پر نہ جاتا تو ایالی اور اس کے ساتھیوں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو جاتی۔ وہ فی الحال تفصیل نہیں بتا سکتا۔ اسے پوری آشا ہے کہ وہ چار پانچ دن تک لوٹ آئے گا۔ اس دوران میں بلیدان کی رسم ادا کر لی جائے۔ اس کی جگہ اس کی دھرم پتنی اوشا رسم میں حصہ لے گی۔ خط کے نیچے گرو دستھا نے اپنی چھوٹی سی گول مہر بھی لگائی۔

ہم گرو کو مارنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے لیکن عمران نے چونکہ اوشا سے گرو کی جان بخشی کا وعدہ کیا تھا، اس لیے گرو کے واسطے سوچنا پڑ رہا تھا۔ رات کی تو خیریت تھی، کسی نے اس طرف آنا نہیں تھا لیکن صبح کی عبادت میں گرو کی غیر حاضری محسوس کی جا سکتی تھی۔ ہم نے [illegible] گرو کے ہاتھ پاؤں بڑی اچھی طرح باندھے۔ [illegible] دونوں زخموں کی مرہم پٹی کا سامان کمرے کے اندر سے ہی مل گیا۔ مرہم پٹی کے بعد اس کو شوربہ پلایا گیا اور خاص طرح کی مقدس کھیر کھلائی گئی۔ کھیر کی کولیاں جن میں کوئی کشتہ وغیرہ بھی ملایا گیا تھا [illegible] میں موجود تھیں۔ ہم نے یہ [illegible] کی مقدار [illegible] گرو [illegible] [illegible] گھنٹوں [illegible]

[illegible] اس کے بعد اس کے منہ پر اچھی طرح ٹیپ لگائی گئی اور الماری کے ایک بڑے خانے میں اس طرح ٹھونس دیا گیا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکتا تھا۔ عمران نے اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا کہ کل آدھی رات تک کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو اس کا خمیازہ سب سے پہلے اسی کو بھگتنا پڑے گا۔ اس کی جان چلی جائے گی۔

بری طرح زخمی ہونے کے بعد گرو کا اب اب کافی کم ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں، وہ کر بھی سکتے ہیں۔ اسے پیپا پر لٹا کر ذبح بھی کیا جا سکتا ہے۔ آنکھوں میں جگہ [illegible] رکھنے کے باوجود اب وہ ہماری بات مان رہا تھا۔ گرو کو جہازی سائز کے خانے میں پیک کرنے کے بعد الماری کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ کنجی بڑی محبت سے عمران نے [illegible] گرد خموم رہی تھی۔

ہم دونوں نے مشورہ کیا۔ عمران واپس، جگت اور موہن کے پاس چلا گیا۔ میں اس کشادہ کمرے میں جوان سال اوشا کے ساتھ موجود رہا۔ بے پناہ خوف نے اسے ہمارے ساتھ مکمل تعاون پر آمادہ کر دیا تھا۔

میں نے اوشا سے کہا۔ "تم کہہ رہی ہو کہ صبح کی عبادت کے فوراً بعد کوئی نہ کوئی شخص یہاں آئے گا اور پوچھے گا کہ گرو عبادت میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟"

"ہاں، ایسا تو ہوگا ہی۔"

"تم کیا جواب دو گی؟"

"میں وہی کروں گی جو تم ہو گے۔ تم نے وچن دیا ہے کہ تم میری اور گرو کی جان نہیں لو گے۔" وہ اپنی سیاہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں دوبارہ وچن دے رہا ہوں۔ تمہیں ہماری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "میں پوجا کے بڑے کمرے میں جاؤں گی اور گرو جی کا یہ پتر (خط) چھوٹے پجاری کو دے دوں گی۔ وہ باقی گروؤں تک پہنچا دیں گے۔ میں انہیں [illegible] گرو دستھا مجھے بھی بتا کر ناہیں گئے۔ میں سوئی ہوئی تھی، وہ اٹھ کر چلے گئے اور جاتے جاتے پتر میرے سرہانے رکھ گئے۔ مجھے وشواس ہے کہ کسی کو شک ناہیں ہووے گا۔ [illegible] رات کے سمے اپنے گھر والوں کے پاس سے [illegible] کسی دھرمی کام سے چلے جانا ہمارے ہاں برا نہیں سمجھا جاوت۔ [illegible] یہ سمجھا جاوت ہے کہ اس طرح جانے سے مہاتما بدھ کی [illegible] جانے والے کا

"ہاتھ تھام لیوت ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ کوئی اس کمرے میں آ کر چھان بین کرے۔"

"ناہیں، ایسا تو تب ہو سکت ہے جب کسی کو شک ہو۔ اور مجھے ناہیں لگتا کہ ایسا ہووے گا۔ ہاں، وہ لوگن حیران ضرور ہوں گے کہ ایسا کیا ضروری کام آن پڑا تھا۔"

وہ بڑی دھیمی آواز میں بات کرتی تھی۔ چہرے کی طرح اس کی آواز میں بھی کشش تھی۔ ہمارے حساب سے وہ اپنے گرو شوہر سے زیادہ عقل مند اور معاملہ فہم تھی۔ اسی کی وجہ سے گرو ابھی تک زندہ تھا۔ رات بخیریت گزر گئی۔ اوشا نے مجھے کھانا کھلایا اور آرام کرنے کے لیے پلنگ پیش کیا۔ لیکن میں نے رات کا باقی حصہ چٹائی پر گزارنا مناسب سمجھا۔ اوشا کو میں نے پلنگ پر لٹا دیا۔ آج اس ریشمی رات کا آغاز اوشا اور اس کے گرو جی نے بڑے محبت بھرے انداز میں کیا تھا۔ محبت کی یہ گرما گرمی ابھی کافی آگے بڑھنا تھی لیکن بیچ میں ہم کود پڑے تھے اور اب اوشا پلنگ پر اور پتی دیو الماری میں تھے۔

میں لیٹا رہا اور حالات کی ستم ظریفی پر غور کرتا رہا۔ گولڈن بلڈنگ کے واقعات بار بار نگاہوں میں آ رہے تھے۔ سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے کا انجام کم از کم میرے لیے تو بہت تسلی بخش ہوا تھا۔ درحقیقت چند ماہ پہلے بھنڈیل اسٹیٹ سے نکلنے کے فوراً بعد ہی میں نے سیٹھ کو ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ سیٹھ کے ایک دو پرانے کارکنوں سے ہماری مڈبھیڑ بھی ہوئی تھی۔ تاہم سیٹھ کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک ماڈل گرل کے ہمراہ کراچی میں دیکھا گیا ہے۔ جاننے والوں نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان سے باہر ہے اور کبھی کبھار ہی یہاں آتا ہے۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیٹھ سراج انڈیا میں ہے اور انڈیا کے دل ممبئی میں اس سے ایک طوفانی ملاقات ہوگی۔ اس ملاقات کے اختتام پر ایک لہو رنگ کلہاڑی ہوگی ایک اونچی منڈیر ہوگی، اور ان دونوں چیزوں کے درمیان سیٹھ سراج ہوگا... اسے دو ہلاکتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

اوشا پلنگ پر لیٹی رہی اور میں چٹائی پر۔ گرو الماری میں مدہوش پڑا رہا... اپنے جسمانی درد اور اپنے حالات کے کرب سے بے خبر۔ ثروت کا خیال بار بار میرے ذہن میں آنے لگا۔ کیا وہ پھر مجھ سے دور جا رہی تھی؟ کیا میرے اور اس کے درمیان سے یوسف کی دیوار کو ہٹانا ناممکن تھا؟

بالکل قریب موجود تھے۔ اس کے بعد آرا کوئے کو حاصل کرنا اور بڑے گروؤں میں سے کچھ کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے بغلی دروازے کی طرف بڑھنا ہمارے پلان میں شامل تھا۔

لیکن جو کچھ ہوا، وہ ہمارے پلان سے خاصا مختلف تھا۔ ایک دم ہال کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔ گہری تاریکی چھا گئی۔ زبردست شور بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے پشتی تھیلوں سے ٹارچیں نکالیں اور ان کے روشن دائرے چبوترے کی طرف پھینکے۔ وہاں ازدحام تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر پل پڑے تھے۔ تلواریں چمک رہی تھیں پھر گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ ہم نے دروازہ کھولا اور تیزی سے چبوترے کی طرف لپکے۔ میں اور عمران آگے تھے۔ موہن عقب میں تھا۔ لوگوں سے ٹکراتے، راستہ بناتے، ہم چبوترے پر پہنچے۔ حسبِ اندیشہ آرا کوئے والی جگہ خالی تھی۔ وہاں سرخ اور گہرے سرخ کپڑوں والے بہت سے جنگجو گتھم گتھا تھے۔ تیز دھار آلے استعمال ہو رہے تھے۔ رائفلوں کے شعلے چمک رہے تھے... جہاں ڈاکٹر مہناز والا تختہ پڑا تھا وہ جگہ بھی اب خالی تھی۔ کیا آرا کوئے کی طرح مہناز بھی منظر سے غائب کر دی گئی ہے؟ یہ سوال تیر کی طرح دماغ میں پیوست ہو گیا۔

خود پر تلوار سے حملہ کرنے والے ایک خونخوار ''جنگجو'' کے سینے پر میں نے رائفل کا فائر کیا اور اندھا دھند چلنے والی گولیوں سے بچنے کے لیے زمین پر لیٹ گیا۔ عمران اور موہن نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ ہم فرش پر پیچھے کی طرف رینگتے چلے گئے تاکہ گولیوں کی بارش سے بچ سکیں۔ آخر ہمیں دو جڑے ہوئے بڑے ستونوں کی آڑ میسر آ گئی۔ ہم نے وہاں پوزیشن لے لی۔

کچھ ہی دیر پہلے جہاں انیس گرو بیٹھے تھے، وہاں اب دو گروؤں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اوشا سمیت اور کسی گرو کا پتا نہیں تھا۔ کھڑکیوں سے باہر زور سے بجلی چمکی۔ روشنی کے جھماکے میں ہال کا منظر تہلکہ خیز دکھائی دیا۔ جہاں کئی لاشیں اور زخمی موجود تھے۔ دونوں طرف کے گن مینوں نے مختلف جگہوں پر پوزیشن لے لی تھی اور دیوانہ وار فائرنگ کر رہے تھے... شیشہ، لکڑی، دھات، سب کچھ چھلنی ہو رہا تھا۔ تب ہماری نگاہ مہناز پر پڑی۔ اس کا اسٹریچر نما تختہ چبوترے کی سیڑھیوں کے پاس اوندھا پڑا تھا۔ مہناز تختے کے نیچے تھی اور گولیوں کی بارش میں تھی... غالباً ہنگامہ شروع ہونے کے بعد اسے بچانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن راستے میں ہی چھوڑ کر اپنی جان بچائی گئی تھی۔ مہناز کو کسی بھی وقت گولی چاٹ سکتی تھی۔

زندگی تیز ترین ہوا میں پھڑپھڑاتے چراغ کی طرح... اسے اس کی جگہ سے ہٹانا موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جیسا تھا... لیکن ایسی چھلانگیں ہم پہلے بھی لگاتے تھے۔ ایک عجیب دیوانگی ہمیں پہلے بھی... رہی تھی۔ جب موت پھنکارتی ہے، دھاڑتی ہے، جیسے شق کرتی ہے، جگر پھاڑ ڈالتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور اس کے سامنے خم ٹھونکنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے... نشہ ہوتا ہے۔ میں اور عمران کندھے سے کندھا ملا کر پہلے کئی بار ایسے جاں گسل مرحلوں سے گزر چکے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... ایک ساتھ اٹھے اور ساتھ ڈاکٹر مہناز کی طرف دوڑے۔ ہم رکوع کے بل جھکے ہوئے تھے۔ پگھلا ہوا سیسہ موت بن کر ہر طرف لپک رہا تھا... کئی گولیاں ہمارے بہت پاس سے گزریں۔ سچ ہے، جب بے خوفی سے موت کا سامنا کیا جاتا ہے تو وہ دھوئیں کی طرح تحلیل ہونے لگتی ہے۔ اس کے جتنا قریب جاتے ہیں، وہ اتنی ہی بے معنی لگنے لگتی ہے۔ ہم نے مہناز کو سیدھا کیا، اسے اٹھایا اور لاشوں کو پھلانگتے ہوئے ایک دروازے سے ٹکرائے اور اسے توڑتے ہوئے ایک تاریک برآمدے میں نکل آئے۔ یہاں بھی کئی افراد گتھم گتھا تھے۔ بارش کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں۔ میں نے ٹارچ کا دائرہ مہناز کے چہرے پر پھینکا۔ وہ زندہ تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں دہشت منجمد تھی۔

گہرے گیروا اور ہلکے گیروا کپڑوں والی دو ٹولیاں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھیں۔ ہم ان کے قریب سے گزرتے ہوئے گول ستونوں والے برآمدے کی طرف بڑھے۔ جگت سنگھ کو یہیں پر ملنا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، موہن بھی کہیں نہیں تھا۔

''لگتا ہے موہن نکل گیا ہے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''وہ کمینہ کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کا انتظام ہے۔'' عمران نے بھی چلا کر جواب دیا۔

کسی طرف سے ہم پر آٹومیٹک رائفل کا برسٹ گیا۔ ہم بھاگتے بھاگتے اسٹریچر نما تختے سمیت گرے،

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے والوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

خاندانی راز

میمونہ عزیز

تہذیب و شائستگی کسی کی میراث نہیں... مگر شجرۂ نسب کی اہمیت آج بھی قائم دائم ہے.. خاندانی افراد ہی اقدار و اخلاق و رکھ رکھاؤ کے باعث نمایاں شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں.. ایک ایسے ہی خاندان کی بھول بھلیوں میں مدغم کہانی کے سلسلے.. جو اپنی عزت و ناموس کی خاطر.. آج بھی اپنی روایتوں کے امین تھے۔

ساتر سن لوئی غصے کے عالم میں فاؤنٹین ہاؤس کے کچن میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے اپنی زرد قمیص کے بٹنوں کے درمیان ایک قلم لگا رکھا تھا جس کی نیلی روشنائی کے دھبے نہ صرف اس کی قمیص بلکہ انگلیوں پر بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ جھلاتے ہوئے بولا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کس طرح کام ہوتا ہے۔ مجھے ریسرچ کے لیے جو مواد درکار تھا، وہ رات میں غائب ہو گیا ہے۔ اب میں کس طرح اپنے کام کو آگے بڑھاؤں؟''

روپ زوال کر دیا ہے اور اب یہ مجسمے بوسیدگی کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے چہروں سے جھلکتی شان و شوکت اور تمکنت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی ان کے سحر میں ڈوب جاتا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی تھی۔ وہ مجسمے تو خاموش رہے البتہ میرے شوہر برائن کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"میرا نام روزی مینڈیاس ہے۔ میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں۔ میرے کارنامے، میری طاقت اور میرا زوال سب کچھ اس چہرے سے عیاں ہے جسے آدھا زمین میں گاڑ دیا گیا ہے۔"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ میرے برابر والے پتھر کے چبوترے پر کھڑا بڑے ڈرامائی انداز میں بول رہا تھا۔ اس کے دونوں پیروں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور اس کے دونوں بازو اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے گروپ کے دوسرے لوگوں نے اس کی تقریر سن کر اسے داد دی تو وہ داد وصول کرنے کے انداز میں جھکا اور بڑی احتیاط سے اپنا قیمتی کیمرا سنبھالتے ہوئے اس چبوترے پر بیٹھ گیا۔

"شاعری ہو رہی ہے؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میری دسویں جماعت کی انگلش ٹیچر ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ شعر یاد رکھنا آخری عمر میں فائدہ مند ہو سکتا ہے لہٰذا فی الحال میں نے اس مشغلے کو اپنی فہرست سے نکال دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "چڑھائی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"زبردست! چلتے ہیں۔ بہت مزہ آئے گا۔"

ہم نے پارکنگ لاٹ سے قریبی پہاڑ کی چوٹی تک آدھے میل کا فاصلہ طے کیا جو سطح سمندر سے دو ہزار میٹر کی بلندی پر تھی۔ گرمی اور بلندی کی وجہ سے یہ سفر خاصا تھکا دینے والا تھا لیکن جب ہم چوٹی پر پہنچے اور وہاں پتھر کے مجسموں کی قطار دیکھی تو ساری محنت وصول ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مجسمہ سازوں نے جان بوجھ کر اس چوٹی کا انتخاب کیا تھا تاکہ دیکھنے والے جب چڑھائی چڑھ کر یہاں پہنچیں تو ان کی سانسیں تھم جائیں اور وہ حیران و ششدر ہو کر ان مجسموں کو دیکھتے رہیں۔

آدھے گھنٹے تک ہم ان مجسموں کو تعریفی نظروں سے دیکھتے رہے، گو کہ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ شدید گرمی میں نکیلے پتھروں پر کھڑے رہنے سے پھسلنے کا بھی خطرہ تھا تاہم یہ

ایک ناقابل یقین منظر تھا۔

"یہ کون ہے، روزی مینڈیاس؟" رینڈی نے پوچھا۔ اس کا سرخ چہرہ بلندی چڑھنے سے سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کی سانس ابھی تک قابو میں نہیں [illegible] ہانپتے ہوئے بولا۔ "کیا شہنشاہ روزی مینڈیاس نے [illegible] بنوایا تھا؟"

ہم [illegible] کا ذہن تھوڑی دیر پہلے ہی [illegible] مقبرہ [illegible] مجھے افسوس [illegible] نے [illegible] سب تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ رینڈی نے [illegible] کیوں کیا ہے۔ جیک بوائل نے اسے گھورا اور بولا۔ "[illegible] جا رہا ہے۔ اسے غور سے سنو۔ تم نے میرا ایپر [illegible] دیا۔"

"وہ جو کوئی بھی تھا لیکن اسے یہاں بیت [illegible] بنانا چاہیے تھا۔ میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔" رینڈی منہ بناتے ہوئے بولا۔

"نیچے ایک بیت الخلا موجود ہے۔" نیلی جلدی سے بولی۔ "واپسی میں ہم وہاں رکیں گے۔ اگر تم چاہو تو ابھی جا سکتے ہو۔"

ہم سب نے [illegible] امید کے ساتھ اسے دیکھا کہ وہ [illegible] وہاں سے چلا جائے تاکہ ہم باقی جگہ اطمینان سے دیکھ سکیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ایک بیرا [illegible] جس کی واپسی کی کوئی امید نہ تھی۔ اس نے جاتے جاتے بیوی کو آواز دی کہ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ جائے۔

"میرے پیسوں کا اس سے اچھا مصرف کوئی نہیں ہو سکتا۔" جیک نے اپنا پرس جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں رینڈی کا شکر گزار ہوں۔"

ہم سب بہت نرم مزاج تھے اور ٹور شروع ہوئے دن ہو چکے تھے لیکن اب پہلی بار یہ ہوا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔

"صرف رینڈی ہی کیوں اور لوگ بھی تو ہیں۔" [illegible] نے جیک سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ایک پرانی کہاوت ہے کہ اگر تم اپنے گرد [illegible] کسی احمق کو نہ پہچان سکو تو تم خود سب سے بڑے احمق ہو۔" رینڈی نے مجھے یہ احساس [illegible] ہے۔"

میں اپنا قہقہہ نہ روک سکی لیکن جیسے ہی میری نظر [illegible] سے چار ہوئی تو مجھے محتاط ہونا پڑ گیا کیونکہ میری ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ ٹور کے دوران دوسرے [illegible] سوالات کے جواب نہ دوں اور جب ٹور لیڈر [illegible] تو اس کی بات غور سے سنوں۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔

[illegible] مندی اور پھر اپنا لیکچر شروع کر دیا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس کی وجہ سے مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ہم بڑی احتیاط سے سنگریزوں سے ڈھکی ڈھلوان پر چل رہے تھے۔ سورج آگ برسا رہا تھا اور اس کی تپش سے زردی مائل پتھر بھی سفید ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ "اسٹیو کی طبیعت کیسی ہے؟ کیا کسی نے آج اسے دیکھا؟" ہمارے گروپ میں صرف رینڈی ہی واحد شخص نہیں تھا جسے پانی اور خوراک کی تبدیلی کی وجہ سے مسئلہ پیش [illegible] اسٹیو بھی اس سے متاثر ہوا تھا۔

جیک کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میں نے سنا [illegible] کہ آج اس نے ہوٹل میں ہی رکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس نے آج کا پروگرام چھوڑ دیا۔"

"لیکن وہ یہاں پہلے بھی آ چکا ہے۔ اسے یہ جگہ یاد تو ہو گی۔"

"نہیں، وہ لیلیٰ کے ساتھ ایک اور ٹور پر آیا تھا اور یہ علاقہ بھی دیکھ چکا ہے، اسی لیے وہ دوبارہ آنا چاہ رہا تھا۔ لیلیٰ ایک اچھی گائیڈ ثابت ہوئی تھی اور اسی وجہ سے وہ [illegible] ملک سے محبت کرنے لگا۔" اس نے ایک بار پھر کندھے اچکائے اور بولا۔ "واقعی یہ ملک بہت خوب صورت اور یہاں کی قابل دید مقامات بھی ہیں لیکن کھانوں کا تو جواب نہیں، اسی وجہ سے میں یہاں آیا ہوں۔"

[illegible] کی شدت کی وجہ سے میرا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ فضا میں ایک عجیب ناگوار مہک تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ جلدی سے یہ راستہ طے ہو اور میں ہوٹل جا کر تازہ دم ہو جاؤں۔

"تمہارے خیال میں ان مجسموں کے سر کتنی مالیت کے ہوں گے؟" یہ سوال لوگین نے کیا تھا۔ میں نے تعجب سے اس کی جانب دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب ہے کہ مارکیٹ میں ان کی کیا قیمت ہو گی؟"

[illegible] ہمارے گروپ کا سب سے کم عمر رکن تھا اور میں اس کی توانائی اور جوش و خروش سے بہت متاثر تھی۔ [illegible] سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ بھی ان چیزوں کی فنی و تاریخی اہمیت پر غور کرنے کے بجائے ان کی قیمت کے [illegible] میں سوچ رہا ہے۔ تاہم میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس کا [illegible] نہیں ہے۔ ممکن ہے [illegible]

چیزیں بلیک مارکیٹ میں ہی مل سکتی ہیں۔ آپ انہیں قانونی طور پر فروخت نہیں کر سکتے۔"

"تم نے بتایا تھا کہ آرکیالوجسٹ ہو اس لیے میں نے سوچا کہ شاید تمہیں اس کی قیمت کا کچھ اندازہ ہو۔"

"آرکیالوجسٹ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے آثار قدیمہ کی مالیت کا بھی علم ہو۔ کھدائی کے دوران عام طور پر برتنوں کے ٹکڑے، سکے اور ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں اور میں نے کبھی نوادرات کی تجارت کا مطالعہ نہیں کیا۔"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ کسی اور کو گھیر چکا تھا لیکن پورے گروپ میں کوئی بھی اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ اس نے باری باری یہ سوال سب سے کیا اور جب کہیں سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ یوں سر ہلانے لگا جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ ذہانت اور عقل مندی میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔

ایک گھنٹے بعد ہم دوسری جگہ پہنچ کر غاروں اور منقش دیواروں کا معائنہ کر رہے تھے۔ یہ جگہ ہماری واپسی کے راستے میں آتی تھی، تب ہی میں نے وہاں رینڈی کی بیوی روز کو پیچھے کی طرف گھسٹتے دیکھا۔ میرا سانس رکنے لگا۔ میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ اس سے ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں اس کی ٹیچر تھی اور نہ ماں کہ اسے ٹوک سکتی لیکن جب اس نے جھک کر ایک پتھر ہٹایا اور کوئی چیز اٹھائی جو سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول پڑی۔ "روز!"

اس نے میری طرف دیکھ کر یوں ہاتھ ہلایا جیسے بڑی مشکل سے چاروں ہاتھ پاؤں سمیت پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ گرم ہوا چل رہی تھی اور اس کے سیاہ بال ماتھے اور چہرے پر آ رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے انہیں ہٹایا اور بولی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

وہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ میں اس سے بات کرنے کا کوئی مناسب طریقہ سوچ رہی تھی۔ پھر میں نے یہ کوشش ترک کر دی اور سیدھے سیدھے انداز میں پوچھ لیا۔ "تمہیں یہاں سے کوئی چیز ملی ہے... تم نے کچھ اٹھایا ہے؟"

"نہیں۔" وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کے [illegible] "جو کچھ تم نے اٹھایا ہے، اسے اپنی جگہ پر

جیک نے مجھے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میں اس سوٹ کیس کو دیکھ چکی ہوں لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں بول پڑی۔ ”کیا، اسٹیو ابھی تک بیمار ہے؟“

”ہاں، صبح وہ کسی ڈاکٹر کو دکھائے گا تاکہ ائرپورٹ روانہ ہونے سے پہلے وہ کچھ دوائیں لے سکے۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ اس کا سامان اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ بے چارہ اسٹیو۔“

جیک کی قمیص کی آستینیں اوپر کی جانب مڑی ہوئی تھیں اور مجھے وہاں ایک مدھم سا گلابی دھبا نظر آرہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اسے پانی سے صاف کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ دھبا پوری طرح دور نہ ہوسکا۔ میں نے اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی لیکن میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس طرح کے کئی خونی دھبے دیکھے تھے۔

”اچھا... پھر ملیں گے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور راہداری کی طرف جانے لگی لیکن اس وقت تک میرے دل کی دھڑکن اعتدال پر نہیں آئی تھی۔

”لیکی۔“ میرے کانوں سے جیک کی آواز ٹکرائی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو جیک مجھ پر پستول تانے ہوئے تھا۔ اس سے پہلے بھی میں اس طرح کی صورت حال کا سامنا کر چکی تھی اور یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

”تم میری قمیص کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”ہونہہ... قمیص!“ میں نے نفی میں سر ہلایا لیکن میرا دل اندر سے ڈوب رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا یا اسے شبہ ہوگیا تھا کہ میں وہ خون کا دھبا دیکھ چکی ہوں۔

”چلانا مت۔ اس سے پہلے کہ کوئی تمہاری آواز سنے، میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو وہی کرو جو میں کہوں۔“ پھر وہ کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اندر چلو۔“

میں کسی قیمت پر بھی اندر نہیں جاسکتی تھی۔ اس کی بات ماننے کا مطلب اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا تھا۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اسٹیو مر چکا ہے یا مرنے والا ہے اور اگر میں اندر چلی گئی تو میرا حشر بھی اس جیسا ہی ہوگا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ باہر رہ کر زیادہ دیر تک بچنے کا بھی یہی نتیجہ نکلے گا۔ میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ معاملات بہت تیزی سے وقوع پذیر ہو رہے تھے اور مجھے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا تھا۔ میں نے لمحہ بھر میں فیصلہ کرلیا کہ دہشت ہی سب سے بہترین ہتھیار ہوسکتی ہے۔ ان حالات میں میرے لیے یہی ایک آسان راستہ تھا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھی۔ میری سانس ناہموار اور تیز چل رہی تھی۔ میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ میں اندر نہیں جاسکتی۔“

اس نے چابی نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی مجھ پر سے نہیں ہٹیں۔ غراتے ہوئے بولا۔ ”چپ ہوجاؤ۔ اندر چلو۔“

یہ کہہ کر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا، ہینڈل کو پیچھے کر کے اپنا پاؤں دروازے میں پھنسا دیا تاکہ وہ کھلا رہے۔

”میں نہیں جاسکتی...“ میرا ایک ہاتھ سینے پر تھا۔ دوسرے ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے میں نے بمشکل چند قدم آگے بڑھائے اور ہانپتے ہوئے بولی۔ ”مجھے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔“

جیک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ میں تیزی سے اس پر جھپٹی۔ شاید اسے اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑایا۔ میں نے اس کی دائیں کلائی پکڑی اور پوری قوت سے نیچے دبانے لگی تاکہ پستول کو خود سے دور کرسکوں۔

اسی اثنا میں برائن بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آگیا۔ منظر دیکھ کر وہ تیزی سے دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا اور اس نے پوری قوت سے جیک کے سر پر گھونسا مارا جس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ فوراً ہی فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے جیک سے پستول چھین کر اس کی ساری گولیاں نکال دیں اور جب یقین ہوگیا کہ اس کے چیمبر میں کوئی گولی نہیں بچی، تب میں نے سکون کا سانس لیا۔

اس ہلچل کی وجہ سے قریبی کمروں میں سوئے ہوئے لوگ جاگ گئے اور ان میں سے کسی نے فون کر کے منیجر کو بلا لیا۔ گو کہ مجھے ترکی زبان نہیں آتی تھی۔ اس لیے لوگوں کو ساری بات سمجھانا بہت مشکل تھا لیکن وہ میرے ہاتھ میں پستول اور برائن کو جیک کی پیٹھ پر سوار دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہاں فوری طور پر مدد کی ضرورت ہے۔ منیجر نے فون کر کے پولیس اور بلی کو بلوایا اور لیکی نے فوراً ہی اس واقعے کی اطلاع میوزیم کو بھی دے دی۔

کمرے میں پہنچ کر اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اسٹیو واقعی مر چکا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر سرخ اور نیلے نشانات تھے جن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ بلی نے یہی بات پولیس کے سامنے دہرائی اور انہیں بتایا کہ میں ایک زمانے میں اپنے ملک کی پولیس کے لیے کام کرچکی ہوں۔

ثبوت کی موجودگی میں جیک کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بات پر جھگڑا ہوگیا تھا کہ اسٹیو نے یہ کہہ کر اس کے ساتھ باہر جانے سے انکار کردیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جیک کو شک ہوا کہ اس کے دل میں بے ایمانی آگئی ہے اور وہ مال مسروقہ اکیلے ہی ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجے میں وہ اشتعال میں آگیا اور اس نے اسٹیو کے منہ پر تکیہ رکھ کر پوری قوت سے دبایا کہ اس کا دم گھٹ گیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا اور اس کے دھبے جیک کی آستین پر لگ گئے۔

”تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ چیز جیک نے چرائی تھی؟“ لیکی نے سب لوگوں کے جانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ اس نے بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے پولیس اور میوزیم کی انتظامیہ سے معاملہ نمٹایا تھا اور اسے اس بات کی خوشی تھی کہ نہ صرف چوری شدہ نوادرات برآمد ہوگئے تھے بلکہ اس کی ساکھ بھی بحال ہوگئی۔

”وہ مسلسل یہی کہتا رہا کہ اسے اس دورے میں صرف کھانوں سے دلچسپی ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ اسے تاریخ سے بھی دلچسپی تھی ورنہ وہ روڈی مینڈیاس کے بارے میں بات نہ کرتا۔ میں آثار قدیمہ کی ماہر ہوں لیکن مجھے بھی اس بارے میں اتنی معلومات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہم سے زیادہ تاریخ کے بارے میں جانتا تھا اور کسی مقصد کے تحت اس میں اپنی دلچسپی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔“

”لہٰذا انہوں نے نوادرات چرانے کا پروگرام بنا لیا۔“ برائن میری بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس سفر کے دوران اتنا ہی اجنبی ظاہر کریں جیسے وہ پہلی بار اس ملک میں آئے ہیں۔ اسٹیو بیماری کا بہانہ بنا کر گروپ کے ساتھ نہیں گیا اور جب اسے جیک کا موبائل پر پیغام ملا تو وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ بوڑھی عورت ہوٹل کے باہر دوا پانے کا مظاہرہ کر رہی تھی اور ہم سب اسے گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ اسٹیو نے ہم لوگوں سے چھپ کر وہ چیزیں بیگ سے لے لیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ انہیں تکیوں کے درمیان رکھ کر لے جائیں گے۔“

دوسرے دن تمام سرکاری کارروائیوں سے فارغ ہوکر ہم وقت پر ائرپورٹ پہنچ گئے۔ میں نے لیکی کا سامان لے جانے میں اس کی مدد کی اور جب میں لاؤنج میں بیٹھی برائن کا انتظار کر رہی تھی تو میں نے ہیرالڈ کو دیکھا جو نیویارک جانے والی فلائٹ کا منتظر تھا۔

”اچھا سفر رہا۔“ اس نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے کندھے اچکائے۔ ”لیکن آخر میں آکر سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔“

”نہیں۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ واقعی افسوس ناک بات ہے کہ ہمارے ایک ساتھی کی موت واقع ہوگئی لیکن مجموعی طور سے یہ ایک اچھا دورہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ان مقامات کو دیکھ کر اپنے علم میں اضافہ کرتی ہو لیکن میرے لیے لوگ اہمیت رکھتے ہیں۔ میں اسی لیے ان جگہوں پر جاتا ہوں تاکہ دیکھ سکوں کہ یہاں کے لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو دیکھ کر بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہم سرکس دیکھنے نہیں جا رہے بلکہ ہم خود سرکس ہیں۔“

اس کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ میں ان کا مطلب تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ شاید میری کیفیت کو بھانپ گیا تھا۔ اس نے پیکٹ سے ایک سگار نکالا اور اسے ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا۔ ”تم دنیا میں جہاں چاہو جاسکتی ہو لیکن کسی جگہ کو دیکھنے سے بہتر وہاں کے لوگوں کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کافی شاپ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ہی برائن آگیا اور مجھے سوچ میں گم دیکھ کر بولا۔ ”کیا ہوا؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں، میں سوچ رہی ہوں کہ ڈھیر سارا علم اور تجربہ رکھنے کے باوجود ہم لوگوں کو پرکھنے میں دھوکا کیوں کھا جاتے ہیں؟“

”اگر تمہارا اشارہ اسٹیو اور جیک کی طرف ہے تو اس طرح کے لوگ ہمیں آئندہ بھی ملتے رہیں گے۔ ہمیں ان سے ہوشیار رہنا ہوگا جو سیاحوں کا بھیس بدل کر چوری اور اسمگلنگ کرتے ہیں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ آئندہ ایسے کسی دورے پر جانے سے پہلے ساتھ جانے والوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرلیا کروں گا تاکہ پھر کبھی ایسی ناخوشگوار صورت حال سے دوچار نہ ہونا پڑے۔“

میں برائن کی بات سن کر مسکرا دی اور سوچنے لگی کہ کیا ایسا ممکن ہے؟

نے بھی جوابی تبصرہ کیا اور واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سلو بھی اس دوران میں باہر نکل چکا تھا اور اس سارے منظر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''خلاص۔'' شہریار کو سامنے پا کر اس نے صورتِ حال پر یک لفظی تبصرہ کیا اور اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''میں تو دوبارہ سونے کے لیے لیٹ رہا ہوں۔ تمہارا دل چاہے تو ناشتا پانی کر لو۔'' کمرے میں پہنچتے ہی اس نے اعلان کیا اور غڑاپ سے بستر پر جا گرا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں اس کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے اور وہ یوں اطمینان سے سو گیا جیسے کچھ دیر قبل دیکھی جانے والی خون میں نہائی لاش اس کے لیے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو۔ حالانکہ صورتِ حال ذرا سی مختلف ہوتی تو پولیس کا نشانہ بننے والے ان دونوں افراد کی جگہ وہ خود بھی ہو سکتے تھے۔

شہریار نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور کمرے کی محدود جگہ میں ہی اپنی معمول کی ورزش کرنے لگا۔ سی ایف پی کو جوائن کرنے سے پہلے بھی صبح اٹھ کر ورزش کرنا اس کا معمول رہا تھا۔ تربیت کے بعد اس معمول میں کچھ مزید سخت مشقوں کے ساتھ اور بھی زیادہ باقاعدگی آ گئی۔ اپنے موجودہ مشن کے دوران بھی وہ اس کام کے لیے موقع نکال ہی لیتا تھا۔ ورزش سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پسینا خشک ہونے کا انتظار کیا اور پھر تولیا اٹھا کر نہانے چلا گیا۔ کمرے سے اس دوران مقتول ڈاکو کی لاش اٹھائی جا چکی تھی اور پولیس اپنی کارروائی مکمل کر کے واپس چلی گئی تھی۔ اس نے لائن سے بنے غسل خانوں میں سے ایک غسل خانے کا رخ کیا اور بھرپور غسل لے کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو وہاں سلو کے ساتھ راہول بھی موجود تھا اور ان کے درمیان ناشتے کے لوازمات سجے تھے۔

''آجاؤ بھئی ناشتا کر لو۔ گرم اور مزیدار ہے۔'' اسے دیکھ کر سلو نے دعوت دی تو وہ بلا تکلف ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وقت بھی خاصا ہو گیا تھا اور ورزش کے بعد غسل نے بھوک بھی خاصی چمکا دی تھی اس لیے ناشتا واقعی بہت مزے کا لگا۔

''تم دونوں کے کاغذات تیار ہو گئے ہیں۔ ان کاغذات کے علاوہ بھی مزید کچھ کاغذات تیار کروا کر ان شہروں کے پی او بکس میں محفوظ کر دیے جائیں گے جن کے بارے میں امکان ہے کہ تمہیں اپنے مشن کے سلسلے میں جانا پڑے گا۔'' ڈاکٹر فرحان کے بارے میں انہیں کنفرم نہیں پتا تھا کہ وہ کس شہر میں ہیں بلکہ کچھ شہروں کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ شاید ان میں سے کسی جگہ وہ موجود ہو سکتے ہیں۔ اسی

حوالے سے راہول نے انہیں اطلاع دی تھی۔ اطلاع کے ساتھ اس نے شناختی کارڈز وغیرہ نکال کر ان کے حوالے کیے۔ شناختی کارڈز پر چسپاں تصویریں ان کے موجودہ حلیوں کے مطابق ہی تھیں۔ شہریار نے شکریے کے ساتھ انہیں وصول کر لیا۔ ان کی عدم موجودگی کے باعث وہ بڑی مشکل میں پھنسنے والے تھے۔

''نادر دادا والے معاملے کا کیا ہوا؟'' اس نے ایک اہم سوال کیا۔

''اس کے آدمی تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اسی چکر میں وہ لوبھائی کے ہوٹل تک بھی پہنچ گئے تھے۔ لوبھائی نے مجھ سے دوستی کا پاس کرتے ہوئے وہی کہا جو میں نے انہیں سکھایا تھا۔ ہوٹل کے خدا کمرے سے وہ تم دونوں کے بیگز لے کر چلے گئے جو میں نے تمہارے اصل بیگز کی جگہ رکھ دیے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ نادر دادا کے لوگ اب بھی تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے اس لیے بہتر ہے کہ تم دونوں جلد سے جلد یہاں سے نکل کر کسی دوسرے شہر پہنچ جاؤ۔ میرے مطابق تمہارے لیے سب سے بہتر ممبئی جانا ہوگا۔ دہلی ریلوے اسٹیشن سے ممبئی کے لیے راجدھانی ٹرین چلتی ہے۔ میں تمہارے لیے اس کی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لے آیا ہوں۔ یہ ٹکٹ لو اور فرسٹ کلاس کے مزے لوٹتے ہوئے ممبئی پہنچ جاؤ۔'' راہول نے ٹکٹ نکال کر ان کے سامنے رکھے تو شہریار کو ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرنا پڑا۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔'' راہول نے سنجیدگی سے کہا اور فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

''ٹھیک کہہ رہا تھا وہ۔ تمہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شکریہ تو اسے ہمارا ادا کرنا چاہیے تھا کہ اس کی خالی خولی میزبانی کے بدلے میں آج میں نے اسے زبردست ناشتا کروایا ورنہ میں بھی اس کی طرح اسے سوکھے منہ ٹرخا سکتا تھا۔'' راہول کے جانے کے بعد سلو نے منہ بناتے ہوئے تبصرہ کیا۔ اسے اس بات کی بہت شکایت تھی کہ راہول والی رہائش گاہ پر اس نے اور اس کے ساتھی نے کام کی بات کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی اور یہاں تک کہ انہیں مہمان خیال کر کے چائے تک کا تکلف نہیں کیا تھا۔

''جانے دو یار۔'' شہریار نے اس کی بات سن کر اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور سمجھانے لگا۔ ''وہ بے چارے کتنے مشکل حالات میں یہاں کام کر رہے ہیں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایسے لوگوں کی زندگی کتنی مشکل اور مختلف

ہوتی ہے۔ اپنی اصل شخصیت، وطن اور خاندان سمیت ہر شے کو بھول کر صرف مقصد کے حصول کے لیے خود کو وقف کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ہر گھڑی خطرے کی تلوار سر پر لٹکتی رہے اور دل میں یہ اندیشہ ہو کہ پتا نہیں کب اور کیسے ہماری اصلیت کھل جائے۔''

''وہ بے چارے ہیں اور ہم تو جیسے پکنک پر نکلے تھے۔'' اس کی بات سن کر سلو بڑبڑایا۔

''ابھی تک تو تم کو پکنک ہی منا رہے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر روانگی کے لیے تیاری کرنے لگا۔ سلو نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ اسٹیشن پہنچے تو ٹرین کی روانگی میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا اور اس بات کا اعلان پبلک سروس سسٹم سے کیا جا رہا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے گاڑی کا نام لے کر تکرار کے ساتھ روانگی کا وقت بتایا جانے لگا۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر لگنے تک وہ چائے نوشی کے ساتھ ساتھ اخبار بینی بھی کرتے رہے۔ یہ انگریزی اخبار تھا جس کے مطالعے میں ایک تو ان کا وقت اچھا گزرا، دوسرے چہروں کے سامنے ایک آڑ بھی رہی۔ بدلے ہوئے حلیوں میں ہونے کے باوجود انہوں نے اس احتیاط کو مناسب سمجھا تھا کہ اگر نادر دادا کے گرگے وہاں منڈلا رہے ہوں تو انہیں غور سے ان کا جائزہ لینے کا موقع نہ مل سکے۔ اخبار بینی کی مصروفیت سے کسی کے شک میں پڑنے کا گمان یوں نہیں تھا کہ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں بیٹھے حضرات میں سے اکثریت اسی مشغلے میں مصروف تھی۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر لگ جانے کا اعلان سن کر انہوں نے اپنے اپنے اخبار رول کر کے بغل میں دبائے اور ٹرین کی طرف بڑھ گئے۔ فرسٹ کلاس میں ان کے لیے مخصوص کوپے شاندار تھا۔ ایک نرم کاؤچ پر ڈھیر ہوتے ہوئے سلو نے بغل میں دبا ہوا اخبار ایک طرف ڈالا اور اپنی کنپٹیوں کو انگلیوں کی مدد سے دباتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

''آج میں نے اتنی انگریزی پڑھ لی ہے کہ لگتا ہے بدہضمی ہو جائے گی۔ سالی یہ انگریزی ان لوگوں نے ہم کو ڈنڈے کے زور پر سکھائی تھی ورنہ بالکل شوق نہیں تھا فرنگیوں کی زبان سیکھنے کا۔''

''چلو، ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کچھ تو اچھا کیا۔'' اس کی بات سن کر شہریار نے تبصرہ کیا۔ وہ خود بھی اس وقت ایک کاؤچ پر ہی براجمان تھا لیکن سلو کے برعکس اخبار لپیٹ کر رکھنے کے بجائے ایک بار پھر کھول لیا تھا۔ اخبار پڑھتے ہوئے اس کی نظر اس چھوٹی سی خبر پر بھی پڑ گئی جس میں نادر دادا کے ہوٹل میں پیش آنے والا واقعہ مختصراً بیان کیا گیا تھا۔ خبر میں نادر دادا کا نام نہیں تھا اور شاید اس طرح اس کی ساکھ بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ شہریار نے سلو کو بھی وہ خبر پڑھ کر سنائی۔

''نام کیسے لکھتا سالا اخبار والا۔ نادر دادا اپنی اس بیجتی (بے عزتی) کے لیے اس کی واٹ نہ لگا دیتا کیا۔'' خبر سن کر اس نے تبصرہ کیا جس سے شہریار نے بھی اتفاق کیا اور آخرکار خود بھی اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھنے کے بعد سلو ہی کی طرح پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نادر دادا کیا تھا اور کیا نہیں، ان کے لیے تو اصل اہمیت اس بات کی تھی کہ وہ اس سے بچ کر نہایت آسانی سے دہلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ممبئی کی طرف مزے سے رواں دواں تھے۔

☆☆☆

''ہم نے رائے چند کو ادھیڑ ڈالا ہے سر۔ اس نے اپنے سارے غیر قانونی دھندوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی قبول کیا ہے کہ وہ را کے لیے کام کرتا رہا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور انہیں جب اس سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو وہ خود اس سے رابطہ کر لیتے ہیں۔'' رائے چند کو جاوید علی نے اپنے جن ماتحتوں کے حوالے کیا تھا، ان میں سے ایک نے رپورٹ دی۔ اس رپورٹ کو سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

رائے چند کو تفتیشی مراحل سے گزارنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ انہیں اپنے کام میں خاصی مہارت حاصل تھی اس لیے یہ سمجھنا ذرا مشکل تھا کہ رائے چند جیسا شخص انہیں جل دینے میں کامیاب رہا ہوگا اور اتنی سختی سے گزرنے کے بعد بھی جھوٹ بول رہا ہوگا۔ اس کی نگرانی کے دوران بھی ایک طرح سے اس کے اس بیان کی تصدیق ہوئی تھی۔ اسے گھر سے مکان اور دکان سے گھر جانے کے سوا کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ اسپتال سے شہریار کے خون وغیرہ کے نمونے لے کر گیا تھا، تب بھی کسی سے ملاقات کے لیے کہیں نہیں گیا تھا اور غالب گمان یہی تھا کہ را کا کوئی ایجنٹ گاہک کے روپ میں آ کر اتنے چپکے سے وہ نمونے لے گیا تھا کہ نگرانی کرنے والے کو بھی شک نہیں گزرا تھا۔

''اس نے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بتایا جن سے وہ ہیروئن اور فلمز حاصل کرتا ہے؟'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

''یس سر! اس کا کہنا ہے کہ یہ اشیا اسے ایک عورت سپلائی کرتی ہے۔ وہ عورت ایک ایسی سیلز ویمن کے روپ میں اس کے گھر آتی ہے جو بظاہر خواتین کے استعمال کی اشیا

گھر گھر لے جا کر فروخت کرتی ہے۔ ہدایت کے مطابق اس کی آمد کے وقت رائے چند گھر پر موجود نہیں ہوتا اور دکان پر رہتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں عورت اس کی بیوی کو ایک پارسل دے کر چلی جاتی ہے اور بدلے میں اس کی بیوی طے شدہ رقم ادا کر دیتی ہے۔" ماتحت نے جواب دیا۔

"یہ طریقہ کار بہت زیادہ عجیب نہیں ہے یار! مانا کہ عورت احتیاط کے پیش نظر اس کی دکان پر آنا مناسب نہیں سمجھتی ہوگی لیکن رائے چند پر گھر میں موجود نہ رہنے کی پابندی کیوں ہے؟ متوسط طبقے کی آبادیوں میں اس طرح سے گھروں پر ساز و سامان فروخت کرنے والی خواتین کی آمد ایک عام سی بات ہے۔ گھریلو خواتین بازاروں کے مقابلے میں اطمینان سے ان خواتین سے خریداری کرنا بہتر سمجھتی ہیں کیونکہ اس طرح انہیں اپنے گھر کی آزاد فضا میں آسانی سے جانچ پڑتال کر کے خریداری کرنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر اگر گھر میں مرد حضرات موجود ہوں تو خود ہی ایک مسائنہ پر ہو جاتے ہیں چنانچہ اگر یہ سمجھا جائے کہ رائے چند کی موجودگی میں اس عورت کے اس کے گھر آنے سے کسی قسم کے شکوک و شبہات جنم لینے کا خدشہ تھا، اس لیے اس نے یہ پابندی عائد کی تھی... تو کچھ عجیب غیر منطقی سی بات ہوگی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اہتمام خاص اس لیے کیا گیا ہے کہ رائے چند اس عورت کو نہ دیکھ سکے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر... مجھے بھی یہ معاملہ کچھ عجیب لگا ہے۔" ماتحت نے اس کی تائید کی۔

"آؤ ذرا چل کر دیکھتے ہیں، رائے چند کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟" جاوید علی اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے ساتھی کے ساتھ چل پڑا۔ رائے چند تفتیش کے مخصوص کمرے میں ایک اسٹریچر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی اور وہ اس رائے چند سے قطعی مختلف لگ رہا تھا جسے جاوید علی نے اس کی دکان پر دیکھا تھا۔

"کیا حال ہے رائے چند! کیا خیال ہے، تمہاری اس حالت کی فلم بنا کر ان نوجوانوں میں تقسیم کر دی جائے جنہیں تم اخلاق باختہ فلمیں دکھا کر تباہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر انہیں نصیحت اور ان کے والدین کو سکون حاصل ہوگا کہ ابھی اس ملک میں وہ لوگ موجود ہیں جو اس کے مستقبل کو برباد کرنے کی کوشش کرنے والوں کے ہاتھ توڑ دینے کی ہمت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔" اس کے لہجے میں رائے چند کے لیے سخت نفرت تھی۔ جواب میں رائے چند نے اپنا منہ موڑ لیا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ اس کا سارا دم خم نکل [illegible] لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس میں بہت جان باقی ہے [illegible] جان باقی ہے تو لازمی ہے، سینے میں کچھ راز بھی باقی ہو [illegible] اسے چھت سے الٹا لٹکا دو تا کہ اسے اپنے اندر کے راز [illegible] زیادہ مشکل نہ ہو۔" اس کی زبان سے حکم جاری ہوتے [illegible] سرعت سے اس پر عمل ہوا اور فوراً ہی رائے چند چھت سے ایک کنڈے سے بندھی زنجیر میں الٹا لٹکا ہوا نظر [illegible] اس کی پہلے ہی ٹھیک ٹھاک خاطر مدارت ہو چکی تھی [illegible] سے جوں جسم کا سارا خون چہرے کی طرف سمٹ آیا [illegible] خوف کے بادل بھی چھائے ہوئے نظر آنے لگے۔

اس کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے جاوید علی [illegible] ایک ساتھی کو اشارہ کیا تو رائے چند پر قیامت ٹوٹ پڑی [illegible] وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ بے شک بجلی کے اس جھٹکے کا تعلق [illegible] کے ساتھ بندھی زنجیر سے تھا کرنٹ لمحے بھر [illegible] اس کے جسم سے گزرا تھا لیکن اسے ایسے لگا جیسے [illegible] زمین کو لرزا کر رکھ دیتا ہے۔

"تم نے عید قرباں پر بکروں کی قربانی ہوتے ہوئے دیکھی ہوگی۔ انہیں بھی اسی طرح الٹا لٹکا کر ان کی کھال اتاری جاتی ہے۔ میرے آدمی کسی قصاب سے کم ماہر نہیں ہیں۔ [illegible] آرام سے کسی بکرے کی طرح تمہاری کھال اتار سکتے ہیں بس فرق صرف اتنا ہوگا کہ بکرے کی کھال اس کی جان نکلنے کے بعد اتاری جاتی ہے اور یہاں کھال اترنے سے تمہاری جان نکلے گی۔" اس کے نہایت سفاکی سے ادا کیے گئے [illegible] ابھی ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک آدمی ہاتھ میں [illegible] چھری لیے رائے چند کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تت... تم مجھ سے ایسا غیر انسانی سلوک نہیں [illegible] سکتے۔" رائے چند بجلی کے جھٹکے سے تو سنبھل گیا تھا لیکن [illegible] حالت میں کھال اترنے کے خیال سے دہشت زدہ [illegible] تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"انسانوں والا سلوک انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تم جیسے درندے کے ساتھ نہیں [illegible] معصوم زندگیوں کو برباد کر ڈالتے ہیں۔ [illegible] [illegible] جو تیر سے زیادہ [illegible] [illegible] [illegible] اور اپنے محبت کرنے والوں کو بھی جیتے جی مار دیتے ہیں۔ [illegible] میں مبتلا ایک جوان [illegible] تڑپ اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو تم کھال اترنے [illegible] کی صورت میں محسوس کرو گے۔" اس نے [illegible] [illegible] میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ [illegible]

[illegible] نے ہاتھ بڑھا کر رائے چند کے بازو کی جلد پر ایک ہلکا سا چرکا لگایا۔ رائے چند بری طرح چیخنے لگا۔ اس کی ان چیخوں میں جسمانی تکلیف سے زیادہ اس دہشت کا دخل تھا کہ اس کے پورے جسم کی کھال کو اسی طرح اتارا جانے والا ہے۔

"چیخنے چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کمرے سے تمہاری آواز نہیں جا سکتی اور اس کمرے میں موجود لوگ صرف وہی بات سنتے ہیں جو ان کے کام آ سکے۔" جاوید علی نے [illegible] بے مہری سے اسے اطلاع فراہم کی۔ کچھ بھی پوچھنے سے قبل وہ اسے اتنا دہشت زدہ کر دینا چاہتا تھا کہ جھوٹ [illegible] کی گنجائش ہی نہ رہے۔

"تم مجھ سے پوچھو، میں وہ سب بتاؤں گا جو تم پوچھو گے۔" حسب توقع رائے چند لائن پر آ گیا۔

"تمہیں مال سپلائی کرنے والی عورت کون ہے؟" اس نے پہلا سوال کیا۔

"میں اسے نہیں جانتا۔ مجھے اوپر سے حکم تھا کہ جب وہ عورت مال دینے میرے گھر آئے تو میں وہاں موجود نہ رہوں۔ ویسے بھی وہ پہلے سے بتا کر مقررہ وقت پر نہیں آتی۔ میری غیر موجودگی میں اچانک ہی کبھی بھی آ جاتی ہے۔" اس نے بتایا۔

"پھر تم اسے مال کی پے منٹ کیسے دیتے ہو؟"

"میں طے شدہ رقم ہمیشہ اپنے گھر کے سیف میں محفوظ رکھتا ہوں۔ وہاں سے میری پتنی نکال کر اسے دے دیتی ہے۔" وہ شرافت سے جواب دے رہا تھا۔

"اس طریقے سے تمہیں مال کی سپلائی میں پریشانی نہیں ہوتی؟ کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہوگا کہ عورت کے مال لانے سے پہلے ہی تمہارا اسٹاک ختم ہو جائے، اس صورت میں تم کیا کرتے ہو؟"

"ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کبھی ایک دو دن کا فرق پڑ جاتا ہے ورنہ زیادہ تر وہ میرا اسٹاک ختم ہونے سے پہلے ہی سپلائی کر دیتی ہے۔"

"تمہیں کبھی تجسس نہیں ہوا کہ اس عورت کو دیکھو؟" جاوید علی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ابھی تک الٹا لٹکا ہوا تھا اور بے پناہ سرخ ہوتے اس کے چہرے سے تاثرات کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔

"میں ایسا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ [illegible] [illegible] کوشش کرتا تو اوپر والے میری کھال میں بھس بھر [illegible] [illegible] اس نے [illegible] [illegible] میں بتایا۔

"اوپر والے کون؟" جاوید علی نے درشتی سے پوچھا۔

جواباً وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔

"میں نے پوچھا ہے اوپر والے کون؟" جاوید علی کی آواز کچھ اور بھی سخت ہو گئی۔ ساتھ ہی اس کے ساتھی کا چھرا ایک بار پھر رائے چند کے جسم کی طرف بڑھا۔

"وہی جنہوں نے میرے ذریعے اسپتال سے اے [illegible] شہریار کے خون اور بالوں کے نمونے منگوائے تھے۔" اس نے دہشت زدہ ہو کر جواب دیا لیکن اب بھی [illegible] لفظ ادا نہ کر سکا۔ البتہ مطلب واضح تھا اس لیے جاوید علی کے جبڑے بھنچ گئے۔ اسلحہ، منشیات، اخلاق باختہ فلمیں۔ دشمن ہر رخ سے وار کر کے انہیں تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا اور اسے یہ آسانی اس لیے تھی کہ اس ملک میں اس کا ساتھ دینے کے لیے رائے چند اور ریاض انور جیسے کئی غدار موجود تھے۔

"اگر تم نے اس عورت کو نہیں دیکھا تب بھی تمہیں تمہاری بیوی نے تو اس کے بارے میں کچھ بتایا ہوگا۔" اس نے رائے چند کو کریدنے کی کوشش کی کیونکہ [illegible] والوں تک پہنچنے کی اس کے پاس اب صرف یہی امید تھی کہ کسی طرح اس عورت کا سراغ مل جائے۔

"نہیں، وہ عورت چہرے پر نقاب لگا کر آتی تھی اس لیے وہ بھی کچھ نہیں جانتی۔"

"ٹھیک ہے جب تم کچھ نہیں جانتے اور کچھ نہیں بتا سکتے تو ہمارے سامنے صرف تم ہی ہو جس کے ذریعے ہم اپنے دل میں بھڑکتی آگ کو بجھا سکیں۔ ادھیڑ ڈالو اس کو۔ اس کی چیخیں مجھے سکون دیں گی۔" وہ رائے چند سے بولتے بولتے اچانک اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا جس نے فوراً ہی الٹے لٹکے رائے چند کے جسم پر چھرا چلا دیا۔ چند انچ کی کھال کا ٹکڑا کٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ ساتھ ہی رائے چند نے ایک دل دوز چیخ ماری لیکن چھرے کو ایک بار پھر اپنے جسم پر محسوس کر کے چیخوں کو قابو کر لیا اور ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"رک جاؤ، میں تمہیں ایک کام کی بات بتا سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بتاؤ۔" جاوید علی کو پہلے ہی یقین تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور چھپائے ہوئے ہے اس لیے اطمینان سے بولا۔

"یہ سچ ہے کہ مال سپلائی کرنے کے لیے آنے والی عورت نقاب میں آتی تھی لیکن ایک دن اتفاق سے اس کے چہرے سے نقاب سرکنے کے کارن میری پتنی نے اس کی شکل دیکھ لی تھی۔ شکل [illegible] روگئی اور ایک روز وہ میرے ساتھ خریداری کے لیے [illegible] نکلی ہوئی تھی تو اس نے اس عورت کو دیکھ کر مجھے اس کے بارے میں بتایا۔ اس وقت وہ عورت نقاب میں نہیں تھی اور بڑے ماڈرن کپڑے پہنے ایک مساج

سینٹر میں جارہی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہاں وہ کسی کام سے گئی تھی یا ملازمت کرتی ہے۔ میں نے تو اوپر والوں کے ڈر سے کبھی دوبارہ اس طرف کا رخ بھی نہیں کیا۔'' آخر اس نے ایک اہم راز اگل ہی دیا۔

''اسے نیچے اتار دو۔'' جاوید علی نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی جس پر پہلے ہی کی طرح سرعت سے عمل کیا گیا۔

''عورت کا حلیہ بتاؤ۔'' رائے چند کو دوبارہ اسٹریچر پر لٹایا گیا تو وہ اس کے مقابل کھڑا ہو تا نرمی سے پوچھنے لگا۔ اس بار اس نے بغیر کسی مزاحمت کے عورت کا حلیہ تفصیل سے بتا دیا۔

''اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دو۔'' حلیہ معلوم کرنے کے بعد اس نے مزید وہاں رکنا بیکار سمجھا اور ہدایت کرتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔

''مجھے گولی مار دو پلیز۔'' پیچھے سے رائے چند نے اس سے درخواست کی۔ یقیناً وہ اذیتوں سے تنگ آ گیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہاں سے زندہ رہائی ممکن نہیں اس لیے درد بھرے لہجے میں یہ التجا کر رہا تھا۔

''ابھی انتظار کرو۔ شاید میرے دل میں تمہارے لیے غصہ کچھ کم ہو جائے تو میں تمہیں ایسی آسان موت کا تحفہ دے سکوں۔'' اس نے مڑے بغیر سرد مہری سے جواب دیا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ اس وقت اسے رائے چند کے مستقبل کا فیصلہ کرنے سے زیادہ اہم کام درپیش تھے اور وہ صرف انہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہی جانا پہچانا منظر تھا۔ مزار کے احاطے میں کھچا کھچ لوگ بھرے ہوئے تھے اور بڑی عقیدت سے اپنی باری آنے پر نذرانے چڑھا رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی چودھری قیمتی پوشاک میں سب سے شاندار اور اونچی کرسی پر براجمان تھا اور اس کے اردگرد کی دیگر کرسیوں پر اس کے خاص مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ عام لنگر کے علاوہ حویلی کے مہمان خانے میں خاص مہمانوں کے لیے خصوصی دعوت کا بھی اہتمام تھا۔ مریدوں کے ہاتھ جوڑنے اور قدموں سے لپٹ کر اپنی عقیدت کے اظہار کا وہ سلسلہ بھی جاری تھا جو چودھری کے گھمنڈ میں مزید اضافے کا سبب بنتا تھا لیکن اس سب کے باوجود آج سے وہ تسکین حاصل نہیں ہو رہی تھی جو ہمیشہ اس موقع پر وہ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ اس بے چینی اور بے لذتی کے پیچھے کئی عوامل کارفرما تھے۔ سب سے اہم سبب تو یہ تھا کہ اب دل سے اپنے مطلق العنان حاکم ہونے کا احساس مٹنے لگا تھا۔ وہ لاکھ خود کو بہلاتا کہ آج بھی پیر آباد اور گردونواح کے دیہاتوں پر اس کی حکمرانی ہے لیکن دل میں خیال کچوکے لگاتا رہتا تھا کہ وہ خود کسی کے زیراثر آ چکا اور اپنے فیصلوں کے لیے کچھ ان دیکھی قوتوں کا محتاج ہے۔ منشیات کے دھندے نے اسے بے تحاشا دولت سے تو نوازا تھا لیکن ساتھ ہی دوسروں کے زیرنگیں ہونے کے ذلت آمیز احساس سے بھی آشنا کر دیا تھا۔

دوسرا ذلت آمیز احساس اپنی جوان بیٹی کے گھر سے بھاگ جانے کا تھا۔ اگرچہ اب تک عوام کو اس معاملے کے بارے میں ڈھنگ سے کوئی خبر نہیں تھی اور مختلف بہانے کشور کے غیاب پر پردے ڈالے جاتے رہے تھے لیکن پھر بھی اسے معلوم تھا کہ لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات تو ضرور موجود ہوں گے اور کسی کو یقین نہیں آتا ہوگا کہ چودھری نے سات پردوں میں رہنے والی بیٹی کو امریکا کے آزاد معاشرے میں رہنے والے اس کے بھائی کے پاس بھیج رکھا ہے۔

اس کے دل کو کچوکے لگانے والا تیسرا احساس مراد شاہ کے رویے کا تھا۔ وہ خاندانی روایات سے بالکل منحرف تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کشور کے سلسلے میں بھی عدم تعاون کی راہ اختیار کی تھی۔ چودھری کا خیال تھا کہ اگر وہ ساتھ دیتا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ کشور اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔

مراد شاہ کے باغی پن کا یہ عالم تھا کہ چودھری نے اس کی تمام تر کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے ازخود اسے فون کیا اور عرس کے موقع پر پاکستان آنے کی ہدایت کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ چودھری لاکھ اسے سمجھاتا رہا کہ وہ مستقبل کا گدی نشین ہے اور اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ خاص مواقع پر یہاں موجود رہ کر تربیت حاصل کرے لیکن وہ نہیں مانا اور صاف کہہ دیا کہ اسے ایسی جھوٹی عزت سے کوئی غرض نہیں ہے بلکہ اس نے تو یہاں تک بھی کہہ ڈالا کہ اگر دادا جی سچ کی روحانی صلاحیتیں رکھنے والے کوئی نیک بزرگ ہوتے تو وہ ان کے عرس کے موقع پر آنے کا سوچ بھی سکتا تھا لیکن یہ جاننے کی صورت میں کہ دادا آخری عمر تک بے راہ روی میں مبتلا رہے اور عیش و نشاط کی محفلیں سجاتے رہے، وہ ہرگز بھی لوگوں کو دھوکا دینے کے اس پروگرام میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس کی صاف گوئی پر چودھری بڑا تلملایا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔

بیٹا جوان اور خودمختار تھا اور اس کی دولت کی پروا کیے بغیر امریکا میں اچھی خاصی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اسے عاق کرنے کی دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ موقع کا فائدہ اٹھا کر کب سے دانت نکالے بیٹھے اس کے داماد سب ہڑپ کر بیٹھ جاتے اور وہ بیٹے سے بھلے کتنا ہی ناراض ہوتا، کسی ا...

...کی جگہ بیٹے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی گستاخی سے بھی خاموش رہنے پر مجبور تھا۔

بظاہر حاکم ہوتے ہوئے مختلف معاملات میں اپنی بے بسی کے احساس نے اسے بے کلی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بے کلی کے اس عالم میں ہی اس نے مزار پر چادر چڑھانے کے ساتھ دیگر رسومات کی ادائیگی کی اور اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ حویلی پہنچ گیا۔ ان مہمانوں میں ... کی میر آفندی بھی شامل تھا جس کی وہاں خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی اور وہ بھی بظاہر اپنی اس پذیرائی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کھانے کے بعد منشی نے کوشش کی کہ عمیر کو شب بسری کے لیے روک سکے لیکن وہ نجی مصروفیت کا بہانہ بنا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مہمان البتہ آج رات حویلی میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے اور حسب روایت ان کے لیے شراب و شباب کے ساتھ شب بسری کا انتظام بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے مختلف علاقوں سے چن چن کر پیشہ ور عورتوں کو جمع کیا گیا تھا۔ ان عورتوں میں سے ایک چودھری کا پھوگرامانے بھی رات گئے اس کی خواب گاہ میں پہنچا دی گئی۔ شوخ میک اپ، زرتار لباس اور زیورات سے لدی پھندی وہ عورت بالکل مختلف تھی پھر بھی جانے کیوں عین عرس والی رات اسے اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر اسے ماہ بانو یاد آ گئی۔ سیاہ چادر کے ہالے میں میک اپ سے مبرا، معصومیت کا احساس لیے ماہ بانو کے معصوم سے چہرے اور اس پیشہ ور عورت کے مکار مسکراہٹ سے سجے چہرے میں کوئی قدر مشترک نہ ہونے کے باوجود اسے ماہ بانو یاد آئی تو احساس شکست بھی جاگ اٹھا۔ یہ بڑی حقیقت تھی کہ ماہ بانو کی اپنی زندگی میں آمد کے اس پہلے روز وہ پہلی بار شکست کے احساس سے دوچار ہوا تھا اور اس کے بعد پے در پے اسے کئی مقامات پر شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یعنی ماہ بانو وہ پہلی ہستی تھی جو بدشگون بن کر اس کی زندگی پر چھا گئی تھی۔ اس کا خیال دل میں آیا تو پھر وہ جذبۂ انتقام سے مغلوب ہوتا چلا گیا۔ شراب نے پہلے ہی حواس کو معطل کر رکھا تھا۔

اس عورت کو دیکھ کر ماہ بانو کیا یاد آئی، اسی پر ماہ بانو کا گمان ہونے لگا اور دل میں اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کی خواہش اس تیزی سے ابھری کہ خود پر قابو نہ رہا۔ اول اول تو اس عورت نے اس کی جارحیت کو برداشت کیا کہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ ایسے کئی گاہکوں سے نمٹ چکی تھی جو متشدد طبیعت کے مالک ہوتے تھے لیکن چودھری تو جیسے اس کا انجر پنجر ڈھیلا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ لاکھ بچاؤ کی کوشش کرتی رہی اور چاہا کہ اپنی مہارت سے چودھری کے جنون کو قابو میں کرے لیکن کامیاب نہیں ہو سکی اور آخرکار خوف زدہ ہو کر چیخنے چلانے لگی۔ اس کی چیخ و پکار کی آوازیں کمرے سے باہر تک سنی گئیں لیکن کس کی ہمت تھی کہ چودھری کی خواب گاہ میں داخل ہوتا۔ چیخ و پکار کی یہ آوازیں اتنی بڑھیں کہ حویلی کی اوپری منزل تک بھی جا پہنچیں۔ بچے کو سلانے کی کوشش میں فریدہ ان آوازوں کو سن کر چونکی اور انہونی کے احساس سے حقیقت جاننے کے لیے نیچے اتر آئی۔ نیچے آ کر اسے فوراً ہی پتا چل گیا کہ یہ آوازیں چودھری کی خواب گاہ سے آ رہی ہیں۔

وہ چودھری کے ملازمین اور چھوٹی چودھرائن کی طرح اس سے ڈرنے اور دبنے والی نہیں تھی کہ کان لپیٹ کر خاموش کھڑی رہتی۔ وہ کسی شیرنی کی طرح غصے میں چلتی چودھری کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچی اور اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ نشے اور انتقام سے بدمست چودھری اس مداخلت پر ہوش میں آیا لیکن اس وقت تک خاصی دیر ہو چکی تھی اور زخموں سے لہولہان عورت بستر پر پڑی اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔

''اسے دیکھو اور فوراً کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' اس نے غرانے والے انداز میں اپنے پیچھے کھڑے منشی کو حکم دیا۔ اگرچہ وہ حویلی کے مکینوں میں شاید سب سے کم حیثیت اور اختیارات کی مالک تھی لیکن تھی تو بہرحال حویلی کی بہو اور وہ بھی اس وقت ایسے کروفر سے بات کر رہی تھی کہ اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فوراً ہی ایک گاڑی ڈاکٹر کو لانے کے لیے روانہ کی گئی اور عورت کو ایک چادر میں لپیٹ کر دوسرے کمرے میں منتقل کیا گیا۔ چودھری اس دوران بالکل خاموش کھڑا رہا۔

''آج تو تو اپنے پیروں پر کھڑا ہے چودھری لیکن اس دن سے ڈر جب قدرت تجھ سے تیری سیاہ کاریوں کا انتقام لینے پر تل جائے گی۔'' فریدہ نے اسے دہکتی نظروں سے گھورتے ہوئے نفرت سے کہا اور ایک جھٹکے سے کمرے سے باہر نکل کر اوپری منزل کی طرف بڑھ گئی۔ یہاں اس کا کردار ختم ہو چکا تھا اور اب یہ اس عورت کی قسمت پر منحصر تھا کہ وہ زندہ بچتی ہے یا نہیں۔

مرکز صحت سے ڈاکٹر اور ڈرائیور کے ساتھ حویلی پہنچے تو زخمی طوائف آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی سی کوشش کی لیکن اس کی ٹوٹتی سانسوں کی ڈوری کو دوبارہ نہ...

جوڑے۔

"یہ ختم ہوگئی ہے۔" انہوں نے اپنے پیچھے کھڑے منشی کو اطلاع دی اور واپسی کے لیے کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے انہیں یہ سمجھنے میں قطعی مشکل نہیں ہوئی تھی کہ اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حویلی میں جنم لینے والی کہانیاں حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی دفن کر دی جاتی ہیں اور انہیں قطعی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ حویلی والوں کو اس کیس کو پولیس تک لے جانے کا مشورہ دے سکیں۔ ان کے واپس جاتے ہی باقی کے معاملات منشی نے سنبھال لیے۔ فوراً ہی حویلی کی ملازماؤں کی مدد سے عورت کو غسل دے کر اس کی لاش کو کفن میں لپیٹ دیا گیا اور صبح ہونے سے پہلے ہی اس نائیکہ کو حویلی بلا لیا گیا جس کے کوٹھے سے وہ عورت منگوائی گئی تھی۔ اپنی ایک ساتھی کی موت کی خبر سن کر وہ بری طرح بپھر گئی۔

"جو ہونا تھا وہ ہوگیا بائی جی۔ ہمیں معلوم ہے تمہارا بڑا نقصان ہوا ہے اور ہم اس نقصان کی ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تم قیمت بولو۔ ہم بغیر کسی اعتراض کے ادا کر دیں گے۔" منشی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا اور دوٹوک لہجے میں پیشکش کی۔ نائیکہ تجربہ کار تھی اور ایسے مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا جانتی تھی چنانچہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بڑے درد بھرے لہجے میں بولی۔

"انسان کا بھی کبھی کوئی مول ہوا ہے منشی جی اور یہ تو میرے کوٹھے کا سب سے انمول ہیرا تھا جو آپ لوگوں نے برباد کر دیا۔"

"کہا ہے نا کہ اس ہیرے کی قیمت بتاؤ۔ تم جو مانگو گی ادا کیا جائے گا۔" منشی کو بھی ہر حال میں یہ معاملہ نمٹانا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں چودھری ایسے کسی اسکینڈل کو سہارنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

"صرف میری گل تو نہیں ہے نا منشی جی۔ اس کا ایک بھائی بھی ہے جو میرے کوٹھے پر ہی طبلہ بجاتا ہے۔ وہ بھلا کیسے اپنی بہن کی قیمت لینے پر راضی ہوگا؟" نائیکہ نے فوراً مظلوم شکل بنالی۔

"کیسے راضی نہیں ہوگا۔ جو آدمی اپنی بہن کو ہر رات نئے آدمی کی سیج سجانے کی قیمت وصول کرسکتا ہے، وہ اس کے مردہ جسم کی قیمت کیسے وصول نہیں کرے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں ایسے خونی رشتوں کو۔ تمہارے ہاں ہر چیز بکاؤ ہوتی ہے پھر بھی اگر اس کا بھائی کوئی اعتراض کرے تو اسے اچھی طرح سمجھا دینا کہ اس کے پاس کوئی دوسری چوائس نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ موقع کا فائدہ اٹھا کر قیمت وصول کرے ورنہ بعد میں رونے پیٹنے کے سوا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔" منشی نے سختی کی راہ دکھائی تو نائیکہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد سر ہلا کر ایک بہت بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا۔ اس کا مطالبہ سن کر منشی کچھ دیر تک خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔

"اپنے یار کھرے ہو منشی جی میں نے یہ رقم بتائی۔ اپنا نقصان پورا کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس رقم سے اس کے بھائی کو بھی تو حصہ دینا پڑے گا ورنہ وہ اپنا منہ کیسے بند رکھے گا۔" وہ بھی جانتی تھی کہ رقم بہت بڑی ہے اسی لیے منشی کی خاموشی پر اپنے حق میں دلیل دینے لگی۔

"میں اور تو دونوں ہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ تو جو مانگ رہی ہے وہ تیری اوقات سے بہت زیادہ ہے لیکن میں نے تجھے زبان دے دی ہے اس لیے اطمینان رکھ کہ تیرا مطالبہ ضرور پورا ہوگا۔ اب یہاں سے اٹھ اور لاش لے کر یہاں سے روانہ ہو جا۔" منشی نے سخت لہجے میں اسے جواب دیا۔ وہ خوشی سے اپنی باچھیں کھل جانے سے بمشکل روک سکی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس وقت وصول ہونے والی رقم اتنی زیادہ ہے جو وہ طوائف ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی اسے کما کر نہیں دے سکتی تھی۔ رہا اس کے بھائی کا مسئلہ تو کوٹھے پر بے دام غلام بن کر کام کرنے والا وہ سولہ سترہ سالہ لڑکا بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ وہ سیدھا سادہ جوان وقت کی روٹی کے لیے بھی اس کا محتاج تھا۔

کچھ دیر بعد وہ لاش کے ساتھ حویلی سے خاموشی سے روانہ ہوگئی۔ زرتار لباس میں سج سنور کر چودھری کا دل جیتنے کی خواہش سینے میں لے کر آنے والی طوائف کو کہاں علم تھا کہ جب وہ اس حویلی سے واپس لوٹے گی تو اپنی زندگی کی بازی ہار کر سفید کفن میں لپٹی واپس جارہی ہوگی۔ اور یہاں میں آنے والے کسی شخص کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ واپسی پر اپنے ساتھ کیا لے کر لوٹے گا۔ وہ تو بس دنیا جیت لینے کی خواہش میں یہاں رائج اصولوں کی تال پر کسی لٹو کی طرح دیوانہ وار ناچتا رہتا ہے اور جب یہ رقص رکتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ پیروں میں چبھے کانٹوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔

☆☆☆

ممبئی ریلوے اسٹیشن پر اتر کر وہ دونوں باہر آئے تو فوراً ہی ایک ٹیکسی ان کے سامنے آرکی۔

"شیواجی ہوٹل۔" سلو نے اسے بتایا۔ ممبئی کا

شہر تھا اور یہاں کے بارے میں وہ خاصی معلومات رکھتا تھا۔ سفر کے دوران اسی نے مشورہ دیا تھا کہ اگر ممبئی پہنچ کر شیواجی ہوٹل میں قیام کیا جائے تو مناسب رہے گا۔ اس لیے اسٹیشن سے نکلتے ہی ٹیکسی والے سے اس ہوٹل کا نام بتا کر وہ دونوں ٹیکسی میں سوار ہوگئے۔ سلو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اپنی طرف کا دروازہ بند بھی نہیں کر پایا تھا کہ [illegible] دروازے سے کوئی مطلوبہ کی طرح ٹیکسی میں گھس آئی اور تیزی سے اپنی طرف کا دروازہ بند کر لیا۔

"کون ہو تم؟" اس کی اس جرأت پر سلو نے [illegible] پوچھا۔

"مجھے انڈو کہتے ہیں۔ تم لوگ شیواجی جارہے ہو تو میں نے سوچا تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ ایک ہی جانب تک ٹیکسی کیا کروں گی۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا اور ایسے دوستانہ لہجے میں بتا رہی تھی جیسے ان سے برسوں کی آشنائی ہو۔

"پر ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے۔ تمہیں چوکٹ کی ٹیکسی چاہیے تو کوئی اور بندہ تلاش کرو۔" سلو کو طیش آگیا۔

اس دوران میں ٹیکسی ڈرائیور اور شہریار دونوں خاموش رہے تھے۔ ڈرائیور شاید اس لیے کہ یہ اس کا معاملہ نہیں تھا اور شہریار اس لیے کہ وہ خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی متناسب جسامت کی مالک تھی اور اس نے پتلی جینز پر ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے شانوں تک آتے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک کے علاوہ اس نے کسی قسم کا سنگھار نہیں کر رکھا تھا۔ البتہ اپنے جاذب نقوش کی وجہ سے وہ عام میں اچھی لگ رہی تھی لیکن پھر بھی اس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ مردوں کو پھانسنے کے لیے گھر سے نکلنے والی کوئی پیشہ ور عورت نہیں تھی۔ سیدھے سادے حلیے کے باوجود وہ کچھ مختلف اور منفرد لگ رہی تھی۔

"تم تو بڑے ال مینرڈ آدمی ہو خیر جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے اپنے جسم کو یوں جنبش دی جیسے ٹیکسی سے اترنے والی ہو لیکن پھر ایک جھٹکے میں اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک ننھا سا پسٹل نکال لیا۔

"چلو اب شرافت سے چل پڑو۔" اس نے پسٹل سلو سے لگا کر حکم دیا تو وہ کچھ اور بھی طیش میں نظر آنے لگا لیکن یوں ہوا کہ پسٹل کی پروا کیے بغیر اندو نامی اس لڑکی پر جھپٹ پڑے گا۔ اس کی اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے شہریار نے [illegible] اسے کوئی احمقانہ حرکت کرنے سے باز رہنے کا اشارہ کیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔ وہ پہلے ہی انجن اسٹارٹ کر چکا تھا چنانچہ فوراً ہی گاڑی چلا دی۔

"مجھے صرف تم سے لفٹ چاہیے تھی۔ اگر تم ویسے ہی مان جاتے تو مجھے پسٹل نکالنا نہ پڑتا۔ تمہیں دھمکی دینے پر مجبور ہونے کی وجہ سے معذرت خواہ ہوں۔" اس نے سلو سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں لفٹ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کرائے کا پرابلم تو ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ تو میں مان نہیں سکتا کہ اتنا مہنگا پسٹل رکھنے والی کا پرس خالی ہوگا۔" سلو نے بھی اس دوران اپنے آپ کو کسی حد تک پرسکون کرلیا تھا چنانچہ اپنے تجسس کو زبان دی۔

"لگتا ہے اسلحے کے بارے میں خاصی جانکاری رکھتے ہو۔ کس گروپ کے بندے ہو؟" اس کے سوال میں سے اپنے مطلب کا نکتہ چن کر اس نے الٹا سلو پر سوال داغا۔ اس سوال سے اسے اندازہ ہوا کہ لڑکی خطرناک ہے اور اس سے زیادہ بات چیت کرنا مشکل میں بھی ڈال سکتا ہے اس لیے بنا جواب دیے چہرہ دوسری طرف موڑ کر اردگرد سے گزرتے ٹریفک کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی اس ادا پر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی ضرور لیکن پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ یہاں تک کہ شیواجی ہوٹل تک پہنچ کر ان کا سفر ختم ہوگیا۔ ٹیکسی رکنے پر اس نے اترنے سے پہلے اپنا پرس کھول کر اس میں سے چند نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کی طرف اچھالے اور پھر اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے سلو سے مخاطب ہو کر بولی۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھے پیسوں کا کوئی پرابلم نہیں ہے پھر بھی تھینکس فار دی لفٹ۔" وہ جیسے آندھی کی طرح ان کی ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی، ویسے ہی اپنی بات کہہ کر آناً فاناً ٹیکسی سے اتری اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

"لڑکی تھی یا کوئی چھلاوا؟" ٹیکسی ڈرائیور بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ان دونوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے شانے اچکا کر خود بھی ٹیکسی سے اتر گئے۔

اس وقت وہ دونوں ہی نفاست سے سلے قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں سفری بیگ کے بجائے اچھی کوالٹی کے بریف کیس تھام رکھے تھے۔ حلیے میں یہ تبدیلی انہوں نے سفر کے دوران کی تھی۔ اب کوئی انہیں دیکھتا تو یہی اندازہ لگاتا کہ وہ معزز کاروباری افراد ہیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے بھی خوش اخلاقی سے ان کا استقبال کیا اور ان کی مرضی کے مطابق انہیں دو سنگل بیڈ والے کمرے فراہم کر دیے۔ کمروں

کے حصول کے لیے انہیں کوئی دشواری اس لیے بھی پیش نہیں آئی کہ اب ان کے پاس مکمل شناختی کاغذات موجود تھے جن کی موجودگی میں ہوٹل کی انتظامیہ کو انہیں کمرے فراہم کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ کمرے مل جانے پر انہوں نے سب سے پہلے فریش ہو کر کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ انہیں کہاں سے باقاعدہ کام کا آغاز کرنا ہے، اس سلسلے میں کچھ معلومات دہلی میں ہی حاصل ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر فرحان جمیل کی تلاش کا آغاز انہوں نے اس انسپکٹر سے کرنے کا فیصلہ کیا جس نے ان پر الزام لگنے کے بعد انہیں گرفتار کیا تھا، اور بعد میں کیس کا رخ موڑ کر انہیں پاکستانی جاسوس قرار دے دیا تھا۔ انہیں ملنے والی اطلاعات کے مطابق وہ انسپکٹر اب نہ صرف ترقی پا چکا تھا بلکہ ایک چھوٹے علاقے سے ممبئی جیسے شہر ٹرانسفر کیا جا چکا تھا۔ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ معنی خیز تھیں۔ فرحان جمیل کے کیس پر کام کرنے کے بعد اگر انسپکٹر پریم ناتھ کی جیبیں بھی نوٹوں سے بھر گئی تھیں تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہوتی لیکن یہاں تو انعام کچھ سوا ہی ملا تھا۔ ایک طرف ترقی ہوئی تھی تو دوسری طرف وہ ممبئی جیسے شہر پہنچ گیا تھا جہاں یقیناً دن دوگنی اور رات چوگنی کمائی کھا رہا تھا۔

غسل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھا لیا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور بھی چلا۔ ابھی ان کے پاس خاصا وقت تھا اس لیے ہر کام اطمینان سے کر رہے تھے۔ حاصل شدہ معلومات کے مطابق پریم ناتھ عموماً رات گیارہ بجے کے بعد اپنے گھر سے نکل کر روزانہ ایک نائٹ کلب جایا کرتا تھا اور یہ ایسا وقت ہوتا تھا جب اس کے ساتھ ایک سپاہی کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ انہیں یہ معلومات ممبئی میں پہلے سے مقیم اپنے ایک آدمی سے حاصل ہوئی تھیں۔ دہلی کی طرح یہاں وہ شخص ان کی مدد کے لیے موجود تھا۔ اس کی ذمے داری تھی کہ وہ ضرورت پڑنے پر انہیں مطلوبہ اسلحہ اور محفوظ ٹھکانا فراہم کرے۔ اپنے طور پر وہ کافی عرصے سے پریم ناتھ کی نگرانی بھی کر رہا تھا لیکن اسے براہِ راست چھیڑنے کا مجاز نہیں تھا۔ اسے ممبئی میں رہ کر ایک عرصے تک اپنی مخصوص خدمات انجام دینی تھیں اس لیے اس کے نظروں میں آنے کا خطرہ نہیں مول لیا جا سکتا تھا۔ ان کی پشت پر رہ کر وہ ان کی جتنی مدد کر سکتا تھا کرتا لیکن اصل ایکشن انہیں ہی لینا تھا۔

کھانے کے دوران میں وہ اپنا لائحہ عمل طے کر چکے تھے۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد انہیں کہیں سے ایک کار، موٹر بائیک چرانی تھی۔ ان چوری شدہ سواریوں میں ہی، ناتھ کے اغوا کی مہم پر نکلتے اور اسے لے کر اس ٹھکانے جاتے جو پہلے ہی اس مقصد کے لیے حاصل کیا جا چکا تھا۔ طور پر ان کی منصوبہ بندی مکمل تھی اور وہ اس مہم پر نکلنے والے تھے کہ وہ ہو گیا جس کی انہیں قطعی توقع نہیں تھی۔

کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک کے ساتھ روم سروس کے الفاظ سن کر دروازہ کھول دیا گیا۔ جانے والا سوگمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں روم سروس کے بجائے چند مسلح افراد سے سامنا کرنا پڑے گا۔ اس نے پورے اطمینان سے بغیر کسی احتیاطی تدبیر کے صرف دروازہ کھول دیا تھا کہ چند منٹ قبل خود اس نے انٹر کام پر سروس سے رابطہ کر کے برتن لے جانے کو کہا تھا۔ لیکن تین مسلح افراد اسے دھکیلتے ہوئے کمرے کے اندر گھس آئے تھے۔

”کون ہو تم لوگ؟“ دونوں ٹانگیں پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا شہریار بھی اس افتاد پر بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ تمہیں ہمارے ساتھ چلنے پر معلوم ہو گا۔“ ان میں سے ایک نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن کیوں... ہم تمہارے ساتھ کیوں جائیں گے؟ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟“ بحث میں الجھ کر شہریار ایک طرف تو ان کا جائزہ لے رہا تھا اور دوسری طرف اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر کس زاویے سے ان پر حملہ کر کے اپنا بچاؤ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے حلیوں، بول چال سے وہ کوئی سرکاری آدمی نہیں لگتے تھے بلکہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی گینگ سے متعلق ہیں۔ گینگ کا خیال آنے پر فطری طور پر اس کا ذہن نادر دادا کی طرف چلا گیا۔ دہلی میں عائشہ نامی جس ویٹریس کو بچانے کے لیے وہ نادر دادا کے غنڈوں سے جھگڑ بیٹھے تھے، اس نے انہیں یہی بتایا تھا کہ دو اجنبیوں کے ہاتھوں اپنے گرگوں کی وہ شکست اس کے لیے سخت بے عزتی کا باعث بنی ہوگی اور وہ اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے ان سے انتقام لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ وہ غیر ضروری مسئلوں میں نہیں الجھنا چاہتے تھے اس لیے دادا کی انتقامی کارروائی سے بچنے کے لیے فوری طور پر وہاں سے فرار ہو کر ممبئی پہنچ گئے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر انہیں یہاں پہنچ کر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ گھیر لیا گیا تھا۔ ان تینوں مسلح افراد کی مشاقی ان کے کھڑے ہونے کے انداز، اسلحے پر گرفت اور نظروں کی تیزی سے بخوبی ظاہر ہو رہی تھی۔ انہوں نے اتنی مہارت سے ان دونوں کو کور کیا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی ذرا سی حرکت کرتا تو نظر میں آئے بغیر نہ رہتا۔

”تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب بھائی جی کے سامنے پہنچ کر ملیں گے۔ ہمیں صرف اتنا حکم ہے کہ تمہیں یہاں سے ان تک پہنچا دیا جائے۔ اب یہ تم پر ہے کہ سیدھے طریقے سے چلتے ہو یا ہم تمہاری ٹانگیں توڑ کر اپنے کندھوں پر لاد کر لے جائیں۔“ اسی شخص نے اسے جواب دیا جو اب تک گفتگو کر رہا تھا۔ شہریار نے ایک نظر سلو کی طرف دیکھا۔ وہ اس انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اسے سلو اور اپنی مہارت پر کوئی شبہ نہیں تھا اور جانتا تھا کہ بے شک اس وقت وہ بری طرح گھرے ہوئے ہیں اور ان کا اسلحہ بھی بریف کیس میں بند ہے، اس کے باوجود یہ ناممکن نہیں کہ وہ دونوں مل کر ان تینوں کو زیر کر لیں لیکن ابھی صورت حال مکمل طور پر ان پر واضح نہیں تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ کمرے میں موجود ان تین مسلح افراد کے علاوہ ان کے کتنے ساتھی ہیں جو باہر مدد کے لیے موجود ہیں۔ پھر دوسری بات یہ تھی کہ وہ اس وقت ایک اچھے ہوٹل کے کمرے میں موجود تھے۔ ان کے کمرے تک پہنچنے والے مسلح افراد اتنی طاقت اور رسائی والے تو ہو سکتے تھے کہ ان کے یوں دندناتے ہوئے ہوٹل میں گھس آنے اور دو مہمانوں کو بزورِ اسلحہ اغوا کر کے لے جانے پر ہوٹل کی انتظامیہ خاموش رہتی لیکن یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ان غنڈوں کو زیر کر کے ہوٹل سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے تو انتظامیہ پولیس کو آگاہ نہیں کرتی اور وہ پولیس کی نظروں میں کسی صورت نہیں آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس نے سلو کو مطمئن رہنے اور کچھ نہ کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ پا کر وہ ریلیکس ہو گیا اور یوں شانے اچکائے جیسے اسے اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو کہ یہاں سے نکال کر کس جگہ لے جایا جائے گا۔

”ٹھیک ہے، ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کے بعد تمہیں اس بات کا احساس ہو گا کہ تم غلط آدمیوں کو لے گئے ہو۔“ اس نے اپنے سامنے کھڑے مسلح افراد کو اپنے بنا مزاحمت کے ساتھ چلنے کا عندیہ دیا تو انہیں آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ حکم دینے والوں نے ان کے ہاتھ اوپر نہیں اٹھوائے تھے اور نہ ہی باندھنے وغیرہ کی کوشش کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اپنے اوپر بھرپور اعتماد تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے سامنے کسی کی اتنی مجال نہیں ہو سکتی کہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر سکے۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے تو شہریار کو اپنے فیصلے کی درستی کا اندازہ ہوا۔ کمرے سے نکلتے ہی انہیں کوریڈور میں چوکس کھڑا ایک مسلح فرد نظر آ گیا۔ دو کو انہوں نے لفٹ سے نیچے جانے کے بعد ہال میں دیکھا۔ وہاں ہوٹل کا عملہ اور کچھ گاہک بھی موجود تھے اور خاصے سراسیمہ نظر آتے تھے۔ وہ باہر نکلے تو ایک تاریک شیشوں والی گاڑی اور دو تین موٹر سائیکلیں ان کی منتظر تھیں۔ انہیں گاڑی میں سوار کروا کر دو افراد ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے جبکہ تیسرا ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر براجمان ہو گیا۔ گاڑی میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا اور گاڑی اسٹارٹ بھی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے اسے تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ پیچھے موٹر

سائیکلیں بھی غراتی ہوئی آگے بڑھیں۔

یہ صورت حال بڑی عجیب تھی۔ وہ جس گاڑی میں سوار تھے، اس میں جدید اسلحے سے لیس تین افراد بالکل چوکس بیٹھے تھے۔ چوتھا فرد ڈرائیور تھا اور یقینی طور پر وہ بھی مسلح تھا۔ وہ کسی طور گاڑی میں موجود ان افراد پر قابو پا بھی لیتے تو ان موٹر سائیکل سواروں کا کیا کرتے جو گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اگر وہ گاڑی میں کوئی الٹی سیدھی حرکت محسوس کرتے تو ان کی گنوں کے دہانے شعلے اگلنے لگتے۔ وہ یہ جانے بغیر کہ کس جرم کی پاداش میں پکڑے گئے تھے، اپنی جان سے چلے جاتے۔ ایسی موت مرنے سے یہی بہتر تھا کہ وہ کچھ انتظار کر لیتے کہ شاید تقدیر کوئی بہتر موقع عنایت کر دے۔

ابھی تو وہ بالکل نہتے تھے اور ان کے پاس موجود ہتھیار ان بریف کیسوں میں بند تھے جو اگلی سیٹ پر بیٹھے شخص کے قدموں میں پڑے تھے۔ انہیں ان کے کمرے سے نکال کر لاتے ہوئے انہوں نے ان کے بریف کیس بھی ساتھ لے لیے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ہوٹل میں الگ الگ کمرے لینے کے باوجود وہ دونوں نہ صرف کھانے کی غرض سے ایک کمرے میں جمع تھے بلکہ انہوں نے اپنے بریف کیس بھی ساتھ رکھے تھے۔ بریف کیس مخصوص نمبروں سے کھلنے والے تھے اس لیے فوری طور پر تو یہ خدشہ نہیں تھا کہ انہیں کھول لیے جانے کی صورت میں ان کی ذات کچھ زیادہ مشکوک ٹھہرے گی لیکن فی الحال وہ خود بھی استفادہ حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

موٹر سائیکلوں کی جلو میں گاڑی انہیں لیے نہ جانے کس سمت دوڑی چلی جا رہی تھی۔ کچھ فاصلہ طے ہوا تو اگلی سیٹ پر بیٹھے شخص نے کسی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، دیکھو کیا پوزیشن ہے؟ کوئی نظر تو نہیں آ رہا؟"

"ٹھیک ہے۔ مجھے تو کوئی دکھائی نہیں پڑا۔ موٹر سائیکل والو ادھر سے۔ اب انہیں بھائی جی کے پاس لے کر پہنچیں۔"

اس نے یہ جملے کس سے کہے تھے، انہیں اس کا اندازہ کچھ دیر میں اس وقت ہوا جب گاڑی کے پیچھے چلتے ہوئے موٹر سائیکل سواروں کو ایک ایک کر کے غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔

"تم لوگ آخر ہمیں کیوں اور کس بھائی جی کے پاس لے جا رہے ہو؟ ہم سیدھے سادے کاروباری لوگ ہیں۔ ہمارا کسی جھگڑے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔" موٹر سائیکل سواروں کے غائب ہوتے ہی شہروز نے ... کی کوشش میں گفتگو کا آغاز کیا۔ کچھ دیر میں وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ انہیں ہوٹل کے کمرے سے اٹھوانے میں

انڈر ورلڈ کے کسی غنڈے کا ہاتھ ہے لیکن ظاہر ہے وہ جھگڑے میں پھنسنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے کوشش تھی کہ کسی طرح ان لوگوں سے پیچھا چھڑا لیں۔ انہیں باتوں میں لگانے کی صورت میں یہ کوئی موقع تھا جب اسے اور سلو کو ایکشن میں آنے کا موقع مل جاتا۔ موٹر سائیکل سواروں کے غائب ہونے کے بعد ایک امید بندھ گئی تھی کہ اگر وہ کسی طرح گاڑی میں موجود لوگوں سے نمٹنے میں کامیاب ہو گئے تو یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔

"بولا تھا نا کہ بھائی جی کے سامنے پہنچ کر سب پتا چل جائے گا پھر کیوں میرے کان کھا رہا ہے۔" اگلی سیٹ پر بیٹھے شخص نے اکھڑ پن سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"دیکھو اگر تم پیسے وغیرہ کے چکر میں ہمیں لے جا رہے ہو تو سمجھ لو کہ ہم کوئی بہت بڑے بزنس مین نہیں، بس چھوٹا سا بیوپار ہے۔ تم نے ہمارے گھر والوں سے تاوان منگا بھی تو وہ دو چار لاکھ سے زیادہ کا بندوبست نہیں کر سکیں گے۔" اس شخص کے لہجے کی پروا کیے بغیر شہروز نے اس سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا جس پر وہ تلملا اٹھا اور پلٹ کر غصے سے بولا۔

"سالے! تجھے بولا ہے نا چپ رہ۔ پھر کیوں بک بک کیے جا رہا ہے؟"

"بڑے بھائی سے گالی دے کر بات مت کرو ورنہ میں تمہاری ان گنوں کی پروا کیے بغیر تمہارا گلا دبا دوں گا۔" سلو کا ذہن بہت تیز تھا۔ اس نے بھانپ لیا کہ شہروز کیا چاہ رہا ہے اس لیے اس کا ساتھ دینے پر کمربستہ ہو گیا اور بات کی کہ اس شخص کے اشتعال میں مزید اضافہ ہو جائے۔ تب تک طے ہو چکا تھا کہ وہ لوگ انہیں کسی بھائی جی کے پاس زندہ لے جانے کے پابند ہیں اس لیے مشتعل ہونے کی صورت میں بھی زیادہ سے زیادہ انہیں زخمی یا بے ہوش کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن جان سے نہیں مارا جاتا... وہ ان کے پاس اپنی جان کی سلامتی کی ضمانت تھی تو خطرہ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"گلا دبائے گا... میرا گلا دبائے گا؟ میں تیرے جسم کی ہڈیوں کے اتنے ٹکڑے کر دوں گا کہ تیرے باپ سے گنے بھی نہیں جا سکیں گے۔" حسب توقع وہ سخت مشتعل ہو گیا اور پیچھے مڑ کر سلو پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ ان دونوں کے درمیان بیٹھے ہوئے اس کے آدمیوں کو بھی یہ جسارت ناگوار گزری تھی اس لیے اس کے چہرے ... [illegible]

مبدل ہوگئی تھی۔ ایسے میں جب ان کی چلتی گاڑی کے عین سامنے کچھ فاصلے پر دھماکا ہوا تو کوئی بھی خود کو سنبھال نہیں سکا اور سڑک پر روانی سے دوڑتی گاڑی بُری طرح لہرا گئی۔ دھماکے کی نوعیت کیا تھی اور کس نے اور کیوں یہ دھماکا کیا تھا، سلو اور شہریار کے پاس ان سوالوں میں الجھنے کی فرصت نہیں تھی۔ انہیں ایک موقع ملا تھا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کر سکتے تھے۔ آگے والا تو پہلے ہی اس وجہ سے مشکل میں پھنس گیا تھا کہ سلو پر مڑ کر حملہ کرنے کی کوشش میں اس کا زاویہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ دھماکے کی وجہ سے گاڑی کا توازن بگڑا تو اسے زوردار جھٹکا لگا اور اس کا سر دروازے سے جا ٹکرایا۔ ڈرائیور لہراتی گاڑی کو سنبھالنے کی فکر میں ہلکان تھا اس لیے انہیں بس ان دو سے ہی نمٹنا تھا جو ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ اگرچہ گاڑی کو جھٹکا لگنے سے وہ دونوں خود بھی کسی قدر متاثر ہوئے تھے لیکن درمیان میں پھنس کر بیٹھے ہونے کی وجہ سے ان کا توازن زیادہ نہیں بگڑا تھا چنانچہ وہ خود کو سنبھال کر اپنی اپنی طرف موجود بندوں سے بھڑ گئے۔ اس موقع پر انہیں ایک بار پھر غیبی مدد ملی اور گاڑی جس پر ڈرائیور کسی حد تک قابو پا چکا تھا، ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دوبارہ ڈگمگائی۔ اس کے ساتھ ہی فوراً ہی ایک اور دھماکا سنائی دیا اور گاڑی رک گئی۔ ان کے کان موخر الذکر دونوں دھماکوں کی نوعیت کو شناخت کر سکتے تھے۔ یہ گاڑی کے ٹائروں کے پھٹنے کے نتیجے میں گونجنے والے دھماکے تھے جن کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کہیں سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد میں آ کر پھٹے ہیں۔

گاڑی رکتے ہی ڈرائیور اور اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر موجود شخص نے باہر کی طرف چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگاتے ہوئے ان کی کوشش تھی کہ خود کو دروازے کی اوٹ میں رکھیں لیکن ان کی قسمت خراب تھی کہ ان کی توقع کے خلاف پیچھے سے دو برسٹ چلے اور ان دونوں کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ اصل میں اب تک ہونے والی کارروائی کے نتیجے میں انہوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ حملہ آور سامنے کے رخ پر موجود ہیں لیکن وہ پیچھے بھی موجود تھے اور ان کو غلط فہمی میں رکھ کر بڑی آسانی سے لقمۂ اجل بنا دیا تھا۔ ادھر پیچھے والے افراد پر سلو اور شہریار آفت بن کر ٹوٹے ہوئے تھے۔

سلو نے اپنے مقابل کے چہرے پر تابڑ توڑ مکے برسا کر اس کی ناک کی ہڈی توڑنے کے ساتھ ساتھ ہونٹ بھی پھاڑ ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک آنکھ بھی مضروب نظر آ رہی تھی۔ جواب میں اس نے بھی ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی تھی اور پہلے گھونسے کے بعد ہی سلو کے شانے پر سے ایک زوردار ضرب لگائی تھی لیکن اس کے بعد موقع نہیں ملا۔ سلو نے نہ صرف اسے گن سے محروم بلکہ اتنی ٹھکائی بھی لگا دی تھی کہ اگر اسے باہر گولیوں کا ... ہوتا تو وہ خود اسے چھوڑ کر گاڑی سے نکل بھاگتا۔ بہرحال تو مقابلے پر ڈٹے رہنے کے سوا اس کے پاس کوئی ... تھا چنانچہ کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ چلانے کی کوشش ... تھا۔ اس مقابلے میں شہریار اس اعتبار سے خوش قسمت ... ہوا تھا کہ اس کے حصے میں آنے والے آدمی کی گن ... وجہ سے پہلے ہی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ بلا ... خطر اس سے مقابلہ کر رہا تھا۔ البتہ وہ شخص دوسرے ... مقابلے میں ذرا زیادہ سخت جان تھا۔ شہریار نے موقع ... اس کے آگے کے بال جکڑ کر اس کا سر دروازے پر ... ضرب کی شدت کی وجہ سے اس کا سر پیچھے سے کھل گیا ... مقابلے پر ڈٹا رہا اور اپنی انگلیوں سے اس طرح شہریار ... جکڑ لیا کہ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مقابل ... اس داؤ سے خود کو نکالنے کے لیے اس نے ایک بار پھر دو ... ہاتھوں سے اس کے بال جکڑ کر اس کا سر دروازے پر ... کی کوشش کی لیکن پہلے کی طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ وجہ ... کہ اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھاتا ہی جا رہا تھا جس کی وجہ ... شہریار کے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اس سے قبل کہ ... کے حواس جواب دے جاتے، اسے ایک ترکیب سوجھی اس نے مقابل کے سر پر اس مقام پر دونوں ہاتھوں سے ضربیں لگانی شروع کر دیں جہاں سے اس کا سر چوٹ کھا کر پھٹ گیا تھا۔ زخمی جگہ پر لگائی جانے والی ان ضربوں نے ... بلبلا اٹھا اور شہریار کے گلے پر اس کی گرفت قدرے کمزور ... گئی۔ اگر اس وقت وہ لوگ گاڑی کی محدود فضا کے بجائے کھلی جگہ پر ہوتے تو ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پیروں سے ... لینے کا بھی موقع مل جاتا لیکن فی الحال تو ہر ایک ہی عمل لڑنے سے قاصر تھا۔

"تم چاروں گاڑی سے باہر نکل آؤ اور یاد رکھنا ... کسی نے بھی اُلٹی سیدھی حرکت کی تو سیدھا اوپر پہنچا دیا جائے گا۔" اس سے قبل کہ اندر جاری کشمکش کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوتی، دائیں بائیں سے دروازے کھولے گئے ... دو گن بردار ان کے سروں پر آ کھڑے ہوئے۔ اس موقع ... سلو کے مقابل کی عجیب مضحکہ خیز حالت ہو گئی۔ عین اس وقت جب دروازہ کھولا گیا، سلو نے اسے ایک اور زوردار مکا ... کر دیا۔ مکا کھا کر وہ پیچھے کی طرف، ان تو دروازہ کھلے ... نیچے میں اس کا آدھا جسم گاڑی سے باہر لٹک گیا جبکہ ٹانگیں ... ہی پھنسی رہیں۔ سلو نے نیچے اترنے کا راستہ بنانے کے ... اسے ٹانگ سے ضرب لگاتے ہوئے نیچے دھکیلا اور پھر ... بھی اتر گیا۔ اس دوران میں شہریار اور اس کا مقابل بھی ... طرف سے اتر چکے تھے۔

سلو اور شہریار کو معلوم نہیں تھا کہ اچانک حملہ کرنے والے لوگ کون تھے اور وہ ان کے ساتھ کس طرح پیش آتے۔ لیکن فی الحال تو ان کی ہدایت پر عمل کیے بغیر چارہ نہیں تھا چنانچہ انہوں نے فوری عمل کیا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد جب انہیں اردگرد کا جائزہ لینے کی فرصت ملی تو معلوم ہوا ... اس وقت وہ کسی بارونق سڑک کے بجائے کسی رہائشی کالونی کی ذیلی سڑک پر ہیں۔ اس سڑک پر سے ظاہر ہے ... رہنے والوں کے سوا مشکل سے ہی کوئی گزرتا ہو گا اس ... یہ سڑک سنسان پڑی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اگر ان کی گاڑی ... کے پیچھے بھی کوئی گاڑی موجود ہوتی تو ہنگامہ شروع ہونے کی صورت میں اس کا ڈرائیور وہیں سے اسے بھگا لے گیا ہو ... کیونکہ پاکستان ہو یا انڈیا، دونوں جگہ یہ رویہ عام تھا کہ ... کسی جھگڑے میں الجھنے یا اس کے گواہ بننے کے مقابلے میں موقع سے غائب ہو جانا سب سے زیادہ بہتر سمجھتے تھے اور ... اس کی وجہ مشترک تھی۔ عام آدمی کے ساتھ پولیس کا ناروا سلوک... دونوں ہی ممالک میں مجرموں سے زیادہ بے قصور ... کو ستانے اور پھنسانے کا کلچر عام تھا اس لیے عام آدمی پولیس کے معاملے میں ملوث نہ ہونے ہی کو سب سے بہتر سمجھتا تھا۔

"تم دونوں اس گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ۔" وہ نیچے اترے تو انہیں گھیرنے والوں میں سے ایک نے سلو اور شہریار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں ذرا فاصلے پر کھڑی ایک بڑی گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل کرانے کے لیے ایک مسلح شخص ان کے سر پر سوار ہو گیا چنانچہ انہیں قدم اٹھانے پڑے۔ وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ فائرنگ کی زوردار آواز کے ساتھ انسانی چیخیں سنائی دیں۔ انہیں یہ سمجھنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ بچ جانے والے باقی دو افراد کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔

"جلدی چلو، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔" ان پر گن تانے پیچھے آتے شخص نے غراتی آواز میں حکم دیا تو انہوں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ معلوم نہیں یہ نئے حملہ آور کون تھے؟ وہ تو ابھی یہی نہیں سمجھ پائے تھے کہ بھائی ... نامی ... والے شخص کے غنڈوں نے انہیں ہوٹل سے کیوں ... کیا ... اب تیسری پارٹی میدان میں کود پڑی اور اب شاید وہ ...

ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں جا رہے تھے۔

"ہری اپ، اندر آ جاؤ۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔" اگرچہ وہ گن پوائنٹ پر گاڑی کی طرف بڑھنے پر مجبور تھے لیکن ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ خیال بھی موجود تھا کہ موقع ملتے ہی یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ اس خیال پر عمل پیرا ہونے کی نوبت آنے سے پہلے ہی گاڑی میں سے ایک نسوانی چہرے نے جھانک کر انہیں پکارا تو وہ نہ صرف حیران ہوئے بلکہ کچھ بھی کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھے اور اندر بیٹھ گئے۔

"چلو، اس سے پہلے کہ بھائی جی کے آدمی یہاں پہنچیں ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔" ان کے بیٹھتے ہی گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور اسی لڑکی نے تیز لہجے میں کہا جو ان کے شرافت سے گاڑی میں بیٹھنے کا سبب بنی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ممبئی ریلوے اسٹیشن سے نکلنے کے بعد زبردستی ان کی ٹیکسی میں سوار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا نام اندو بتایا تھا اور وہ اب بھی انہی کپڑوں میں ملبوس تھی جن میں انہوں نے اسے چند گھنٹے قبل پہلی ملاقات میں دیکھا تھا۔ اندو نامی اس لڑکی کے الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ پہلے سے اسٹارٹ گاڑی چل پڑی۔ انہوں نے کھڑکی کے شیشے سے دیکھا۔ وہاں موجود دیگر اسلحہ بردار افراد بھی تیزی سے بھاگ کر ایک دوسری گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ وہ دوسری گاڑی بھی چند سیکنڈز میں ان کی گاڑی کے پیچھے فراٹے بھرتی ہوئی آنے لگی۔

"وہاں اس گاڑی میں ہمارے بریف کیس بھی تھے۔" شہریار کو اندو کا انداز کچھ دوستانہ لگا تھا اس لیے اس کے سامنے اپنے بریف کیسوں کے لیے دہائی دی۔

"فکر نہ کرو۔ میرے ساتھی بہت ہوشیار ہیں۔ وہ کام کی کوئی بھی چیز چھوڑ کر نہیں آئیں گے۔ تمہارے بریف کیس تمہیں واپس مل جائیں گے۔" اندو نے اسے تسلی دی تو وہ خاموش ہو گیا۔ زیادہ بات کرنے کی گنجائش اس لیے نہیں تھی کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اندو سمیت گاڑی میں موجود ہر فرد کے چہرے اور جسم تنے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت سے ایسا لگتا تھا کہ راہِ فرار اختیار کرنے کے باوجود انہیں یہ خطرہ ہو کہ کسی طرف سے حملہ ہو جائے گا۔ چند لمحوں بعد فضا میں فائرنگ کی آوازیں گونجیں تو گویا ان کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

"وہ باسٹرڈز ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔" اندو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوری پیچھے کی طرف مڑ گئی اور وہاں کا منظر دیکھ کر دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

"ڈونٹ وری، پچھلی گاڑی میں روی اور شنکر موجود

اکیلا تھا، فائرنگ کرنے کی صورت میں مشکل میں بھی پھنس سکتا تھا۔ اس کی گاڑی کا ٹائر پہلے ہی میں پنکچر کر چکی تھی۔'' اس نے نہایت اطمینان سے وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے، یہاں تک تو سمجھ میں آ گئی کہ بھائی جی کے غنڈوں نے تمہارے چکر میں ہمیں گھیر لیا تھا لیکن یہ بتاؤ کہ تم ہماری مدد کو کیسے پہنچیں؟'' شہریار نے دوسرا سوال اٹھایا۔ جب وہ آسانی سے ہر بات بتاتی جا رہی تھی تو اپنی ہر الجھن دور کر لینا ہی مناسب تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں شیوجی ہوٹل کی بالکل سامنے والی بلڈنگ میں تھی۔ وہیں کی ایک کھڑکی سے میں نے بھائی جی کے آدمیوں کو ہوٹل کے اردگرد منڈلاتے ہوئے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ میری تلاش میں ہیں اور ظاہر ہے میں تو انہیں وہاں نہیں مل سکتی تھی لیکن میری وجہ سے تم دونوں مصیبت میں پھنسنے والے تھے۔ میرے من کو یہ اچھا نہیں لگا کہ تم دونوں بیکار میں پھنس جاؤ۔ میں خود تو بلڈنگ کے پیچھے کے راستے سے وہاں سے نکل گئی لیکن دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ دیکھتے رہیں بھائی جی کے بندے کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے جب مجھے فون پر بتایا کہ وہ لوگ تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں تو میں نے تمہیں بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہم نے جس سڑک پر ان کی گاڑی کو گھیرا تھا، وہ بھائی جی کے ٹھکانے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ سڑک پر جو ہنگامہ ہوا تو اس کی آوازیں وہاں تک گئی ہوں گی جب ہی تو ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی اور اس کا نتیجہ بھی تم نے دیکھ لیا تھا۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ تم لوگوں کی جان بچانے کے لیے میں نے اور میرے ساتھیوں نے خود کو کتنے خطرے میں ڈال دیا تھا۔'' سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے اس نے کافی کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ ان کی گفتگو کے دوران ایک ملازم نہایت خاموشی سے کافی سرو کر کے چلا گیا تھا۔

''خاک جان بچائی ہے تم نے ہماری۔ اس سے اچھا تو تم ہمیں ان لوگوں کے ساتھ جانے دیتیں۔ وہاں جا کر کیا ہوتا... وہ ہم سے تمہارے بارے میں پوچھتے اور ہم بتا دیتے کہ تم زبردستی ہمارے ساتھ ہماری ٹیکسی میں بیٹھی تھیں اور شیواجی پہنچنے کے بعد اتر کر کہیں چلی گئیں۔'' مسو نے ایک بار پھر اپنی خاموشی توڑ کر خفگی کا اظہار کیا۔

''اس گمان میں مت رہنا مسو۔ بھائی جی کے آدمی اتنی آسانی سے تمہاری بات ماننے والے نہیں تھے۔ وہ سچائی جاننے کے لیے تمہاری چمڑی اتار کر رکھ دیتے اور پھر کہیں جا کر مانتے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں اس سے بچانا چاہتی تھی اس لیے اتنا کھٹ راگ پھیلایا۔'' اندو نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے اپنا احسان جتایا۔

''بچت تو ہماری اب بھی نہیں ہوئی۔ ہم یہاں ایک میٹنگ کے لیے آئے تھے اور اب حالات یہ ہیں کہ یہاں سے باہر نکلے تو مارے جائیں گے۔'' وہ بھی اس کا احسان ماننے کو راضی نہیں تھا۔

''میرا ساتھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہارے اس حملے کے بعد ہمیں چھڑا لانے پر تو ان لوگوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ ہم تمہارے خاص آدمی تھے اور اب ہمارے لیے خطرہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکا ہے۔'' شہریار نے بھی مسو کا ساتھ دیتے ہوئے اندو کو اس کی غلطی کا احساس دلایا۔

''ٹھیک ہے، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب میں تمہارے لیے بس اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ تمہیں ممبئی سے حفاظت سے نکال دوں اور اس کا انتظام جلدی ہو جائے گا۔ جب تک تم دونوں آرام کرو۔ کوئی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا سکتے ہو۔ تمہاری ہر اچھا پوری کرے گا۔'' اسے یوں اپنی غلطی کا احساس دلانا پسند نہیں آیا تو چنانچہ کچھ ناراضی سے کہتی ہوئی اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

''ہمارے بریف کیس ابھی تک ہمیں نہیں ملے ہیں۔'' اسے جاتا دیکھ کر شہریار نے جلدی سے یاددہانی کروائی۔

''مجھے یاد ہے۔ یہاں سے جانے سے پہلے تمہارے بریف کیس مل جائیں گے۔'' اس نے خشک لہجے میں جواب دیا اور مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر باہر چلی گئی۔ ویسے بھی اس سے مزید کچھ کہنا بیکار ہوتا کیونکہ وہ بھی جانتے تھے کہ بریف کیس دوسری گاڑی میں جانے والے بندے اپنے ساتھ لے گئے تھے اور وہ گاڑی اس کے ساتھ اس بنگلے میں نہیں آئی تھی۔ اسلحے کے علاوہ ان بریف کیسوں میں ان کی چند دوسری اہم چیزیں بھی موجود تھیں اس لیے وہ انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس صورت میں انتظار ہی سب سے بہتر تھا۔ ویسے بھی فی الحال پریم ناتھ والے منصوبے پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے دوبارہ نئے سرے سے منصوبہ بندی کرنی پڑتی چنانچہ انتظار کرتے رہے۔

ملازم نے ایک بار خود ہی ان سے پوچھ کر چائے کے ساتھ ہلکی پھلکی ریفریشمنٹ کی چیزیں پیش کر دیں۔ ٹیلی ویژن سیٹ موجود تھا اس لیے وہ وقت گزاری کے لیے خبریں دیکھتے رہے۔ خبروں میں دو گروہوں کے تصادم کے نتیجے میں بھائی جی کے گرگوں کے مارے جانے کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ خبریں دیکھتے ہوئے ہی انہوں نے ٹی وی کی اسکرین پر بھائی جی اور اشوک صاحب کی تصویریں بھی دیکھیں۔ بھائی جی کی طرف سے الزام لگایا گیا تھا کہ اس کے آدمیوں کے قتل کے پیچھے اشوک کا ہاتھ ہے لیکن اشوک نے اس الزام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کھلی بدمعاشی کے مظاہرے کو ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہوئے سست رفتاری سے ان کی خاصا وقت گزر گیا اور اندو ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس بار اس کے دونوں ہاتھوں میں ان کے بریف کیس لٹکے ہوئے تھے۔

''یہ لو تمہارے بریف کیس اور فوراً یہاں سے اٹھ جاؤ۔ باہر گاڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم دونوں یہاں سے سیدھے ریلوے اسٹیشن جاؤ گے اور وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر دہلی۔ فرسٹ کلاس میں دہلی تک کے لیے کوپے بک کروا دیا گیا ہے۔ وہاں سے تم اپنے حساب سے پانی پت جانے کا انتظام کر لینا اور پھر دوبارہ کبھی ممبئی کا رخ مت کرنا ورنہ آئندہ کے لیے میں تمہاری کوئی گارنٹی نہیں لے سکتی۔'' اس نے بریف کیس فرش پر رکھے اور انہیں کوئی بات کرنے کا موقع دیے بغیر اپنی کہہ کر کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے باہر نکل گئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا لیکن کچھ کہہ اس لیے نہیں سکے کہ اندو کے باہر جاتے ہی وہ شخص اندر آ گیا تھا جو گاڑی میں اگلی نشست پر بیٹھا رہا تھا۔

''چلیں؟'' اس نے اس لہجے میں یہ ایک لفظ ادا کیا جیسے سوال نہ کر رہا ہو، انہیں حکم دے رہا ہو۔ چاروناچار انہیں قدم آگے بڑھانے پڑے کیونکہ اس وقت وہ عام کاروباری افراد کا کردار ادا کر رہے تھے اور ظاہر ہے کوئی سیدھا سادہ کاروباری شخص غنڈوں سے اختلاف کی ہمت تو نہیں کر سکتا تھا۔ اس بار انہیں جس گاڑی میں سفر کروایا گیا، وہ پہلی کے مقابلے میں چھوٹی تھی لیکن اس کے تاریک شیشوں کے پیچھے وہ سب کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اسٹیشن پہنچ کر بھی وہ شخص ان کے ساتھ ساتھ رہا۔

''یہاں ہمارے کچھ آدمی ہر طرف نظر رکھے ہوئے ہیں پھر بھی میں تم لوگوں کو بالکل ٹائم پر لایا ہوں۔ جلدی جلدی چلو ورنہ ایک منٹ بعد ٹرین نکل جائے گی۔'' وہ دونوں پہلے ہی یہ سوچ چکے تھے کہ اسٹیشن پہنچ کر کسی طرح وہاں سے نکلنے کی تدبیر کریں گے لیکن یہاں تو ایسا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ نہایت افراتفری میں انہیں تقریباً چلتی ٹرین میں سوار ہونا پڑا اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے فرسٹ کلاس

کے اس کوپے میں جا بیٹھے جو ان کے لیے بک کروا دیا گیا تھا۔ قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی۔ وہ دہلی کے ایک داوا سے بچتے بچاتے ممبئی پہنچے تھے اور ممبئی کے دو بھائیوں کی مہربانی کی وجہ سے دوبارہ دہلی کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

''میرے خیال میں اب تمہیں جاب چھوڑ دینی چاہیے۔'' وہ حسبِ معمول ناشتے کے بعد اسٹور جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب اسلم نے اس سے یہ بات کہی۔

''وہ کیوں جناب؟'' اس نے دوپٹے کو دونوں شانوں پر اچھی طرح پھیلاتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تمہاری حالت ایسی ہے کہ تم گھر میں رہ کر زیادہ سے زیادہ آرام کرو تو تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔'' اسلم نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ابھی تو وہ اسے ہمیشہ سے اچھی لگتی تھی لیکن جب سے ماں بننے کے مرحلے میں داخل ہوئی تھی، چہرے پر ایک الگ ہی نور آ گیا تھا اور اسلم کا دل پہلے سے زیادہ شدت سے اس کی طرف کھنچتا تھا۔

''میں کوئی دنیا کی انوکھی عورت تھوڑی ہوں جو ماں بننے جا رہی ہے۔ آپ نے اپنے ہاں کے گاؤں دیہاتوں میں نہیں دیکھا کہ کیسے عورتیں آخری وقت تک کھیتوں میں سخت محنت کرتی رہتی ہیں بلکہ بعض دفعہ تو وہیں ڈلیوری کی نوبت آ جاتی ہے۔ میری جاب تو اتنی سخت بھی نہیں ہے جو آپ اتنے گھبرا رہے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر اسلم کی تشفی کروانے کی کوشش کی۔

''تم اپنا ان عورتوں سے مقابلہ نہیں کرو۔ ان کے شوہروں کو ان کا خیال نہیں ہوتا ہو گا لیکن میری تو تم جان ہو۔ میرا بس نہیں چلتا کہ میں تمہیں کیسے پھولوں کی طرح سنبھال کر رکھوں۔'' اس نے عقب سے ماہ بانو کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ اپنے لمبے گھنے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسلم کی اس حرکت پر بالوں پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور گھنے بال ایک آبشار کی صورت اسلم کے چہرے اور شانوں پر آ گرے۔

''کیا کر رہے ہیں؟ اتنی مشکل سے بال سمیٹے تھے۔ سب بکھرا دیے۔ اب دوبارہ باندھنے میں دیر لگے تو مجھ پر الزام مت رکھیے گا کہ لیٹ کروا دیا۔'' اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

''میں تو چاہتا ہوں کہ تم جاؤ ہی نہیں، بس آرام سے گھر پر بیٹھو اور آنے والے مہمان کے استقبال کی تیاری

کرو۔" اس نے کچھ اور بھی قریب ہوتے ہوئے اس کے بالوں کی مہک اپنی سانسوں میں اتاری۔ اس کی اس وارفتگی پر ماہ بانو کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ اسلم کی یہ وارفتگی اور والہانہ پن اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اول روز سے ہی اسے اسی طرح چاہ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اس کی اتنی بے تحاشا محبت پر کچھ کسمسا سی جاتی تھی اور اندر ہی اندر ایک احساسِ جرم ستانا شروع کر دیتا تھا۔ اپنے دل و دماغ پر لاکھ پہرے بٹھانے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں بہت دھیمی سروں میں بجتے ہوئے ساز شہریار کی محبت کا ہے۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اسے بھلا نہ پائی تھی، بس خود کو پابند کر لیا تھا کہ ہونٹوں پر شہریار کا نام تک نہ آئے۔ شہریار نے بھی یہاں بھیجتے ہوئے اسے پابند کیا تھا کہ وہ کسی صورت اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گی چنانچہ اسے پاکستان میں ہونے والے واقعات کی کوئی خبر نہیں تھی اور واحد خبر رساں دل تھا جو اسے اطلاع دیتا تھا کہ وہ جہاں بھی ہے، سلامت ہے۔ اس دیوانے دل کو اس کی وحشتوں سے بچانے اور پابندیوں میں جکڑے رکھنے کے لیے وہ اپنا ہر دم مصروف رہنا ضروری سمجھتی تھی لیکن اب اسلم فرمائش کر رہا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ گھر بیٹھ کر اسے آرام نہیں ملے گا بلکہ بے لگام سوچیں پاگل کرنے چلی آئیں گی۔

"کن خیالوں میں ڈوب گئیں؟ کیا آنے والے مہمان کے بارے میں سوچ رہی ہو کہ وہ بیٹی ہوگی یا بیٹا؟ کچھ بھی ہو بھئی، مجھے تو جی جان سے پیارا ہوگا کیونکہ وہ میری جان کے وجود کا حصہ جو ہوگا۔" اسلم اس وقت خاصے رومانی موڈ میں تھا۔ ماہ بانو نے کسمسا کر اس کی بانہوں کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

"یہ آپ کو بے وقت کی شوخیاں کیوں سوجھ رہی ہیں؟ مجھے تیار ہونے دیں نا۔" ناکامی کی صورت میں اس نے بے بس سے انداز میں ذرا جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن اسلم کہاں قابو میں تھا۔ پے در پے اس کے کئی گرم بوسوں نے ماہ بانو کی گردن کی پشت کو دہکا ڈالا تھا۔

"اسلم! میں کہہ رہی ہوں نا کہ مجھے تیار ہونے دیں۔ ہمیں وقت پر اسٹور پہنچنا ہے۔" اس بار اس نے ذرا قوت سے اسلم کو پیچھے دھکیلا۔

"اور میں جو تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی جاب چھوڑ دو تو اس پر تم ذرا توجہ نہیں دے رہیں۔" اس بار وہ بھی ذرا سا خفا ہوا۔

"میں اس لیے توجہ نہیں دے رہی ہوں کہ میں آپ کی طرح جذبات سے نہیں بلکہ حقیقت پسندی سے سوچتی ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کی بات اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ماں جتنی موبائل ہوگی، بچے کے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ آرام کا مشورہ صرف ان عورتوں کو دیا جاتا ہے جن کے ساتھ کوئی پیچیدگی ہو اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ گھر میں فارغ بیٹھنا میرے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا۔ میرا ماضی میرا ایک دردناک ماضی ہے۔ میں بہت مصیبتوں سے گزری ہوں اور اپنے بہت قریبی رشتوں کو کھویا ہے۔ مجھے یہ خیال بے چین رکھتا ہے کہ وہاں حیدرآباد میں میرے ماں باپ کیسی تنہا اور بے یار و مددگار زندگی گزار رہے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر میں گھر میں فارغ بیٹھ گئی تو اذیت ناک سوچیں مجھے چین سے کہاں بیٹھنے دیں گی۔ گھر سے باہر نکلتی ہوں، مصروف رہتی ہوں تو دل بہلا رہتا ہے۔ دل و ذہن کو مصروف رکھنے والی سرگرمیاں ختم ہو گئیں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔ ویسے بھی اب ہمیں آنے والے بچے کے مستقبل کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا۔ مصطفیٰ بھائی کی مہربانی ہے، انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ ہمیں یہ سہولت ہمیشہ حاصل رہے۔ حالات میں کبھی بھی کوئی ایسی تبدیلی آسکتی ہے کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے۔ اس صورت میں کرائے کے کسی گھر میں رہنا اور اس کے اخراجات برداشت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ وقت اور سہولت سے فائدہ اٹھا کر ہم جتنی سیونگ کر سکتے ہیں کر لیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ہم دونوں مل کر محنت کریں۔ یہ کوئی پاکستان تو ہے نہیں کہ ایک شخص کمائے اور پورا گھر کھائے۔ یہاں تو سب کو جینے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔" وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی جبکہ اسلم کو یک دم ہی چپ لگ گئی۔

"تم تیار ہو کر باہر آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ اس کو کسی قدر سنبھل کر پلٹا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ اس کے انداز سے ماہ بانو کو لگا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی [illegible] کر گئی ہے اور جو آپ کو اتنا چاہیں ان کا دل دکھانا تو کسی صورت اچھا نہیں ہوتا۔ احساس ہونے پر وہ فوراً ہی اسلم کے پیچھے لپکی اور اس کا بازو تھام کر اسے باہر جانے سے روکا۔

"آئی ایم ویری سوری اسلم۔ میری باتیں شاید آپ کو بری لگی ہیں۔"

"نہیں، برا ماننے کی کیا بات ہے؟ تم نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔ میں ہی ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔" اس نے دھیرے سے ماہ بانو کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹایا۔

"آپ میرے ساتھ اس طرح نہیں کریں اسلم۔ یہ آپ کی محبت ہی تو ہے جو مجھے اس دنیا میں جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ آپ بھی مجھ سے روٹھ گئے تو میں کیا کروں گی؟" وہ بے تاب ہو کر اس کے سینے سے لگ گئی اور پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ عورت کے آنسو تو وہ ہتھیار ہیں جو بڑے بڑے سورماؤں کو فتح کر لیتے ہیں۔ اسلم جیسا محبت کرنے والا کہاں ان کا وار سہہ پاتا، فوراً ہی گھبرا گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ماہ بانو۔ میں واقعی تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم نے جو کچھ کہا، وہ میری سمجھ میں آ گیا ہے اور میں پورے دل سے تمہیں جاب پر جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔" اس نے ماہ بانو کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کے رخسار پر سے آنسو صاف کیے۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔ رونے سے اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے سے پڑ گئے تھے جو اسے کچھ اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ اسلم نے بے ساختہ ہی اس کی آنکھوں کو ایک ایک کر کے چوم لیا۔

"میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔ اب تم پانچ منٹ کے اندر تیار ہو کر آ جاؤ ورنہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کبھی بھی مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" ماہ بانو کھلکھلا کر ہنسی۔ اسے دھوپ میں بارش کا منظر یاد آ گیا اور اس نے مسکرا کر اپنے دل میں اس کے اس یقین کی تائید کی کہ وہ بھی اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ کم از کم اپنی مرضی سے تو ہرگز نہیں۔

☆☆☆

جاوید علی نے مساج سینٹر میں قدم رکھا۔ یہ خاصی جدید اور خوب صورت عمارت تھی اور شہر کے پوش علاقے میں واقع تھی۔ جاوید علی نے اس سینٹر کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، اس کے مطابق یہاں طبقۂ امراء کے افراد کا آنا جانا تھا اور مرد و زن دونوں ہی وہاں مساج کروانے کی غرض سے آتے تھے۔ سینٹر کو ایک سابق ایس پی کی بیگم چلا رہی تھی جو کہ خود بھی خاصی ماڈرن عورت تھی اور سننے میں آیا تھا کہ جوانی میں آدھے شہر کے مردوں سے اس کے تعلقات تھے۔ اب بھی وہ خاصی پہنچ والی تھی اسی لیے اس کے مساج سینٹر کے بارے میں خاصی افواہوں کے باوجود اب تک پولیس نے ایک بار بھی چھان بین کی زحمت نہیں کی تھی۔ جاوید علی اور ان کی ٹیم کی تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوا تھا کہ یہ مساج سینٹر محض ایک آڑ ہے ورنہ اصل میں یہاں کوئی اور ہی دھندا کیا جا رہا ہے۔ اس دھندے میں عیاشی کا سامان فراہم کرنے سے لے کر بڑی پارٹیوں کو بلیک میل کرنے تک سب کچھ شامل تھا اور ظاہر ہے اس مقصد کے لیے مساج سینٹر میں جہاں خوب صورت لڑکیاں اور ہینڈسم لڑکے ملازمت کرتے تھے، وہیں مسلح گارڈز اور خفیہ کیمرے بھی موجود تھے۔ خفیہ کیمروں کی موجودگی کا سب سے بڑا سبب ان فلموں کی تیاری تھا جو چیدہ چیدہ گاہکوں کی قابلِ اعتراض حالت میں بنائی جاتی تھیں اور پھر انہیں بلیک میل کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ مساج سینٹر کی اس بدنام شہرت کے باوجود وہاں آنے والے گاہکوں کی تعداد کبھی کم نہیں ہوتی تھی اور لوگ باقاعدگی سے وہاں آتے رہتے تھے۔ بہرحال، وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا براہ راست ان کے ادارے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی اس قسم کے جرائم ان کے دائرۂ کار میں آتے تھے۔ انہیں تو بس اس عورت کی تلاش تھی جو رائے چند کو غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن سپلائی کرتی تھی۔ رائے چند نے انہیں اس عورت کا جو حلیہ بتایا تھا، وہ اس اعتبار سے خاصا منفرد تھا کہ رائے چند کے مطابق وہ لمبے قد کی لیکن جاپانیوں کے سے نقش و نگار رکھنے والی عورت تھی۔ جاوید علی نے باری باری اپنے دو ساتھیوں کو گاہکوں کے روپ میں مساج سینٹر بھیجا تھا۔ وہاں انہوں نے اپنی خدمت انجام دینے والی لڑکیوں کے علاوہ اور بھی کئی خواتین کو دیکھا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی رائے چند کے بتائے ہوئے حلیے پر پوری نہیں اترتی تھی۔

سی ایف پی کے دو جوان مستقل مساج سینٹر کی نگرانی کر رہے تھے لیکن انہوں نے بھی وہاں اس حلیے کی کسی عورت کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا جس سے انہیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ شاید رائے چند نے ان سے غلط بیانی کی ہے لیکن آج اچانک ہی نگرانی کرنے والے جوانوں نے اطلاع دی کہ اس حلیے کی ایک عورت کو مساج سینٹر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ پیچھے اس کے آدمی اور پولیس کی ایک چھاپا مار ٹیم تیار تھی جو اس کی طرف سے اشارہ ملتے ہی سینٹر پر ریڈ کر دیتی۔

"ہیلو سر! دیبا مساج سینٹر میں خوش آمدید۔" وہ گلاس ڈور کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، استقبالیے پر موجود لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ خاصی طرح دار لڑکی تھی اور اس نے ٹاپ لیس بلاؤز کے نیچے اسکن ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ بہت ہی پرکشش انداز میں مسکرائی اور

پھر اپنی مترنم آواز میں اسے خوش آمدید کہا۔
وہ اس اعتبار سے بڑی زبردست لڑکی تھی کہ اسے قدرت نے خوب صورت چہرے اور پُرکشش جسم کے ساتھ ساتھ دلکش آواز سے بھی نوازا تھا ورنہ عموماً اتنا زبردست تناسب کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ شاید وہ اسی تناسب کی وجہ سے استقبالیہ پر بٹھائی گئی تھی کہ آنے والا پہلے مرحلے میں ہی متاثر ہو جائے اور یقین کر لے کہ یہاں اسے جو بھی ملے گا، وہ زبردست ہی ہوگا۔
''یو آر سو بیوٹی فل۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تم سے زیادہ خوب صورت لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''
جاوید علی نے کسی دل پھینک عاشق کی طرح چھوٹتے ہی اس کی تعریف کر دی جس پر وہ بڑی ادا سے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور نہایت لگاوٹ سے بولی۔ ''اٹس آ کمپلیمنٹ فار می۔''
''بھئی جو سچ تھا، وہ میں نے بتا دیا۔'' جاوید علی نے بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دیا۔
''ایسا شاید اس لیے ہے کہ آپ اس سے پہلے کبھی ہمارے مساج سینٹر نہیں آئے۔ یہاں آپ کو مجھ سے بھی زیادہ خوب صورت چہرے اور جسم دیکھنے کو ملیں گے۔'' اب اس کا انداز خالص کاروباری تھا۔
''اوہ، تم نے تو مجھے تجسس میں ڈال دیا۔ میں بے چین ہوں کہ ایک ہی دن میں اپنی زندگی کی دوسری خوب صورت لڑکی کو دیکھ سکوں۔'' وہ بھی برسرِ مطلب آ گیا۔
''اپنے کوائف نوٹ کروا دیں۔'' وہ فوراً ہی اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔
''نام؟''
''کیپٹن انس شیر علی۔'' اس نے پورے اعتماد سے بتایا۔
''اوہ تو آپ آرمی سے ہیں۔'' وہ ذرا سا چونکی۔
''کیوں، یہاں آرمی والوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے کیا؟'' جواب میں اس نے مسکرا کر پوچھا۔
''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن آرمی والے خود ہی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ شاید اپنی ٹف روٹین اور ریگولر ایکسر سائز کی عادت کی وجہ سے انہیں فرصت اور ضرورت دونوں ہی نہیں ہوتیں۔'' اس نے وضاحت کی تو وہ بولا۔
''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں بھی پچھلے کئی دن سے چھٹیوں پر ہوں۔ آیا ہوا ہوں اور چھٹیوں کی وجہ سے روٹین میں تھوڑا فرق پڑ گیا ہے اس لیے سوچا ذرا جسم کو فٹ کروا دیا جائے اور سستی نکال دی جائے تاکہ واپس جانے پر ایڈجسٹ کرنے میں آسانی رہے۔''
''ڈونٹ وری سر! یہاں سے آپ ایسے فٹ ہو کر جائیں گے کہ پھر دوبارہ بار بار ہمارے پاس آنا چاہیں گے۔'' اس نے اعتماد سے دعویٰ کیا اور مزید کوائف حاصل کرنے لگی۔ جاوید علی کو اپنے دو ساتھیوں کے تعاون کی بنیاد پر ان سوالات کے بارے میں پہلے سے ہی علم تھا۔ اس لیے اپنے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتا رہا جن کی بنا پر وہ اسے کوئی امیر کبیر شخص سمجھ کر خصوصی اہمیت کا حامل جانے۔ امارت کے ساتھ آرمی کے بیک گراؤنڈ کے تڑکے نے سونے پر سہاگا کا کام کیا تھا اور وہ لڑکی یقیناً بہت متاثر ہوئی تھی کیونکہ اس کے مکمل کوائف نقل کرنے کے بعد وہ اس کی طرف رخ کر کے دل آویز انداز میں مسکرائی۔ عین اسی وقت اس کے سامنے رکھے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔
''یس میم!'' اس نے انٹرکام اٹھا کر مؤدبانہ لہجے میں کہا اور دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ چند لمحے بعد دوسری طرف کی بات سن کر اس نے اسی مؤدبانہ لہجے میں ''اوکے میم'' کہا اور ریسیور رکھتے ہی دوسرے ہاتھ سے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ایک بیس بائیس سالہ اسمارٹ سی لڑکی مختصر لباس میں وہاں نمودار ہو گئی۔
''سر کو روم نمبر ففٹین میں لے جاؤ۔'' ریسپشنسٹ نے اسے حکم دیا۔
''او کے مس۔'' وہ کہہ کر جاوید علی کی طرف پلٹی۔ ''آئیے سر۔''
جاوید علی اس کی راہنمائی میں چل پڑا۔ عمارت باہر سے جتنی خوب صورت نظر آتی تھی، اندر سے بھی اتنی ہی خوب صورت اور جدید تھی۔ وہاں صفائی کا بھی خوب خیال رکھا گیا تھا۔ فرش کی سطح اتنی چمکیلی اور شفاف تھی کہ چلتے ہوئے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس کی راہنما لڑکی چمکیلی چال چلتی ہوئی سیڑھیوں سے اوپر لے گئی۔ اوپری منزل میں قطار سے کمرے بنے ہوئے تھے اور ہر کمرے کے دروازے کے اوپر کمرا نمبر بھی درج تھا۔ ان میں سے کچھ نمبر روشن تھے اور کچھ نہیں۔ روشن نمبروں کا مطلب وہ جانتا تھا۔ جن کمروں کے نمبر روشن تھے، وہاں گاہک موجود تھے۔ کمرا نمبر پندرہ کے سامنے پہنچ کر لڑکی نے سائڈ میں لگا چھوٹا سا بٹن دبایا۔ ردعمل میں فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک طویل ... پہنی دراز قامت لڑکی جس کے چہرے کے نقوش جاپانیوں کے سے تھے، اس کے استقبال کے لیے منتظر تھی۔ ... چہرہ دیکھ کر جاوید علی کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ آج سینٹر میں ... کی سوچ ... اگرچہ وہ خصوصاً امید تھا ... لڑکی براہ راست اسی سے واسطہ پڑ جائے گا۔
''ویلکم سر! پلیز اندر تشریف لائیں۔'' جاوید علی کو دیکھ کر مسکرائی اور حلاوت آمیز لہجے میں اسے دعوت دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ جاوید علی کو بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھانا پڑا جسے اس نے بہت جوش سے تھاما اور پھر چھوڑنے کے بجائے ہلکے سے دباتے ہوئے اندر کھینچ لیا۔ اندر وہی ماحول تھا جو کسی مساج سینٹر کے کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ درمیان میں پڑا خصوصی طرز کا بیڈ، ریکس میں رکھی مختلف بوتلیں اور اسٹینڈ پر ٹنگے تولیے وغیرہ۔ ان چیزوں کے علاوہ وہاں ایک روم ریفریجریٹر بھی موجود تھا جس کا مقصد اسے اس وقت فوراً ہی سمجھ آ گیا جب اس نے لڑکی کو اس میں سے بیئر کا ٹن نکال کر لاتے دیکھا۔
''میں نے سوچا کہ پہلے آپ کی تھوڑی سی تواضع کر دوں۔'' یہ کہہ کر ٹن اسے تھما کر وہ خود بیڈ سے کچھ فاصلے پر موجود کرسی پر جا بیٹھی۔ جاوید علی کو پہلے ہی اس نے بیڈ پر بٹھا دیا تھا۔ ٹن ہاتھ میں لیے وہ اس کی جانب دیکھنے لگا۔ کرسی پر وہ ایسے انداز اور زاویے سے بیٹھی تھی کہ اس کا طویل گاؤن سامنے سے کھل گیا تھا اور اس سے اس کی لمبی خوب صورت ٹانگیں عریاں حالت میں گھٹنوں کے اوپر تک صاف دکھائی دے رہی تھیں۔
''فی الحال میں اس کی ضرورت تو محسوس نہیں کر رہا لیکن تم جیسی خوب صورت میزبان کو انکار بھی نہیں کیا جا سکتا اس لیے تھوڑی سی چکھ لیتا ہوں۔'' اس نے ایسا ظاہر کیا کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہو گیا ہے اور ٹن کھول کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ صرف پینے کی اداکاری کر رہا تھا، پی نہیں رہا تھا۔
''سننے میں تو آیا ہے کہ آرمی والے بڑے شوق سے یہ شغل کرتے ہیں اور آپ معمولی سی بیئر کے لیے تکلف سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ مخمور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
''آرمی والے شوق ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کا اپنا ایک ڈسپلن ہوتا ہے اور چاہیں بھی تو اسے توڑنے میں خاصی مشکل محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اس وقت پینے کا عادی نہیں ہوں، صرف تمہارا دل رکھنے کے لیے چکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں آرمی میں ہوں؟ ابھی تو ہمارا آپس میں انٹروڈکشن بھی نہیں ہوا؟'' اسے جواب دیتے دیتے اس نے سوال بھی داغ دیا۔
''مجھیں جادو سے۔'' وہ کھلکھلائی اور ٹن ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس طرح شاید وہ مزید کچھ کہنے سے بچنا چاہتی تھی۔
جاوید علی نے بھی جواب پر اصرار نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے استقبالیہ کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو سن لی ہو۔ اسے عین وقت پر بجنے والا انٹرکام بھی یاد آیا۔ امکان یہی تھا کہ اس کے کوائف جان کر اسے جاوید علی میں خصوصی دلچسپی محسوس ہوئی ہو اور اس نے خود اسے وہاں بلوایا ہو۔
''تمہیں تو جادو سے پتا چل گیا لیکن مجھے ایسا کوئی جادو نہیں آتا اس لیے تمہیں اپنا انٹروڈکشن خود کروانا پڑے گا۔''
''میں عالیہ ہوں۔ اس مساج سینٹر میں میرا میڈم روبا کے ساتھ ففٹی پرسنٹ کا شیئر ہے اور بنیادی طور پر میں صرف یہاں کے انتظامات کی نگرانی کرتی ہوں یا اگر کوئی گاہک پسند آ جائے تو خود اسے سروسز فراہم کرنے میں حرج نہیں سمجھتی۔'' اس نے اپنے بارے میں بتایا۔
''یعنی میں ان چند خوش نصیبوں میں سے ہوں جنہیں یہ موقع ملا ہے؟'' جاوید علی نے خوشی کا اظہار کیا تو وہ ہنس دی۔
''ویسے تمہارا نام سن کر مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی ہے۔ تمہارے نقوش سے میں تمہیں جاپانی سمجھا تھا۔'' وہ بھی گفتگو کو طول دے کر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس کے آدمی اشارہ ملنے کے بعد یہاں پہنچ کر پوزیشن سنبھال لیں۔
''نقوش سے جاپانی سمجھے تھے اور قد دیکھ کر کیا سوچا تھا؟'' اس نے شوخی سے پوچھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈسٹ بن تک گئی جس میں اس نے بیئر کا خالی ٹن ڈال دیا۔
''ہاں، قد کے معاملے میں حساب کتاب کچھ گڑبڑ ہے۔'' جاوید علی نے الجھن کے اظہار کے لیے ایک ہاتھ بالوں تک لے جا کر آہستہ سے کھجایا۔ ''عام طور پر جاپانی لڑکیوں کا قد لمبا نہیں ہوتا اور تم خاصی لمبی ہو... لیکن یار کچھ ایکسیپشنل کیسز بھی تو ہوتے ہیں تو میں نے سوچا کہ تم ان میں سے ایک ہو۔''
''میں تمہاری الجھن دور کر دیتی ہوں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میری ماں جاپانی اور باپ پاکستانی ہے اور میں دونوں کا مکسچر۔'' اپنی بات کہہ کر وہ کھلکھلائی تو جاوید علی نے بھی اس کا ساتھ دیا اور سائڈ پر ذرا سا جھک کر اپنے ہاتھ میں تھما بیئر کا ٹن وہاں موجود تپائی پر رکھ دیا۔ ٹن رکھ کر وہ سیدھا ہوا تو نظروں کے سامنے گویا بجلی سی کوند گئی۔ اس کے لمحے بھر کی حرکت میں ہی عالیہ نے اپنا طویل گاؤن اتار پھینکا تھا اور اب ایک مختصر سی بکنی میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"میرے خیال میں اب کام شروع کر دیتے ہیں۔" وہ ہنستی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی آئی اور اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر اسے اتار کر ایک قریبی اسٹینڈ پر لٹکا دیا۔

"آرمی والے بڑے اسمارٹ ہوتے ہیں۔" شرٹ ٹانگ کر وہ دوبارہ اس کے نزدیک آئی اور اس کے کسرتی جسم پر اپنی لمبی انگلیاں پھیرتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولی۔

"یہ فوج کی زندگی کا کمال ہے۔" اسے عالیہ کا قرب ناگوار گزر رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ اس کے بغیر اپنے مقصد کو نہیں پا سکے گا اس لیے لہجے اور تاثرات کو خوش گوار رکھا تھا۔

"یہ تو ہے۔ تم فوجی ہو تبھی کمال کے ہو۔ میرا تم سے پہلے بھی ایک فوجی سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ وہ تمہاری طرح ینگ نہیں تھا پھر بھی بڑی زبردست چیز تھا۔ افسوس کہ ایک بار کے بعد دوبارہ واپس ہی نہیں آیا۔" وہ آپ جناب کا تکلف چھوڑ کر اب بے تکلفی کے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی اور اسے بہت نرمی سے بستر پر لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کرنل توحید نام بتایا تھا اس نے اپنا۔ بہت ہینڈسم اور زور آور آدمی تھا۔ پتا نہیں اب کہاں ہو گا۔ دل میں بڑی شدید خواہش ہے کہ کبھی دوبارہ اس سے مل سکوں۔ تم تو خود آرمی میں ہو، کبھی سامنا ہو تو پیغام دے دینا کہ مساج سینٹر والی عالیہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔"

"میں کیسے انہیں یہ پیغام دے سکتا ہوں؟ ایک کرنل سے کیپٹن رینک کے کسی بندے کو ایسی بات کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔" عالیہ کی زبان سے کرنل توحید کا ذکر سن کر وہ چونک گیا تھا۔ اس بات پر یقین کرنا تو خیر مشکل تھا کہ کرنل توحید کبھی اس مساج سینٹر پر عالیہ نام کی اس عورت سے ملے ہوں گے، البتہ عالیہ کی ذات کچھ اور بھی مشکوک ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے کوائف نوٹ کرواتے ہوئے اپنے آپ کو قابل توجہ بنانے کے لیے یہ بتایا تھا کہ اس کے والد ریٹائرڈ بریگیڈیئر جنرل تھے اور شاید اصل میں یہی بات عالیہ کے لیے قابل توجہ ٹھہری تھی۔ ایک بریگیڈیئر جنرل کی فیملی سے کسی کرنل کے محرم ہونے کا بہت زیادہ امکان تھا اور اس امکان کی بنیاد پر عالیہ اس کی مدد سے کرنل توحید کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے کرنل توحید پر ہونے والا وہ خودکش حملہ بھولا نہیں تھا جس میں وہ ایف سی کے جوانوں کی پھرتی کے باعث بال بال بچے تھے۔ ان پر وہ حملہ شہریار کی سابقہ بیوی ڈاکٹر ماریا کے قتل کے بعد انتقامی کارروائی کے طور پر کیا گیا تھا اور ڈاکٹر ماریا مبینہ طور پر را اور موساد کی ڈبل ایجنٹ تھی۔ اور اب عالیہ اس کے حوالے سے پوچھ گچھ کر رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اس کا بھی ان دو ہی ایجنسیوں یا کم از کم کسی ایک سے ضرور تعلق ہے۔

"کسی عام کیپٹن کی نہیں ہو سکتی لیکن ایسا کیپٹن جو بریگیڈیئر جنرل کا بیٹا ہو ایسی جرأت کر سکتا ہے۔" عالیہ کی بات کہی تو اس نے اپنے دھیان میں تھی۔

"تم کرنل صاحب کو ٹھیک سے جانتی نہیں ہو اس لیے ایسی بات کہہ رہی ہو۔ وہ بہت سخت مزاج آدمی ہیں۔ نجی محفلوں میں بھی ڈسپلن کو توڑنا پسند نہیں کرتے۔" اس نے عالیہ کو تاثر دیا کہ وہ کرنل توحید سے بخوبی واقف ہے۔ اس نے عالیہ کے چہرے پر دوڑتی خوشی کی لہر کو محسوس کر لیا۔

"ٹھیک ہے، تم میں ہمت نہیں ہے تو مجھے ایڈریس دے دینا۔ میں تمہیں دکھاؤں گی کہ تمہارے ڈیڈ اینڈ ٹف کرنل صاحب عالیہ کے سامنے کیسے موم بنتے ہیں۔" اس نے ابھی تک اس کا باقاعدہ مساج شروع نہیں کیا تھا۔ یونہی ادھر سے ادھر انگلیوں کو گردش دے رہی تھی۔ شاید وہ خوش تھی کہ ایک بے وقوف کیپٹن ہاتھ آ گیا ہے اور اس سے آسانی سے کرنل کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے گی۔

"اسے ذرا احتیاط سے۔ میرا تعویذ خراب نہیں ہونا چاہیے۔" عالیہ کی گردش کرتی انگلیاں بے دھیانی میں اس کے گلے میں موجود تعویذ سے جا ٹکرائی تھیں۔ اس نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کا یہ موقع مناسب سمجھا اور اسے ٹوکا۔

"اوہ سوری، پر مجھے حیرت ہے کہ تم جیسا ماڈرن آرمی آفیسر بھی یہ تعویذ وغیرہ جیسی چیزیں پہنتا ہے۔" اس نے فوراً ہی معذرت کرنے کے ساتھ حیرت کا بھی اظہار کیا۔

"میری ماں دیہاتی بیک گراؤنڈ کی ورپرانے خیالات کی عورت ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب تک میں تعویذ اپنے گلے میں پہنا رہوں گا، ہر بلا اور مصیبت سے محفوظ رہوں گا۔" اس نے بتایا۔

"چلو پھر دیکھتے ہیں کہ تمہاری ماں کا یہ تعویذ آج تمہیں مجھ جیسی خوب صورت بلا سے کیسے بچاتا ہے؟" اس نے شوخی سے کہتے ہوئے جھک کر اس پر چھا جانے کی کوشش کی۔ تبھی ایک ساتھ دو باتیں وقوع پذیر ہوئیں۔ ایک جاوید کی گردن کے قریب پیدا ہونے والا ارتعاش اور دوسرے کمرے میں موجود کسی خفیہ اسپیکر سے ابھرنے والی آواز۔ کمرا ساؤنڈ پروف تھا۔ نہ تو یہاں کی آوازیں باہر جا سکتی تھیں اور نہ ہی باہر کی آوازیں اندر آ سکتی تھیں شاید اسی لیے

اہتمام کیا گیا تھا۔

”پولیس نے سینٹر پر ریڈ کر دیا ہے۔ پلیز آپ سب الرٹ ہو جائیں۔“ اسپیکر سے ابھرنے والی گھبرائی ہوئی آواز کو اس نے شناخت کر لیا۔ وہ وہی مترنم آواز والی ریسیپشنسٹ تھی جس سے وہ استقبالیہ کمرے میں مل چکا تھا۔ اس کی آواز سن کر اس نے بڑی خوب صورتی سے فطری ردعمل کا مظاہرہ کیا اور عالیہ کو دھکیل کر اپنے اوپر سے ہٹاتے ہوئے اس اسٹینڈ کی طرف دوڑا جہاں اس کی شرٹ موجود تھی۔ شرٹ اسٹینڈ سے اتار کر اس نے نہایت پھرتی سے پہن لی اور بٹن لگاتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں عالیہ سے پوچھنے لگا۔

”یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہو تو بتاؤ؟؟“

”اتنے پریشان مت ہو کیپٹن! ہم سچویشن کو ہینڈل کر لیں گے۔ یہ پولیس والے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ عالیہ نے بھی اس دوران میں اپنا گاؤن پہن لیا تھا اور بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے دلاسا دے رہی تھی۔

”تم میرا پرابلم نہیں سمجھو گی۔ آج کل پولیس والے میڈیا کی ٹیم ساتھ لے کر ایسے ریڈ کرتے ہیں۔ تم تو شاید بعد میں کچھ لے دے کر کے اپنا دھندا چلاتی رہو گی لیکن اگر میری یہاں موجودگی ظاہر ہو گئی تو میرے خاندان کی ساکھ پھر بھی نہیں لوٹ سکے گی۔ مجھے کسی کی بھی نظروں میں آئے بغیر فوراً یہاں سے نکلنا ہے اور مجھے تم باہر نکالو گی۔“ وہ طیش کا مظاہرہ کرتا ہوا اس پر چڑھ دوڑا۔

”اوکے، میں کچھ کرتی ہوں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ وہ اسے لے کر کمرے سے باہر نکلی تو معاملے کی سنگینی کا صحیح اندازہ ہوا۔ وہاں خاصا شور تھا اور دیگر کمروں میں موجود افراد بھی باہر نکل آئے تھے۔ نیچے سے پولیس والوں کی وارننگ کے ساتھ ساتھ اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

”اس طرف چلو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کاریڈور کے آخری سرے کی طرف بھاگی۔ اس سرے پر بھی سیڑھیاں موجود تھیں۔ وہ اسے لے کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ نیچے پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا رخ کیا اور دفتر کے انداز سے سجے اس کمرے میں ٹھہرنے کے بجائے وہاں موجود دوسرے دروازے سے نکلتی چلی گئی۔ اب وہ عمارت کے عقبی حصے میں تھے۔

”ہمیں یہ دیوار پھاند کر باہر نکلنا ہوگا۔“ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اسے بتایا۔

”ہم اس دیوار کو پھلانگ کر کہاں نکلیں گے؟“ جاوید علی نے اس سے دریافت کیا۔

”گلی میں، یہ ایک پتلی سی گلی ہے جس کی دوسری جانب ایک پرائیویٹ اسکول کی باؤنڈری وال ہے۔ اس وقت اسکول بند ہوگا۔ ہم اس کی باؤنڈری وال کراس کر کے اس وقت تک چھپ سکتے ہیں جب تک پولیس یہاں سے نہیں جاتی۔ وہاں بیٹھ کر میں اوپر کسی کو خبر دوں گی تو ان والوں کا دماغ خود ہی ٹھکانے آ جائے گا۔“ وہ پتا نہیں اس کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی لیکن بہت زیادہ بہرحال نہیں ٹوٹ رہی تھی اور پوری طرح پُریقین تھی کہ صورت حال اس کی منشا کے مطابق کنٹرول میں آ جائے گی۔

”تمہیں جو کچھ کرنا ہے، بعد میں کرتی رہنا۔ فی الحال یہاں سے نکلنے کی کرو۔“ جاوید علی ہر صورت اسے وہاں سے باہر نکالنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے موقع نہ ملے۔ اس کے ٹوکنے پر وہ حرکت میں آئی اور اس کا سہارا لے کر دیوار پر چڑھ گئی۔ اس کے دیوار پر چڑھنے کے انداز میں خاصی مشاقی تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔ وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کود گیا۔ درمیانی گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ وہ دونوں اسے پار کر کے اسکول کے احاطے کی طرف بڑھے اور ابھی وہ اسے سہارا دے کر دیوار پر چڑھا ہی رہا تھا کہ گلی روشنیوں سے بھر گئی۔

”خبردار! بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔“ روشنی کے ساتھ ہی ایک للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہی گویا ٹھٹک کر رک گئے۔ پھر عالیہ نے تیزی سے اپنے گاؤن میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالنا چاہا لیکن جاوید علی نے اس کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے اس کی کلائی کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

”میرا ہاتھ چھوڑو ایڈیٹ، مجھے فون کرنا ہے۔“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غصے سے غرائی لیکن ظاہر ہے وہ اس کی بات نہیں مان سکتا تھا۔ اسی پل بھاگتے ہوئے قدم ان کے عین سامنے آ کر رک گئے اور ایک گن کی نال عالیہ کی کنپٹی سے جا لگی۔

”اسے گاڑی میں ڈالو۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ جاوید علی نے گن بردار اور اس کے دوسرے ساتھی کو حکم دیا۔

”یو...“ عالیہ کچھ بھنبھناتی ہوئی اس کی طرف غصے سے مڑی۔

”حرکت مت کرو، ورنہ تمہیں ماری جاؤ گی۔“ گن بردار نے سختی سے اسے حکم دیا پھر یک دم ہی گن کا دستہ بڑے سلیقے انداز میں اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ وہ لہراتی ہوئی نیچے گرنے لگی تو اس کے دوسرے ساتھی نے اسے سنبھال لیا۔

کندھے پر ڈال کر گلی کے دوسرے سرے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ یہ گلی خاصی پتلی تھی اس لیے وہ لوگ اپنی گاڑی اندر نہیں لا سکے تھے اور مجبوراً اسے عالیہ کو اپنے کندھے پر اٹھا کر گاڑی تک لے جانا پڑا تھا۔ کارروائی کرنے والے جاوید علی سمیت گاڑی میں بیٹھ گئے تو گاڑی آگے بڑھ گئی۔ جاوید علی یہاں ٹیکسی میں آیا تھا اس لیے اسے اپنے پیچھے گاڑی یہاں کھڑی کرنے کی ٹینشن نہیں تھی۔ سی ایف پی اور پولیس کا کوئی رابطہ نہ ہونے کے باوجود انہوں نے یہ احتیاط رکھی تھی کہ پولیس کو بھی ان کا کوئی اتا پتا نہ ملے۔ وہ پولیس کے محکمے میں بھری ہوئی کالی بھیڑوں کی وجہ سے ان پر کبھی بھی پورا اعتماد نہیں کرتے تھے۔ اس کارروائی کے لیے بھی پولیس والوں کو اوپر سے بس اتنے کم احکامات دیے گئے تھے کہ خفیہ ایجنسی کے دو افراد انہیں اپنے ساتھ جس جگہ لے جائیں، وہاں بغیر کسی جھجک کے ریڈ کر دیں اور ریڈ کی جگہ پر سے یہ دونوں افراد جو کچھ اپنی تحویل میں لینا چاہیں، لینے دیں۔ پولیس کا کام صرف اتنا ہوگا کہ عمارت میں موجود افراد کو گرفتار کر کے عمارت اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس کے بعد آگے کی کارروائی کے لیے انہیں مزید ہدایات جاری کی جائیں گی۔ مقامی تھانے کا انچارج اور دیگر افسران اگرچہ ان احکامات پر حیران تو ہوئے تھے، خاص طور پر انہیں یہ بات بری طرح کھلی تھی کہ انہیں استعمال تو کیا جا رہا ہے لیکن اعتماد نہیں کیا جا رہا تھا لیکن حکم کی تعمیل مجبوری تھی کہ احکامات آئے ہی تھے اوپر سے، اور سختی کے ساتھ تھے کہ ان کے پاس چوں چرا کی گنجائش نہیں تھی۔

”ہاں، کیا رہا؟“ گاڑی نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ جاوید علی کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے نمبر دیکھ کر کال ریسیو کی اور سنجیدگی سے بولا۔

”پولیس نے گرفتاریاں شروع کر دی ہیں۔ تھانہ انچارج کے انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ اس کارروائی پر بالکل بھی خوش نہیں ہے اور مجبوری میں ہی سب کچھ کر رہا ہے۔ اوپر سے احکامات کے علاوہ تھوڑا دباؤ میڈیا کا بھی ہے۔ ہم جس نیوز رپورٹر کو اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں، وہ اپنے ہینڈی کیم سمیت مسلسل پولیس والوں کے سر پر سوار ہے۔ میڈم دیبا نے بھی خاصا شور مچا رکھا تھا اور پولیس والوں کو مسلسل دھمکیاں اور گالیاں دے رہی تھی کہ پابندی سے ملنے والے ماہانہ بھتے کے باوجود انہوں نے اس کے سینٹر میں قدم رکھنے کی جرأت کیسے کی۔ وہ تو تھانہ انچارج نے ہی میڈیا کے بندے کی موجودگی کا احساس دلا کر چپ رہنے کا اشارہ کیا ورنہ پبلک کو اور بھی بہت کچھ دیکھنے اور سننے کو مل جاتا۔“ دوسری طرف موجود شخص پُرجوش انداز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

”یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ تم بتاؤ تم لوگوں کے کام کا کیا رہا؟“ اس نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

”ہم نے کافی کچھ اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ مختلف مقامات خصوصاً کمروں میں نصب کیمروں سے تیار کی جانے والی ویڈیوز ہمارے قبضے میں ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹرز سے ہارڈ ڈسکس بھی نکال لی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ یہاں اتنا کچھ موجود ہے کہ ہم دو افراد محدود وقت میں سب کچھ نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہمیں اس عمارت کو اپنی کسٹڈی میں لینا ہوگا۔“ دوسری طرف سے جواب آیا۔

”ٹھیک ہے۔ پولیس والوں کو بتا دو کہ فی الحال وہ عمارت سے ملزمان کے علاوہ کوئی بھی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے اور وقتی طور پر عمارت کا کنٹرول بھی انہیں تمہارے ہاتھ میں دینا ہوگا۔ بعد میں ضروری کارروائی کر کے عمارت ان کے حوالے کر دی جائے گی۔“ اس نے ہدایت جاری کی۔

”اوکے باس اور کچھ؟“

”اور یہ کہ اس نیوز رپورٹر سے ہوشیار رہنا۔ اسٹوری بنانے کے چکر میں یہ لوگ اپنی حدود سے تجاوز کرنے سے بھی باز نہیں آتے اور یہ بات تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ اس ریڈ میں سی ایف پی یا کسی دوسرے خفیہ ادارے کی شمولیت کا قطعی ذکر نہیں آنا چاہیے۔“ اس نیوز رپورٹر کو انہوں نے ایک بڑی اسٹوری کا لالچ دے کر خود اس کارروائی میں ساتھ رکھنے کا انتظام کیا تھا لیکن اس پر چند شرائط بھی لاگو کی گئی تھیں جن میں ایک کسی خفیہ ادارے کی موجودگی کو راز میں رکھنا بھی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بس وہی کچھ ریکارڈ کر سکتا تھا جس کی اسے اجازت دی جاتی۔ رازداری کو قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی کیمرا ٹیم اور ٹیکنیکل اسٹاف کو ساتھ لانے کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی اور وہ تنہا ہی اپنے ہینڈی کیم کی مدد سے اس موقع کی کوریج کر رہا تھا۔

”ڈونٹ وری، وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ یہاں سے جانے سے پہلے اسے اپنے کیمرے میں محفوظ ویڈیو سمیت ہر چیز کی مکمل تلاشی دینی پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے تو پھر تم اطمینان سے اپنا کام کرو۔ تم دونوں جب تک وہاں موجود ہو، تمہیں کور دینے کے لیے ہمارے ساتھی آس پاس موجود رہیں گے۔“ وہ موبائل آف کر کے واپس جیب میں رکھنے لگا تو ہاتھ خود بخود ہی اپنے گلے میں موجود تعویذ

سے جا لگا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس تعویذ کو اپنے گلے سے اتار کر محفوظ کرنے کے لیے ایک ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ آج کے اس مشن میں اس تعویذ نے بڑی کرامات دکھائی تھیں۔ بظاہر وہ سیاہ ڈوری میں پرویا ہوا عام سا چوکور تعویذ تھا لیکن حقیقت میں اس میں ایک نہایت طاقتور اور جدید ساخت کی ننھی سی ڈیوائس رکھی گئی تھی۔ اس ڈیوائس کی مدد سے اس کے ساتھی دور گاڑی میں بیٹھے مساج سینٹر میں اس کی کسی بھی فرد سے ہونے والی گفتگو اچھی طرح سنتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک دوسرے کو کاشن دینے کی سہولت بھی موجود تھی۔ مساج سینٹر میں عالیہ سے سامنا ہوتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو کاشن دے دیا تھا کہ وہ اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے ساتھی بھی اسی طرح اسے کاشن دے کر اپنے ایکشن کے لیے ریڈی ہونے کا عندیہ دیتے رہے تھے۔ تعویذ کے ساتھ رابطے میں موجود جلد کی سطح پر یہ کاشن ایک تھرتھراہٹ کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا اور کسی دوسرے کو خبر بھی نہیں ہو پاتی تھی کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے جیسا کہ عالیہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اپنی دانست میں تو وہ کرنل توحید تک پہنچنے کے لیے ایک کھنڈرے سے کیپٹن کو قابو میں کرنے جارہی تھی لیکن کھیل ہی کھیل میں بازی پلٹ گئی تھی اور اب وہی صورت سے بھولا نظر آنے والا کیپٹن چہرے پر سخت تاثرات سجائے اسے بےخبری کے عالم میں اپنے ساتھ لیے جارہا تھا۔ بےہوشی کی حالت میں پچھلی نشست پر بیٹھی عالیہ کو اندازہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ شکل و صورت سے بھولا بھالا نظر آنے والا یہ کیپٹن اس کے را اور موساد سے ملتے تانے بانوں کی وجہ سے اس کے لیے کتنا سفاک ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے را والوں کی وجہ سے اپنی پہلی محبت کو کھویا تھا۔ اسے کبھی بھی، کسی بھی حال میں شازمین کا چہرہ بھولتا نہیں تھا اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس کی یادداشت میں ہردم تازہ رہنے والا شازمین کا چہرہ اپنے خوب صورت خدوخال کے ساتھ نہیں بلکہ اس اذیت اور خوف کے ساتھ منجمد تھا جس سے وہ را کے ایجنٹوں کی تحویل میں گزری تھی۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ را کے کسی ایجنٹ کے ہاتھ آجانے کے بعد وہ اس کے ساتھ کسی رورعایت یا نرمی سے کام لیتا۔ طرح دار عالیہ کا بُرا وقت اس کے بہت قریب آگیا تھا لیکن وہ اس سے بےخبر پچھلی نشست پر بےہوش پڑی کبھی دائیں والے، تو کبھی بائیں والے کے کندھے پر گری جارہی تھی۔

☆☆☆

"مجھے اور کتنا انتظار کرنا ہوگا سر؟" ذیشان نے اپنے فون پر عمیر آفندی کی کال ریسیو کی تو خود کو خاصی مشتعل محسوس کیا۔ عمیر آفندی کو شہریار کی جگہ دلوانے میں اسی نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور اس نے اب تک یہ ثابت کیا تھا کہ اس کا انتخاب درست ہے۔ وہ دیانت داری اور لگن کے ساتھ اپنے فرائض بھرپور طریقے سے انجام دے رہا تھا لیکن اس دوران اسے ایک بڑے صدمے سے گزرنا پڑا تھا۔ اس کا کزن اظفر جو درحقیقت سی ٹی ڈی کا ایک خاص آدمی تھا جنگل کا راز جاننے کی کوشش میں اپنے ساتھیوں سمیت جان گنوا چکا تھا۔ یہ عمیر ہی تھا جس نے اس بات کا کھوج لگایا تھا کہ اظفر اور اس کے ساتھیوں کی موت کے پیچھے کوئی حادثہ نہیں بلکہ باقاعدہ قاتلانہ منصوبہ موجود تھا اور اسی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد تحقیقات کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ وہاں جنگل میں ایسا کیا ہو رہا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو جانیں گنوانی پڑ رہی ہیں۔

"مجھے تمہارے جذبات کا پوری طرح احساس ہے عمیر! شاید تم یقین نہیں کرو لیکن اظفر کو کھونے کا ہم سب کو بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں بلکہ ہمارا دکھ تو اس حوالے سے بھی بڑھ جاتا ہے کہ اظفر کے ساتھ ہم نے اپنے چار ساتھی مزید گنوائے ہیں اور ہم مزید کوئی کارروائی کرنے میں تذبذب کا شکار بھی اسی لیے ہیں کہ کہیں کسی بھرپور پلاننگ کے نہ ہونے کی صورت میں ہمیں مزید نقصان نہ اٹھانا پڑے۔" آخر خود کو سنبھال کر اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"یوں کہیں کہ آپ لوگ ڈر رہے ہیں اور آپ کے پاس ظفر جیسا کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے جو بےدھڑک اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔" وہ ذرا تلخ ہوا۔

"تم غلط ہی نہیں سمجھ رہے، ہمارے ساتھیوں کے ساتھ زیادتی بھی کر رہے ہو۔ ہم میں سے ہر ایک ہر وقت وطن کی خاطر جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اندھا دھند اپنے آدمیوں کو آگ میں جھونک دیں۔ ہمارا ہر ایک ساتھی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے اور ظفر جیسے بےشمار خوبیوں والے جوانوں کو کھونے کے بعد ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں کی صورتِ حال کتنی خراب ہے۔ ہم اس بات کو بھولے نہیں ہیں کہ ہمیں اس سلسلے میں کوئی کارروائی کرنی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ افرادی قوت اور وسائل کی کمی کی وجہ سے تھوڑا انتظار کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے لوگ کئی دوسرے محاذوں پر مصروف ہیں اور فی الوقت ہم اس طرف توجہ دینے پر مجبور ہیں۔ جنگل میں آپریشن کرنا ہماری آئندہ کی پلاننگ میں شامل ہے لیکن اب ہم یہ آپریشن

جلد بازی کے دریعے نہیں کرنا چاہتے۔ پولیس میں موجود کالی بھیڑوں اور رازداری کے فقدان کی وجہ سے ایسی کوئی کوشش ہمیں پیچھے لے جانے کے علاوہ کچھ ثابت نہیں ہوگا۔ چنانچہ تمہیں کتنا ہی ناگوار گزرے، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تمہیں بھی ہماری طرح موزوں وقت تک کے لیے صبر کرنا ہوگا۔" اس نے عمیر کے تلخ جملے کے جواب میں ذرا طوالت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ لوگ مشہرم خان کو بھی واپس ڈیوٹی پر نہیں بلا رہے ہیں۔ وہ میرے پاس آجائے تو کم از کم ہم دونوں مل کر کچھ کر ہی لیں گے۔ وہ جی دار بندہ ہے، میرا ساتھ دے گا۔" عمیر کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"مشہرم خان کے معاملے میں بھی ہم مجبور ہیں۔ وہ کچھ ایسے معاملات میں ملوث ہو گیا ہے کہ اب اس کا منظرِ عام پر آنا خود اس کی جان کی سلامتی کے لیے خطرناک ہوگا۔ کم از کم اب وہ اپنی پہلی والی جگہ پر تو بالکل کام نہیں کرسکے گا۔ اس کے لیے ہم کچھ اور سوچ رہے ہیں۔" ذیشان نے اسے روکھا جواب دیا۔

"اس طرح تو میں یہاں کچھ نہیں کرسکوں گا اور چودھری اور اس کے گرگے اپنی من مانی کرتے رہیں گے۔" وہ جھنجلایا۔

"ایک بات یاد رکھو عمیر! ہم قصائی نہیں ہیں۔ ہم اپنے لوگوں کی وطن کے لیے محبت اور جذبات کو دیکھتے ہوئے انہیں کسی مذبح خانے میں ایسے ہی نہیں دھکیل دیتے ہیں۔ اگرچہ ہم ہیں ہی خطروں کے کھلاڑی پھر بھی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے ایک ایک فرد کی حفاظت کا خیال رکھیں۔"

ذیشان بھی اب بےحد سنجیدہ موڈ میں آچکا تھا لیکن عمیر کی ذہنی رو شاید کچھ بہکی ہوئی تھی چنانچہ لہجے کی جھنجلاہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ذرا غصے سے بولا۔ "آپ احتیاطیں ہی کرتے رہیں گے اور یہاں چودھری اور اس کے گرگے خون کی ہولی کھیلتے رہیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ یہاں ایسا کوئی فرد نہیں جو ان کے ہاتھ پکڑ سکے۔ وہ خود کو قانون کی گرفت سے بالکل آزاد سمجھتے ہیں۔"

"اب کون سا نیا واقعہ ہوا ہے، مجھے بتاؤ تاکہ میں جان سکوں کہ تم اتنے ڈسٹرب کیوں ہو؟" ذیشان کا لہجہ یک دم نرم پڑ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ہے جو اس جیسے کھرے شخص کے لیے تکلیف کا باعث بنی ہوئی ہے۔

"چودھری کے گاؤں میں ہونے والے سالانہ عرس کے بارے میں تو آپ بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ اپنی اسی پالیسی کے مطابق کہ چودھری سے الجھے بغیر اپنے کام کیے جاتے رہیں، میں اس عرس میں شریک ہوا تھا لیکن صرف کھانے کے وقت تک۔ میرے پی اے عبدالسلام نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ چودھری کے اصرار پر وہاں رات بسر کرنے والے عیاشی اور فحاشی کی ہر حد پھلانگ جاتے ہیں اور ظاہر ہے میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عرس کی رات وہاں بڑا ہنگامہ ہوا اور چودھری نے تشدد کے ذریعے وہاں آئی ایک طوائف کو قتل کر ڈالا۔ اصولاً اس پر قتل کا مقدمہ چلنا چاہیے تھا لیکن چودھری نے نائکہ کا منہ نوٹوں سے بھر کر بند کر دیا اور اس کے اپنے ذاتی ملازمین میں سے تو کسی کے منہ کھولنے کا ویسے ہی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا تو اس بےچاری طوائف کے قتل کا مقدمہ کون درج کرواتا۔ اب آپ بتائیں کہ وہ عورت بےشک طوائف تھی لیکن اسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم تو نہیں کیا جاسکتا۔ اور ایک انسان کا یہ حق ہے کہ اگر کسی نے اس پر ظلم و زیادتی کی ہے تو ذمے دار افراد اس کی دادرسی کریں۔ وہ مظلوم طوائف اپنی جان سے جانے کے بعد شاید قبر کے اندھیروں میں منتظر ہوگی کہ کسی طرح تو نظامِ انصاف کام کرے لیکن یہاں یہ حال ہے کہ سرے سے کوئی مدعی اور گواہ ہی نہیں ہے۔"

عمیر اپنے ڈپریشن کی وجہ آہستہ آہستہ بتاتا چلا گیا۔ حادثے کا علم اسے ان خبروں کے ذریعے ہوا تھا جن کو چھپانے کی کتنی ہی کوشش کی جائے، مگر وہ سرگوشیوں کی صورت اردگرد گردش کرتی رہتی ہیں۔

"یہ واقعی بہت افسوس ناک واقعہ ہے لیکن اس واقعے پر بیٹھ کر صرف افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم کوشش کرو کہ کسی طرح اس معاملے میں چودھری پر گرفت کی جاسکے۔" ذیشان نے خود بھی افسوس کرتے ہوئے اس کو مشورہ دیا۔

"میں کیا کرسکتا ہوں جبکہ کہیں قتل کا کوئی مقدمہ ہی درج نہیں ہوا ہے اور نہ ہی کوئی عینی شاہد موجود ہے۔ میری معلومات کے مطابق موت کی وجہ سیڑھیوں سے گرنا قرار دی گئی ہے۔" وہ کچھ مایوس سا تھا۔

"تم یہ کرسکتے ہو کہ اس کیس کی تحقیقات کرواؤ۔ وہاں پولیس میں ڈی ایس پی منظور نامی ایک آدمی کافی ذہین کا ہے۔ تم پیچھے رہتے ہوئے اس سے اس سلسلے میں کام لے سکتے ہو۔ مرنے والی کی قبر کشائی کروا کر لاش کا پوسٹ مارٹم کرواؤ لیکن اس سے پہلے اس کا کوئی ایسا والی وارث یا قریبی عزیز وغیرہ ڈھونڈو جو اس حادثے پر دل سے افسردہ ہو اور اس بات پر راضی ہو جائے کہ چودھری کے نام نہ سہی، کسی نامعلوم

فرد کے خلاف ایف آئی آر درج کروا دے۔ نائیکا نے رقم لے کر خاموشی اختیار کرلی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی سب نے بھی اس صورت حال کو قبول کرلیا ہو۔ لوگ کسی کی طاقت سے خوف زدہ ہوسکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ سارے کے سارے لوگ ہی بے حس ہوں۔ وہاں اس کوٹھے پر کوئی تو ہوگا جسے اس صورتِ حال نے جھنجوڑا ہوگا۔ تمہارا کام ہے کہ کسی بھی طریقے سے اس شخص کا کھوج لگاؤ۔ باقی رہی گواہ کی بات تو وہ تمہیں حویلی کے اندر بھی مل سکتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق چودھری کے چھوٹے بیٹے بہزاد شاہ کی بیوی فریدہ اپنے سسر سے سخت نفرت کرتی ہے اور اگر ہم کسی طرح اس تک رسائی حاصل کرلیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ وہ گواہی کے لیے تیار ہوجائے گی۔" وہ ایک کے بعد ایک مشورے دیتا چلا گیا جو عمیر آفندی کے دل کو لگے۔

"آپ نے مجھے بہت اچھی لائن آف ایکشن دے دی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چودھری کی گردن گرفت میں لے سکوں۔" حسبِ توقع وہ کوئی راہ نظر آتے ہی پُرجوش ہوگیا۔

"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔" ذیشان جانتا تھا کہ چودھری جیسے بندوں کے لیے اس نظام میں اس قسم کے الزامات سے بچنے کے لیے کتنی گنجائش اور سہولتیں موجود ہیں پھر بھی اس کی ہمت بندھائی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ قتل کے اس کیس میں بے شک چودھری کو کوئی سزا نہ ملے اور الزام ثابت نہ ہو پھر بھی اتنا تو ہوگا کہ اس کے دامن پر لگنے والے داغوں میں ایک داغ کا اضافہ ہوجائے گا۔

"میں اس کیس کو حل کرنے میں اپنی پوری جان لڑا دوں گا۔" عمیر نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

"ہم بھی اظفر کے قاتلوں کو کبھی معاف نہیں کریں گے اور انہیں ایک دن ان کے انجام تک ضرور پہنچائیں گے۔" جواباً ذیشان نے اسے یقین دہانی کروائی اور دوسری طرف کا جواب سنے بغیر فون بند کردیا۔

اگرچہ اس نے بہت سجاؤ سے عمیر کو اس وقت نمٹا یا تھا لیکن خود اس کے اپنے اعصاب جھنجھنا اٹھے تھے اور وہ کسی بھی کام کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھنے کے قابل نہیں تھا۔ چنانچہ عجیب اعصاب زدہ حالت میں اپنی نشست چھوڑ دی اور ایک اسٹیل الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا جس میں بے شمار کیسوں کی فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک فائل اظفر والے کیس کی بھی تھی۔ اس فائل کو الماری سے نکال کر وہ اپنی میز تک لایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہاں اظفر اور اس کے ساتھیوں کی حیدرآباد روانگی سے لے کر قتل تک کی تمام ممکنہ معلومات موجود تھیں۔ اس کے ساتھ ایک نقشہ بھی موجود تھا۔ یہ نقشہ انہیں اظفر کے سامان میں سے ملا تھا۔ فائل پڑھتے ہوئے اس نے وہ نقشہ بھی کھول لیا۔ جنگل کے بارے میں اس معلوماتی نقشے پر اظفر نے سرخ [illegible] سے نشان لگائے تھے لیکن ان نشانوں میں ایک نشان [illegible] نمایاں تھا۔ اظفر نے اپنی نوٹ بک میں نشان زدہ مقام پر پہنچنے کے لیے عین اسی دن کی تاریخ لکھی تھی جس دن [illegible] اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا گیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز [illegible] ان سب کی لاشیں اس مقام سے بہت دور بالکل مختلف [illegible] میں ملی تھیں جبکہ اگر وہ لوگ کسی حادثے کا شکار ہوئے تھے تو اصولاً ان کی لاشیں اس مقام کے اطراف میں یا [illegible] طرف جانے والے راستے پر ملنی چاہیے تھیں۔ یہ نکتہ شروع سے اس کے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ اب ایک بار پھر [illegible] دیکھنے پر وہ کھٹک بیدار ہوگئی اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ جب بھی اس سمت میں دوبارہ کام شروع کیا گیا، اس نکتے کو سب سے زیادہ اہمیت دینے پر زور دے گا۔

☆☆☆

ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔ ممبئی سے دہلی جانے والی نان اسٹاپ ٹرین تھی اور وہ دونوں فرسٹ کلاس کے کوپے میں بیٹھے اس عجیب و غریب صورتِ حال پر حیرت کا شکار تھے۔ آج ہی تو وہ دہلی سے اپنی جان بچا کر ممبئی پہنچے تھے لیکن ممبئی کے اسٹیشن پر اترتے ہی ان کے ساتھ عجیب و غریب واقعات کا آغاز ہوگیا تھا اور واقعات کے اس تسلسل کے نتیجے میں وہ ایک بار پھر دہلی کی طرف جا... بلکہ بھیجے جارہے تھے۔ ان کے حساب کتاب کے مطابق اس وقت ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ انسپکٹر پریم ناتھ کو گھات لگا کر اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جاتے اور اس کا دماغ ٹھکانے پر لانے کی تدبیریں کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اس نے اچانک ترقی کی سیڑھیاں کس طرح طے کیں اور اس میں ڈاکٹر فرحان جمیل والے کیس کا کتنا [illegible] ہے؟ پریم ناتھ کی ترقی اور فرحان جمیل کے کیس کا آپس میں ربط مل جانے کی صورت میں ان کے لیے انہیں تلاش کرنے میں کچھ آسانی ہوجاتی۔ وہ کوشش کرتے تو شاید یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ فرحان جمیل کو اس کے تخیلی گاؤں سے اغوا کرکے کس جگہ رکھا گیا ہے۔ کم از کم کوئی کلیو تو مل ہی جاتا جہاں یہاں [illegible] نئی کہانی شروع ہوگئی۔ وہ اس عجیب سی رپورٹر لڑکی کی مہربانی سے ممبئی سے واپس دہلی جانے والی ٹرین میں [illegible]

ہوئے تھے اور سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کریں۔ دہلی تک پہنچ کر واپس آنے میں وقت بھی ضائع ہوتا اور یہ اندیشہ بھی [illegible] کہ دہلی پہنچنے کی صورت میں کہیں نادر دادا یا اس کے آدمیوں سے ٹکراؤ نہ ہوجائے۔ ناگزیر حالات کے علاوہ وہ کسی بھی شخص سے براہِ راست تصادم کے حق میں نہیں تھے اور اب وہاں سے نکلنے کی مشترکہ کوشش کررہے تھے۔

"ہمیں ہمارے بریف کیس کھونے کی کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" کوئی موضوع گفتگو نہ پا کر سلو نے ایک بار پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بہت ایمرجنسی میں بالکل ٹرین کے چلنے کے وقت پر وہاں پہنچے تھے، اس کے باوجود سلو نے کوپے میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنے بریف کیسوں کو چیک کیا تھا اور چیک کرنے کے بعد یہ اعلان کردیا تھا کہ بریف کیسوں کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم کوشش کرنے والوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ بریف کیس ان کے لیے بہت اہم تھے۔ ایک طرف وہ اگر انہیں کاروباری نظر آنے والے معززین میں شمار کرواتے تھے تو دوسری طرف ان میں ان کا بہت سا اہم سامان موجود تھا۔

"اسے تجسس کے علاوہ کیا سمجھا جاسکتا ہے؟ اندو صحافی ہے جو کہ فطرتاً ہوتے ہی کھوجی ہیں اور اس پر سونے پہ سہاگا یہ کہ وہ جرائم پیشہ افراد کی آلۂ کار بھی بنی ہوئی ہے۔ ہمارے متعلق جاننے کے شوق نے اس سے یہ قدم اٹھوایا ہوگا لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں رہے ہیں۔" شہریار نے اپنا خیال پیش کیا۔ اس تیز رفتار ٹرین میں بیٹھ کر وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے؟

"ایک طرح سے یہ اطمینان کی بات ہے بھی اور نہیں بھی۔ اطمینان اس بات کا کہ وہ لوگ بریف کیس میں موجود اشیا کے بارے میں نہیں جان سکے لیکن اگر اندو کی شخصیت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی اس بات پر خاصی بے چین ہوگئی ہوگی کہ عام سے کاروباری افراد کے پاس اس طرح کے بریف کیس کیونکر موجود ہیں جو ایک گینگ کے ماہر غنڈوں سے بھی نہیں کھل پائے۔" سلو نے جو تجزیہ پیش کیا، وہ قابلِ غور تھا۔ جرائم کی دنیا سے وابستہ افراد کی حس کسی گڑبڑ کو محسوس کرلینے کے معاملے میں دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے اس لیے بہت ممکن تھا کہ اندو سے ان [illegible] اپنے بارے میں بتائی گئی تفصیلات میں سے کسی پر بھی یقین نہ کیا ہو لیکن اس صورت میں سوچنے کی بات یہ تھی کہ [illegible] اگلا اقدام کیا ہوگا۔ ظاہری طور پر تو اس نے خوا تین [illegible] تقاضے پورے کرتے ہوئے ان دونوں کو بھائی جی کے گرگوں کے چنگل سے چھڑا کر ممبئی سے بحفاظت نکال دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید کی تھی کہ دہلی سے سیدھے اپنے شہر پانی پت چلے جاؤ۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ دوسرے رخ سے دیکھا جاتا تو سمجھ آتی کہ اندو کے نزدیک وہ دونوں مشکوک افراد ہیں چنانچہ اس نے کوئی نہ کوئی ایسا انتظام کیا ہوگا کہ ان کے بارے میں حقیقت جان سکے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ دہلی ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد انہیں ایسے افراد کا سامنا کرنا پڑے جو ان کے بارے میں کھوج لگانے پر مامور ہوں۔ دہلی سے پہلے کوئی ایسا امکان اس لیے نہیں تھا کہ یہ ٹرین نان اسٹاپ دہلی جارہی تھی۔

"ہمیں اس لڑکی سے اپنا پیچھا چھڑانا ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم دہلی پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی کہیں غائب ہوجائیں اور ٹرین کے بجائے کسی اور ذریعے سے واپس ممبئی پہنچیں۔" وہ جیسے جیسے غور کررہا تھا، ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جارہا تھا کہ اندو نامی وہ لڑکی اتنی آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنا بہت ضروری تھا۔ ویسے بھی دوبارہ اتنا لمبا سفر طے کرکے دہلی واپس جا پہنچنے کی تو کوئی تک ہی نہیں تھی۔ اندو کے بارے میں اپنی سوچ کو وہم بھی قرار دے دیتے، تب بھی ان کے لیے مناسب تو یہی تھا کہ وہ دہلی نہ جائیں اور راستے میں ہی کہیں ڈراپ ہوجائیں۔ مگر کیسے؟ یہ ایک سوال تھا جو ان کے ذہنوں میں گونج رہا تھا۔ آخر وہ سوچ سمجھ کر ایک متفقہ منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

شہریار نے گھنٹی کا بٹن دبا کر فرسٹ کلاس میں سروس فراہم کرنے والے بیرے کو اپنے کوپے میں بلوایا۔ جس وقت بیرا کوپے میں آیا، سلو اوپر کی برتھ پر سینے تک چادر اوڑھے لیٹا تھا اور بہت دھیمی آواز میں کراہ رہا تھا۔

"میرے لیے ایک کپ کافی لادو اور اگر ہوسکے تو میرے ساتھی کے لیے کوئی پین کلر بھی لے آنا۔ یہ گردوں کا مریض ہے اور بدقسمتی سے اس نے اپنی دوائیں ساتھ نہیں رکھی تھیں۔ اب اسے درد شروع ہوگیا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ دہلی تک کس طرح پہنچے گا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جاگ کر اس کے سرہانے ڈیوٹی دینی پڑے گی اسی لیے میں کافی کی ضرورت محسوس کررہا ہوں۔" اس نے بیرے کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کیا جس پر اس کے چہرے پر بھی تشویش کی لہر دوڑ گئی لیکن اسے دلاسا دینے کے لیے وہ مسکرایا

اور تسلی آمیز لہجے میں بولا۔
"ڈونٹ یو وری سر! میں ابھی دونوں چیزیں پہنچاتا ہوں۔ آئی ہوپ کہ ان کی حالت سنبھل جائے گی۔" تھوڑی دیر بعد وہ کافی کی پیالی اور پین کلر سمیت واپس آ گیا۔ اس بار سلو کی کراہیں کچھ زیادہ بلند ہو چکی تھیں۔ بیرے نے اسے پانی کے ساتھ ہمدردی سے وہ گولی کھلائی اور سہارا دے کر دوبارہ تکیے پر لٹا دیا۔
"اور کوئی کام سر؟" سلو کو لٹانے کے بعد وہ شہر یار کے سامنے مودبانہ کھڑا ہو کر پوچھنے لگا۔
"نہیں تم جاؤ۔ کوئی ضرورت ہوئی تو بتا دیں گے۔"
اس نے جواب دیا تو بیرا باہر نکل گیا لیکن پندرہ منٹ بعد ہی شہر یار نے اسے دوبارہ کال کر لیا۔ اس بار سلو کی کراہیں باقاعدہ چیخوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔
"میرے خیال میں میرا ساتھی دہلی تک سفر نہیں کر سکے گا۔ ہمیں راستے میں کہیں اترنا ہوگا۔" چہرے پر بے پناہ پریشانی کے تاثرات سجائے شہر یار نے اس سے کہا لیکن خود سلو کو سنبھالنے میں لگا رہا جو بہترین اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے درد سے لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔
"میں اوپر والوں کو انفارم کرتا ہوں۔" چہرے پر تشویش سجائے بیرا وہاں سے واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں دو افراد ان کے کوپے میں موجود تھے۔
"ٹرین رکوا کر ہمیں کسی نزدیکی شہر میں اتار دیجیے۔"
شہر یار نے ان کے سامنے بھی مطالبہ کیا جس پر ان میں سے ایک نے بُرا سا منہ بنایا اور بولا۔ "یہ نان اسٹاپ ٹرین ہے۔ اسے درمیان میں روکنا بہت مشکل ہوگا۔"
"ہم کوشش کرتے ہیں کہ مسافروں میں سے کوئی ڈاکٹر مل جائے تو ان کی تکلیف کم کرنے کا بندوبست کیا جا سکے۔" دوسرے شخص نے تحمل سے کہا لیکن شہر یار اس پر چڑھ دوڑا اور بہت سی باتیں سنائیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ ٹرین کا عملہ غفلت کا مرتکب ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ساتھی کی جان بھی جا سکتی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ٹرین میں کسی ڈاکٹر کو تلاش کرنے کے بجائے انہیں قریبی اسٹیشن پر اتار دیا جائے جہاں سے وہ کسی اسپتال جا کر علاج کروا سکیں۔ کافی لیت و لعل کے بعد ان کا یہ مطالبہ مان لیا گیا۔
کراہتا نڈھال ہوتا سلو، شہر یار کے سہارے ٹرین سے نیچے اترا۔ دہلی جانے والی ٹرین کچھ ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد آگے بڑھ گئی جبکہ انہیں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سلو کی اداکاری کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا۔

"ابھی ایمبولینس آتی ہی ہوگی۔" اسٹیشن [illegible] اسے تسلی دینے کے ساتھ بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش [illegible] بمشکل کرسی پر بیٹھا اور دوہرا ہو گیا۔ [illegible] حالت دیکھ کر خائف ہوا جا رہا تھا۔ [illegible] ایمبولینس پہنچنے کی اطلاع پہنچ گئی۔ شہر یار [illegible] کمرے سے باہر لے گیا اور ایمبولینس میں موجود [illegible] بتایا۔ تھوڑی دیر [illegible] گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھی اور اسٹیشن سے باہر نکل [illegible] راستوں پر دوڑنے لگی۔
"بس دوست، گاڑی روک دو۔ اس سے آگے [illegible] ہم خود کریں گے۔" گاڑی نے تھوڑا ہی فاصلہ طے [illegible] شہر یار نے پسٹل نکال کر ڈرائیور کے سر پر رکھ دیا۔
"یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر! پیشنٹ کو اسپتال [illegible] ہے۔" ڈرائیور اس ناگہانی پر بوکھلا گیا لیکن فوراً ہی اسے بات کا احساس ہو گیا کہ مریض کی کراہیں سنائی نہیں رہیں اور وہ آرام سے اسٹریچر پر بیٹھا ہنس رہا ہے۔
"کون ہو تم لوگ؟" ڈرائیور نے خوف زدہ [illegible] میں پوچھا۔
"تمہیں یہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گاڑی روکو اور جیسے ہم کہتے ہیں کرو۔" سلو نے اسے دھمکایا۔
"گاڑی رکنی نہیں چاہیے ڈرائیور۔ یہ لوگ [illegible] سے یہ ہم خود معلوم کر لیں گے۔" اچانک ہی کوئی چھڑ [illegible] سلو کے اسٹریچر کے نیچے سے برآمد ہو [illegible] اپنی خوفناک [illegible] سے بیک وقت ان دونوں کو نشانے پر لیتا ہوا بولا۔ [illegible] شکل دیکھ کر وہ دونوں دنگ رہ گئے۔ یہ تو وہی بیرا تھا جو انکساری سے ٹرین میں ان کی خدمات انجام دے رہا تھا۔
"کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کا خیال من میں [illegible] اسے نکال دو۔ اگر تم دونوں نے کسی طرح مجھے قابو کر بھی [illegible] ان لوگوں سے نہیں بچ سکو گے جو ساتھ والی گاڑی [illegible] تمہارے لیے ہی موجود ہیں۔" وہ فوری حیرت کے جھٹکے سے نکلے بھی نہیں تھے کہ اس نے انہیں مطلع کیا۔ بے ساختہ [illegible] کی نظریں ایمبولینس کی کھڑکی کے شیشوں سے باہر [illegible] وہاں واقعی ایک ہائی روف نما گاڑی موجود تھی اور اس [illegible] سوار مسلح افراد کے ہتھیاروں کی نالیں یقینی طور پر ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

بابر نعیم

اور وہ اچھی زندگی کی تمام تر رنگینی اور خوشگواریت ایک دوسرے کے ساتھ بانٹتے اور رفاقت میں پیہم ہوتی ہے... شدت کی محبت کبھی کبھی بے جا حساسیت کو جنم دے دیتی ہے۔ ایک ایسے ہی محبت کرنے والے کی روداد جو شک و بے یقینی، اعتبار و بے اعتباری کے سنگم پر کھڑا تھا

برٹن کی نگاہیں اپنی بیوی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو ڈبیا کی پیکنگ کھولنے میں مصروف تھی۔
جونہی اس کی بیوی نے ریپر اتارنے کے بعد ڈبیا کو کھولا تو اس کی آنکھیں خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے جگمگانے لگیں۔ ڈبیا کے اندر سونے کا بریسلیٹ رکھا ہوا تھا جس میں ڈائمنڈ لگا ہوا تھا۔ نما آویزہ اس کی دلکشی میں مزید چار چاند لگا رہا تھا۔
بظاہر اس کی بیوی بے حد خوش نظر آ رہی تھی لیکن برٹن

"[illegible] تم یہ اچھا کرتے ہو؟"
"[illegible] بات اہمیت نہیں رکھتی۔ اہم بات یہ ہے کہ تم [illegible] سوچو نہیں۔ تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟"
"[illegible]۔۔۔ تم موضوع تبدیل مت کرو۔ یہ بات بے [illegible] اہمیت رکھتی ہے۔ تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں آج کہاں [illegible]" ایمبر نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔
"[illegible]۔۔۔ اس بریسلیٹ میں نے تمہیں دیا تھا، اس [illegible] کے ذریعے۔" برٹن نے جواب دیا۔
"بریسلیٹ کے ذریعے؟" ایمبر کے لہجے میں حیرت [illegible]
[illegible] نے اس کے تو ویزے کے اندر جی پی ایس [illegible] رکھوا دیا تھا۔"
یہ سنتے ہی ایمبر کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔
برٹن کو یوں لگا جیسے ایمبر اچانک بیمار پڑ گئی ہو۔ اس نے ایمبر پر دباؤ ڈالنے کے لیے موقع غنیمت جانا اور بولا۔ "تم کہاں گئی تھیں؟ تم اس بلڈنگ میں کس سے ملنے کے لیے گئی تھیں؟"
"جہنم میں جاؤ۔" ایمبر کا چہرہ شعلے اگلنے لگا۔
برٹن کو یوں محسوس ہوا جیسے ایمبر کی آنکھوں میں آنسو امڈ [illegible] ہوں لیکن اس نے فوراً ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا۔
برٹن نے آگے بڑھ کر ایمبر کا بازو جکڑ لیا اور بولا۔ "تم کس سے ملاقاتیں کر رہی ہو؟"
"[illegible] سے نہیں، برٹن۔ بس اب رک جاؤ اور مجھے چھوڑ دو۔" ایمبر نے روہانسے لہجے میں کہا۔
برٹن نے ایمبر کا بازو چھوڑ دیا اور اس کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ طمانچے کی آواز خاصی زوردار تھی۔ ایمبر کا منہ بگڑ گیا لیکن وہ اپنے قدموں پر کھڑی رہی۔ تب برٹن آگے [illegible] طرف جھکا اور [illegible] کے انداز میں بولا۔ "تم کس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہو؟" اس کے ہونٹ ایمبر کے کان کو چھو رہے تھے۔
"میں نے تم سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔" ایمبر نے نظریں نیچے جھکاتے ہوئے کہا۔
برٹن نے ایمبر کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور [illegible] چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے اسے زبردستی اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کرتے ہوئے بولا۔ "طوائف!" ساتھ ہی اسے [illegible] جانب دھکیل دیا۔
ایمبر نے گرنے سے بچنے کی کوشش کی تو اس کا ہاتھ [illegible] پر موجود خنجروں کے پھلوں سے ٹکرا گیا۔ وہ خود [illegible]

"الجھا"

[illegible]

"حل"

[illegible]

"راھنمائی"

[illegible]
"مجھے یہ معلوم ہے کہ میں اپنے راستے پر صحیح جا رہا ہوں [illegible] راستہ نہیں بھولا ہوں۔" سائیکل سوار نے اطمینان سے جواب دیا۔

نظارہ

ایک جہاز سمندر پر سے اڑتے ہوئے فضا میں ہچکولے [illegible] لگا۔ جس پر مسافروں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور ہر طرف [illegible] مچ گئی۔ [illegible] جہاز کے کپتان کی [illegible] خواتین و حضرات [illegible]
[illegible] آپ کھڑکی سے [illegible] بہت خوب صورت نظارہ [illegible] لال رنگ کی کشتی دیکھ رہے ہیں۔ میں اسی کشتی سے بول رہا [illegible]
([illegible])

اب اس کے پاس واضح ثبوت آ گیا تھا۔ وہ [illegible] ایمبر سے دوٹوک بات کر سکتا تھا۔

☆☆☆

"ویلکم ہوم، ہنی۔ آج کا دن کیسا رہا؟" ایمبر [illegible] میں مصروف تھی۔
جب برٹن نے کچن میں قدم رکھا تو ایمبر نے [illegible] رخسار کو چوم لیا۔ برٹن نے سوچا۔۔۔ وہ یہ کیوں ظاہر [illegible] ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو؟
"میرے خیال سے تو ٹھیک ہی رہا۔" برٹن نے جواب دیا۔ "اور تمہارا؟"
"اوہ، تم تو جانتے ہی ہو۔ کوئی خاص بات نہیں [illegible] پہلے دفتر، پھر کچھ سودا سلف کی خریداری اور اس کے بعد سیدھی گھر آ گئی تاکہ ڈنر تیار کر سکوں۔" ایمبر نے بتایا۔ اس کی [illegible] ہوئی اشیا کچن کے اس گرینائٹ ٹاپ پر پھیلی ہوئی تھیں جو [illegible] انہوں نے گزشتہ سال لگوایا تھا۔
"اور لنچ کا کیا رہا؟"
"لنچ؟" ایمبر شیلف میں سے ایک ملکنگ باؤل نکالنے لگی۔
برٹن اس کے نزدیک چلا گیا۔
"ہاں لنچ۔۔۔ تم آج لنچ کرنے کہیں گئی تھیں؟"
"ہوں، نہیں تو۔ نہیں، میں نے لنچ دفتر ہی میں کیا تھا۔" ایمبر نے جواب دیا۔
"واقعی؟"
اس بات پر ایمبر، برٹن کی طرف گھوم گئی اور اس نے تولتی نظروں سے برٹن کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ "ہاں، برٹن۔۔۔ واقعی۔"
"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"
ایمبر یہ سنتے ہی تن کر کھڑی ہو گئی اور برٹن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "کیا کہا تم نے؟" اس کی آواز بلند تھی۔
لیکن برٹن کو یقین تھا کہ ایمبر کی آواز تڑخ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔
"ہاں، تم جھوٹ بول رہی ہو۔"
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"
"تم والنٹ اسٹریٹ پر ایک بلڈنگ میں گئی تھیں۔" برٹن نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔
ایمبر نے اپنے [illegible] ایک جھٹکا دیا اور درشت لہجے میں [illegible]

یقینی طور پر یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔
"بے حد پیارا ہے۔" ایمبر نے کہا۔
"مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں پسند آیا۔" برٹن نے کہا۔
"لیکن موقع کیا ہے؟"
"شادی کی سالگرہ کا پیشگی تحفہ۔"
ایمبر مسکراتے ہوئے بولی۔ "اس میں تو ابھی دو ماہ باقی ہیں۔"
"بات یہ ہے کہ میں گزشتہ کئی دنوں سے احمق پن کا مظاہرہ کر رہا ہوں جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ اس کے علاوہ مجھ سے یہ انتظار نہیں ہو رہا کہ دیکھوں یہ تم پر کیسا لگتا ہے۔"
"تھینک یو ڈارلنگ۔" یہ کہتے ہوئے ایمبر نے اس کے رخسار پر ایک بوسہ لے لیا۔
ایمبر کی جذباتی کیفیت سے برٹن کو احساس ہو گیا کہ اس کا لایا ہوا تحفہ ایمبر کو واقعی پسند آیا ہے۔

☆☆☆

برٹن اپنے دفتر میں کمپیوٹر ٹیبل پر بیٹھا لنچ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی نگاہیں اسکرین پر حرکت کرتے ہوئے ایک نقطے پر جمی ہوئی تھیں جو دھیرے دھیرے ففتھ اسٹریٹ پر آگے بڑھ رہا تھا۔
یہ نقطہ ففتھ اور والنٹ کے چوراہے پر پہنچ کر رک گیا۔ پھر روڈ سے ہٹ کر حرکت کرنے لگا۔ سیٹلائٹ امیج کے مطابق یہ ایک پارکنگ لاٹ تھی۔ نقطہ اب اسی پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ برٹن کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ایمبر وہاں کیا کر رہی تھی جبکہ اسے اس وقت اپنے دفتر میں ہونا چاہیے تھا۔۔۔ برٹن کو پہلے ہی اس پر شک تھا۔
تیس سیکنڈ بعد وہ نقطہ ایک بار پھر حرکت کرنے لگا مگر اس بار اس کی رفتار بے حد سست تھی۔ ایمبر یقیناً اپنی کار سے اتر کر اب پیدل جا رہی تھی۔ پھر یہ نقطہ والنٹ پر فورتھ اور ففتھ اسٹریٹ کے درمیان رک گیا۔
اپنے کمپیوٹر پر چند کلک کرنے کے بعد برٹن کو پتا چلا کہ وہ اس وقت ایک بلڈنگ کے سامنے تھی۔ اس عمارت میں پچیس ماڈرن طرز کے اپارٹمنٹ بنے ہوئے تھے اور اس کمپلیکس کی ویب سائٹ کے مطابق یہاں سے وسط شہر تک رسائی بے حد آسان تھی بلکہ اس میں ایک گرم پانی کا انڈور سوئمنگ پول اور مکمل طور پر آراستہ ایک جمنازیم بھی تھا۔
برٹن نے ایک گہری سانس لی اور اپنے کمپیوٹر پر جی پی ایس ٹریکنگ پروگرام بند کر دیا۔

سنبھال نہ سکی اور غذاؤں کے چند پیکٹوں کے ساتھ اس کا پرس بھی اس کے ساتھ فرش پر گر پڑا۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو۔" ایمبر کا لہجہ بدستور روہانسا ہو رہا تھا۔ "چلے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"یہ میرا گھر ہے۔ ہر روز جب میں بیدار ہوتا ہوں تو تمہارے کسی نئے جھوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں روز روز کے ان جھوٹ سے عاجز آ گیا ہوں۔ اب بھی وقت ہے کہ تم سچائی اور ایمان داری سے کام لو۔"

برٹن نے یہ کہتے ہوئے ایمبر کے داہنے شانے پر ایک زوردار لات رسید کی۔ وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ گر پڑی۔ پہلے اس کا بایاں شانہ اور پھر اس کا سر فرش سے ٹکرا گیا۔

برٹن مسکرانے لگا۔

ایمبر نے برٹن سے دور کھسکنے کی کوشش کی تو سرامک ٹائلز کے فرش پر اس کے ہاتھ پیر پھسل گئے۔

برٹن نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔

ایمبر نے فرش پر گرا ہوا اپنا پرس اٹھا لیا اور اپنا ہاتھ پرس کے اندر گھسیڑ دیا۔ پھر کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنی نظریں برٹن پر جما دیں۔ ساتھ ہی پرس میں کچھ ٹٹولنے لگی۔

برٹن بدستور کھڑا مسکرا رہا تھا۔

جب ایمبر نے اپنے پرس میں سے ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک چھوٹا سا ریوالور دبا ہوا تھا۔ اس نے ریوالور کا رخ برٹن کے سینے کی جانب کر دیا۔ برٹن نے نوٹ کیا کہ ریوالور کے دستے پر ایمبر کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔

"دھیان سے۔" برٹن نے کہا۔ "خود کو کوئی گزند مت پہنچا لینا۔"

"مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"یہ مجھے دے دو۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ تم کیا کر رہی ہو۔"

"مجھے... تنہا... چھوڑ دو۔" ایمبر نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے ادا کیا۔

ریوالور کا رخ بدستور برٹن کے سینے کی جانب تھا لیکن اسے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ ایمبر نے یہ خطرناک کھلونا کہاں سے خریدا تھا لیکن یہ بات ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کھلونے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اسے تو یہاں تک یقین تھا کہ ریوالور میں گولیاں موجود نہیں ہوں گی۔ یہ لوڈ نہیں ہوگا۔

"اب کھڑی ہو جاؤ اور یہ ریوالور مجھے دے دو۔" برٹن نے اطمینان سے کہا۔

پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"رک جاؤ۔" ایمبر نے وارننگ دی۔

برٹن نے اس کی وارننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔

تب ایمبر نے چیختے ہوئے کہا۔ "میں کہتی ہوں رک جاؤ۔ اب میں تمہیں مزید کوئی وارننگ نہیں دوں گی۔"

برٹن نے اس کی اَن سنی کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔

تب اس کے کانوں میں دھماکا سنائی دیا۔ ساتھ ہی محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک دہکتی ہوئی سلاخ اس کے سینے میں دل تک اتار دی ہو۔ وہ دونوں گھٹنوں کے بل نیچے گرا۔ آگے کو لڑھکنے لگا۔ اس نے فرش پر منہ کے بل گرنے سے بچانے کی خاطر اپنے بازوؤں کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن کوشش میں ناکام رہا۔ وہ منہ کے بل فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اس نے کن انکھیوں سے دیکھا تو کچن کے فرش پر پھیلا ہوا سرخ مائع اسے دھندلا نظر آنے لگا۔ وہ حیران ہو رہا تھا۔ کیا یہ پھیلا ہوا تمام خون اسی کا ہے؟

☆☆☆

ایمبر کو اپنا وجود بے جان سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے نیچے کھسکتی چلی گئی۔

اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی اور وہ رو رہی تھی۔ یوں لگا جیسے یہ کیفیت اس پر گھنٹوں طاری رہی ہو۔ وہ اس محبت کا ماتم کر رہی تھی جس پر وہ کبھی ناز کیا کرتی تھی۔ اب اسے کھو چکی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے ضائع ہونے والے ان برسوں کا سوگ منا رہی تھی۔

جب اس کے آنسو بہنا تھم گئے تو اطمینان کا ایک مبہم احساس اس کے وجود پر چھا گیا۔ اب وہ خود کو بے حد ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

پھر اس نے اپنے پرس میں سے سیل فون نکالا۔ ہر چند کہ نائن ون ون ڈائل کرنے سے قبل اس نے برٹن کی لاش کی طرف دیکھا اور نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ "برٹن، میں کسی سے ملنے نہیں گئی تھی۔ میں تو سڑک پار اس گن رینج میں گئی تھی جہاں روز دوپہر کے وقفے میں نشانے بازی کی مشق کرنے جایا کرتی ہوں۔"

آسودگی کا احساس اس کے وجود سے جھلک رہا تھا۔

"تم نے شک کر کے مجھ سے میرا مان چھین لیا تھا۔ تمہیں اس کی سزا تو مل چکی ہے۔"

ہر شخص کے باطن میں وہ فرد چھپا ہوتا ہے... جو اپنی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں سچ بولتا ہے... جز دبیز تہوں میں چھپے ہونے کے باعث مشکل سے قابلِ گرفت ٹھہرتا ہے... ایسا شخص کبھی وفادار نہیں رہ سکتا... جس کے مزاج اور رویوں میں ہمہ وقت تبدیلی رونما ہوتی رہے... محبوب کے درجے پر فائز ایک تغافل پسند اور ہرجائی کی داستان۔

پُراسرار محبوب

تنویر ریاض

میں لائبریری میں بیٹھی نوٹس تیار کر رہی تھی کہ اچانک ہی مجھے اپنے چہرے پر کسی کی نظروں کی تپش محسوس ہوئی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں اسے نہیں جانتی تھی۔ شاید وہ فرانس ڈی سیلز اکیڈمی میں پڑھتا ہوگا۔ وہ خاصا مہنگا اسکول تھا اور وہاں کے طالب علم سفید قمیص، ٹائی اور جیکٹ پہن کر کلاس میں آتے تھے گو کہ وہ میرے لیے اجنبی تھا لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے جانتا ہے۔ اس وقت میں سولہ سال کی تھی اور

کر تم کبھی اس طرح کی کشتی میں نہیں بیٹھیں، فکر نہ کرو یہ بہت محفوظ ہے اور پھر میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ ڈوبنے نہیں دوں گا۔"

کشتی والا ہمارے پاس آیا اور اس نے ڈیسمنڈ سے کوئی بات کی جو میں پوری طرح نہ سن سکی لیکن ڈیسمنڈ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے ہٹتے ہوئے بولا۔ "پھر کبھی سہی۔ یہ مناسب وقت نہیں ہے۔"

"اس آدمی نے تم سے کیا کہا جو تم اتنے پریشان نظر آرہے ہو۔"

"وہی جو میں نے تمہیں بتایا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ مناسب وقت نہیں ہے۔"

یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر ڈیسمنڈ اتنا پریشان ہو جاتا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس آدمی نے صرف یہی بات کہی ہوگی لیکن جانتی تھی کہ ڈیسمنڈ سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتائے گا۔

☆☆☆

"اگر میں مر گیا تب بھی یہ ایک عارضی وقفہ ہوگا تاوقتیکہ میری جگہ کوئی دوسرا اس دنیا میں آجائے۔"

"تمہاری مراد دوسرے جنم سے ہے۔"

"ہاں کیونکہ ہماری روحیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں صرف جسم خاک میں مل جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا چشمہ ہٹایا اور میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ جب بھی اس انداز میں گفتگو کرتا تو اس کے چہرے پر نرمی چھا جاتی اور میں اس کی محبت میں بے ہوش ہونے کے قریب محسوس کرنے لگتی گوکہ کبھی نہ جان سکی کہ وہ دل سے یہ بات کہہ رہا ہے یا اس میں بھی کوئی طنز چھپا ہوا ہے۔

ڈیسمنڈ نے اپنا پولورائڈ کیمرا نکال لیا اور میری تصویریں بنانے لگا۔ جب بھی ہم اکٹھے ہوتے، وہ اسی طرح میری تصویریں اتارنے لگتا۔ ان میں سے کچھ وہ نشانی کے طور پر مجھے دے دیتا ورنہ زیادہ تر تصویریں اپنے پاس ہی رکھتا، اور جب بھی میں نے اپنے چھوٹے سے کوڈک کیمرے کے ذریعے اس کی تصویریں کھینچنے کی کوشش کی تو اس نے انکار کر دیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے بولا۔ "فوٹو گرافرز کو اپنی تصویریں بنوانا پسند نہیں۔"

میں اس کی عجیب و غریب منطق پر حیران رہ گئی۔ اسی طرح ایک اور موقع پر اس نے بڑے پُراسرار انداز میں کہا۔ "اگر تم نے میری کوئی تصویر اتاری تو کسی کے ہاتھ بھی نقل لگ سکتی ہے کیونکہ تم اس کیمرے میں فلم استعمال کرتی ہو جبکہ میں پولورائڈ کیمرا استعمال کرتا ہوں جس سے صرف ایک ہی مرتبہ تصویر لی جاسکتی ہے۔"

جب بھی ڈیسمنڈ میری تصویریں اتارتا تو اس کے لیے مختلف پوز بناتا۔ وہ میرے شانوں کو مضبوطی سے پکڑ کر میرا چہرہ اپنی جانب کرتا اور کبھی میرے سر کو دائیں بائیں گھماتا۔ اس کی لمبی انگلیاں میرے چہرے کو سختی سے پکڑے رکھتیں اور جب میں اس کی مرضی کے مطابق پوز دینے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کی انگلیوں کا دباؤ بھی کم ہو جاتا۔

ایک سے زائد مرتبہ وہ مجھ سے میرے خاندان اور آباؤ اجداد کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔ میں جو جانتی تھی اسے بتا دیا لیکن لگتا تھا جیسے وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ میں کئی مرتبہ اسے بتا چکی تھی کہ مجھ سے بڑی صرف ایک بہن کرسٹائن تھی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ ضروری نہیں کہ ملاقات ہی ہو بس وہ اسے دور سے ہی دیکھنا چاہ رہا تھا اور پھر ایک روز اتفاقیہ طور پر ان دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ ہم دونوں اپنی سائیکلوں کے ساتھ چلتے ہوئے فورڈ ہورن پارک کی طرف جا رہے تھے جبکہ کرسٹائن سامنے سے اپنے دو دوستوں کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ اس وقت اس کی عمر بیس برس تھی۔ وہ ویلز کالج میں پڑھ رہی تھی اور ویک اینڈ پر گھر آئی ہوئی تھی۔

"کرسٹائن! میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا۔ "ایلزبتھ ہر وقت تمہارے بارے میں ہی گفتگو کرتی رہتی ہے۔"

اس تبصرے کا کرسٹائن پر کوئی اثر نہیں ہوا، وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔"

یوں لگ رہا تھا کہ وہ زبردستی مسکرا رہی ہو۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے ڈیسمنڈ کا تعارف کروانا بھی ضروری نہ سمجھا۔ وہ دونوں لڑکیاں بھی حیرت سے ڈیسمنڈ کو دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو اور انتہائی نامناسب انداز میں انہیں دیکھ کر مسکرا رہا ہو۔

مجھے کرسٹائن اور اس کی سہیلیوں کی بے رخی پر شدید غصہ آرہا تھا اور میں دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ مجھ سے جلتی ہیں۔ میرے پاس بوائے فرینڈ جو ہے وہ مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتیں۔ وہ مجھے بھی اپنی ہی طرح دیکھنا چاہتی ہیں۔

بعد میں ڈیسمنڈ نے مجھ سے کرسٹائن کے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھی؟

"ہاں، میرا مطلب ہے، نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں [illegible]

ایسا لگتا ہے کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا۔"

"تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مجھ سے دور ہوتے ہوئے بھی بہت قریب ہے اور ہمیشہ میری بھلائی کے بارے میں سوچتی ہے۔"

[illegible] کہ یہ سب پورا سچ نہ ہو البتہ مجھے یہ پریشانی [illegible] ہوئی تھی کہ میری اور ڈیسمنڈ کی توقع کے برعکس وہ [illegible] بالکل بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ یقیناً وہ مجھ سے حسد کر رہی تھی۔

ڈیسمنڈ بولا۔ "اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے پہلے سے جانتی ہو جبکہ وہ مجھے بالکل بھی نہیں جانتی۔"

جب میری گھر پر کرسٹائن سے ملاقات ہوئی تو وہ بولی۔ "ممانے ڈیسمنڈ ہیرش کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ لگ رہا تھا جیسے وہ ایکٹنگ کر رہا ہو۔"

"ایکٹنگ۔" میں چونکتے ہوئے بولی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں نہیں جانتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے بارے میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ وہ ایک شاندار انسان ہے۔"

"تم اس کے بارے میں کتنا جانتی ہو؟"

میں نے کرسٹائن کو بتا دیا کہ ڈیسمنڈ سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی اور اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔ میں نے اس سے بھی کرسٹائن کو آگاہ کر دیا۔ [illegible] اپنے والد کے کالج میں اسکالرشپ آفر ہوئی تھی لیکن اس نے خود ہی درخواست کر کے اسے ایک سال کے لیے مؤخر کر دیا تھا۔

کرسٹائن مجھ سے ڈیسمنڈ کے بارے میں اس طرح سوالات کرتی رہی جن سے میں مشتعل ہو جاؤں۔ تنگ آکر میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ ڈیسمنڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ کتنا اسمارٹ اور شوخ ہے۔ میں نے غصے میں یہاں تک کہہ دیا کہ وہ مجھ سے حسد کر رہی ہے۔

"میں بالکل بھی حسد نہیں کر رہی۔" اس نے ہلکا سا احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہے۔ تم مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتیں۔" میں اپنی بات پر قائم رہی۔

گاہے گاہے بازخواں

قائد اعظم کے ماہ و سال

☆6 سال کی عمر میں گھر پر گجراتی ٹیوشن کی ابتدا۔

☆9 سال کی عمر میں قریبی پرائمری اسکول میں داخلہ۔

☆اسکول جانے سے گریز اور اس کے لیے والد صاحب کے دفتر [illegible]

[illegible]

[illegible] اسکول میں واپسی کا مطالبہ۔

[illegible]

☆10 برس کی عمر میں سندھ مدرسۃ الاسلام میں گجراتی کی چوتھی جماعت [illegible] داخلہ۔

[illegible]

☆بمبئی کے انجمن الاسلام اسکول میں داخلہ اور گجراتی کی چوتھی جماعت [illegible]

☆کراچی واپسی۔ 23 دسمبر 1887ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام میں دوبارہ داخلہ۔

☆5 جنوری 1891ء کو انگریزی کی چوتھی کلاس سے اسکول کو خیرباد۔

☆لارنس روڈ (حالیہ نشتر روڈ) کے سی ایم ایس ہائی اسکول میں داخلہ۔

☆ [illegible] 9 فروری 1891ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام میں تیسری بار داخلہ۔

☆گراہمز ٹریڈنگ کمپنی کے انگریز جنرل منیجر کی طرف سے لندن میں 3 سالہ کاروباری تربیت کی پیشکش۔

☆ [illegible]

☆والدہ کو خوف کہ کنوارے بیٹے کو ولایت بھیجنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

☆پانیلی کی ایمی بائی سے شادی کی تجویز۔ محمد علی جناح کی ہچکچاہٹ کے بعد رضامندی۔

☆ 30 جنوری 1892ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام کی انگریزی کی پانچویں جماعت سے رخصتی (بسلسلہ عقد مسنونہ)

☆کراچی سے ویراول کی بندرگاہ کے ذریعے آبائی گاؤں پانیلی میں آمد [illegible]

☆دلہن والوں کا سماجی رسوم پر اصرار، وہ تین ماہ یا کم از کم ایک ماہ سے پہلے [illegible]

☆جناح پونجا کے کاروباری تفکرات، مواصلاتی رابطے مفقود یا انتہائی سست، وہ فوری طور پر کراچی جانے کے خواہاں۔ ایمی بائی اپنے شوہر کی دیکھ بھال کے لیے ان کے ساتھ جانے پر کمربستہ۔ محمد علی اپنے والدین کے ہم خیال۔

☆ [illegible]

☆ [illegible]

☆مفاہمت کی سب کوششیں ناکام ہونے پر محمد علی کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے اپنی سسرال پہنچے اور کہا کہ وہ جب تک چاہیں ایمی بائی کو گھر رکھیں۔ وہ خود اپنے والدین کے ساتھ کراچی جا رہے ہیں۔ وہاں سے 3 سال کے لیے [illegible] شاید ان کی بیوی اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں کراچی [illegible]

"میں اس سے حسد کیوں کروں گی۔" کرسٹائن نے کہا۔ "مجھے وہ کچھ پُراسرار سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی عجیب سی ہیں۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ عمر میں تم سے بڑا ہے اور کسی طرح بھی تئیس سے کم کا نہیں ہے۔"

"وہ بیس سال کا ہے۔"

"یہ تم کیسے جانتی ہو؟"

"اس نے خود مجھے بتایا تھا۔ اس نے اسکول اور کالج کی تعلیم کے درمیان ایک سال کا وقفہ لیا ہے اور اس سال اپنا اسکالرشپ بھی مؤخر کر دیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی ایسا کر چکا ہے۔"

میں نے غصے میں آکر اسے دھکا دے دیا اور بولی۔ "کرسٹائن! میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔" اس کے بعد کرسٹائن کچھ نہ بولی۔ لیکن میں نے اسے ماں سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔ اس کے خیال میں ڈیسمنڈ کچھ پُراسرار سا تھا اور کچھ اجنبی سا لگتا تھا۔

ماں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت ہی تمیزدار اور سلجھا ہوا، کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہاری بہن دوست بنائے۔"

"اسے دوستوں کی کیا کمی ہے۔ کئی لڑکیوں سے اس کی بہت اچھی دوستی ہے۔"

"میرا مطلب بوائے فرینڈ سے ہے۔ اب وہ سولہ سال کی ہو چکی ہے۔"

"صرف اس لیے وہ ایلزبتھ کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہے کہ وہ جوان اور پُرکشش ہے۔ مجھے تو وہ خاصا تجربہ کار لگتا ہے اور یہی چیز مجھے شک میں ڈال رہی ہے۔"

"کرسٹائن! تم زیادتی کر رہی ہو۔" ممی نے تیز لہجے میں کہا۔ "میری ڈیسمنڈ سے کئی بار بات ہو چکی ہے اور میں نے اسے ایلزبتھ کا ہم مزاج پایا ہے۔ وہ بالکل ہمارے علاقے کے لڑکوں جیسا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کسی روز والدین سمیت اسے رات کے کھانے پر بلالوں۔ یہ ایلزبتھ کے حق میں اچھا ہوگا۔"

"جب میں یہاں نہ ہوں تب انہیں کھانے پر بلانا۔ مجھے تو اس دعوت سے دور ہی رکھو۔"

"اب تو میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ تم اپنی چھوٹی بہن سے تھوڑا بہت حسد کر رہی ہو۔ مجھے تمہارے دوستوں میں کوئی بھی ڈیسمنڈ جیسا نظر نہیں آتا۔"

"وہ مجھے پُراسرار ہونے کے ساتھ ساتھ بدچلن بھی لگتا ہے۔ خیر مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں تو بس یہ چاہتی کہ وہ میری بہن کے ساتھ نظر نہ آئے۔"

"ٹھیک ہے کرسٹی، میں تمہاری بات سمجھ گئی۔"

"میں صرف اپنی بہن کے بارے میں پریشان ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایلزبتھ اپنی حفاظت خود کر سکتی اور ویسے بھی میں ان دونوں پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔"

کرسٹائن نے مضحکہ خیز انداز میں قہقہہ لگایا جیسے اسے ماں کی قوتِ مشاہدہ پر بھروسا نہ ہو۔

☆☆☆

"خوابوں میں بھی بڑے اسرار چھپے ہوتے ہیں۔" اس وقت ہم دونوں ریڈووڈ ڈیک پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر میرا کتا روڈی، اپنے پیر پھیلائے سو رہا تھا۔

"کتے بھی خواب دیکھتے ہیں۔ تم اس کا مشاہدہ کر سکتی ہو۔ اس وقت یہ کتا بھی خواب میں اپنے آپ کو دوڑتے یا شکار کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوگا۔ اگر جانوروں سے وہ کام نہ لیا جائے جس کے لیے انہیں پالا جاتا ہے تو وہ اداس ہو جاتے ہیں اور انہیں یوں لگتا ہے جیسے روح ان کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔"

وہ اتنے یقین سے بول رہا تھا کہ مجھے اس کی باتوں پر توجہ دینا پڑی ورنہ اس سے پہلے میں نے کبھی روڈی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہماری دن بھر کی یادیں، شعور میں جمع ہوتی رہتی ہیں، اور پھر نیند کے دوران سب کچھ خواب کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ خواہشات ہوتی ہیں جن کے پورے ہونے کی ہم تمنا کرتے رہتے ہیں۔"

"پھر ڈراؤنے خواب کیوں آتے ہیں؟" میں موضوع میں دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

"یقیناً یہ ہمارے لیے ایک سزا ہے۔"

"کمال ہے، میں نے تو کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں۔"

"تم مجھے اپنے خوابوں کے بارے میں بتاؤ ایلزبتھ۔" وہ پُرشوق لہجے میں بولا۔ "تم کیا خواب دیکھتی ہو؟"

مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے مذاق کر رہا ہے اور سوال کا جواب دینا ایسا ہی تھا جیسے میں کمرۂ جماعت میں ٹیچر کے سوال کا جواب دے رہی ہوں اور اسے یہ پہلے سے معلوم ہو کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ اگر مختلف جواب دے دیا تو اسے قبول نہیں کریں گے۔

"میں نہیں جانتی اور نہ ہی مجھے اپنے خوابوں کا مطلب ... خواب تو بس خواب ہی ہوتے ہیں ... دیکھ ... جب چھوٹی تھی تو سمجھتی تھی کہ یہ خواب سچے ... ہیں۔ ایک خواب میں بار بار دیکھا کرتی تھی جیسے میں ... کی کوشش کر رہی ہوں پھر مجھے ٹھوکر لگتی ہے اور میں گر ... میں کسی جگہ سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر ... کامیاب نہیں ہو پاتی۔"

"اور تمہارے خوابوں میں کون آتا ہے؟"

"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ عام طور پر مَیں لوگوں کو ... میں دیکھتی ہوں۔"

ہم دونوں ایک بینچ پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ... قربت ہمیشہ میرے اندر ہیجان برپا کر دیتی تھی۔ ... ڈیسمنڈ نے کبھی بھی میری کمر یا گردن کے گرد اپنا بازو ... نہیں ڈالا نہ ہی کبھی میرا ہاتھ پکڑا۔ ماسوائے ان موقع کے ... چڑھائی کے دوران مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہوتی۔ ... کبھی اپنا چہرہ میرے منہ کے قریب نہیں لایا گو کہ کبھی کبھی ... رخصت ہوتے وقت وہ میرے ماتھے یا گلے پر الوداعی بوسہ ... ثبت کرتا لیکن اس کا انداز ایسا ہوتا جیسے کوئی بالغ شخص کسی ... بچے کو پیار کر رہا ہو۔

کرسٹائن کا کہنا تھا کہ اس کے لیے میرے اندر کوئی ... کشش نہیں ہے۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر وہ میرے خوابوں ... کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ ... میرے خوابوں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جسے یاد رکھا ... جائے ... میں بہت مختلف خواب دیکھتی ہوں ... اس میں ... رہا وہ تو اپنی ایک جھلک دکھا کر رخصت ہو جاتے ... سوائے اس کے کہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھوں۔

"کس قسم کے ڈراؤنے خواب؟"

"میں نہیں جانتی۔ یہ ہمیشہ پریشان کن اور ڈراؤنے ... ہوتے ہیں۔"

وہ بڑے غور سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ... طرح دیکھنے پر میں گڑبڑا گئی۔

"ان دنوں تم کس قسم کے خواب دیکھ رہی ہو، کیا تم ... ان میں کوئی خاص بات محسوس کی؟"

میں اس سوال کا کیا جواب دیتی کیونکہ کسی خواب کو یاد ... رکھنا ناممکن تھا اور آنکھ کھلتے پر یہ خواب ذہن کے ... پردے سے ہٹ جاتے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ چند ایک مرتبہ میں نے تمہارے ... سلسلے میں خواب دیکھا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

بیروی

جج نے چوری کے جرم میں گرفتار ملزم سے دریافت کیا۔ "تمہارا وکیل کہاں ہے؟"

ملزم ... معلوم ہوا۔ میں نے کوئی چیز نہیں چرائی ہے تو کوئی وکیل میری پیروی کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔"

(کاشان، فیصل آباد)

دنیادار کی تعریف

حضرت علیؓ سے کسی نے سوال کیا۔ "امیرالمومنین! دنیادار کی آپ کیا تعریف فرمائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔

"دنیادار بھونکنے والے کتے کی طرح ہوتے ہیں جو ایک دوسرے پر غراتے رہتے ہیں۔ یہ درندے کی طرح ہیں۔ ان میں طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے ہیں، اور بڑے چھوٹوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان میں کچھ تو بندھے ہوئے اونٹ کی طرح ہوتے ہیں جو نقصان تو کرنا چاہتے ہیں لیکن بندھے ہونے کی وجہ سے مجبور ہوتے ہیں اور ان میں کچھ آزاد اونٹ کی طرح ہوتے ہیں جو ہر طرح کا نقصان کرتے پھرتے ہیں۔"

(مرسلہ: اعتزاز ظفر، اسلام آباد)

میں نہیں جانتی تھی کہ یہ سچ ہے لیکن یہ لگا جیسے وہ ایسے ہی کسی جواب کی توقع کر رہا تھا۔

"کیا واقعی؟" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "میں کیا کر رہا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں۔" میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"تم نے یہ خواب کب دیکھا۔ مجھ سے ملنے سے پہلے یا بعد میں۔"

اس نے میرا ہاتھ کلائی سے پکڑ لیا۔ اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی غلط ثابت ہو گئی کہ ڈیسمنڈ نے مجھے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میرا دل چاہا کہ ممی ہمارے لیے کوئی ڈرنک لے کر باہر آجائیں جیسا کہ وہ کبھی کبھار کیا کرتی تھیں لیکن شاید وہ کچن میں نہیں بلکہ گھر کے کسی اور حصے میں مصروف تھیں۔

کیونکہ وہ ہمیشہ بغیر بتائے ہی آجاتا تھا اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اس کی آمد کے موقع پر گھر میں کسی دوسرے فرد کی موجودگی کو یقینی بناتی۔ ہماری دوستی میں سارے فیصلے ڈیسمنڈ ہی کیا کرتا تھا ہمیں کب ملنا ہے، کہاں جانا ہے، اور کیا کرنا ہے، وغیرہ وغیرہ اور اگر کبھی وہ اپنے کسی ذاتی کام میں مصروف ہوجانے کی وجہ سے مجھ سے ملنے نہ آپاتا تو میں اس کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ میرے پاس تو اس کا فون نمبر بھی نہیں تھا جس پر میں اس سے بات کرلیتی۔

اس نے اپنا پولورائڈ کیمرا نکال لیا جو مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ''تم نے بتایا نہیں کہ کیا میں تم سے ملنے سے پہلے بھی تمہارے خوابوں میں آتا رہا ہوں؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ شاید اس رات میں نے...''

''ایلزبتھ! میری طرف دیکھو... مجھے اپنے خوابوں کے بارے میں بتاؤ۔ جیسے میں تمہارا تجزیہ کررہا ہوں۔''

میں نے سنجیدگی سے اس خواب کو یاد کرنے کی کوشش کی پھر آہستہ آہستہ میرے ذہن کے پردے پر بہت کچھ واضح ہونا شروع ہوگیا۔ اس دوران میں وہ میرے قریب ہو کر تصویریں اتارنے لگا۔

''وہ ایک جھیل تھی اور اس کے کناروں پر درخت ایک مضبوط دیوار کی طرح ایستادہ تھے۔ ہم ایک کشتی میں سفر کر رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ تم ہی اس کے چپو چلا رہے تھے لیکن مجھے یقین نہیں کہ میں ہی اس کشتی میں تمہارے ساتھ تھی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' وہ حیرت سے بولا۔ ''اگر تم نہیں تو میرے ساتھ کون تھا؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''کیسی احمقانہ باتیں کرتی ہو۔ اس کشتی میں ہم دونوں کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے میری کئی تصویریں اتاریں۔

جب میں نے اس سے اس کے خوابوں کے بارے میں پوچھا تو وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے خواب بھی ڈرائیونگ لائسنس کی طرح کہیں گم ہوگئے ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہیں اپنا کوئی خواب یاد نہ ہو؟''

''یقین نہ آئے تو میرے ڈاکٹر سے پوچھ لو۔''

میں جانتی تھی کہ ڈیسمنڈ کے والد ڈاکٹر تھے لیکن وہ کسی اور ڈاکٹر کی بات کررہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کوئی ایسی دوا استعمال کرتا ہو جو خوابوں کو مکمل صاف کردیتی ہے اور ذہن بالکل خالی ہوجاتا ہے۔

ڈیسمنڈ نے کھینچی ہوئی تصویریں دیکھیں اور ان کے بارے میں کوئی گفتگو کیے بغیر ہی انہیں اپنی جیب میں رکھ لیا۔ مجھے یہ جان کر افسوس ہورہا تھا کہ اس نے کافی عرصے سے خواب نہیں دیکھا جب میں نے اس کے سامنے اس کا ذکر کیا تو وہ بولا۔ ''بعض اوقات خواب نہ دیکھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

اس روز میرے گھر سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنا انگوٹھا میرے ماتھے پر رکھا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ شاید وہ اس جگہ بوسہ دے گا۔ میری پلکوں پر امید کے چراغ روشن ہوگئے مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا

☆☆☆

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میری ماں سے وہ غلطی سرزد ہوگئی جب اس نے ڈیسمنڈ کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور کہا کہ وہ اپنے والدین کو بھی ساتھ لے کر آئے۔ اس نے بڑے سلیقے سے یہ دعوت رد کردی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مسز مارش، یہ دعوت دینے کا بہت بہت شکریہ۔ دراصل میرے والدین ان دنوں بہت مصروف ہیں۔ والد اپنے کام کے سلسلے میں مسلسل سفر میں ہیں۔ میرے لیے بھی تنہا اس دعوت میں آنا مناسب نہ ہوگا۔''

اس کے چند دنوں بعد مما نے دوبارہ یہ دعوت دی لیکن اس نے پہلے کی طرح معذرت کرلی۔ مجھے یہ سب عجیب نہیں لگا کیونکہ جب ہم تنہا ہوتے تو وہ میری فیملی کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھا کرتا تھا لیکن اس کے انکار سے ظاہر ہوگیا کہ وہ میرے خاندان والوں سے ملنا نہیں چاہتا نہ ہی اپنے والدین کو ان سے ملوانا چاہتا ہے

☆☆☆

یہ اکتوبر کے آخری دن تھے جب ایک روز وہ وائلن لے کر ہمارے گھر آیا اور وہ میرے اور مما کے سامنے بیٹھ کر وائلن بجا رہا تھا۔ وائلن بجانے کے دوران اس کی آنکھیں بند تھیں اور نچلا ہونٹ بھینچا ہوا تھا۔ وائلن کی خوب صورت دھنوں نے مجھے اور مما کو بے حد متاثر کیا۔ ہم دونوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہمارے قصبے میں کئی ایسے میوزک کلب تھے جہاں میں اور کرسٹائن پیانو کی طالب علم کے طور پر شرکت کرچکے تھے۔ میری مما اس کی دھنوں کی تعریف کرتے ہوئے بولیں۔ ''تمہیں وائلن سیکھتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟''

''گیارہ سال لیکن میں نے ٹھیک سے نہیں سیکھا۔ میرے ٹیچر کا کہنا تھا کہ مجھ میں خداداد صلاحیتیں ہیں۔''

''کیا تم اب بھی موسیقی کی کلاس لے رہے ہو؟''

''نہیں، یہاں نہیں۔'' اس نے یوں منہ بنایا جیسے یہ کوئی غیر ضروری سوال ہو۔ ''آج کل میں اسٹرائیکرز ویلی میں رہ رہا ہوں، روچسٹر یا میونخ میں نہیں۔''

اس کا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس شہر میں کوئی اچھا میوزک ٹیچر دستیاب نہیں۔ اس کے بعد مما نے کچھ نہیں کہا وہ ڈیسمنڈ کی دھنیں سنتی رہیں۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے مقابلے میں ڈیسمنڈ کی کمپنی سے زیادہ لطف اندوز ہورہی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کرسٹائن، ڈیسمنڈ کے بارے میں غلط سوچ رہی تھی اور مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ مما اس معاملے میں میرے ساتھ تھیں۔

کچھ دیر بعد مما اٹھ کر چلی گئیں تو ڈیسمنڈ نے ایک انتہائی جذباتی دھن چھیڑ دی گوکہ وہ اتنی مہارت کا مظاہرہ نہ کرسکا اس کے باوجود وہ دھن انتہائی اثر انگیز تھی۔ مجھے لگا کہ میں ڈیسمنڈ سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرنے لگی ہوں۔ شاید یہ میری زندگی کی سب سے خالص محبت تھی۔

ڈیسمنڈ نے وائلن اپنے کندھے سے اتارا اور میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب تم کوشش کرو۔ میں تمہاری رہنمائی کرسکتا ہوں۔''

''لیکن کیوں؟'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''بس یونہی ساز چھیڑو جس طرح میں تمہیں بتاؤں۔''

''لیکن...'' میں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

''تم میوزک کلاسیں لیتی رہی ہو۔ تھوڑی سی مشق سے تمہاری تکنیک بہتر ہوجائے گی۔''

میں یہ بات ڈیسمنڈ کو بتا چکی تھی کہ میں نے چھ سے بارہ سال کی عمر تک وائلن کی نہیں بلکہ پیانو کی کلاسیں لی تھیں جن میں کوئی ذہین شاگرد نہیں تھی اس لیے کسی نے بھی میرے کلاسیں چھوڑنے پر اعتراض نہیں کیا۔

میں وائلن نہیں بجا سکتی تھی کیونکہ یہ پیانو سے بالکل مختلف ساز تھا۔ میں نے احتجاج کیا تو وہ بولا۔

''تم موسیقی کی کلاسیں لے چکی ہو اور یہی بنیادی بات ہے اور تم موسیقی کے ابتدائی اصولوں سے واقف ہو اس لیے تمہیں ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور میرے کندھے پر وائلن لگادیا۔ اس کے بعد اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دھن کے تاروں پر رکھا اور اسے ہلکے سے حرکت دی۔ ایک نامانوس سی آواز ابھری تو میں نے گھبرا کر کہا۔ ''تمہارا شکریہ ڈیسمنڈ لیکن میں...''

''میں تمہیں سکھا سکتا ہوں جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تمہیں بتادوں گا۔''

''لیکن یہ بہت زیادہ حقیقی نہیں ہوگا۔''

ڈیسمنڈ بولا۔ ''دیکھو! کسی بھی ساز کو بجانے کے لیے صبر، مشق اور بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے بہت زیادہ باصلاحیت ہونا ضروری نہیں۔ لہٰذا تم اسے بہانہ مت بناؤ۔ ہم دونوں مل کر وائلن بجائیں گے۔ ہمارا اپنا گروپ ہوگا جسے سننے کے لیے لوگ جمع ہوں گے لیکن اس کے لیے تھوڑا سا صبر چاہیے۔''

اب ڈیسمنڈ کی توجہ پوری طرح مجھے ہدایات دینے پر تھی۔ میں نے اس کی شخصیت کا یہ روپ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سانسوں کی ناگوار مہک اور ماتھے پر چمکتا پسینہ مجھے پریشان کررہا تھا اور یہ قربت میرے لیے خطرے کی علامت بن رہی تھی۔ میں اس حد تک پریشان ہوگئی تھی کہ اس سے اپنا مافی الضمیر بھی بیان نہ کرسکی۔ میں اسے بتادینا چاہتی تھی کہ مجھے اس سے یا کسی اور سے وائلن سیکھنے میں بالکل بھی دلچسپی نہیں۔

جب میں نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا اور اس کی مسکراہٹ سے دوستانہ پن مفقود ہوچکا تھا۔

''تم کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ اتنی جلدی ہمت کیوں ہار دی؟''

اس کی آواز سن کر مما راہداری میں آگئیں۔ اس نے

بہادری

عدالت میں جج نے ایک گواہ عورت سے کہا۔ ''تم نے واقعی بڑی بہادری دکھائی کہ ایک ڈاکو پر یوں پل پڑیں۔''

عورت نے صفائی پیش کی۔ ''مجھے یہ پتا ہی کب تھا کہ یہ ڈاکو ہے میں تو یہ سمجھی تھی کہ میرا شوہر دیر سے گھر آیا ہے۔''

(شہناز شہرت، حیدرآباد)

"ایلزبتھ! ڈیسمنڈ کو کیا ہو گیا ہے، وہ کہاں غائب ہے۔"

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

"تم مجھے اپنی زندگی سے دور نہیں رکھ سکتیں ایلزبتھ! تم جانتی ہو کہ ہم جنم جنم کے ساتھی ہیں۔"

یہ وہ پیغام تھا جو مجھے چند روز بعد ڈیسمنڈ کی جانب سے موصول ہوا۔ اس نے یہ پیغام ایک لفافہ میں رکھ کر میرے اسکول کے لاکر میں پہنچا دیا تھا جسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ میرے اسکول کی عمارت میں آیا ہوگا۔ جہاں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کون جانے اس سے پہلے وہ کتنی بار میرے لاکر تک رسائی حاصل کر چکا ہوگا۔ خوف کی ایک لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے اس پیغام کو کئی بار پڑھا اور مجھے اس میں ایک واضح دھمکی نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ یہ بات اپنے والدین کو بتا دینی چاہیے لیکن اس میں خدشہ یہ تھا کہ وہ ڈیسمنڈ کے والدین یا مقامی پولیس سے رابطہ کرتے جبکہ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔

ابھی تک یہ بھی واضح نہیں تھا کہ ڈیسمنڈ مجھ سے کس طرح رابطہ کرنے کی امید کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کبھی اپنا ٹیلی فون نمبر یا پتا نہیں دیا تھا پھر میں اس سے کس طرح رابطہ کر سکتی تھی۔ میں نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے مہربانی کر کے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

☆☆☆

پھر ایک روز اس کا فون آ گیا۔ رات گئے ایک یا دو مرتبہ گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو ہیلو، کہتی رہی لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر مجھے ایک آہٹ سنائی دی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ سائیکل پر ہمارے گھر کے پاس سے گزرا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈیسمنڈ ہی ہے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایک کار ہمارے ڈرائیو وے میں داخل ہوئی۔ اس کی روشنی کھڑکیوں پر پڑ رہی تھی پھر وہ کار وہاں سے چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا کتا روڈی بھی غائب ہو گیا۔ ہم نے اسے پورے علاقے میں تلاش کیا۔ گھروں کے دروازوں پر دستک دی۔ اس کی تصویریں درختوں اور دیواروں پر لگائیں۔ اسے جانوروں کی پناہ گاہ میں تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ میرا شبہ ڈیسمنڈ کی طرف گیا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ اتنا ظالم نہیں تھا بلکہ وہ روڈی کو پسند کرتا تھا۔ ایک خیال مجھے یہ بھی آیا کہ ممکن ہے اس نے مجھ

پر دباؤ ڈالنے کی خاطر روڈی کو اپنے پاس رکھ لیا ہو۔

ہاکی سیزن ختم ہونے والا تھا اور ڈیسمنڈ نے پھر پریکٹس میں آنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ گراؤنڈ میں بیٹھا رہتا اور اسے دیکھ کر میری ٹیم کی لڑکیاں [illegible] کرتیں۔

"ایلزبتھ، یہی تمہارا بوائے فرینڈ ہے۔"

"لگتا ہے کہ ایلزبتھ کا بوائے فرینڈ آؤٹ [illegible] رہا ہے۔"

ایک دن کوچ نے مجھے اپنے دفتر میں [illegible] "بوائے فرینڈ کی وجہ سے تمہارے کھیل میں خلل [illegible] اسی لیے میں نے تمہیں ٹیم کے ساتھ نہ بھیجنے کا فیصلہ [illegible] کیونکہ تمہاری وجہ سے دوسری لڑکیوں کا کھیل بھی متاثر ہو رہا ہے۔"

میں نے کمزور لہجے میں کہا۔ "وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ ہمارے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ میں نہیں جانتی [illegible] ایسا کیوں کر رہا ہے۔"

"تم دونوں کتنے قریب تھے۔ کیا تمہارے درمیان حد درجہ بے تکلفی تھی؟"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے چہرے پر تھپڑ مارا ہو۔ میرے لیے اس سوال کا جواب دینا مشکل تھا پھر بھی میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ "ہمارے درمیان کوئی بے تکلفی نہیں تھی۔"

"تمہیں یقین ہے؟" مسٹر ڈی سوزا نے مشتبہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، مجھے یقین ہے۔" لیکن میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ ڈیسمنڈ کے بارے میں کسی اجنبی سے بات کرنا اپنی محبت کو دھوکا دینے کے برابر تھا۔

"ایلزبتھ! تم میری بات سن رہی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تمہارے اندر بہت تبدیلی ہو چکی ہے۔ مجھے تمہاری آنکھوں میں وحشت نظر آ رہی ہے۔ کیا اس لڑکے نے تمہارے ساتھ کسی بھی انداز میں کوئی زیادتی کی یا تم سے ناجائز فائدہ اٹھایا؟"

میں نے کچھ کہے بغیر سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنے والدین کو اس کے بارے میں بتا دو۔ کیا وہ اس سے مل چکے ہیں؟"

میں نے مبہم انداز میں بڑبڑاتے ہوئے ہاں کہا۔ بہرحال ممی اسے اچھی طرح جانتی تھیں۔ البتہ میں نے

والد کو اس کے بارے میں کبھی نہیں بتایا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ [illegible] نہیں اور اب جو کچھ ہو رہا تھا اس کا سارا الزام مجھی کو دیتے۔

بالآخر میں مسٹر ڈی سوزا کے دفتر سے باہر چلی آئی۔

☆☆☆

کچھ دن بعد مجھے گھر کے پتے پر ڈاک سے ایک لفافہ موصول ہوا جس میں میری زوم لینس سے کھینچی گئی کچھ تصویریں تھیں جو کافی فاصلے سے لی گئی تھیں۔ وہ مدد سے [illegible] کار میں سوار ہوتے ہوئے، سہیلیوں کے ہمراہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اور ہاکی کھیلتے ہوئے لیکن ان میں سب سے پریشان کن تصویر وہ تھی جو والدہ کے ساتھ کچن میں کام کرتے ہوئے لی گئی تھی اور اس کی پشت پر لکھا ہوا تھا۔ "ہمیشہ تم سے بہت قریب" گویا اب میری خلوت بھی محفوظ نہیں رہی تھی۔

میں نے یہ تصویریں کسی کو نہیں دکھائیں۔ ڈر تھا کہ گھر والے ان پر شدید ردعمل ظاہر نہ کریں۔ سارا الزام مجھ پر ہی آتا کہ میں نے اس شخص کو اپنی زندگی میں مداخلت کرنے کی اجازت دی۔ میں کتنی لاپروا کیوں ہو گئی تھی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہمارے احاطے کے آخری سرے پر درختوں کی قطار تھی۔ "یقیناً ڈیسمنڈ نے وہیں چھپ کر طاقتور زوم لینس کے ذریعے یہ تصویریں اتاری ہوں گی۔ وہ شکاری اور میں اس کے نشانے کی زد پر تھی۔" میں چلا چلا کر کہنا چاہ رہی تھی۔ "میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ کاش تم مر جاؤ۔ ہمارا کتا واپس کر دو اور ہمیں تنہا چھوڑ دو۔"

☆☆☆

کچھ دن سکون سے گزر گئے۔ مجھے بھی اطمینان ہو گیا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا۔ ایک دن مجھے اسکول سے نکلنے میں دیر ہو گئی۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا کہ اچانک ہی وہ میرے سامنے آ گیا۔

"ہائے ایلزبتھ! کیا میں تمہیں یاد ہوں؟"

وہ ملامت آمیز انداز میں مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اس کے چہرے کی سختی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ مجھ سے کتنا ناراض ہے۔

"تم مجھے بھولی تو نہ ہو گی۔ تمہارا دوست ہوں ڈیسمنڈ۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس سے مل کر خوش نہیں ہوں۔ مجھے اسکول کی عمارت میں واپس چلے جانا چاہیے تھا مگر میں اس کی مزید بے عزتی یا اسے ناراض کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکی۔ لگ رہا تھا کہ ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی۔

"جانتی ہو کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے نظر انداز کر رہی ہو۔ ہمارے درمیان غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے دور کر دوں۔ ہمیں آپس میں بات کرنے کی ضرورت ہے۔ میں کار لے کر آیا ہوں۔ تمہیں گھر تک چھوڑ دوں گا۔"

"تمہارے پاس کار ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا تم نے ڈرائیونگ لائسنس بنوا رکھا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ "میرے والد کی ہے اور لائسنس کی ضرورت صرف اس وقت پیش آتی ہے جب میں کوئی ایکسیڈنٹ یا ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کروں جبکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"سوری، میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"میرے ساتھ چلو ایلزبتھ! ہم صرف جھیل تک جائیں گے۔ تم چاہو تو کشتی کی سیر بھی کر لینا۔ پھر میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔"

میں نے اسے یاد دلایا کہ اب سیزن ختم ہونے کو ہے اور کوئی کشتی کرائے پر نہیں ملے گی۔ ویسے بھی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اندھیرا پھیلنے والا ہے۔

☆☆☆

میری نظر قریب کھڑی ہوئی کار پر گئی جس کی بتیاں روشن تھیں اور ڈرائیونگ سائڈ والا دروازہ کھلا ہوا تھا پھر اچانک ہی ڈیسمنڈ آگے بڑھا اور اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"میں نے سنا ہے کہ تمہارا کتا گم ہو گیا ہے۔ تم اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ مجھے بھی وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ شاید میں اس کی تلاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ اسے روڈی کے بارے میں علم تھا۔ وہ مجھے کار کی جانب کھینچنے لگا۔ میں نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔ تم یقیناً میرے ساتھ چلنا چاہو گی اگر میں تمہیں روڈی تک پہنچا دوں۔ ہم صرف جھیل تک جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں سب باتیں صاف ہو جائیں گی اور ہم دوبارہ دوست بن جائیں گے۔"

میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟“

”میں، تم سے کیا چاہتا ہوں۔ تم، مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ یہ تو میں نے پہلی نظر میں ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں اور تم بھی ایسا ہی سوچتی ہو۔“

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”یہ سچ نہیں ہے۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہوا۔“

گوکہ وہ مجھے روڈی کو ڈھونڈنے کا لالچ دے رہا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ مجھے اس کے ساتھ کار میں نہیں بیٹھنا ہے۔

ڈیسمنڈ مجھے کار کی جانب گھسیٹ رہا تھا۔ میں اپنے چہرے پر اس کی گرم سانسیں محسوس کرسکتی تھی اور اس کے جسم سے اٹھنے والی بو میرے نتھنوں میں گھسی جارہی تھی۔ میں نے چلانا چاہا لیکن میری چیخ حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔

اچانک ہی کسی کی نظر ہم پر پڑی۔ وہ زور سے چلایا۔ ڈیسمنڈ نے فوراً ہی مجھے چھوڑ دیا اور تیزی سے کار کی طرف بھاگا۔ چند سیکنڈوں میں وہ وہاں سے جاچکا تھا۔

”وہ کون تھا اور تم سے کیا چاہ رہا تھا؟ آنے والا میرے اسکول کا آرٹ ٹیچر تھا۔

میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے درمیان غلط فہمی ہوگئی تھی۔

”کیا میں پولیس کو فون کردوں؟“

”نہیں، نہیں۔ وہ میرا بوائے فرینڈ ہے اور اب ہمارے درمیان معاملات ٹھیک ہوجائیں گے۔“

☆☆☆

میں اپنے کمرے میں تھی جب ماں نے ہذیانی انداز میں چلانا شروع کردیا۔ اس وقت دس بجے کی مقامی خبریں نشر ہورہی تھیں جن میں بتایا گیا کہ اسٹاکرز ویلی کا ایک شہری ڈیسمنڈ ہیرش کار کے حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ اس کی کار اسّی میل فی گھنٹا کی رفتار سے اسٹاکرز ویلی کے جنوب میں چھ میل پر واقع ایک کنکریٹ کے پل سے جاٹکرائی ہماری نظریں تباہ شدہ کار کی فلم پر جم گئیں۔ خاتون نیوز کاسٹر بتارہی تھی کہ نوجوان کی موت فوری طور پر واقع ہوگئی تھی۔ ٹیلی وژن پر اس کی تصویر بھی دکھائی گئی جس میں وہ بہت کم عمر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اسکول کے لڑکوں کی طرح نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا اور اس کے بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ اس

تصویر کو دیکھ کر میں بول اٹھی۔

”یہ ڈیسمنڈ نہیں ہوسکتا۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔“

مما مجھ سے زیادہ پریشان تھیں۔ انہوں نے [illegible] کے لیے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن میرے بالکل ڈھیلے اور سرد ہوچکے تھے جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ چند سیکنڈ بعد خبریں ختم ہوگئیں تو ماں مجھے گلے لگا رہی تھی جبکہ میں پتھر کے بے جان مجسمے کے مانند ساکت تھی۔ اس رات میں دیر تک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرتی رہی۔ نہ جانے کب ڈیسمنڈ کا فون آجائے۔

☆☆☆

اگلی صبح اخبارات میں اس حادثے کی تفصیل [illegible] معلوم ہوا کہ ڈیسمنڈ کی موت کس طرح واقع ہوئی [illegible] ہی صفحے پر اس کی برسوں پرانی تصویر شائع ہوئی تھی جس میں وہ بہت کم عمر دکھائی دے رہا تھا [illegible] اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ تصویر کے نیچے ایک بہت ہی [illegible] ناک کیپشن درج تھا۔ ”اسٹاکرز ویلی کا [illegible] کار کے حادثے میں ہلاک ہوگیا۔“

☆☆☆

کئی شاہدوں نے پولیس کو بتایا کہ تیز رفتاری کی وجہ سے ڈرائیور گاڑی کو قابو میں نہ رکھ سکا اور وہ کنکریٹ کے ستون سے ٹکرا گئی۔ ایسی کوئی علامات نظر نہیں آئیں جن سے معلوم ہوتا کہ حادثہ کار پھسلنے کی وجہ سے پیش آیا۔ تباہ شدہ 1977ء ماڈل مرسیڈیز، ڈیسمنڈ کے والد گورڈن ہیرش کے نام پر رجسٹرڈ تھی۔ ڈیسمنڈ لائسنس کے بغیر کار چلا رہا تھا۔ حادثے کے وقت اس کے والدین کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ سہ پہر سے ہی گھر سے غائب تھا۔ نیویارک [illegible] حادثے کی تحقیقات کررہی تھی کیونکہ اسٹاکرز ویلی پولیس کی حدود سے باہر پیش آیا تھا۔

☆☆☆

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ نیویارک پولیس کی خاتون سراغ رساں مجھ سے اور میرے والدین سے [illegible] کرنے کے لیے ہمارے گھر پہنچ گئی۔ اس نے بتایا کہ ڈیسمنڈ کی تباہ شدہ کار سے میری کئی تصویریں برآمد ہوئی ہیں۔ پولیس اس امکان پر غور کررہی تھی کہ ڈیسمنڈ نے خودکشی نہیں کی۔ سراغ رساں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہم دونوں کے درمیان کوئی قریبی تعلق تھا۔ میں ڈیسمنڈ کو کب سے اور کس حیثیت میں جانتی تھی۔ آخری بار میری اس سے ملاقات ہوئی اور اس وقت اس کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔

میں نے پُرسکون انداز میں ان تمام سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ جانتی تھی کہ میرے والدین حیرانی کے عالم میں یہ سب سن رہے تھے۔ میں نے انہیں دھوکا دیا اور ان معاملات سے لاعلم رکھا جو میرے اور ڈیسمنڈ کے درمیان چل رہے تھے۔ مثلاً میرے والدین کو معلوم نہیں تھا کہ ڈیسمنڈ میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس نے میرے لاکر میں محبت بھرے پیغامات رکھ دیے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ میری ڈیسمنڈ سے اس روز بھی ملاقات ہوئی جس دن یہ حادثہ پیش آیا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ڈیسمنڈ مجھے اپنے [illegible] میں ہارورڈ [illegible] تک لے جانا چاہ رہا تھا۔

میں نے اپنے بیان میں پولیس کو بتادیا کہ ڈیسمنڈ سے میری ملاقات اسکول کی عمارت کے عقب میں شام پانچ [illegible] منٹ پر ہوئی تھی جبکہ 9 بج کر بیس منٹ پر اس کی موت واقع ہوئی۔ آرٹ ٹیچر جسے دیکھ کر ڈیسمنڈ بھاگ گیا تھا، اس نے بھی پولیس کو یہی بتایا۔ پولیس کو یقین تھا کہ حادثے سے پہلے ڈیسمنڈ نے کافی مقدار میں شراب پی تھی اور وہ نشے کی حالت میں لائسنس کے بغیر گاڑی چلا رہا تھا۔

سراغ رساں نے ہمیں بتایا کہ ڈیسمنڈ کے گھر والے یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ان کے بیٹے نے جان بوجھ کر موت کو گلے لگایا۔ فی الحال وہ پولیس سے کوئی بات نہیں کررہے تھے اور انہوں نے میڈیا سے بھی دوری اختیار کر رکھی تھی۔ ایک وکیل کے ذریعے ان کا جو پیغام سامنے آیا۔ اس کے مطابق ان کے بیٹے نے پہلے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اور یہ ذاتی مسائل ہی تھے جن کی وجہ سے وہ شراب نوشی پر مجبور ہوا اور نشے کی حالت میں کار پر کنٹرول برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ اسے خودکشی ماننے پر تیار نہ تھے، ان کے مطابق ڈیسمنڈ کو زندگی سے پیار تھا اور اس نے کبھی خودکشی کے بارے میں بات نہیں کی تھی بلکہ اس کا مستقبل روشن تھا اور اسے [illegible] کالج سے وظیفہ ملنے والا تھا۔

”تم جانتی ہو کہ اس کا ماضی بے داغ نہیں ہے۔ وہ مجرمانہ ریکارڈ کا حامل تھا۔“

سراغ رساں کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہم حیران رہ گئے۔ اس نے بتایا کہ ڈیسمنڈ سات سال تک بریکلم کے اصلاحی مرکز میں سزا کاٹ چکا ہے۔ وہ چودہ سال کا تھا جب اس نے اگست 1970ء میں اپنی گیارہ سالہ بہن کو قتل کردیا تھا۔ وہ اپنی بہن امینڈا کے ساتھ جنگل میں کشتی رانی کررہا تھا۔ اچانک ہی اس نے اپنی بہن پر چپو سے حملہ کردیا اور اس کے سر اور سینے پر اس وقت تک ضربیں لگاتا رہا جب تک وہ

”دل“

[illegible]

”زاویۂ نظر“

[illegible]

”آمد“

[illegible]

”سوال“

[illegible] تم بھائی کو کون سا چیں دو گے؟

[illegible]

”عالمِ خواب“

[illegible]

”میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میں سوتے میں کیسی لگتی ہوں۔“ دوسری خاتون نے جواب دیا۔

”خوش لباس“

[illegible]

[illegible] منگیتر نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”...لیکن یہ تو بتاؤ کہ تاپ دینے کے لیے تم نے [illegible]“

مرنہ گئی پھر اس نے امینڈا کی لاش کو جھیل میں پھینکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس واقعے کا کوئی عینی شاہد نہ تھا لیکن لڑکے کو سکتے کی حالت میں خون آلود لاش اور چپو سمیت کشتی کو کنارے کی طرف دھکیلتے ہوئے دیکھا گیا۔

ڈیسمنڈ نے کبھی بھی واضح طور پر نہیں بتایا کہ اس نے اپنی بہن کو کیوں قتل کر دیا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی غصے کا تیز تھا۔ وہ عدم توجہی کا شکار تھا اور اسی وجہ سے اپنے خیالات میں کھویا رہتا تھا شاید اسی لیے وہ خود فریبی کے عالم میں اپنی بہن سے غیر معمولی طور پر قریب ہو گیا اور اس کے ساتھ وائلن پر گانے لگا۔ والدین نے اس کے لیے نامی گرامی وکیل کا انتخاب کیا جس کی کوششوں سے اس کے جرم کی نوعیت بدل گئی اور اسے قتل غیر عمد کے الزام میں سات سال کے لیے اصلاحی مرکز بھیج دیا گیا۔ استغاثہ کا موقف یہ تھا کہ ایسے خطرناک شخص کو صرف سات سال بعد معاشرے میں آزاد نہیں چھوڑ دینا چاہیے لیکن ڈیسمنڈ کو کم عمر ہونے کی وجہ سے یہ رعایت مل گئی۔ وہ ذہنی مریض تھا بحالی کے مرکز میں اس کا علاج ہوا اور اسے اکیس سال کی عمر میں صحت مند قرار دے دیا گیا۔

اس کا خاندان اسٹرانگیرز ویلی میں منتقل ہو گیا۔ انہیں امید تھی کہ ڈیسمنڈ یہاں رہ کر نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر سکے گا۔ اس کی کہی ہوئی بہت سی باتیں غلط تھیں۔ اس کا باپ کبھی بھی یورپ میں نہیں رہا اور نہ ہی اس نے وہاں دواؤں کی کمپنی کی کوئی شاخ کھولنے میں مدد دی۔ وہ محض اس کمپنی کا ریسرچ ڈائریکٹر تھا اور ہمیشہ روچسٹر میں مقیم رہا۔

سراغ رساں نے مجھے امینڈا کی تصویر بھی دکھائی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم دونوں میں کچھ مشابہت ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ وہ بہت کم عمر تھی اور دیکھنے میں ہی بچی لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جسے اس کے بھائی نے کیمرے میں قید کر لیا۔

یہ سب کچھ جاننے کے بعد میرے والدین طیش میں آ گئے۔ وہ فوری طور پر ڈیسمنڈ کے باپ سے مل کر وضاحت مانگنا چاہ رہے تھے کہ وہ اتنے خود غرض کیوں ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنے بیمار اور منتشر لڑکے کو ایک نارمل انسان کی طرح آزاد چھوڑ دیا۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ ہماری بیٹی سے ملتا رہتا ہے اور یہ کہ جو دوائیں وہ لے رہا تھا، وہ ناکافی تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے پر پوری توجہ کیوں نہیں دی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے والدین میری زندگی سے کھیلنا چاہ رہے تھے۔ ایک ایسی لڑکی کی زندگی سے جسے وہ جانتے بھی نہیں تھے اور نہ ہی کبھی ملے تھے لیکن اپنے بیٹے کی گرل فرینڈ کے بارے میں معلوم ضرور ہوگا۔

اس موقع پر میں سراغ رساں کے مزید سوالوں کا جواب نہ دے سکی۔ مجھ میں اپنے والدین کے غصے کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں دوڑتی ہوئی بالائی منزل پر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے اپنے آپ کو بستر پر گرا لیا۔ جب ہی، کثر و بیشتر میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے کبھی … دے گا۔

آج بھی اسٹرانگیرز ویلی سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں لیکن میں کبھی ایک یا دو دن سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرتی۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ فورسٹ ہورن کی طرف بھی نہ جاؤں جہاں ہم دونوں ملا کرتے تھے اور نہ میں دوبارہ ہورون جھیل کی طرف گئی۔ میرے اسکول کی یادیں بھی اب دھندلا گئی ہیں۔ میں نے گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد دادی کے گھر کے پاس ایک پرائیویٹ اسکول میں داخلہ لے لیا تھا کیونکہ میرے والدین سمجھتے تھے کہ ان مسائل کی وجہ سے مجھے اسٹرانگیرز ویلی میں نہیں رہنا چاہیے۔

میں اپنے دوستوں اور گھر والوں کو بہت یاد کرتی ہوں۔ ان دنوں کو بھی نہیں بھول سکتی جو میں نے وہاں گزارے لیکن میرا وہاں رہنا ممکن نہیں کیونکہ جا بجا بہت سی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں وہ مجھے نظر آیا تھا۔ میں نے ایک مصروف سڑک پر اسے دیکھا۔ میں نے سڑک پار کر کے اس کی طرف بڑھنا چاہا۔ اچانک ہی بہت سے ہارن ایک ساتھ بج اٹھے۔ میں ٹریفک میں بری طرح پھنس گئی اور مرتے مرتے بچی۔ اسی لمحے میرے کانوں میں ایک سرگوشی سنائی دی۔ ”میں ہمیشہ تمہارے انتہائی قریب رہوں گا۔“

☆☆☆

سوچتی ہوں کہ اگر اس روز ڈیسمنڈ کی باتوں میں آ کر اس کے ساتھ کار میں بیٹھ جاتی تو شاید وہ زندگی کی بازی ہارتا۔ وہ مجھے کشتی کی سیر کروانے کے لیے جھیل پر لے جا رہا تھا۔ اگر اس کے ساتھ چلی جاتی تو کیا میرا انجام بھی بہن جیسا ہی ہوتا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میرے پورے بدن میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے اور شاید اس روز میں نے زندگی میں پہلی بار کوئی …

ایک اہم بات تو بتانا بھول گئی کہ … کبھی نہیں ملی۔ کیا ڈیسمنڈ اسے بھی اپنا رقیب سمجھتا تھا۔

شکاری گھڑا

محمد عفنان آزاد

کھوج و جستجو کی کوئی حد نہیں... تاریخ کے اوراق پلٹتے جائیں تو ہمیشہ ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوتا ہے... اور پڑھنے والا آہستہ آہستہ اس طلسم کدے میں کھوتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی شخص کی مہم پسندی جو اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی... زمین کے اندر پوشیدہ خزانوں کی تلاش و دریافت کا سہرا وہ اپنے سر باندھنا چاہتا تھا۔
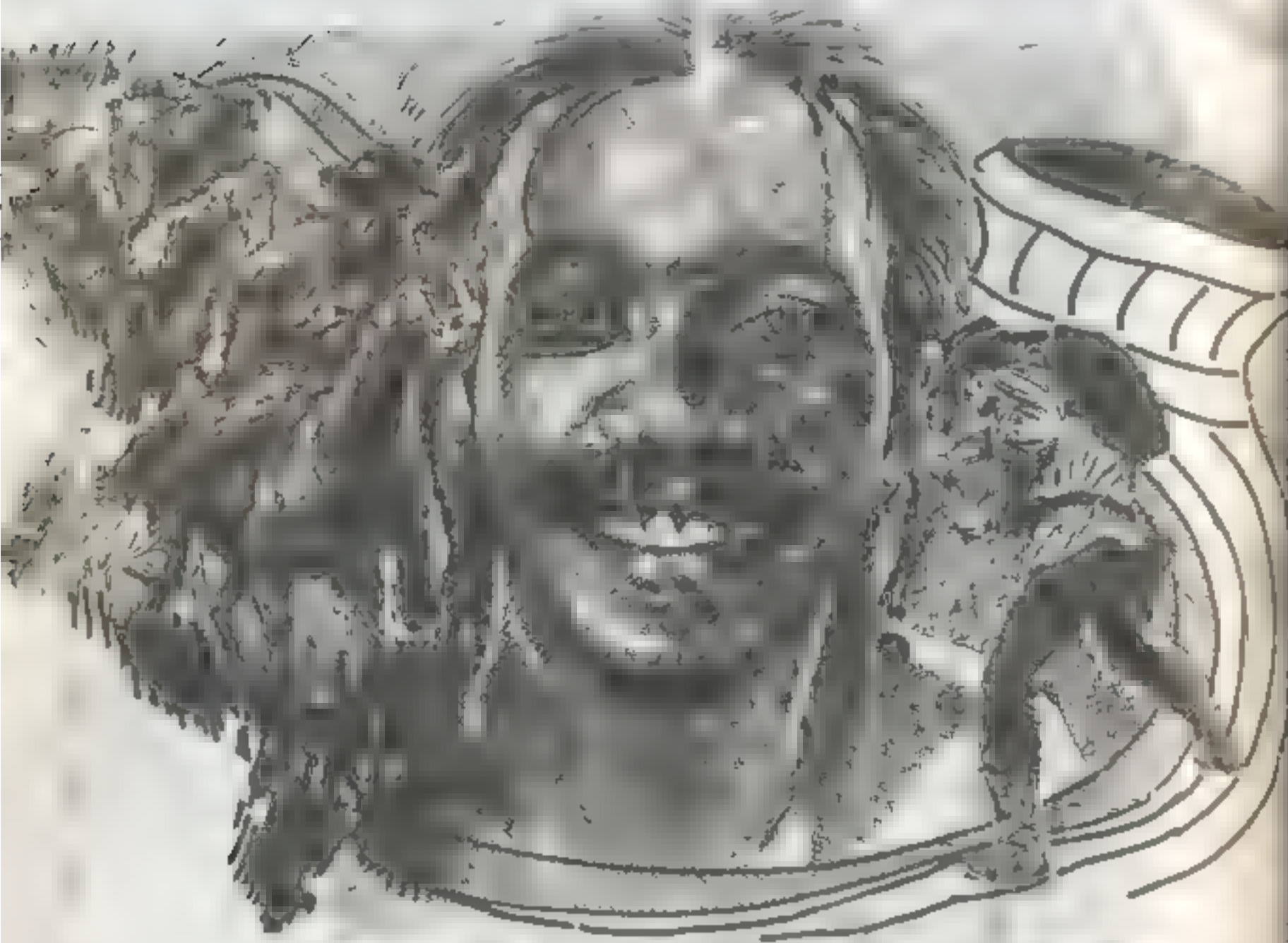
ایڈرٹ سان اُس وقت سی بتائی کے سائے تلے بیٹھا تھا۔ مقامی بولی میں یہ نام بادلوں کو چھوتی اُس اونچی چٹان کا تھا جس کا ایک حصہ ہوائی جہاز کے ایک پر کی طرح باہر نکلا ہوا تھا۔ اس چٹان کو یہاں آنے والے امریکی 'بحری جہاز' کہتے تھے۔ گھنے درختوں سے محروم، تپتے ریگ زار میں سی بتائی کا سایہ غنیمت تھا۔ اکثر چرواہے، مویشیوں کو ریگستان میں چھوڑ کے تپتی دھوپ سے بچنے کے لیے وہاں گھڑی دو گھڑی

کے لیے آکر بیٹھ جاتے تھے۔ ایدت سان بھی دم لینے کے لیے وہاں بیٹھا تھا۔ [illegible] سے اس کا بُرا حال تھا۔ اگر یہ سایہ نہ ہوتا تو وہ اس ریگستانی میدان میں پریشان ہونے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے جمی ہوئی تھیں۔ تیز دھوپ کے باعث ریگستانی سرزمین بھوری کے بجائے تپ کر سرخی رنگ میں بدل چکی تھی جس پر اس کی آنٹی کے پالتو مویشی جنگلی جھاڑیاں چر کر پیٹ بھر رہے تھے۔

ایدت سان خود تو سائے تلے بیٹھ گیا تھا مگر اپنے کتے کو دوڑا دیا کہ وہ مویشیوں کے اردگرد گھوم کر شکاری جانوروں کو اُن سے دور رکھے۔ وہ دوڑتا ہوا چلا گیا مگر کچھ دیر بعد ہی ہانپتا کانپتا واپس آگیا۔ گرمی کی شدت سے اُس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ بھی پیاس کے مارے [illegible] رہا تھا۔

ایدت سان جانتا تھا کہ دوپہر کا یہ وقت صرف آرام کا ہے۔ اس نے ایک بڑے چٹانی پتھر سے ٹیک لگائی، پاؤں پھیلائے اور نیم دراز حالت میں لیٹ گیا۔ وہی نہیں، اس کے آباؤاجداد بھی صدیوں سے اسی ریگستان کے باسی تھے۔ وہ بھی کبھی اس کی طرح اسی چٹانی سائے تلے، پتھر سے کمر ٹکا کر اپنے جانوروں کو چرتا دیکھتے تھے۔

ایدت سان قصے کہانیوں کا بہت شوقین تھا۔ وہ بچپن سے بڑوں سے سنتا آیا تھا کہ اس کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا جو کبھی میکسیکو کے اس پورے خطے میں بڑی مذہبی اہمیت کے باعث کسی [illegible] جانے [illegible] تھے۔ اس نے بڑوں سے سنا تھا کہ جب کیوا کا عظیم مندر ریت برد ہوا تو وہ اٹھ کر اس علاقے میں چلے آئے تھے۔ کیوا کا مندر کیا تباہ ہوا، اُن کے گھرانے کی مذہبی اہمیت ہی گھٹ کر رہ گئی اور رفتہ رفتہ لوگ بھولتے چلے گئے کہ کیوا مندر کے پیشوا کا اُن کے سماج میں کیا مقام تھا۔ اُس نے سنا تھا کہ ری بتائی کے میدان میں کئی بار اُن کے اور مخالف قبیلوں کے مابین جنگیں لڑی گئی تھیں۔ وہ خود کو بہت بہادر سمجھتا تھا۔ اسے اپنے قبیلے کے جواں مردوں کی بہادری کے قصے اچھے لگتے تھے۔

اب تو یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ جہاں وہ ستانے کے لیے ری بتائی کے [illegible] میں لیٹتا، اس کے تخیل کے پردے پر بزرگوں سے سنے قصے فلم کی صورت چلنے لگتے۔ اس وقت بھی وہ چشم تخیل سے جاگتے میں خواب دیکھ رہا تھا کہ سامنے میدان میں جنگ ہو رہی ہے... گھوڑے ادھر سے اُدھر دوڑ رہے ہیں... تلواریں چل رہی ہیں... فضا میں تیر اُڑ رہے ہیں... زخمی زمین پر تڑپ رہے ہیں اور لاشیں تپتی ریت پر گھوڑوں کے سموں تلے روندی جا رہی ہیں۔ ان نیزوں میں کھوئے ہوئے [illegible] اس کی آنکھ لگ [illegible] نہیں چلا تھا۔

[illegible] وہ بھی... وہ اپنے تصور میں [illegible] کے [illegible] بیٹھ کر، سامنے میدان [illegible] مویشیوں کی [illegible] کر رہے [illegible] سان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ [illegible] دل میں، پیچھے جانے [illegible] خواب میں [illegible] بھونکنے سے وہ عالم خواب میں بھی [illegible] وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کتا مستعدی سے کھڑا سامنے کی طرف دیکھتا ہوا بدستور بھونکے جا رہا تھا۔ ایدت سان نے آنکھیں ملیں اور سامنے کی طرف دیکھا۔ ایک گھڑسوار اُن کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے سکون کی سانس لی۔ کتے کے بھونکنے سے... وہ سمجھا کہ کوئی بکری بھیڑ [illegible] میں چلی گئی ہے مگر وہ [illegible]... [illegible] ایک بار پھر سامنے دیکھا۔ گھڑسوار اس کے کافی قریب تھا۔ ایدت سان اٹھا اور دو قدم آگے بڑھ کر کھڑا ہوگیا۔

وہ کاؤبوائے اسٹائل کا لباس اور ہرن کی کھال کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر بڑا سا چھجے دار ہیٹ تھا جس سے اس کا چہرہ بھی بڑی حد تک چھپ گیا تھا۔ وہ تیز گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور ایدت سان کے بالکل قریب [illegible] لگام کھینچی... ہانپتا گھوڑا ہنہناتا ہوا رک گیا۔ گھوڑے کی زبان باہر نکلی ہوئی اور خود سوار بھی پسینے میں شرابور [illegible] گیا کہ یہ بڑی دور سے آ رہے ہوں گے۔ "انگلش جانتے ہو؟" سوار نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

ایدت سان نے منہ سے [illegible] سر ہلا دیا۔

"یہ بہت اچھا ہوا۔" وہ [illegible] "مجھے ناواجو نہیں آتی۔ میرا نام گریفتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے [illegible] توقف کیا اور [illegible] غور سے اسے دیکھتے پوچھا۔ "تم... تمہارا نام کیا ہے؟"

جنوب مشرق کی سمت سے آنے والی ریلوے لائن امریکا میں بننے والے بہت [illegible] نیو میکسیکو کی سرزمین کے دروازے پہلی بار کھولے تھے۔ [illegible] سے پہلے ایسا نہیں تھا مگر اب ایدت سان جانتا تھا کہ غیر مقامیوں کو حیرت کی نظر سے [illegible] میں تاجر اور وہ [illegible] نیزوں کی تلاش میں [illegible]

[ری]وفین تھے جو قدیم سرخ فاموں کو مذہبی عقیدے پر چلانے [illegible] یہاں پہنچے۔ ان کے علاوہ وہ سیاح تھے جو قدرتی [illegible] سے [illegible] قدیم طرز کی زندگی بسر کرنے [illegible] سرخ فاموں کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ سب سے آخر میں وہ ماہرین بشریات و آثار قدیمہ تھے جن کا مقصد قدیم چیزوں اور تہذیبی آثار تلاش کرکے [illegible] کی تہذیبی تاریخ سے دنیا کو آگاہ کرنا تھا۔

[illegible] حال [illegible] سب سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ [illegible] سیاح کو چھوڑ کر گریفتی بھی باقی قسم کے لوگوں میں سے ہوگا۔ گرچہ ایدت سان ابھی کم عمر تھا مگر اس کی [illegible] بہت اچھی تھی جس کی وجہ سے وہ خاصا بڑا لگتا [illegible] پچھلے دو تین برسوں کے دوران میں وہ کئی غیرملکیوں کے [illegible] کا کام کرچکا تھا۔ اس سے اچھی خاصی آمدنی [illegible] جاتی تھی۔ گریفتی نے جس انداز سے اپنا تعارف [کرا]یا وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بھی اس سے کسی قسم کی خدمات لینا چاہتا ہے۔

اس کے گھر اور قبیلے والے ناواجو بولی میں اسے ایدت سان کہتے تھے، جس کا مطلب 'سننے والا' ہے۔ ایک نام اور تھا 'ایبے' جو اس کے مشنری اسکول والوں نے رکھا تھا۔ انہیں ناواجو بولی میں اس کا نام پکارنے میں دقت ہوتی تھی۔ جب گریفتی نے اس کا نام پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گیا [illegible] نام بتائے۔ "لوگ مجھے ایدت سان کہتے ہیں لیکن تم مجھے..."

"ابے... ویت..." اس نے قطع کلامی کرکے اٹکتے [illegible] نام لینا شروع کیا۔

"تم مجھے ایبے پکار سکتے ہو۔" ایدت سان نے مسکرا کر [illegible] وہ ناواردی مشکل سمجھ گیا۔

"اوہ..." گھڑسوار مسکرایا اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ "بات یہ ہے کہ مجھے عظیم کیوا شہر کی تلاش ہے جو [illegible] ریت میں مدفون ہے۔" اس نے اِردگرد نظر دوڑائی۔ "پچھلے دو ماہ سے وہ جگہ تلاش کر رہا ہوں مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ اس مقدس کی تلاش میں تم میری مدد کرتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے پُرامید نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ سنتے ہی وہ چونکا مگر فوری طور پر کچھ نہ کہا۔ مہم جوئی [illegible] فطرت میں تھی اور کافی عرصے سے وہ کہیں گیا بھی نہیں تھا۔ یہ سنتے ہی اس کی رگ پھڑک اٹھی۔ وہ مقامی [illegible] دوسرے باشندوں کی طرح اپنی زمین سے چپے چپے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُن کی تاریخ کا عظیم کیوا شہر ریت میں دفن ہوچکا ہے مگر [illegible] اس کے قصے سن چکا تھا۔ بہت عرصہ پہلے ایک بار اسے وہاں جانے کا موقع بھی ملا تھا۔ اس وقت اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا مگر عقل مندوں کی طرح اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ "میں تمہیں وہاں تک لے جاسکتا ہوں۔" کافی دیر بعد اس نے اپنی زبان کھولی۔

"واہ..." گریفتی نے خوش ہوکر کہا اور چھلانگ مار کر گھوڑے کی پشت سے اترا۔ اب وہ اپنے نوعمر گائیڈ سے معاملات طے کرنا چاہتا تھا۔ "آؤ... بیٹھ کر ساری باتیں طے کرتے ہیں۔" اس نے گھوڑے کی لگام تھامی اور سامنے پڑے بڑے پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ایدت سان خاموشی سے اس کے سامنے ریت پر اکڑوں بیٹھ کر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے امید تھی کہ اس کام کے بدلے اسے اچھا خاصا معاوضہ مل سکتا ہے۔

☆☆☆

چار دن تک گھوڑوں پر سفر کرنے کے بعد آخر وہ دونوں اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ وہ مقام چٹانوں کے درمیان دائرے کی شکل میں ایک بہت بڑے گڑھے کی صورت تھا جہاں ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ ایدت سان کے بزرگ کہتے تھے کہ کبھی یہیں عظیم کیوا اور اس کا عالی شان مندر واقع تھا مگر اب وہ ریت کے اس گڑھے میں دفن ہوچکا تھا۔ یہی مقام گریفتی کی منزلِ مقصود تھی۔

"بہت خوب۔" گریفتی نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں سے اترے۔ ان کی لگامیں ایک چٹان سے باندھیں۔ گریفتی ایک ہموار اور سایہ دار جگہ دیکھ کر خیمہ گاڑنے لگا۔ ایدت سان نے تھکے ماندے گھوڑوں کی پشت سے زین اتاری اور ان کی تھکن دور کرنے کے لیے، ان کی پیٹھ پر [illegible] لگا۔

"یہ لو تمہارا کمبل..." گریفتی نے بڑے سے تھیلے سے سامان باہر نکالتے ہوئے [illegible] پکار کر کہا۔

"رکھ دو، لیتا ہوں۔" ایدت سان نے جواب دیا۔ یہ کمبل اس کا واحد اثاثہ تھا جسے اس کی آنٹی نے نکلتے وقت دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چٹیل چٹانوں والے ریگستان کا دن چاہے جتنا گرم ہو مگر رات اتنی ٹھنڈی ہوتی ہے کہ کمبل کے بغیر سونا

اُصول پرست

سلیم فاروقی

خسارے کے سودے اور سود و زیاں کے سلسلے زندگی کو دشوار ہی نہیں... دشوار تر بنادیتے ہیں... وہ بھی اپنی زندگی کو اپنے عزائم کے ساتھ گزارنے کا متمنی تھا... مگر اچانک ہی ایک حادثے نے اس کی زندگی کے محور و مرکز کو ہلا ڈالا۔

میں ٹیوشن پڑھا کر نکلا تو بہت خوش تھا۔ اس دن مجھے ٹیوشن فیس ملی تھی۔ میں ایک ہی گھر کے دو بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ دونوں ''اولیول'' کررہے تھے۔ میں انہیں صرف فزکس اور میتھمیٹکس پڑھاتا تھا۔ اس کے عوض مجھے مہینے میں آٹھ ہزار ملتے تھے۔ وہ بنگلا مین روڈ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ مجھے تقریباً ایک ڈیڑھ میل تک پیدل چلنا پڑتا تھا کیونکہ وہاں کوئی سواری نہیں جاتی تھی۔

میں یونیورسٹی کے بعد ان بچوں کو پڑھانے کے لیے جاتا تھا۔ گرمیوں کی جھلستی، سُلگتی دوپہر میں یہ ڈیڑھ میل مجھے گویا ڈیڑھ سو میل لگتے تھے۔

بنگلے تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے پسینے میں شرابور ہوجاتے تھے۔ ایسے میں مجھے خود بھی اپنے آپ سے شرم آتی تھی۔ بنگلے کے آرام دہ اور خنک کمرے میں داخل ہوکر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں جہنم سے جنت میں آگیا ہوں۔ دونوں بچے تعلیم کے معاملے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھے۔ لڑکی تو پھر بھی میرا دیا ہوا ہوم ورک کرلیتی اور میری بات بھی سمجھ لیتی تھی

لیکن لڑکا بہت غیر سنجیدہ تھا۔ شاید اسی لیے وہ تعلیم میں پیچھے رہ گیا تھا اور اس کی چھوٹی بہن اس کے برابر پہنچ گئی تھی۔ میں اگر چاہتا تو اس خودسر اور نخریلے لڑکے کو ایک دن میں سیدھا کرسکتا تھا لیکن میں ان بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا اس لیے بس دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتا۔

یونیورسٹی کے بعد ان بچوں کے ساتھ مغزماری کرنے میں میرے دماغ کی چولیں ہل جاتی تھیں۔

وہ دونوں شہر کے ایک معروف بزنس مین احسان الحق کے بچے تھے۔ اس بنگلے میں ان دونوں بچوں کے علاوہ مسز احسان اور احسان صاحب کی والدہ بھی رہتی تھیں جو بیماری کے باعث اپنے کمرے میں پڑی رہتی تھیں۔ بنگلے کے مکین اس لحاظ سے بااخلاق تھے کہ وہاں میرے ساتھ تحقیر آمیز سلوک نہیں ہوتا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ایک ملازم پہلے مجھے ٹھنڈا یخ پانی دیتا، پھر تھوڑی دیر بعد چائے لے آتا۔

وہاں سے ملنے والے آٹھ ہزار روپے میری تعلیم کے کام آتے تھے۔ میں نے مختلف جگہ ٹیوشن پڑھائی تھی لیکن اپنی خوددار طبیعت کے باعث کہیں ٹِک کر نہ پڑھا سکا۔ ان میں سے بہت سے والدین کا مزاج ایسا تھا کہ وہ مجھ سے اپنی خانگی ملازمین ڈرائیور، خانساماں اور مالی والا سلوک کرتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ مجھے برآمدے سے اندر بھی داخل نہ ہونے دیتے لیکن اس سے ان کے نازو نعم میں پلے ہوئے بچوں کو تکلیف ہوتی اس لیے میری رسائی ان کے ڈرائنگ روم تک ہوجاتی تھی۔ بچے بھی ایسے نخریلے کہ کبھی پڑھنے کا موڈ ہے تو پڑھ لیا ورنہ ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ آج ہم نہیں پڑھیں گے۔ مجھے مجبوراً واپس جانا پڑتا تھا۔

یہ تمام ٹیوشنز ڈیفنس اور کلفٹن جیسے پوش علاقوں میں تھیں جہاں پبلک ٹرانسپورٹ نہیں جاتی تھی اور مجھے کافی پیدل چلنا پڑتا تھا۔

میں اپنے محلے میں بھی ٹیوشن پڑھا سکتا تھا لیکن وہاں مجھے اتنے پیسے کون دیتا؟

احسان الحق صاحب کا گھر واحد گھر تھا جہاں میری عزتِ نفس مجروح نہیں ہوئی تھی۔ بس ان کے بیٹے عدنان کے ساتھ ذرا زیادہ مغزماری کرنا پڑتی تھی۔ اس کے لیے میں نے خود سے سمجھوتا کرلیا تھا۔

میری پیدائش سے پہلے ابو فروٹ کا ٹھیلا لگایا کرتے تھے لیکن اب انہوں نے سبزی منڈی میں چھوٹی سی ایک دکان کرائے پر لے لی تھی۔

اماں تو چاہتی تھیں کہ میں میٹرک کرنے کے بعد کوئی

ملازمت کرلوں یا کاروبار میں ابو کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میٹرک میں جب میرا اے ون گریڈ آیا تو ابو نے مشورہ دیا کہ تم اپنی صلاحیتوں کو ضائع مت کرو اور کسی کالج میں داخلہ لے لو۔ گھر کے اخراجات تو جیسے تیسے چل ہی رہے ہیں۔ میرے تمام اساتذہ بھی اس بات سے متفق تھے کہ مجھے تعلیم نہیں چھوڑنی چاہیے۔

مجھے شہر کے ایک بہترین کالج میں ایڈمیشن مل گیا۔ داخلے کے اخراجات تو ابو نے کسی نہ کسی طرح برداشت کرلیے لیکن وہ میرے مزید تعلیمی اخراجات اٹھانے کے متحمل نہیں تھے۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ وہ سب بھی پڑھ رہے تھے۔ ابو نے خود تو تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن وہ حتی المقدور اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتے تھے۔

ہم لوگ لیاقت آباد میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ یہ بھی دادا جان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے اچھے وقتوں میں یہ مکان خرید لیا تھا۔ ابو اپنے والدین کے اکلوتے تھے اس لیے اب یہ مکان ہماری ملکیت تھا۔

میں کالج سے واپس آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا

پھر اپنے بہن بھائیوں راشد اور ساجد کو پڑھانے بیٹھ جاتا۔ میں چاہتا تھا کہ میری طرح میرے بھائی بھی تعلیمی میدان میں اچھی پوزیشن حاصل کریں۔ نائلہ ابھی چھوٹی تھی لیکن وہ بھی اپنا قاعدہ اور کاپی لے کر آجاتی کہ مجھے بھی پڑھائیں۔ میں اسے بھی پڑھا دیتا اور وہ حیرت انگیز طور پر پہلی ہی دفعہ میں سبق یاد کر لیتی۔

جب محلے والوں نے یہ سنا کہ امجد اپنے بہن بھائیوں کو پڑھاتا ہے تو انہیں بھی اپنے بچوں کو پڑھانے کا خیال آیا۔

یوں محلے کے پندرہ بیس بچے جمع ہو گئے جن سے میں پچاس روپے فیس لیتا تھا۔

اس فیس میں مجھے تمام مضامین پڑھانا پڑتے تھے۔

یوں ٹیوشن فیس کی مد میں مجھے تقریباً ایک ہزار روپے مل جاتے تھے۔ ایک ہزار روپے کی حقیقت ہی کیا ہے لیکن اس سے میں اپنے اور اپنے بہن بھائیوں کے اخراجات پورے کر لیتا تھا۔ اپنے کپڑے بنا لیتا تھا لیکن شام سے رات تک میرا گھر گویا اسکول بنا رہتا تھا۔

ہمارے محلے میں شیخ صاحب خاصے صاحب حیثیت تھے۔ لیاقت آباد میں ان کی سیمنٹ اور لوہے، سریے کی دکان تھی۔ ان کا گھر بھی دو منزلہ تھا۔

ایک دن وہ میرے پاس آئے اور بولے۔ ''امجد میاں! میں نے سنا ہے کہ تم بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہو؟'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''چچا جان! یہ بات تو پورا محلہ جانتا ہے۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔ میں محلے کے دوسرے لڑکوں کی طرح انہیں چچا جان کہتا تھا۔

''بھئی، یہ تو چراغ تلے اندھیرے والی بات ہوئی... تم اس نالائق رمضان کو بھی پڑھا دیا کرو۔'' رمضان ان کا کند ذہن اور نکما بیٹا تھا۔ ''فیس کی پروا مت کرنا۔ بس پڑھنے لکھنے میں اس کا دل لگ جائے۔''

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ''چچا جان! آپ کے مکان کی اوپر والی منزل خالی ہے نا؟''

''ہاں بیٹا خالی تو ہے لیکن میں اسے کرائے پر نہیں دوں گا۔ میں نے یہ مکان اپنے لیے بنایا ہے۔ اکثر پنجاب سے مہمان آجاتے ہیں تو وہ منزل ان کے کام آتی ہے۔''

''میں کسی کو کرائے پر دینے کی بات نہیں کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ بچوں کو ایک دو گھنٹے کے لیے آپ کے گھر میں پڑھاؤں۔ مجھے صرف ایک کمرے کی ضرورت ہے، وہ بھی صرف دو گھنٹے کے لیے۔ اگر آپ اجازت دے دیں تو میں بچوں کو وہاں پڑھا دیا کروں اور ٹیوشن فیس بھی میں آپ سے نہیں لوں گا۔''

شیخ صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن جب تم بچوں کو وہاں پڑھاؤ گے تو بجلی بھی خرچ ہوگی، پنکھا بھی چلے گا۔ تم یوں کرو، مجھے ہر مہینے بس دو سو روپے دے دیا کرو۔''

موجودہ کرائے کے حساب سے وہ بہت کم پیسے مانگ رہے تھے اور وہ کرایہ مجھے ڈیڑھ سو روپے ہی میں پڑ رہا تھا۔ جگہ کی کمی کے باعث میں اب تک محلے کے کم سے کم چھ سات بچوں کو واپس کر چکا تھا۔ میں اگر شیخ صاحب کا مکان لے لیتا تو میری آمدنی دگنی ہو جاتی۔

''سوچ کیا رہے ہو بیٹا؟'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''میں تو تم سے بالکل پیسے نہ لیتا لیکن آج کل بجلی کے ریٹ بھی تو بہت بڑھ گئے ہیں پھر بچوں کی وجہ سے مکان کا رنگ، روغن بھی خراب ہوگا اس لیے...''

''چلیے، مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں شام کو پانچ بجے سے سات بجے تک آپ کا مکان استعمال کروں گا۔''

شیخ صاحب خاصے صاحب حیثیت بلکہ دولت مند تھے۔ وہ چاہتے تو اپنا مکان یوں بھی دے سکتے تھے لیکن ان کے اندر جو کاروباری آدمی بیٹھا تھا، وہ ان باتوں کو کب سمجھتا تھا۔

یوں شیخ صاحب کے گھر کی بالائی منزل پر میں بچوں کو پڑھانے لگا۔ دو ہی مہینے میں وہ گھر چھوٹے سے ایک ٹیوشن سینٹر میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے اپنی مدد کے لیے اپنے دونوں بھائیوں کو بھی لگا لیا تھا۔ چھوٹی کلاس کے بچوں کو وہ بھی پڑھا دیتے تھے۔ وہ خود بھی بہت اچھے طریقے سے پڑھ رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میری طرح میٹرک میں اے ون گریڈ لائیں گے۔

شیخ صاحب کا بیٹا رمضان میری توقع سے زیادہ غبی اور کند ذہن ثابت ہوا۔ میں اس پر خصوصی توجہ دیتا تھا لیکن وہ کم بخت آگے کا سبق یاد کرتا تھا تو پچھلا سب کچھ بھول جاتا تھا۔

اس ٹیوشن سینٹر سے مجھے کرایہ دینے کے بعد تین ساڑھے تین ہزار کی آمدنی ہو جاتی تھی۔ ان پیسوں سے ہمارے گھر میں بھی کچھ خوش حالی آگئی تھی۔ میں خود بھی اچھا لباس پہننے لگا تھا اور میرے دونوں بھائی بھی اجلے کپڑوں میں رہتے تھے۔

ٹیوشن سینٹر سے فارغ ہو کر میں رات کو دیر تک خود بھی پڑھتا رہتا تھا۔

اماں اکثر کہتی تھیں۔ ''امجد بیٹا! تو کم سے کم رات کو ایک گلاس دودھ ہی پی لیا کر۔ اتنی سخت محنت کرے گا تو دماغ میں خشکی پیدا ہو جائے گی۔''

مجھے دودھ سے نہ جانے کیوں چڑ تھی۔ میں نے کبھی دودھ نہیں پیا۔ ہاں، میں رات کو پڑھنے کے دوران وقفے وقفے سے چائے پیتا رہتا تھا۔

میرے انٹر کے امتحانات ہوئے تو حسب توقع میری پرسنٹیج بانوے فیصد تھی۔ مجھے بہت آسانی سے این ای ڈی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔

اچانک کسی نے شیخ صاحب کے دل میں ڈالا کہ اس ٹیوشن سینٹر سے تو امجد ہزاروں کما رہا ہے۔ اگر وہ دو تین لڑکے رکھ کر خود ہی ٹیوشن سینٹر چلائیں تو انہیں ہزاروں روپے کی آمدنی ہو سکتی ہے۔

ایک دن میں بچوں کو پڑھا کر فارغ ہوا اور ان کے بیٹے رمضان کو پڑھا رہا تھا کہ شیخ صاحب دھب دھب کرتے اوپر آگئے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔

وہ مسکرا کر بولے۔ ''وعلیکم السلام، جیتے رہو۔ کیسا چل رہا ہے یہ نالائق؟'' انہوں نے رمضان کی طرف اشارہ کیا۔

وہ نالائق اس سال کسی نہ کسی طرح اپنی کلاس میں پاس ہو گیا تھا۔ یہ بھی میری ہی مغز ماری کا نتیجہ تھا۔

''اب تو یہ پڑھنے میں دل لگانے لگا ہے چچا جان۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''رمضان!'' انہوں نے بیٹے سے کہا۔ ''جا، بھائی کے لیے ایک ٹھنڈی بوتل لے کر آ۔''

''ارے چچا جان! اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

رمضان کو تو وہاں سے اٹھنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ وہ فوراً وہاں سے غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد سیٹھ صاحب کچھ دیر خاموش بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے پھر بولے۔ ''بیٹا امجد! بات یہ ہے کہ آج کل میرا ہاتھ کچھ تنگ ہے۔ میں اپنا مکان کرائے پر اٹھانا چاہتا ہوں۔''

میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اس دو سال کے عرصے میں میرا ٹیوشن سینٹر خوب جم گیا تھا اور اب تو وہاں سے پانچ ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی ہو رہی تھی۔ یونیورسٹی

کے اخراجات منہ پھاڑے سامنے کھڑے تھے اور شیخ صاحب کہہ رہے تھے کہ میں مکان خالی کر دوں۔ انہوں نے زبان سے تو نہیں کہا تھا لیکن ان کا مطلب تو یہی تھا۔

''لیکن چچا جان! آپ نے تو کہا تھا کہ آپ یہ مکان کرائے پر نہیں اٹھائیں گے؟'' میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

اس دوران میں رمضان کولڈ ڈرنک ... دے کر پھر غائب ہو گیا تھا۔

''بیٹا! میں مکان کبھی کرائے پر نہ اٹھاتا لیکن پچھلے دنوں مجھے کاروبار میں بہت نقصان ہو گیا ہے۔ سیمنٹ کی ایجنسی بھی ہاتھ سے نکل گئی ہے اس لیے...''

میں جانتا تھا کہ ان کے سریے اور لوہے کا کاروبار اتنا بڑھ گیا ہے کہ انہوں نے خود ہی سیمنٹ کی وہ ایجنسی اپنے بھائی کو دے دی ہے۔

''چچا جان! آپ اس مکان کا کتنا کرایہ لیں گے؟'' میں نے پوچھا۔ شاید وہ اتنا کرایہ مانگتے کہ میں خود انہیں وہ کرایہ دے سکتا۔

''بیٹا! تم تو جانتے ہو کہ آج کل مکانوں کے کرائے اور قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ میرا یہ مکان بھی ساڑھے پانچ ہزار روپے میں تو آرام سے کرائے پر اٹھ جائے گا۔ نیا مکان ہے ایسے مکان اس علاقے میں ملتے کہاں ہیں۔''

''ساڑھے پانچ ہزار!'' میرا دل ڈوبنے لگا۔

''میں پندرہ ہزار ایڈوانس لوں گا۔ گیس اور بجلی کا بل کرائے دار خود دے گا۔'' انہوں نے مجھے مزید ہلایا۔

''آپ مجھے دو تین مہینے کی مہلت دے دیں۔ اس دوران میں کوئی دوسری جگہ دیکھ کر میں آپ کا مکان خالی کر دوں گا۔''

''نہیں بیٹا'' انہوں نے اس مرتبہ خشک لہجے میں کہا۔ ''میں نے پہلی تاریخ کو یہ مکان کرائے پر دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں نے تو ان لوگوں سے ایڈوانس بھی پکڑ لیا ہے۔''

''اچھا، آپ مجھے پانچ تاریخ تک کی مہلت دے دیں۔ اس وقت تک مجھے بچوں سے ٹیوشن فیس مل جائے گی ورنہ کوئی بھی بچہ فیس نہیں دے گا۔'' میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''بیٹا! میں نے تم سے کسی قسم کا ایڈوانس نہیں لیا تھا۔ تم نے کہا اور میں نے تمہیں اپنا مکان دے دیا۔ میں اگر

کرایے داروں سے وعدہ نہ کر چکا ہوتا تو تمہیں پانچ کیا دس پندرہ تاریخ تک کی مہلت بھی دے دیتا لیکن بندے کی زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ تمہیں یہ مکان تیس تاریخ تک خالی کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے چچا جان! آپ کہتے ہیں تو میں مکان تیس تاریخ تک خالی کردوں گا۔"

"امجد بیٹا! برا مت ماننا، انسان کبھی کبھی بہت مجبور ہو جاتا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کاش آپ واقعی اتنے مجبور ہو جائیں، تب آپ کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا لیکن میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور انہیں سلام کر کے وہاں سے نکل آیا۔ مکان کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ آمدنی کا ایک ذریعہ بند ہوگیا تھا۔ انجینئر بننے کا خواب ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

پھر میں نے سوچا، اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ رزق کا ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دس دروازے نئے کھول دیتا ہے۔ میں خاموشی سے گھر آ کر لیٹ گیا۔

جب میں نے ابو کو بتایا کہ شیخ صاحب نے اپنا مکان خالی کرنے کو کہا ہے تو انہیں یقین نہیں آیا۔ وہ مجھ سے بولے۔ "ارے ان کے حالات تو بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی تو وہ کسی سے ایک نیا ٹرک خریدنے کی بات کر رہے تھے۔ وہ صرف اپنا مکان خالی کرانا چاہتے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو ابو۔" میں نے کہا۔ "اب میں تو انجینئر تک نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟" ابو نے کہا۔ "تو فکر کیوں کرتا ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں بیٹا! تیری برسوں کی محنت کو یوں ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ تو انجینئر بنے گا اور ضرور بنے گا۔" ابو نے میری ڈھارس بندھائی۔

"بھائی جان! ہم اس علاقے میں کوئی ایک کمرے کا مکان ڈھونڈتے ہیں۔ ایک آدھ ہفتے میں ہمیں کوئی کمرا مل ہی جائے گا۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟"

میں بھی اس رات دیر تک جاگتا رہا پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

دونوں بھائیوں نے دوسرے ہی دن سے مکان کی تلاش شروع کر دی لیکن بہ قول شیخ صاحب کے مکان کے کرائے واقعی آسمانوں سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے کوئی ڈھنگ کا مکان نہ مل سکا اور جو مکان ملا بھی تو اس کا کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ میں اگر وہ کرائے پر لے لیتا تو میری ساری آمدنی تو کرائے ہی میں نکل جاتی۔

میں نے یونیورسٹی میں داخلہ البتہ لے لیا تھا۔ مسئلہ آئندہ کے اخراجات کا تھا۔

مجھے محلے کے ایک بچے سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب نے اپنے مکان میں خود ٹیوشن سینٹر کھول لیا ہے اور دو تین لڑکوں کو ملازم رکھ لیا ہے۔ مجھے اس بات پر صدمہ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ شیخ صاحب بہرحال اپنے مکان کے مالک تھے اور وہ اس میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ اب مجھے کہیں ملتے تھے تو کترا کر نکل جاتے تھے۔

میں نے دوبارہ اپنے گھر پر بچوں کی ٹیوشن کا سلسلہ شروع کیا لیکن اب وہ صورت حال پیدا نہ ہو سکی۔

ایک دن میرے ایک کلاس فیلو نے بتایا کہ وہ ڈیفنس اور کلفٹن میں "اولیول" کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہے اور اسے پندرہ سے بیس ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہو جاتی ہے۔

میں نے اس سے کہا۔ "یار اقبال! اگر ہو سکے تو ایک دو ٹیوشنز مجھے بھی دلوا دو۔ میں بھی آج کل شدید مالی مشکلات کا شکار ہوں۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" اقبال نے کہا۔ "اچھے ٹیوٹرز آج کل ملتے ہی کہاں ہیں اور ان علاقوں میں تو لوگ فی مضمون کے حساب سے معاوضہ دیتے ہیں۔ میں صرف میتھس پڑھاتا ہوں اور ایک بچے کے تین ہزار اور چار ہزار روپے لیتا ہوں۔ یونیورسٹی کے بعد میں تین گھنٹے اس میں لگاتا ہوں۔"

اس کے پاس بائیک بھی تھی۔ وہ میٹرک کرنے کے بعد ہی سے ٹیوشنز پڑھا رہا تھا اور کھلے ہاتھ سے خرچ کرتا تھا۔ میری طرح اس کا تعلق بھی ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کے والد کی پرچون کی دکان تھی۔

دو دن بعد ہی اقبال نے میرے لیے دو بچوں کی ٹیوشن کا بندوبست کر دیا لیکن ڈیفنس کے اس علاقے میں جانا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ مجھے میلوں پیدل چل کر وہاں جانا پڑتا تھا۔ یوں یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر خود ہی ان بچوں کے ذریعے میرے رابطے دوسرے بچوں سے ہوتے گئے لیکن ساتھ ہی جہاں میری عزتِ نفس مجروح ہوتی میں وہاں پڑھانا چھوڑ دیتا۔

☆☆☆

میں ٹیوشن فیس کے آٹھ ہزار جیب میں رکھ کر اٹھا تو مجھے نہ تو گرمی کی شدت کا احساس تھا، نہ پیدل چلنے میں اتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ مجھے وہاں سے خیابانِ شمشیر تک پیدل

پھر مجھے سلطان مسجد سے بس ملتی تھی۔

میں اپنی دھن میں مگن جا رہا تھا کہ مجھے احسان [صاحب] نظر آئے۔ وہ اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے [دیکھ ک]ر انہوں نے گاڑی رکوائی اور اپنی طرف کا شیشہ اتار [دیا۔]

میں سڑک پار کر کے ان کے پاس پہنچا اور انہیں سلام [کیا۔]

[وہ] مسکرا کر بولے۔ "امجد صاحب! آپ پیدل ہی [جا رہے] ہیں؟"

"کیا کروں سر! ابھی تک میرے پاس کوئی سواری [نہیں] ہے لیکن آئندہ مہینے ان شاء اللہ اپنی بائیک لے لوں [گا۔]

"چلیے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔" انہوں نے [کہا۔]

"شکریہ سر!" میں نے ممنونیت سے کہا۔ "میں نے [آدھ]ے سے زیادہ فاصلہ تو طے کر لیا ہے اب اسٹاپ زیادہ [دور نہ]یں ہے۔"

وہ مسکرائے اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔

میں پھر تیز تیز قدم رکھتا بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو [گیا۔ ڈیف]نس کا وہ علاقہ یوں بھی سنسان ہے اور اس وقت تو [اک]ا دکا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

اچانک میرے پیچھے سے ایک موٹر سائیکل آئی اور [میر]ے سامنے رک گئی۔ موٹر سائیکل پر دو نوجوان سوار [تھے۔] وہ اپنے حلیوں ہی سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ ان [میں س]ے ایک گٹکا کھا رہا تھا۔ اس نے اپنی کمر میں اڑسی ہوئی [گ]ن کی ایک جھلک مجھے دکھائی اور بولا۔ "چل نکال، کیا ہے [تیر]ے پاس؟"

"میں غریب آدمی ہوں، میرے پاس کیا ہو سکتا [ہ]ے۔" میں نے کہا۔

"زیادہ باتیں مت بنا، جلدی کر۔" دوسرا بولا۔ "[ہمار]ے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ چل موبائل نکال اور [پیس]ے۔"

میرے ساتھ اس طرح کا واقعہ پہلی دفعہ پیش آیا تھا۔ [لوگوں] سے اس قسم کے واقعات سنے ضرور تھے۔ میں نے [سن]ا تھا کہ اگر ان لوگوں کی بات نہ مانی جائے تو وہ گولی [چلا]نے میں بھی دیر نہیں کرتے۔ میں نے خاموشی سے اپنا [موبائل] نکالا اور ان کے حوالے کر دیا۔

"اب تو یہاں رہتا ہے اور یہ قسمت موبائل استعمال کرتا ہے؟" گٹکا کھانے والے نے کہا۔ "چل پیسے نکال۔"

"میرے پاس صرف بس کے کرائے کے پیسے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا نا جلدی کر۔" اس نے کہا اور گن نکال کر میرے پیٹ پر رکھ دی۔ میں نے چار و ناچار جیب سے پیسے نکالے اور اس کے حوالے کر دیے۔

"ابے ہم سے اڑ رہا تھا۔ بس میں کیا اتنا کرایہ لگتا ہے؟" اس نے کہا اور بہت شاہانہ انداز میں ہزار روپے کا

...سے شعور

ماں نے دروازے پر گندے ہاتھوں کے نشان دیکھے تو بچے کو ڈانٹنے لگی۔

"تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ گندے ہاتھوں سے دروازہ نہ کھولا کرو۔ یہ دیکھو، دروازہ کتنا گندہ کر دیا ہے تم نے۔"

بچہ سادگی سے بولا۔ "امی! یقین کیجیے۔ میں نے دروازہ گندہ نہیں کیا۔ میں تو ہمیشہ پیروں سے دروازہ کھولتا ہوں۔"

دیکھو تو

کسی شخص نے ایک گدھی اور ایک خنزیر (سور) پال رکھا تھا۔ وہ خنزیر کو بڑی اچھی گھاس کھلایا کرتا تھا لیکن گدھی کو معمولی چیزیں کھانے کو دیا کرتا تھا۔ گدھی کا بچہ مالک کی اس ناانصافی کو غم و غصے سے دیکھتا اور نظریں بچا کے خنزیر کی ہری بھری گھاس پر منہ مار آیا کرتا تھا۔ ایک دن اس کی یہ حرکت گدھی نے بھی دیکھ لی۔ اس نے بچے کو ڈانٹا اور کہا۔ "خبردار! جو تو نے پھر کبھی خنزیر کی گھاس کھائی ورنہ تیرا بھی وہی انجام ہوگا جو اس کا ہونے والا ہے۔"

بچہ ماں کی بات نہیں سمجھا اور معمول کے مطابق چوری چھپے خنزیر کی گھاس کھاتا رہا۔

ایک دن بچے نے دیکھا، اس کا مالک خنزیر کو ذبح کر رہا ہے۔ بچہ بھاگ کر ماں کے پاس پہنچا اور خوف کے مارے ماں کے سامنے منہ کھول کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "ماں! ذرا میرے منہ میں جھانک کے تو دیکھو کہیں کوئی گھاس کا ٹکڑا ادھر ادھر پھنسا تو نہیں رہ گیا؟"

(حسن ابدال سے ریاض بٹ کی سوغات)

ایک نوٹ میری طرف پھینک دیا۔ ”جا ہماری طرف سے ٹیکسی میں چلا جانا۔“ اس نے میرے ہی پیسے لے کر شاہانہ انداز میں کہا اور دونوں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

غصے کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ اگر ان کے پاس گن نہ ہوتی تو شاید میں ان دونوں سے بھڑ جاتا۔ میں اپنے خون پسینے کی کمائی اتنی آسانی سے ان کے حوالے نہ کرتا۔ میں نے ان کے حلیے اور موٹر سائیکل کا نمبر ذہن نشین کر لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان کے خلاف پولیس میں رپورٹ کر دوں، پولیس ان کے حلیے اور موٹر سائیکل کے نمبر سے انہیں گرفتار کرنے میں دیر نہیں کرے گی۔

مجھے پتا نہیں تھا کہ اس علاقے کا پولیس اسٹیشن کہاں ہے؟

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ملازم نما ایک شخص نظر آیا۔ میں نے اس سے پولیس اسٹیشن کا پتا پوچھا۔ معلوم ہوا کہ پولیس اسٹیشن وہاں سے کافی دور ہے لیکن میں نے بھی آج ٹھان لی تھی کہ میں ان اُچکوں کی رپورٹ ضرور درج کراؤں گا۔

سلطان مسجد سے مجھے پولیس اسٹیشن کے لیے بس بھی مل سکتی تھی لیکن پیسے بچانے کی خاطر میں پیدل ہی روانہ ہو گیا۔

میں تھانے پہنچا تو گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا، پھر اکھڑ لہجے میں بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”مجھے رپورٹ درج کرانا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیسی رپورٹ، کس کی رپورٹ؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے میں غلطی سے پولیس اسٹیشن کے بجائے کہیں اور آ گیا ہوں۔

خاصی بحث کے بعد اس نے مجھے اندر جانے کی اجازت دی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رپورٹ کہاں درج ہوتی ہے۔ میں پولیس اسٹیشن کے برآمدے میں داخل ہوا۔

برآمدے میں ایک کرسی پر کالا سا ایک سپاہی بیٹھا اونگھ رہا تھا میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”جناب! یہ رپورٹ کہاں درج کی جاتی ہے؟“

اس نے بولنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی بس ہاتھ کا اشارہ کر کے پھر اونگھنے لگا۔ میں مزید آگے بڑھا تو مجھے ایک کمرے پر ہیڈ محرر کے نام کی تختی نظر آئی۔ میں [illegible] میں داخل ہو گیا۔ میں نے سنا تھا کہ رپورٹ ہیڈ [illegible] کرتا ہے۔

ہیڈ محرر نے اپنی شرٹ کے بٹن کھول رکھے [illegible] دونوں پیر اس نے سامنے ایک کرسی پر رکھے [illegible] وہ ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

اس نے ایک طائرانہ سی نظر مجھ پر [illegible] بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ”او فکر نہ کر یار! [illegible] آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔ کھانا تو تجھے کھلا [illegible] کیوں؟... اب بھی پوچھتا ہے کہ کیوں؟... مرضی کا تھانہ تجھے مل گیا ہے، رج کے [illegible] اوئے... میں...“

میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ [illegible] آواز میں کہا۔ ”ایکسکیوز می!... میں...“

”کیا بات ہے، اوئے؟“ اس نے اکھڑ [illegible] پھر ریسیور پر بولا۔ ”نہیں یار! تجھ سے نہیں کہہ رہا، تجھے ابھی دوبارہ ٹیلی فون کرتا ہوں۔“

اس نے ریسیور رکھا اور گھور کے دیکھا۔

”مجھے ایک رپورٹ درج کرانا ہے۔“ میں [illegible]

”کس بات کی رپورٹ؟ کیا کسی نے تم [illegible] چرا لی ہے یا پھر کوئی زمین، پلاٹ چھین لیا ہے؟“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے گن پوائنٹ پر [illegible] نے لوٹ لیا ہے؟“

”گن پوائنٹ پر؟“ وہ یوں حیرت سے بولا [illegible] پوائنٹ پر لٹنے کا واقعہ پہلی دفعہ اس کے علم میں آیا ہو۔

”کیا لوٹا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا پرس اور موبائل فون۔“ میں نے جو [illegible]

”اوئے، یہ تو روز کی واردات ہے، کتنے [illegible] پرس میں؟“ اس نے پوچھا۔

”آٹھ ہزار روپے [illegible] میرا قومی شناختی [illegible] یونیورسٹی کا کارڈ، اس کے علاوہ میرا موبائل بھی تھا۔“

”اور تم اس رقم کی رپورٹ لکھانے تھانے آ [illegible]“

”تو اور کہاں جاؤں؟“ میں نے کہا۔

”اوئے، یہاں تو لوگوں کی گاڑیاں چھن جا [illegible] لاکھوں روپیا کیش اور لاکھوں روپے کا زیور چھین جا [illegible] اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ تم اپنے آٹھ ہزار کو رو [illegible]“

”اس پرس میں میرا قومی شناختی کارڈ تھا۔“ [illegible]

[illegible] لیے پتا [illegible]

[illegible]چا۔ اس کی ایف آئی آر میں کاٹ دیتا [illegible] نے گویا میری سات پشتوں پر احسان کرتے [illegible] تین سو روپے نکالو۔“

”تین سو روپے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ [illegible] کے جناب؟“

”یار! ہمیں سرکار کی طرف سے اسٹیشنری ملتی ہے نہ [illegible] سہولت۔ اب ہم عوام کی خدمت کریں تو کیسے؟“

”میں نے ابھی تو آپ کو بتایا ہے کہ میرے پاس [illegible] جو پیسے تھے وہ اُچکے لے گئے۔“

”بغیر پیسوں کے تو ایف آئی آر نہیں کٹتی۔“ اس نے [illegible] کہا۔ ”جاؤ گھر سے پیسے لے کر آؤ۔“

”میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔“ میں نے کہا۔ [illegible]”کیا مجھے ان تین سو روپے کی رسید دیں گے؟“

”تو مجھ سے رسید مانگ رہا ہے؟“ وہ بپھر کر بولا۔ [illegible]“

”آپ پلیز تمیز سے بات کریں۔“ میں نے بمشکل [illegible] برقرار رکھا۔ مجھ میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ میں [illegible] بدتمیزی برداشت کرتا تھا نہ کبھی بولتا تھا۔ میں نے اسی [illegible] خاطر تو اچھی اچھی ٹیوشنز چھوڑ دی تھیں۔ وہ دو ٹکے [illegible] کا آدمی مجھ سے اس لہجے میں بات کر رہا تھا جو ہمارے ہی [illegible] پاتا تھا۔

”میں تجھے ابھی اچھی طرح تمیز سکھا دوں گا۔“ ہیڈ [illegible] بپھر کر بولا۔ ”ابھی اٹھا کر بند کر دوں گا تو ساری تمیز [illegible] سے نکل جائے گی۔“

”تم عوام کے خادم ہو یا آقا؟“ میں نے بپھر کر کہا۔ [illegible] تو بات کرنے تک کی تمیز نہیں ہے۔ میں ابھی [illegible] ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔“

”محمد خان!“ اس نے ہانک لگائی۔

دوسرے ہی لمحے کسی کمرے سے ایک لمبا تڑنگا آدمی [illegible] ہوا۔ وہ صرف بنیان اور دھوتی میں ملبوس تھا۔

”اسے بتاؤ کہ افسروں سے کیسے بات کی جاتی [illegible]

محمد خان آگے بڑھا، پھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، [illegible] گدی پر ایک زوردار ہاتھ رسید کیا۔ میں جھٹکے سے آگے [illegible] اس نے میرا کالر پکڑ لیا اور مجھے پیچھے کی طرف کھینچ کر [illegible] منہ پر اس سے بھی زیادہ زور سے تھپڑ مارا۔ اس [illegible] کا ہاتھ اتنا سخت تھا کہ میرے بائیں گال میں جیسے [illegible] بھر گئیں اور کان میں سائیں سائیں ہونے لگی

مال غنیمت

ایک فوجی افسر نے ترقی کی خوشی میں سپاہیوں کی دعوت کی اور حکم دیا کہ کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑو جیسے دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہو۔ سپاہیوں نے ویسا ہی کیا۔ ایک سپاہی پیٹ بھر کر کھا چکا تو باقی مٹھائیاں جیب میں رکھنے لگا۔ افسر نے برا مناتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”جتنوں کو مار سکا، مار دیا، باقی کو قیدی بنا رہا ہوں۔“

(مرسلہ: سہیل خالد، راجن پور)

عذاب

ایک روز شیطان سے کسی نے پوچھا۔ ”تم انسانوں پر طرح طرح کی مصیبتیں ڈالتے رہتے ہو۔ اب تک تم نے سب سے بڑی بلا کس پر ڈالی ہے؟“

جواب ملا۔

”ایک عورت پر۔ میں نے اسے سو جوڑے لباس، سو جوڑے جوتے اور میک اپ کی بے شمار اشیا دے کر ایسے گھر میں بھیج دیا جہاں آئینہ نہیں تھا۔ یہ محرومی اس کے لیے عذاب دوزخ سے زیادہ وحشت ناک تھی۔“

(مرسلہ: سلیم قادر، منڈی بہاالدین)

عقلمند را اشارا...

کیلی فورنیا کی ایک خاتون نے نئی گھڑی خریدی مگر وہ خراب نکلی۔ خاتون نے گھڑی ساز کمپنی کے نام خط لکھا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ مجبوراً خاتون نے کمپنی کو ٹیلی گرام بھیجا جس کا مضمون یہ تھا۔ ”میں نے آپ کی گھڑی خریدی ہے۔ بتائیے کیا وقت ہوا ہے؟“

یہ تدبیر مؤثر ثابت ہوئی۔ کمپنی والے خاتون کا اشارہ سمجھ گئے اور انہوں نے دوسری گھڑی بھیج دی۔

(مرسلہ: طیب شاہین، کھیالہ شیخاں)

"ہاں بھئی، اب سمجھ آئی تجھے تمیز کی؟" ہیڈ محرر نے پوچھا۔ "یا لاک اپ میں بند کر کے تیری چھترول کراؤں۔ مجھ سے رسید مانگتا ہے؟"

"دیکھیے اس پرس میں قومی شناختی کارڈ ہے اور..."

"چل اب نکل یہاں سے، پیسے لے کر آ پھر بات کرنا۔"

توہین کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ میں ان لوگوں کو ایف آئی آر کا ایک پیسا نہیں دوں گا۔

میں پولیس اسٹیشن سے باہر نکلا تو اپنی نظروں میں خود ہی ذلیل ہو چکا تھا۔ اتنی تذلیل تو زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے محلے میں بھی بہت رکھ رکھاؤ سے رہتا تھا اس لیے کبھی کسی نے "ابے" کر کے بات بھی نہیں کی تھی۔

میں نے اس پولیس اسٹیشن کا ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ میرے پاس موبائل نہیں تھا ورنہ میں اسی وقت پولیس اسٹیشن فون کر کے ان کے ایس ایس پی کا نمبر پوچھ لیتا۔

میں پولیس اسٹیشن سے نکل کر پیدل ہی جدھر منہ اٹھایا چل دیا۔ اس وقت تو مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ مجھے گھر جانا ہے۔ بس میرے اندر سے ایک ہی آواز آ رہی تھی انتقام... انتقام...

اچانک میری نظر ایک دکان پر پڑی جہاں ایزی لوڈ اور پی سی او کی سہولت میسر تھی۔ میں نے اس پی سی او سے پولیس اسٹیشن میں ٹیلی فون کیا۔

فوراً ہی دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ "اے ایس آئی عزیز الرحمن بول رہا ہوں سر! حکم؟"

"انچارج صاحب سے بات کرائیں۔" میں نے انگریزی میں کہا اور آواز کو خاصا رعب دار اور باوقار بنا لیا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" اس نے اپنے طور پر انگلش ہی میں پوچھا۔

"ایس ایس پی ایسٹ!" میں نے باوقار لہجے میں کہا۔

"ہولڈ آن کریں پلیز سر!" اس نے کہا۔

چند لمحے بعد مجھے ٹیلی فون پر ایک گھگیائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یس سر! انسپکٹر فرقان اسپیکنگ!"

"انسپکٹر صاحب! آپ تھوڑا سا فیور کریں۔" میں نے کہا۔

"یس سر حکم کریں؟"

"مجھے آپ کے ایس ایس پی صاحب کا سیل نمبر چاہیے، مجھ سے مس ہو گیا ہے اور ان سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

"لکھیں سر!" انسپکٹر نے کہا اور مجھے سیل نمبر لکھوا دیا۔

"تھینک یو انسپکٹر۔" میں نے کہا۔

"سر! کوئی اور حکم؟"

"تھینکس۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے اسی پی سی او سے متعلقہ سیل نمبر ملایا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، پھر کسی نے کال ریسیو کر لی اور بھاری آواز میں بولا۔ "ہیلو!"

"ایس ایس پی صاحب؟" میں نے کہا۔

"جی بول رہا ہوں، آپ کون؟"

"میں اس شہر کا ایک قانون پسند شہری ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی کچھ دیر قبل ڈیفنس کے علاقے میں ایف آئی آر درج کرانے گیا تھا۔ وہاں نہ صرف ہیڈ محرر نے رپورٹ درج کرنے کے تین سو روپے مانگے بلکہ انکار پر مجھے زدوکوب کیا اور گالیاں دیں۔ کیا واقعی پاکستان میں رپورٹ درج کرنے کے تین سو روپے رشوت ہے۔ ہیڈ محرر کا یہی کہنا تھا۔"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" اس بار افسر نے بہت نرمی سے پوچھا۔

"میرا نام امجد علی ہے سر! آج دو لڑکوں نے گن پوائنٹ پر مجھ سے میرا سیل فون اور پرس چھین لیا۔ پرس میں آٹھ ہزار روپے تھے۔ مجھے رقم سے زیادہ اپنے شناختی کارڈ کی پریشانی ہے۔"

"ڈونٹ یو وری مسٹر!" ایس ایس پی نے کہا۔ "میں ابھی متعلقہ تھانے میں بات کرتا ہوں۔ آپ اپنا کونٹیکٹ نمبر دے دیں تاکہ آپ کو انفارم کیا جا سکے۔"

"سر! میرا سیل فون تو چھن چکا ہے۔ میرے ہاں لینڈ لائن ٹیلی فون نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اوکے، تو پھر آپ کل صبح پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ درج کرا دیں۔ وہ لوگ انکار کریں تو مجھے بتا دیجیے گا اور براہ راست انسپکٹر فرقان سے ملیے گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ سر!"

"کوئی بات نہیں مسٹر امجد!" ایس ایس پی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے پی سی او والے کو ادائیگی کی اور باہر نکلا تو پہلے کے مقابلے میں خاصا ہلکا پھلکا تھا۔

مجھے گھر پہنچتے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ ابو، امی پریشان تھے اور میرے دونوں بھائی مجھے میرے دوستوں کے گھر ڈھونڈ رہے تھے۔

"کہاں رہ گئے تھے بیٹا؟" ابو نے کہا۔ "کم سے کم ایک ٹیلی فون ہی کر دیا کرو کہ میں دیر سے آؤں گا۔" اچانک ان کی نظر میرے بائیں گال پر پڑی۔ وہ گھبرا کر بولے۔ "یہ... تمہارے... چہرے پر کیا ہوا؟... چوٹ کیسے لگی؟"

میں نے ابو سے کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں سب کچھ بتا دیا۔

"بیٹا! سمجھو کہ جان کا صدقہ گیا۔ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ کبھی مزاحمت مت کرنا۔"

"مجھے تو اب امتحانی فیس کی فکر ہے ابو۔ وہ پرسوں اس کی آخری تاریخ ہے، میں ایک دن میں رقم کا بندوبست کہاں سے کروں گا؟"

"اس کی تم فکر مت کرو۔" امی نے کہا۔ "اس کا بندوبست میں کر دوں گی۔ میں نے ایک کمیٹی ڈال رکھی ہے۔ میں وہ کمیٹی اسی مہینے لے لوں گی۔"

"اور بیٹا! ہمارے ملک کی پولیس اتنی مہذب نہیں ہے، ان کے ساتھ اتنی بات بڑھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"تو کیا میں انہیں رشوت دے دیتا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

اسی وقت میرے دونوں بھائی بھی آ گئے۔ مجھے گھر میں دیکھ کر ان کے چہرے پُرسکون ہو گئے۔

مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے امی سے کھانا مانگا اور خود منہ ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف چلا گیا۔ واش بیسن پر لگے آئینے میں مجھے اپنی شکل دیکھ کر یقین نہ آیا۔ میرے بائیں گال پر انگلیوں کے نشانات تھے جو اب نیلے ہو چکے تھے اور میرا گال بُری طرح سوج گیا تھا۔ میرے دل میں ایک مرتبہ پھر نفرت کی لہر اٹھی اور میرے اندر سے انتقام... انتقام... کی آوازیں آنے لگیں۔

محمد خان کا تھپڑ اتنا شدید تھا کہ میرے جبڑے میں بھی شدید تکلیف تھی۔ مجھ سے کھانا کھانا دشوار ہو گیا۔ میں نے دو چار لقمے لے کر کھانا چھوڑ دیا۔

"راشد!" امی نے میری حالت دیکھ کر چھوٹے بھائی سے کہا۔ "جا کر ایک فروٹ بن لے آؤ۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "دودھ تو تم پیتے نہیں ہو اس لیے بن چائے سے کھا لینا۔"

فروٹ بن کھانے اور چائے پینے کے بعد میں نے دو پین کلرز لیں اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ رہ رہ کے مجھے پولیس اسٹیشن میں ہونے والی تذلیل یاد آ رہی تھی۔ مجھے ہیڈ محرر کا لہجہ اور محمد خان کا تھپڑ میرا خون کھولا رہے تھے۔ پھر نہ جانے کب اور کیسے مجھے نیند آ گئی۔

دستک کی پُرشور آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ دروازہ انتہائی زوردار آواز میں کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔

"کون ہے بھئی؟" ابو نے بلند آواز میں کہا۔ "آ رہا ہوں، دروازہ تو مت توڑو۔"

میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین کا عمل تھا۔ میں پریشان ہو کر باہر صحن میں نکل آیا۔ ابو اور امی تو پہلے ہی صحن میں تھے۔

دروازہ ایک مرتبہ پھر زوردار انداز میں دھڑدھڑایا گیا۔

قسط وار

ایک امریکی نے عمر بھر میں کبھی نہ تو جنگ میں حصہ لیا تھا نہ سود کھایا تھا اور نہ کسی سیاہ فام پر ظلم کیا تھا۔ مرنے کے بعد اسے سیدھا جنت میں لے جایا گیا۔ داروغۂ جنت نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک آرام کرسی پیش کی۔ امریکی نے اسے بڑی خوشی سے قبول کیا اور بولا۔

"اس کی پہلی قسط کتنے ڈالر ہے؟"

نصیحت

ایک لڑکی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے لگی تو ماں نے نصیحت کی۔ "بیٹی تم وہاں ہاسٹل میں رہو گی اس لیے میری ایک بات یاد رکھنا کہ لڑکوں کے کمروں میں کبھی نہ جانا۔"

جب لڑکی پڑھ لکھ کر واپس آئی تو ماں نے اپنی نصیحت کے بارے میں پوچھا۔ لڑکی نے جواب دیا۔ "ہاں امی! میں نے آپ کی نصیحت پر پورا پورا عمل کیا۔ میں آج تک کسی لڑکے کے کمرے میں نہیں گئی البتہ لڑکے خود ہی میرے کمرے میں آ جاتے تھے۔"

(مرسلہ: ملتان سے ڈاکٹر افتخار کا انتخاب)

"کون ہے؟" ابو جھنجلا کر بولے۔

"دروازہ کھولو۔" باہر سے کوئی سخت لہجے میں چیخا۔ "پولیس!"

"پولیس" ابو نے حیرت سے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

فوراً ہی کئی پولیس والے ابو کو دھکیل کر دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ ابو ارے ارے... یہ کیا ہے... کون ہو بھئی کہتے ہی رہ گئے۔

ان پولیس والوں میں ایک سب انسپکٹر اور تین سپاہی تھے۔ کھلے دروازے سے مجھے پولیس کی موبائل وین بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے انسپکٹر؟" میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"امجد علی کون ہے؟" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اکھڑ لہجے میں سوال کر دیا۔

"میں ہوں امجد علی!" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"گرفتار کر لو اسے۔" اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

"کیا بات ہے، کیا جرم کیا ہے میرے بیٹے نے؟" ابو نے بوکھلا کر پوچھا۔ "آپ اسے ایسے نہیں لے جا سکتے۔"

"او بزرگو! میرے پاس اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔"

"گرفتاری کا وارنٹ ہے؟" امی نے دہل کر کہا۔ "کیا کیا ہے اس نے؟"

"یہ ڈکیتی کی ایک واردات میں ملوث ہے اماں جی۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اس نے اور اس کے ساتھیوں نے دو افراد کو زخمی بھی کیا ہے۔ ان میں سے ایک کی حالت نازک ہے۔ دعا کریں کہ وہ بچ جائے ورنہ ابھی تو اس پر ڈکیتی اور اقدام قتل کی وارداتوں کا کیس بنا ہے۔ زخمی اگر مر گیا تو اس پر تین سو دو کا کیس بن جائے گا۔" پھر وہ مجھے دھکیل کر بولا۔ "چل بھئی آگے لگ۔"

انسپکٹر نے مجھے دھکا دیا اور پولیس والے پیچھے سے مجھے لاتیں اور ٹھڈے مارتے ہوئے باہر کی طرف لے چلے۔

"ارے اسے روکیں۔" اماں نے روتے ہوئے کہا۔ "کچھ کریں۔"

"میں ابھی سہیل صاحب سے بات کرتا ہوں۔" ابو نے کہا۔ "ان کے پولیس کے اعلیٰ افسران سے تعلقات ہیں۔"

سہیل صاحب سبزی منڈی کی انجمن کے صدر تھے۔ ان کے تعلقات بھی تھے اور وہ ابو سے بہت بے تکلف بھی تھے۔ پولیس والوں نے مجھے لاتیں مار کے گاڑی کی طرف دھکیلا، پھر ایک سپاہی نے بالوں سے پکڑ کر مجھے پولیس کی موبائل وین میں گھسیٹ لیا۔

"میں کوئی مزاحمت تو نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پھر تم لوگ مجھے اس طرح کیوں گھسیٹ رہے ہو؟"

"اوئے تو کیا تجھے پھولوں کے ہار پہنا کر لے جائیں۔" ایک پولیس والا طنزیہ لہجے میں بولا۔

میں خاموش ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے موبائل اسٹارٹ ہوئی اور روانہ ہو گئی۔

مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں نے مجھے کسی غلط فہمی میں گرفتار کیا ہے لیکن میں بعد میں انہیں چھوڑوں گا نہیں۔ میں ان سب کے خلاف عدالت میں جاؤں گا۔ یہ لوگ سمجھتے کیا ہیں؟

میں اسی قسم کے خیالات میں گم تھا کہ وین پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔

"چل بھئی، اب نیچے اتر یا تجھے بھی ٹھڈے مار کے اتاریں۔" ایک سپاہی نے مجھے کھینچتے ہوئے کہا۔

[illegible] کا پولیس اسٹیشن تھا لیکن ماحول اس کا بھی وہی تھا۔ وہی میلی اور سیلی دیواریں، وہی بوسیدہ فرنیچر، وہی مکروہ چہروں والے پولیس اہلکار اور اسی قسم کی گفتگو۔

سب انسپکٹر نے مجھے انچارج کے سامنے پیش کر دیا۔ "سر ملزم امجد علی کو گرفتار کر لیا ہے۔"

انچارج بھی مکروہ صورت اور بڑی بڑی مونچھوں والا ایک قصائی نما شخص تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مونچھوں سے اس کے چہرے پر رعب پیدا ہو گیا ہے لیکن وہ ان مونچھوں کی وجہ سے پولیس والے سے زیادہ خود کوئی مجرم لگ رہا تھا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی پھر مجھے گالی دے کر بولا۔ "تیری... تو ہی امجد ہے؟"

"ہاں، میں ہی امجد علی ہوں لیکن..." اسی وقت پیچھے سے کسی نے میری گدی پر زور دار ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔ "صاحب کے سامنے اونچی آواز میں بولنے کی کوشش مت کرنا۔"

"لے جاؤ اس... کو۔" انچارج نے پھر ایک دفعہ

گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اس کی تو... اس سے میں بعد میں تفتیش کر لوں گا۔"

مجھے لانے والے سپاہی پھر مجھے ٹھڈے اور لاتیں مارتے ہوئے وہاں سے باہر نکال لائے اور ایک کاریڈور کے آخری سرے پر واقع لاک اپ میں پہنچے، پھر ان لوگوں نے میری ہتھکڑیاں کھول کر مجھے حوالات میں دھکیل دیا۔

حوالات میں عجیب سی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں میلی سی ایک دری تھی اور کونے میں پانی کا بڑا سا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سلور کا ایک بڑا سا ٹیڑھا گلاس تھا جس پر جگہ جگہ میل جما ہوا تھا۔

میں حوالات کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ابو اور سہیل صاحب وہاں آئیں گے اور مجھے لے جائیں گے۔

میرے پاس گھڑی تو تھی نہیں لیکن میرا خیال تھا کہ مجھے وہاں آئے ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ ظاہر ہے ابو نے سہیل صاحب سے بات کی ہوگی، پھر شاید ان کے گھر بھی گئے ہوں۔ سہیل صاحب نے پولیس کے کسی اعلیٰ افسر سے بات کی ہوگی۔ ممکن ہے اس افسر نے ٹیلی فون کر دیا ہو یا ممکن ہے وہ لوگ خود ہی پولیس اسٹیشن آ رہے ہوں۔

اس ایک گھنٹے میں حوالات میں مزید چار آدمیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اب مجھ سمیت اس حوالات میں کل سات آدمی تھے۔ [illegible] اس کوٹھڑی کی حوالات میں ہوا کے گزرنے کے لیے صرف ایک روشن دان تھا۔ اگر دروازہ سلاخوں والا نہ ہوتا تو شاید اس وقت میں دم گھٹنے سے مر جاتا۔

اچانک دروازے کے باہر فرش پر بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی، پھر مجھے حوالات کے سامنے دو سنتری نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا، اس کے جسم پر اجلے کپڑے تھے اور بال خاصے سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بھی نہیں تھیں۔

سنتریوں نے دروازہ کھولا اور اسے بہت احترام سے اندر جانے کو کہا۔

وہ مسکراتا ہوا اندر آگیا۔ اس نے پہلے سرسری طور پر تمام حوالاتیوں کا جائزہ لیا، پھر ایک دیوار کے ساتھ ٹک کر بیٹھ گیا اور جیب سے غیر ملکی برانڈ کا مہنگا سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑ کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اس سے پہلے جو چار قیدی آئے تھے۔ وہ اپنے حلیوں ہی سے اچکے لگ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے پان یا گٹکا کھا

ضرب کلیم

کلیم صاحب، ملٹری اکاؤنٹ میں غالباً ڈپٹی کاؤنٹنٹ جنرل یا اس سے بھی کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں شعر و سخن سے ایک گونہ لگاؤ تھا۔ اکثر مشاعرے رچاتے۔ ایک مشاعرے میں سالک صاحب بھی شریک تھے۔ کسی نے ان سے کلیم صاحب کے بیٹے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"آپ کلیم صاحب کے بیٹے ہیں؟"

سالک صاحب کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی، فرمایا۔

"تو یہ کہیے آپ ضرب کلیم ہیں۔"

از: "نور تن" شورش کاشمیری

(مرسلہ: تسنیم اختر، کوٹ ادو)

رکھا تھا۔ مجھ سے پہلے والے دونوں قیدی اب ایک طرف پڑے سو رہے تھے۔ اپنے لباس اور حلیوں سے وہ بھی جرائم پیشہ ہی لگ رہے تھے۔

میرے بعد آنے والے چار قیدیوں میں سے ایک نے میرے نزدیک آکر رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔ "استاد! تم کس کیس میں آئے ہو، لگتا ہے کہ کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے۔"

"اپنے کام سے کام رکھو۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔

"ابے تو کیا کہیں بم دھماکا کرتے ہوئے پکڑے گئے ہو؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مجھ پر ڈکیتی اور قتل کے الزامات ہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا تو وہ بڑبڑاتا ہوا پھر اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔

نو وارد حوالاتی بہت غور سے میرا جائزہ لے رہا تھا پھر وہ کھسک کر میرے پاس آیا اور بولا۔ "تم مجھے کرمنل تو نہیں لگتے۔ تمہیں یہ لوگ یہاں کیوں لائے ہیں؟ شکل سے بھی پڑھے لکھے لگتے ہو اور لباس سے بھی کسی اچھے گھرانے کے معلوم ہوتے ہو۔"

"مجھے تو خود بھی نہیں معلوم کہ یہ لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں، بس مجھے اتنا ضرور بتایا ہے کہ مجھ پر ڈکیتی اور اقد [illegible]"

''واقعی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم کرتے کیا ہو؟''

''میں این ای ڈی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں اور یہ میرا انجینئرنگ کا آخری سال بلکہ آخری سمسٹر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا پھر مجھ سے بولا۔ ''سگریٹ پیو گے؟''

''میں سگریٹ نہیں پیتا جناب!'' میں نے کہا۔

''اچھا ٹھہرو، میں تمہارے لیے چائے اور پانی منگواتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم جب سے یہاں آئے ہو، تم نے پانی بھی نہیں پیا ہے۔ کوئی شریف آدمی یہ پانی پی ہی نہیں سکتا۔''

وہ اٹھ کر ٹہلتا ہوا حوالات کی سلاخوں والے دروازے تک پہنچا۔ میں بہت غور سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔

''اے، کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے بلند آواز میں کسی کو پکارا۔

''جی جناب!'' فوراً ہی ایک سنتری حوالات کے دروازے پر نمودار ہوا۔ ''میرا نام نور خان ہے جناب! حکم؟''

اس شخص نے جیب سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکالے اور بولا۔ ''دو گرما گرم، بہترین چائے، چکن پیٹیز اور ٹھنڈے پانی کی دو بوتلیں لے آؤ۔''

''بہت بہتر جناب۔''

وہ دوبارہ میرے نزدیک آ بیٹھا۔

سنتری دس منٹ کے اندر اندر مطلوبہ اشیا لے آیا۔ اب دوسرے حوالاتی بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ہم لوگوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''چائے پیو۔'' نووارد نے کہا اور چائے کا کپ میری طرف بڑھا دیا۔ ''میرا نام سلطان ہے۔''

''میرا نام امجد ہے... امجد علی۔'' میں نے چائے سے پہلے منرل واٹر کی بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔ مجھے اس وقت واقعی شدید پیاس لگ رہی تھی۔

''پیو، پیو۔'' وہ فراخ دلی سے بولا۔ ''میں نے یہ پانی کی بوتلیں تمہارے لیے ہی منگوائی ہیں۔''

میں نے بوتل کھولی اور ایک سانس میں آدھی سے زیادہ خالی کر دی۔ پھر اس کے مجبور کرنے پر میں نے چائے بھی پی اور ایک پیٹیز بھی کھا لیا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں میرا وکیل آئے گا تو میں اس سے تمہارے لیے بھی بات کروں گا۔'' سلطان نے کہا۔ پھر وہ چائے پی کر سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ پینے کے بعد وہ دیوار سے ٹکا ٹکا ہی اونگھ گیا۔

اس وقت حوالات کے برآمدے میں بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور ایک پولیس والے کا کرخت چہرہ نظر آیا، پھر دوسرا پولیس والا بھی آ گیا۔ سلاخوں والا دروازہ کھلا اور ان میں سے ایک پولیس والا اندر آ گیا۔ ''امجد علی کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ہوں امجد علی۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے میرے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی پھنسا دی۔

اس کی منحوس آواز سے سلطان بھی جاگ گیا۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ''اسے ہتھکڑی لگانا ضروری ہے؟''

''صاحب کا حکم ہے جناب!''

''لگتا ہے تمہارا صاحب نیا نیا یہاں آیا ہے۔''

''جی جناب! وہ ابھی پچھلے ہفتے ہی اس پولیس اسٹیشن میں آئے ہیں۔''

''اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ مت کرنا۔'' سلطان نے درشت لہجے میں کہا۔

سنتری نے اس کے کہنے پر اتنا کرم ضرور کیا کہ مجھے گھونسے اور ٹھڈے مارنے کے بجائے آرام سے انچارج کے دفتر تک لے گیا۔

انچارج اسی رعونت سے اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور بولا۔ ''امجد علی! اس ڈاکے میں تمہارے ساتھ اور کون کون شامل تھا؟''

''کس ڈاکے کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''اوئے، تجھے ابھی تک عقل نہیں آئی۔'' وہ پھر کر بولا۔ ''لگتا ہے تو پرانا واردتیا ہے۔ ابھی تیری چھترول ہو گی تو تجھے سب کچھ یاد آ جائے گا۔''

''انسپکٹر! میں ایک شریف شہری ہوں آپ مجھ سے اس لہجے میں بات مت کریں۔'' میں نے کہا۔

''اوئے تواب کے بچے! میں ابھی تیری شرافت نکالتا ہوں۔'' پھر وہ بلند آواز میں پکارا۔ ''حاکم خان!''

دوسرے ہی لمحے کمرے میں مضبوط ہاتھ پیروں کا ایک لمبا تڑنگا سپاہی داخل ہوا اور بولا۔ ''یس سر!''

''اسے لے جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ڈی سی صاحب کے بنگلے میں جو ڈاکا پڑا ہے، اس میں اس کے ساتھ اور کون کون شریک تھا، لوٹ کا مال کہاں ہے اور ان لوگوں نے جو کچھ لوٹا وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''جو حکم سرکار۔'' حاکم خان نے کہا۔ پھر اس نے میری گردن پشت سے یوں دبوچ لی جیسے سپیرے سانپ کی گردن پکڑتے ہیں۔ ''چل بھئی، ذرا تجھے ساتویں آسمان کی سیر کرائیں۔''

''سر! سلطان صاحب نے کہا ہے کہ اس پر سختی نہ کریں۔''

''کون سلطان اوئے؟'' انچارج نے اسے جھڑک دیا۔ ''حاکم علی اسے لے جاؤ۔ میں تمہیں ایک گھنٹہ دے رہا ہوں۔ اس سے پوری تفصیل معلوم کر لو۔''

حاکم علی مجھے گردن سے پکڑے پکڑے باہر نکلا اور میری ہتھکڑی کی زنجیر دوسرے ہاتھ میں پکڑ لی۔

وہاں سے مجھے وہ جس کمرے میں لایا وہ تو عجیب و غریب ساز و سامان سے بھرا ہوا تھا۔ پانی کی بھری ہوئی اور خالی بالٹیاں، ربر کے پائپ، رسیاں، چھوٹے بڑے مختلف سائز کے ڈنڈے، بینچ نما ایک تختہ جیسا عموماً ایکسر سائز کرنے والوں کے پاس ہوتا ہے جس پر لیٹ کر وہ بینچ پریس کرتے ہیں اور اسی طرح کا دوسرا الم غلم۔

''ہاں تو میاں امجد!'' حاکم خان نے یوں کہا جیسے وہ میرا کوئی بزرگ ہو۔ ''سب کچھ بغیر مار پیٹ کے بتائے گا یا مجھے ہاتھ پیر چلانے کا موقع دے گا؟''

''آپ لوگوں کو شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی ڈاکے میں شریک نہیں تھا۔ میں تو شام کے بعد گھر سے باہر بھی نہیں نکلا ہوں۔''

حاکم خان نے یوں مایوسی سے سر ہلایا جیسے اسے میرا جواب سن کر افسوس ہوا ہو۔

''دیکھ میاں!'' اس نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''میں تجھے پانچ منٹ دے رہا ہوں۔ تو اس عرصے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لے، میں ہر ملزم کو اتنا وقت ضرور دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

ہتھکڑی میرے ہاتھ میں ابھی تک پڑی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی حالتِ زار دیکھ کر رونا آ گیا۔ جتنی وہ لوگ میری تذلیل کر رہے تھے اتنی ہی میرے دل میں نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اب آپ اسے میری خوبی کہہ لیں یا خامی کہ میں نہ تذلیل کبھی برداشت کرتا ہوں، نہ اسے بھولتا ہوں۔

میرے رشتے کے ایک چچا نے مجھے بے قصور دو تین تھپڑ رسید کر دیے تھے۔ اس دن سے مجھے ان کی شکل سے نفرت ہو گئی تھی۔ ایک موقع پر ابو سے ان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ وہ ہمارے گھر آئے اور ابو کو برا بھلا کہنے لگے۔ میرے اندر سلگتی ہوئی برسوں کی نفرت جاگ گئی۔ انہوں نے جب ابو کو گالی دی تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے اٹھ کر ان کا گریبان پکڑ لیا اور ان کے چہرے پر اتنی زور سے گھونسا مارا کہ ان کا جبڑا ابل کر رہ گیا۔ جواب میں ابو نے مجھے بہت بری طرح مارا لیکن ان کی تذلیل کر کے میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ میں نے ان دنوں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور کالج میں پڑھ رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور حاکم خان اندر آ گیا۔ پہلی نظر میں تو میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔ اس سے پہلے وہ وردی میں تھا، اس وقت وہ مجھے ایک سینڈو کٹ بنیان اور دھوتی میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی بھی نہیں تھی۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ اس کا سر انڈے کی طرح شفاف ہے لیکن چہرے پر نحوست تھی۔

''ہاں بھئی، امجد!'' اس نے کہا۔ ''تو پھر تو نے کیا سوچا۔ دیکھ میں نے تجھے پانچ کے بجائے سات منٹ دے دیے ہیں۔ انچارج صاحب تو مجھ سے ایک ایک منٹ کا حساب مانگیں گے۔''

''مجھے کیا سوچنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں بتا چکا ہوں کہ میں کسی واردات میں ملوث نہیں ہوں۔''

''اچھا'' اس نے اچھا کو لمبا کر کے کہا، پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی کی چابی تھی۔ اس نے میری ہتھکڑی کھول دی اور بولا۔ ''لے، میں نے تیری ہتھکڑی بھی کھول دی۔ دیکھ امجد! اگر تو سچ بولے گا تو صاحب تجھ پر بہت ہلکا کیس بنائے گا، سارا کیس تیرے ساتھیوں پر ڈال دے گا۔''

''میں نے کہا نا کہ میں نے کوئی واردات نہیں کی اور میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔''

اس نے اچانک میرے چہرے پر بھرپور تھپڑ رسید کر دیا۔ اس نے بھی میرے بائیں گال کو نشانہ بنایا تھا۔ میرا جبڑا پہلے ہی دکھ رہا تھا۔ اس کے تھپڑ سے تو گویا میری جان ہی نکل گئی۔ اس نے ایک دفعہ پھر پشت سے میری گردن دبوچی اور میری کمر پر گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔ میں تکلیف کی شدت سے کراہتا ہوا فرش پر گر گیا۔

''ہاں، اب بول، کچھ یاد آیا؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"تو ایسے نہیں مانے گا۔" اس نے کہا۔ پھر بلند آواز میں بولا۔ "کرم دین۔"

فوراً ہی ایک سپاہی اندر آگیا۔

"اس... کے کپڑے اتار لو۔" اس نے مجھے انتہائی غلیظ گالی دیتے ہوئے کہا۔

کرم دین نے پہلے میری شرٹ اتاری، پھر بنیان بھی کھینچ تان کر کے اتار پھینکی۔

"واہ بھئی۔" تو نے تو سلمان خان کی طرح باڈی بنا رکھی ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جب کرم دین نے میری پینٹ کی بیلٹ پر ہاتھ ڈالا تو میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"اوئے تھانے میں بند ہے اور پولیس والے پہ ہاتھ اٹھا رہا ہے؟" حاکم خان نے کہا۔ "تجھ پر تو یک دفعہ اور لگ جائے گی۔" پھر وہ کرم دین سے مخاطب ہوا۔ "اس کے ہاتھ باندھ دو کرم دین۔"

کرم دین ایک مرتبہ پھر میری طرف بڑھا۔ اس دفعہ اس کے ہاتھ میں رسی کا ایک گچھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس نے میرے ہاتھ باندھ دیے تو پھر وہ میرے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا۔ میں اسے دھکیل کر پیچھے ہٹ گیا۔

حاکم خان اس وقت وہاں پڑی ہوئی واحد کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری حرکت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اچانک اٹھا اور میرے چہرے پر بھرپور گھونسا رسید کر دیا۔ میں گھونسے کی ضرب سے پشت کی دیوار سے ٹکرایا تو زمین و آسمان گھومنے لگے۔

جب میں ذرا سنبھلا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے مجھے بالکل برہنہ کر دیا ہے۔

اس کرب سے وہی لوگ واقف ہوں گے جو کبھی اس تجربے سے گزرے ہوں۔ خود کو بے بس دیکھ کر میری ساری خود اعتمادی، عزتِ نفس، خودداری ہر چیز بری طرح مجروح ہو گئی اور یوں میں خود اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گیا۔

"اب بتا، تیرے ساتھ اس واردات میں کون کون شریک تھا؟" حاکم خان نے پوچھا اور لچک دار سا ایک بید اٹھا لیا۔

"میں بتا تو چکا ہوں کہ..."

شائیں کی آواز کے ساتھ اس نے میرے برہنہ جسم پر پوری قوت سے بید رسید کر دیا۔ میرے جسم میں گویا آگ سی لگ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے میرے جسم پر جلتی ہوئی سلاخ پھیر دی ہو۔ اس نے دوبارہ بید میرے جسم پر مارا، پھر تو گویا اس پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے پے در پے میرے برہنہ جسم پر اتنے بید مارے کہ تکلیف کا احساس ہی مٹ گیا۔ میرا پورا جسم لہولہو ہو رہا تھا۔ لچک دار بید کی ضربوں سے میرے جسم کی کھال ادھڑ گئی۔

"بتا ورنہ میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تیری سات پشتوں تک کو عبرت ہو گی۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"اگر تو نے اب بھی نہ بتایا تو..." پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "تیرے کتنے بھائی ہیں؟"

"دو۔" میں نے کہا۔

"اور بہن؟"

"بہن صرف ایک ہے۔"

"کیا عمر ہے اس کی؟"

"وہ اس وقت بارہ سال کی ہے۔" میں نے تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے کہا۔

"اوئے بارہ سال کی لڑکی بچی تو نہیں ہوتی۔ تو نے اب بھی زبان نہ کھولی تو میں تیری بہن کو بھی اٹھوا لاتا ہوں اور تیری آنکھوں کے سامنے..."

"حاکم خان۔" میں چیخ کر بولا۔ "بکواس بند کر۔" میں نے زخمی ہونے کے باوجود اس کے پیٹ میں بھینسے کی طرح ٹکر ماری۔ حاکم خان کے منہ سے اوغ کی آواز برآمد ہوئی اور وہ دھم سے فرش پر گر پڑا۔ کمرے کا دروازہ اس نے خود ہی اندر سے بولٹ کیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بید چھین کر اس کے جسم پر برسانا شروع کر دیا اور بولا۔ "غلیظ، کمینے آدمی میری بہن کے لیے ایسی بات کرے گا۔ میں تجھے آج زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" مجھ پر بھی گویا جنون طاری ہو گیا تھا۔

اس مار پیٹ میں اس کے جسم سے دھوتی کھل گئی تھی۔ میں نے اس کے برہنہ جسم پر پوری قوت سے بید رسید کیے، اس کے حلق سے کرب ناک آوازیں نکل رہی تھیں لیکن باہر موجود ہر شخص یہی سمجھ رہا ہو گا کہ حاکم خان مجھ سے تفتیش کر رہا ہے اور وہ چیخیں میری ہیں۔ میں نے جھک کر اس کی بنیان بھی پھاڑ دی۔ اب وہ بھی میری طرح برہنہ تھا۔ میں نے پھر اس کے جسم پر جوش و خروش سے بید برسانا شروع کر دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم بھی لہولہان ہو گیا۔ وہ اتنا بوکھلا گیا کہ اپنی مدد کے لیے کسی کو آواز دینا بھی بھول گیا۔

"تو میری بہن کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے گا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے جسم پر یک مرتبہ پھر بید کی بارش کر دی۔ میرے دل میں تو گزشتہ کئی گھنٹوں سے پولیس کے خلاف انتقامی کارروائی کا لاوا پک رہا تھا۔ میری بہن کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کر کے حاکم خان نے گویا میرے نفرت کے بارود میں جلتی ہوئی تیلی پھینک دی تھی۔

اسی وقت دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

میں جانتا تھا کہ میں زیادہ دیر دروازہ بند نہیں رکھ سکتا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اب وہ لوگ مجھ پر تھرڈ ڈگری کا استعمال کریں گے۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

آنے والا کرم دین تھا۔

وہ کمرے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ حاکم خان فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔

میں نے کرم دین کو بھی اندر گھسیٹ لیا اور اس کے چہرے پر بھی زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ "الو کے پٹھے! تو مجھے گالی دے گا؟"

اس نے مجھے زیرِ لب گالی دی تھی۔ وہ مدقوق سا سپاہی تھا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑا اور اسے کمرے کے اندرونی حصے کی طرف اچھال دیا۔ پھر میں اپنے کپڑے پہن ہی رہا تھا کہ کمرے میں سپاہی نور خان اور ایک شخص داخل ہوا۔ اس نے کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرے پر ذہانت کی چمک تھی۔ وہ بہت باوقار انداز میں اندر آیا تو حاکم خان نے بھی اٹھ کر اپنا تہبند باندھ لیا۔

"امجد علی!" اس نے مجھ سے کہا۔ "میں بیرسٹر اسد انصاری ہوں اور تمہارا وکیل ہوں۔"

پھر اس نے بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک فارم نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"لو، اس پر سائن کر دو۔" اس نے مجھے پین دیتے ہوئے کہا۔ "یہ وکالت نامہ ہے۔"

میں نے سرسری طور پر اس کاغذ پر نظر دوڑائی۔ وہ واقعی وکالت نامہ تھا۔ میں نے اس پر دستخط کر دیے۔

"اب تم اپنی شرٹ پہن لو اور میرے ساتھ اپنی رج کے دفتر میں چلو۔ سوری یار، مجھے آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اصل میں عین وقت پر میری گاڑی نے دھوکا دے دیا۔ اب رات کے اس پہر مجھے کوئی ٹیکسی یا رکشہ کہاں ملتا؟ میں نے ریڈیو کیب طلب کی اور وہیں کھڑے ہو کر انتظار کرتا رہا۔ ریڈیو کیب بیس، پچیس منٹ میں وہاں پہنچی۔" بیرسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "بس یہی پچیس منٹ تمہارے بہت قیمتی تھے۔"

"اسے ایسے کہاں لے کر جا رہے ہیں بیرسٹر صاحب؟ میں اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی ڈال دوں۔ اس نے اپنے جرائم میں ایک اور فردِ جرم کا اضافہ کر لیا ہے۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے، ایک ایسے پولیس اہلکار پر جو آن ڈیوٹی ہے۔"

"تم لوگ آپس میں لڑتے ہو اور الزام دیتے ہو زیرِ حراست ملزمان کو؟" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "اس بات کا گواہ تو میں بھی ہوں کہ تمہارا وہ سپاہی جو دیوار کے ساتھ کھڑا ہے، تمہارے جسم پر بید برسا رہا تھا۔ الزام تم اس شریف آدمی پر لگا رہے ہو۔ میں تو کورٹ میں تمہیں ننگا کر دوں گا۔ تم نے تو میرے کلائنٹ کو یہاں برہنہ کیا ہے۔" پھر

ٹیک ری

بوڑھی بھنا صاحب تو بہت دنوں کا تو اب سب ہو جاتی آری تھی، کسی دوست نے پوچھا۔ "بوڑھی اتنی خوش کیوں نظر آ رہی ہے؟"

بوڑھی بیبیاں نے جواب دیا۔ "آج میری چھوٹی بچی نے مجھ سے ایک درہم مانگا۔ میں نے معذرت کی اور کہا میری جیب خالی ہے، اس لیے میں درہم نہیں دے سکتا۔ میری بچی بگڑ گئی اور غصے میں ماں سے کہا۔ امی! کیا دنیا کے سارے امیر مر گئے تھے جو آپ نے اس بھکاری سے شادی کر لی؟"

٭٭٭

ایک صاحب اپنے کتے کو زنجیر سے پکڑے بازار میں جا رہے تھے۔ ایک شخص نے انہیں اس طرح ٹہلتے دیکھا تو کہنے لگے۔ "اس گدھے کے ساتھ جا رہے ہو؟"

وہ صاحب کچھ شوخ تھے، فوراً بولے۔ "بھئی، اچھے خاصے کتے کو گدھا بنا دیا۔"

اس پر وہ شخص برجستہ بولا۔ "جی صاحب! میں تو اس کتے سے کہہ رہا تھا۔"

(محمد عنایت کی پشاور سے سوغات)

وہ مجھ سے بولا۔ ”چلو امجد۔“

ہم دوبارہ انچارج کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس کے چہرے پر اضطراب تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ سلطان حوالات کے بجائے وہاں ایک کرسی پر آرام سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

”مجھے اپنے کلائنٹ کا بیان تنہائی میں لینا ہے۔“ بیرسٹر انصاری نے کہا۔

انچارج نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی یقیناً کوئی کمرا تھا۔ میں بیرسٹر صاحب کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ایک سنگل بیڈ اور چند کرسیاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ گویا انچارج صاحب وہاں باقاعدہ سوتے تھے۔

بیرسٹر صاحب نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا۔ کمرے میں ایک کولر بھی رکھا تھا۔ اس نے کولر سے گلاس میں پانی بھرا اور مجھے دیا۔ پانی پینے کے بعد گویا میرے جسم میں ایک نئی توانائی آگئی۔

”امجد!“ بیرسٹر صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ان لوگوں نے تم پر اقدام قتل اور ڈکیتی کا الزام لگایا ہے۔ جائے واردات سے تمہارا پرس برآمد ہوا ہے۔ اس میں نہ صرف تمہارا قومی شناختی کارڈ ہے بلکہ کالج کا کارڈ بھی ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ وہ چیزیں وہاں کیسے پہنچیں؟“

میرے ذہن میں بھی جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آگیا کہ میرا موبائل فون اور پرس گن پوائنٹ پر دو اچکوں نے چھین لیا تھا۔ میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

”تم نے ایس ایس پی کو بتایا تھا کہ پولیس اسٹیشن والے تم سے ایف آئی آر کے تین سو روپے مانگ رہے تھے؟“

”جی ہاں، میں نے انہیں سب کچھ تفصیل سے بتایا تھا اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ متعلقہ پولیس اسٹیشن کو ٹیلی فون کر دیں گے، تم صبح جا کر ایف آئی آر درج کرا دینا۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور بات؟“ اس نے پوچھا۔ وہ باقاعدہ پوائنٹ نوٹ بھی کرتا جا رہا تھا۔

پھر وہ بولا۔ ”تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے ایس ایس پی ایسٹ بن کر پولیس اسٹیشن کے انچارج سے ایس ایس پی علی صاحب کا نمبر حاصل کیا لیکن ہم فوری طور پر اس پوائنٹ کو ڈسکس ہی نہیں کریں گے۔ آؤ میرے ساتھ۔“ وہ مجھے لے کر دوبارہ انچارج کے کمرے میں آگیا۔ اس نے انچارج سے پوچھا۔ ”آپ نے ملزم کا بیان لینے کی کوشش کی؟“

”جی ہاں جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ نے اس بیان پر ملزم کے سائن بھی لیے ہوں گے؟“

”اس کا بیان تو لیا تھا لیکن اس کی کاغذی کارروائی پوری نہیں ہوئی تھی۔“ انچارج بوکھلا کر بولا۔

”آپ نے میرے کلائنٹ کو محض اس لیے حراست میں رکھا کہ جائے واردات سے اس کا پرس برآمد ہوا تھا۔ نہ صرف حراست میں رکھا بلکہ اس پر تشدد بھی کیا تاکہ وہ آپ کی مرضی کا بیان دے سکے۔“

”بیرسٹر صاحب! آپ ہم سے زیادہ قانون جانتے ہو۔ جائے واردات سے اگر کسی ملزم کا پرس برآمد ہو تو آپ کیا سمجھو گے؟“

”میں اس ملزم سے پوچھوں گا کہ تمہارا پرس وہاں کیسے پہنچا؟“ بیرسٹر نے خشک لہجے میں کہا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ آج دوپہر کے وقت بلکہ آپ یوں کہیں کہ کل سہ پہر کے وقت دو اچکوں نے گن پوائنٹ پر اس کا پرس چھین لیا تھا۔ اس نے متعلقہ پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر درج کرانے کی کوشش کی تو اس سے تین سو روپے رشوت کے طلب کیے گئے۔ اس کے انکار پر ہیڈ محرر اور ایک کانسٹیبل نے نہ صرف اسے گالیاں دیں بلکہ اسے زدوکوب بھی کیا۔“

”یہ تو اس کی بنائی ہوئی کہانی ہے بیرسٹر صاحب! کسی بھی پولیس اسٹیشن میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہاں، کچھ لوگ پیسے مانگتے ہیں لیکن آخر ایف آئی آر درج کر لیتے ہیں، پیسے نہ سہی، وہ لوگ شناختی کارڈ کی گمشدگی کی ایف آئی آر تو درج کر ہی لیتے۔ یہ سب اس کی من گھڑت کہانی ہے۔“

”اس نے اس واقعے کی اطلاع ایس ایس پی علی کو بھی دی تھی۔“ بیرسٹر نے کہا۔

انچارج نے چونک کر بیرسٹر کو دیکھا۔ ”ملزم کا ایس ایس پی صاحب سے کیا تعلق ہے؟“

”یہ تو ایس ایس پی صاحب خود ہی بتائیں گے۔“

”ملزم کے خلاف اقدام قتل اور ڈکیتی کا پرچہ کٹ چکا ہے۔“ انچارج نے کہا۔ ”اب تو آپ اسے کورٹ ہی سے بری کرا سکتے ہو۔“

”میری ذمے داریاں مجھے مت سمجھائیں۔“ بیرسٹر نے کہا۔ ”آپ ابھی ملزم کا بیان لیں ورنہ کل پر اس کے ... ترائیں۔ میں ایس ایس پی علی کو بھی یہاں بلوا سکتا ...“

”ان کی کیا ضرورت ہے؟“ انچارج بوکھلا کر بولا۔

”واردات کی رپورٹ نہ لکھنے کے گواہ تو وہی ہیں اور ... کا پورا ڈپارٹمنٹ جانتا ہے کہ انسپکٹر علی کبھی کسی ملزم ... میں جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ آپ امجد کا بیان لیں، ... ایس ایس پی صاحب سے بعد میں تحریری طور پر وہ ... لکھوا لوں گا۔“

انچارج نے گھنٹی بجائی تو ایک سپاہی فوراً ہی کمرے ... ہو ...

”ہیڈ محرر کو یہاں بھیجو۔“ انچارج نے کہا۔

فوراً ہی ہیڈ محرر وہاں آگیا۔

”ملزم امجد کا بیان لو۔“ اس نے مرے مرے لہجے ...

میں نے وہی سب کچھ اپنے بیان میں لکھوا دیا جو ... ساتھ پیش آیا تھا۔

بیرسٹر صاحب نے اس بیان کا جائزہ لیا، پھر مجھ سے ... کرنے کو کہا۔ گواہ کے طور پر اس نے اپنے اور سلطان ... کیے اور ہیڈ محرر سے کہا۔ ”اس بیان کی ایک فوٹو ... مجھے دے دو۔“

انچارج نے اشارے سے کہا کہ بیرسٹر جو کچھ کہہ رہا ... دو۔

”صاحب جی! اس وقت اس بیان کی فوٹو کاپی کیسے ... ے؟“ ہیڈ محرر نے کہا۔

”تم نے اس کی کاربن کاپی تو بنائی ہے نا؟ وہی کاپی ... دے دو۔“

ہیڈ محرر نے کاربن کاپی بیرسٹر کے حوالے کر دی۔ ... نے وہ کاپی اپنے بریف کیس میں رکھی اور اٹھ ... ، پھر سخت لہجے میں بولا۔ ”اب اگر کسی نے میرے ... کو ایک انگلی بھی لگائی تو اس کے ذمے دار انچارج ... ہوں گے۔“

رخصت ہونے سے پہلے بیرسٹر نے مجھے بہت تسلی دی ... تم پر کوئی تشدد نہیں کرے گا۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ ... ہوتے ہی کورٹ سے تمہاری ضمانت کرا لوں گا۔“ پھر ... سے مخاطب ہوا۔ ”سلطان صاحب! آپ کو بھی صبح ... ار کرنا ہوگا۔“

”کوئی بات نہیں، یوں بھی اب صبح ہونے میں دیر ہی ...“

بیرسٹر کے رخصت ہونے کے بعد سلطان بھی وہاں سے چلا گیا۔

میں دوبارہ حوالات میں پہنچا تو وہاں اب قیدیوں کی تعداد مزید بڑھ چکی تھی لیکن ان میں سلطان نہیں تھا۔ انچارج نے شاید اس کے آرام کا بندوبست کسی اور جگہ کر دیا تھا۔

ابھی وہاں بیٹھے ہوئے مشکل سے دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کانسٹیبل کرم دین وہاں آگیا اور بولا۔ ”امجد علی! تمہیں انچارج صاحب بلا رہے ہیں۔“

اس نے اندر آ کر میرے ہاتھ میں دوبارہ ہتھکڑی لگا دی اور مجھے انچارج کے کمرے میں لے گیا۔

میں نے کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی تو انچارج ڈپٹ کر بولا۔ ”کھڑا رہ، تو یہاں اپنے باپ کے ولیمے میں نہیں آیا ہے۔“

میں اس کے بدلے ہوئے رویے پر دنگ رہ گیا۔

”تو کیا سمجھتا ہے کہ تیرے اس من گھڑت بیان کے بعد تجھے رہا کر دیا جائے گا؟ پھر تو نے پولیس کی حراست میں ہونے کے باوجود ایک ڈیوٹی حوالدار پر ہاتھ اٹھایا، یہ پولیس اسٹیشن ہے بچے، یہاں ہمارا حکم چلتا ہے۔ وہ کالے کوٹ والا حکم تو ایسے دے کر گیا تھا کہ جیسے وہ بیرسٹر نہ ہو پولیس کا آئی جی ہو۔ ابھی صبح ہونے میں دیر ہے۔ اس وقت تک تو حاکم خان تیرے بدن کا ریشہ ریشہ علیحدہ کر دے گا پھر میں دیکھتا ہوں کہ تیرا بیرسٹر کیا کرے گا۔ صبح تک تو اس قابل بھی نہیں رہے گا کہ کسی کو پہچان سکے۔“ پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”حاکم خان!“ حاکم خان فوراً ہی اندر آگیا۔ وہ شاید اسی انتظار میں بیٹھا تھا کہ انچارج اب مجھے اس کے حوالے کرے گا۔ وہ اب بھی اسی حلیے میں تھا یعنی بنیان اور دھوتی۔

”حاکم خان!“ انچارج نے کہا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ ایک لڑکے نے مار مار کے تجھے لہولہان کر دیا اور تو کچھ بھی نہ کر سکا اب تیرے پاس دو گھنٹے ہیں۔ تو اسے بتا کہ پولیس کی وردی کیا ہے اور پولیس اہلکار پر ہاتھ اٹھانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ خیال رکھنا کہ یہ مرنے نہ پائے ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

حاکم خان نے مجھے یوں دیکھا جیسے قسائی بکری کو دیکھتا ہے پھر اس نے پہلے کی طرح پشت سے میری گردن دبوچی اور مجھے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے کرم دین سے کہا کہ

اس۔۔۔کو الٹا لٹکا دو۔ اس نے پھر انتہائی غلیظ گالی دی تھی۔
کرم دین نے آگے بڑھ کر پھرتی سے میرے دونوں پیروں میں رسی باندھی اور زوردار جھٹکا مار کر مجھے گرا لیا۔
''کرم دین!'' حاکم خان نے کہا۔ ''میں اس حرام زادے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، حاکم خان پر جس کے نام سے بڑے بڑے مجرم لرزتے ہیں، بعد میں چاہے مجھے پھانسی ہی پر کیوں نہ چڑھنا پڑے۔''
اس کی باتیں سن کر میں اندر سے کانپ کر رہ گیا۔ اس کے تیور مجھے بہت خطرناک لگ رہے تھے۔ اس نے جوش میں آکر اپنی بنیان بھی اتار دی تھی۔ اس کے پورے جسم پر بید کے نشانات تھے جہاں سے اس کی کھال ادھڑی تھی وہاں اب کھرنڈ سا جم گیا تھا۔ اس نے میز پر سے ایک چاقو اٹھا لیا تھا اور اسے تھامے جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھ رہا تھا۔
کرم دین مجھے الٹا لٹکانے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کرم دین نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر نور خان کھڑا تھا۔
''کیا بات ہے؟'' حاکم خان نے پوچھا۔
''انچارج صاحب نے امجد کو اپنے دفتر میں بلایا ہے۔''
''کیوں؟'' حاکم خان نے بپھر کر پوچھا۔
''شاید انہیں اس سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔''
کرم دین نے میرے پاؤں کھول دیے اور نور خان مجھے ایک مرتبہ پھر انچارج کے کمرے میں لے گیا۔
انچارج نے جھنجلا کر کہا۔ ''اس حرام زادے کو یہاں کیوں لائے ہو؟ اس کی ہتھکڑی کھولو اور اسے سلطان کے پاس پہنچا دو۔''
''جی سر!'' نور خان نے کہا اور فوراً میری ہتھکڑی کھول دی۔ پھر اس نے مجھے ایک کمرے میں سلطان کے پاس پہنچا دیا۔ وہ خاصا صاف ستھرا کمرا تھا۔ وہاں دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ چھت پر پنکھا بھی تھا اور کمرے میں پانی کا کولر بھی موجود تھا۔
نور خان کے جانے کے بعد سلطان نے دروازہ اندر سے بند کیا اور مجھ سے بولا۔ ''تم اطمینان سے سو جاؤ امجد! صبح بات کریں گے۔''
''سلطان صاحب! مجھے اس وقت نیند نہیں آئے گی۔ مجھے یہ بتائیے کہ بغیر کسی جان پہچان کے آپ کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں پیدا ہو گئی؟''
''یار، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔'' سلطان نے کہا۔ ''آج میں تمہارے کام آیا ہوں، کل تم میرے کام آ جاؤ گے۔''
''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے الجھ کر پوچھا۔
''میں بھی تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔'' سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ تم کسی لڑکی کے چکر میں آئے ہو۔ عین وقت پر لڑکی کے ساتھ فرار ہوتے پکڑے گئے ہو لیکن جب تم نے بتایا کہ تم پر ڈکیتی کا الزام ہے تو مجھے حیرت ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ کہیں نہ کہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے لوگوں کو پرکھنے کا سلیقہ تو ہے۔ میں سمجھ گیا کہ تمہیں بے گناہ پھنسایا گیا ہے۔''
''لیکن آپ نے میری اس حد تک مدد کیسے کر لی؟'' میں نے پوچھا۔
''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں بلکہ ایک گینگ کا چیف ہوں۔ ہم ہر طرح کے غیر قانونی کام کرتے ہیں۔ اسمگلنگ، اغوا برائے تاوان اور ذخیرہ اندوزی، جعلی کرنسی اور دستاویز کی تیاری۔ ہمیں ہر وقت تم جیسے پڑھے لکھے، ذہین اور وجیہ نوجوانوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ پھر تم تو انجینئر بننے والے ہو۔ صبح بیرسٹر انصاری تمہاری ضمانت کرا لے گا۔ پھر تم اپنی تعلیم بھی جاری رکھنا اور ہمارے لیے کام بھی کرتے رہنا۔''
''اور اگر میں انکار کر دوں تو؟''
''تو پھر انصاری تمہارا کیس نہیں لڑے گا۔ ضمانت بھی نہیں ہو پائے گی اور ممکن ہے کہ تمہیں اور ڈکیتی کے اس کیس میں بھی سزا ہو جائے۔ تمہارے ہاتھ میں ہے حوالات سے جیل جاؤ یا گھر؟''
''سلطان صاحب!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اپنے ضمیر کا سودا نہیں کر سکتا۔ میں آپ کے کسی غیر قانونی کام میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔''
''زیادہ جذباتی مت بنو امجد۔'' سلطان نے کہا۔ ''صبح تک اچھی طرح سوچ لو۔ تم انجینئر بننا چاہتے ہو۔ زندگی کے بہترین سال جیل کی کال کوٹھری میں گزارنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں صبح تک کا وقت دے رہا ہوں۔ میری آفر پر غور کر لو۔''
میں نے بھی اس وقت اس سے زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مشتعل ہو کر دوبارہ مجھے حاکم خان کے حوالے نہ کر دے۔ میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اس لیے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی نیند نہیں آئی۔ سلطان خود بھی جاگ رہا تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''سلطان صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ اتنے بڑے گینگ کے سرغنہ ہیں۔ پولیس والے بھی آپ کو عزت سے سلام کرتے ہیں۔ آپ حوالات تک کیسے پہنچ گئے؟''
''تمہیں سچی بات بتا دوں؟'' سلطان نے کہا۔ ''میں نے اپنے سب سے بڑے حریف شاہ زیب خان کو ختم کرا دیا ہے۔ اس کے اور میرے درمیان کافی دن سے جھگڑا چل رہا تھا۔ اس کے قتل کے الزام میں پولیس سب سے پہلے میری طرف رخ کرتی۔ میں نے ایک روڈ سائڈ ایکسیڈنٹ کروایا اور پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ شاہ زیب کو شام ساڑھے پانچ بجے کے قریب قتل کیا تھا لیکن پولیس اسٹیشن کے ریکارڈ میں میری گرفتاری کا وقت سوا پانچ بجے ہے۔ میں کسی جرم میں یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ اپنی جان بچانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ صبح تک میرے ایکسیڈنٹ والے کیس کی ضمانت ہو جائے گی۔ تم اتنے ذہین تو ہو کہ اب پوری بات سمجھ گئے ہو گے۔''
''اس میں ذہانت کا تو کوئی دخل ہی نہیں ہے۔'' میں بولا۔ ''ہاں، اس میں آپ کی ذہانت کا دخل ضرور ہے۔''
پھر میں خاموشی سے لیٹا اندھیرے میں چھت کو تکتا رہا۔
وہ رات بھی شیطان کی آنت کی طرح طویل ہو گئی تھی۔ مجھے ابو کی طرف سے بھی بہت تشویش تھی اور امی کی طرف سے بھی۔ نہ جانے ان لوگوں نے رات کیسے گزاری ہو گی اور رات بھر کہاں کہاں مارے مارے پھرے ہوں گے۔
پھر نہ جانے کیسے میری آنکھ لگ گئی۔
میری آنکھ کھلی تو پولیس اسٹیشن کا ایک اے ایس آئی اکرم مجھے اور سلطان کو کورٹ لے جانے کے لیے تیار تھا۔ یہ بھی سلطان کا کمال تھا کہ ہم اتنی صبح کورٹ جا رہے تھے۔
کورٹ میں بیرسٹر انصاری بھی تھا اور ابو، امی اور میرا بھائی بھی۔ انہیں شاید سلطان کی ہی نے اطلاع

عقل بڑی یا بھینس

بھینس کے متعلق یہ عام خیال ہے کہ یہ جانور شعریت سے قطعی مبرا ہے۔ سیاہ رنگت، بے ڈھنگا جسم، بھدی اور بے ہنگم آواز، اور پھر رفتار، خدا کی پناہ، یوں تو ہتھنی بھی جھوم جھوم کے چلتی ہے لیکن اس کی چال میں ایک قسم کی مستی ہے اور بھینس میں یہ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھاشا کے شاعروں نے محبوب کی رفتار کو ہتھنی کی چال سے تشبیہ دی ہے لیکن بھینس کو اس موقع پر بھی یاد نہیں کیا۔
موسیقی کا اثر انسان اور حیوان سب پر ہوتا ہے۔ اونٹ حدی کی آواز سن کر تیز چلنا شروع کر دیتے ہیں اور پرندوں کو تو گانے بجانے کی عادت ہے۔ بندر خود تو نہیں گاتے، البتہ انسانوں کا گانا سن کر ضرور خوش ہوتے ہیں۔ گھوڑے قرنا کی آواز سن کر بے چین ہو جاتے ہیں اور تو اور ہم نے گائے اور بکریوں کو بھی راگ سن کر سر ہلاتے دیکھا ہے لیکن بھینس کے متعلق سب کی رائے یہی ہے کہ اس جانور پر نہ شاعری کا اثر ہوتا ہے نہ موسیقی کا۔ خواہ آپ اسے جوش کا کلام سنائیے یا وارث شاہ کا۔ بین بجائیے یا ہارمونیم۔ کیا مجال جو ٹس سے مس ہو جائے۔
لیکن ہم شاعر حضرات مایوس نہیں ہوئے اور ان میں شاعری کا مذاق پیدا کرنے کا شوق بہت ترقی کر رہا ہے۔ بھینس کو شاعری سے اس لیے بھی کوئی تعلق نہیں کہ عقل اور شاعری میں ہمیشہ سے جنگ رہی ہے اور بھینس کا مقابلہ ہمیشہ عقل سے کیا جاتا ہے، چنانچہ آج تک بڑے بڑے عالم یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ عقل بڑی ہے یا بھینس۔''

چراغ حسن حسرت کے انکشافات
میمونہ عزیز کا کراچی سے انتخاب

دی تھی۔
میرے ہاتھ میں اس وقت بھی ہتھکڑی موجود تھی۔
اچانک میری نظر شائلہ پر پڑی۔ میں گرفتہ دلی سے اس کی بہن کو ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا۔ اس وقت وہ بھی آ کر وہاں بیٹھ جاتی تھی اور کہتی تھی کہ امجد صاحب! آپ کو انجینئر کے بجائے وکیل ہونا چاہیے تھا۔ آپ اتنے مؤثر اور خوب صورت انداز میں بولتے ہیں کہ سننے والا فقٹی پرسنٹ تو آپ کی دلکش گفتگو سن کر ہی قائل ہو جاتا ہے۔

وہ کچھ عرصہ پہلے لندن سے بار ایٹ لا کر کے آئی تھی اور کسی بڑے وکیل کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اس سے اکثر میری گفتگو رہتی تھی۔ وہ انتہائی ذہین اور باصلاحیت لڑکی تھی اور وہ بھی گفتگو اور خاص طور پر بحث کا فن جانتی تھی۔

وہ اس وقت وکیلوں کے مخصوص لباس میں بہت پُرکشش اور باوقار لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف چھپانا چاہا لیکن وہ مجھے دیکھ چکی تھی۔

وہ تیر کی طرح میری طرف آئی اور بولی۔ ''مسٹر امجد! آپ یہاں، اس حال میں؟''

''ہم سب اپنے اپنے حالات کے اسیر ہیں شائلہ صاحبہ! میں بھی ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں۔''

''آپ کا وکیل کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے وکیل بیرسٹر انصاری صاحب ہیں۔'' میں نے کہا۔

بیرسٹر انصاری کا نام سن کر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ ''لیکن ان کی شہرت تو اچھی نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں، میرے وکالت نامے پر سائن کر دیں۔ اگر انصاری آپ کی ضمانت نہ کرا سکا تو پولیس آپ کا ریمانڈ لے لے گی۔ آپ کس پولیس اسٹیشن میں ہیں، مجھے بتائیں تاکہ میں وہاں پہنچ کر آپ کا کیس تفصیل سے سن سکوں۔''

میں نے اسے مطلوبہ پولیس اسٹیشن کے بارے میں بتایا اور اس کے اصرار پر وکالت نامے پر سائن کر دیے۔

شائلہ رخصت ہو رہی تھی تو انصاری وہاں پہنچ گیا اور بولا۔ ''امجد صاحب! آپ نے یقیناً کل سلطان صاحب کی بات پر غور کیا ہوگا؟ ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ آپ مجھے بتائیے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں سلطان صاحب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ان کی آفر قبول نہیں ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر میں بھی معذرت چاہوں گا۔ میں بھی آپ کے کیس کی پیروی نہیں کر سکوں گا۔ اب آپ جانیں اور مجسٹریٹ جانے۔ ویسے اب آپ کو سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم رکھتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

میں نے راشد سے کہا۔ ''راشد! ابھی ایک بیرسٹر صاحبہ مجھ سے بات کر رہی تھیں۔ انہیں ڈھونڈ کر لاؤ ورنہ میری زندگی بھر کی محنت اکارت ہو جائے گی۔''

راشد اسی وقت بھاگتا ہوا چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد وہ شائلہ کو ساتھ لے کر آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ انصاری نے میرا کیس لڑنے سے عین وقت پر انکار کر دیا ہے۔ میں نے مختصراً اسے بتایا کہ کس طرح مجھے اس کیس میں ملوث کیا گیا ہوں اور سلطان مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

''آپ ایس ایس پی علی کو جانتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک اچھے اور ذمے دار افسر ہیں۔''

''آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ یہ ہمارے فیملی فرینڈ ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن سے میری اچھی فرینڈشپ ہے اور آپ کی قسمت اچھی ہے کہ اس وقت علی آفیشل کام سے یہاں کورٹ ہی میں موجود ہیں۔ میں علی صاحب سے رابطہ کرتی ہوں۔'' شائلہ نے کہا۔

اس کے پاس نمبر نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر سالی یعنی اپنی بیسٹ فرینڈ سے علی کا نمبر لیا اور انہیں کال دی۔ پھر وہ ہم سے کچھ فاصلے پر چلی گئی اور وہیں کھڑی بات کرتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے بتایا کہ علی دس منٹ میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔

اگر نور خان کانسٹیبل نہ ہوتا تو مجھے بہت دقت پیش آتی۔ وہ فطری طور پر شریف آدمی تھا۔ ایس آئی تو مجھے نور خان کی حراست میں چھوڑ کر جانے کب کا چلا گیا تھا۔ نور خان نے بغیر کسی لالچ کے میری ملاقات نہ صرف شائلہ سے کرائی بلکہ شائلہ سے بھی بات کرنے کا موقع دیا۔

تھوڑی دیر بعد سلطان کا نمبر آ گیا۔ انصاری نے فوراً ہی اس کی ضمانت کرا لی۔

پھر مجھے بلایا گیا تو نور خان مجھے لے کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ اس وقت بھی سلطان اور بیرسٹر انصاری دونوں کورٹ روم میں موجود تھے۔ وہ شاید میری تباہی کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔

اچانک شائلہ آگے بڑھی اور اس نے مجسٹریٹ کے سامنے اپنا وکالت نامہ رکھ دیا۔

میں نے سلطان اور بیرسٹر انصاری کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھیں حیرت سے گویا پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ شائلہ نے مختصراً مجسٹریٹ کو میرے کیس کے بارے میں بتایا اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ ایس ایس پی علی اس وقت کورٹ میں موجود ہیں۔ ''آپ چاہیں تو میں انہیں بھی یہاں طلب کر سکتی ہوں۔''

پورا کیس سننے کے بعد مجسٹریٹ نے میری ضمانت کی درخواست قبول کر لی اور مجھے فوری طور پر ضمانت پر رہا کر دیا گیا لیکن ابھی کیس باقی تھا اور جب تک عدالت کو میری بے گناہی کا ثبوت نہ مل جاتا، اس کیس سے میری گلوخلاصی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجسٹریٹ نے دو لاکھ روپے کے مچلکے پر ہمارے مکان کے کاغذات پر میری ضمانت منظور کی تھی۔ یہ رقم ابو نے سہیل صاحب سے قرض کے طور پر لی تھی۔ وہ بھی رات بھر ابو کے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ مجسٹریٹ نے کیس کے لیے اگلے ماہ کی انیس تاریخ دے دی۔ گویا اب مجھے ڈیڑھ مہینے بعد عدالت میں پیش ہونا تھا۔

شائلہ کو فوری طور پر ایک دوسری کورٹ میں پہنچنا تھا۔

میں نے فاتحانہ انداز میں بیرسٹر انصاری اور سلطان کو دیکھا اور کورٹ سے باہر آ گیا۔

شائلہ نے مجھ سے گھر کا ایڈریس لے لیا تھا۔ وہ تین دن بعد گھر آ گئی۔ اس سے پہلے وہ سیل فون پر مجھ سے کیس کے بارے میں ایک ایک بات پوچھ چکی تھی۔ اس دن تو وہ کیس کی فائل تیار کر کے لائی تھی۔ اس میں علی کا بیان بھی تھا۔

آئندہ پیشی پر علی نے مجسٹریٹ کے سامنے میرے حق میں گواہی دے دی اور مجسٹریٹ کو بتا دیا کہ پولیس اسٹیشن میں اس سے ایف آئی آر کے لیے رشوت طلب کی گئی تھی۔ میں نے اس ہیڈ محرر اور انچارج کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کی تھی۔

علی کے بیان کے بعد میرا کیس مزید مضبوط ہو گیا۔ پولیس نہ جانے کہاں سے ایسے گواہ تلاش کر لائی تھی جنہوں نے مجھے اس وقت محمد علی سوسائٹی کے اس بنگلے سے نکلتے دیکھا تھا جس میں ڈکیتی اور اقدام قتل کی واردات ہوئی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ زخمی ہونے والے دونوں آدمی اب روبہ صحت تھے اور ایک ہفتے میں اسپتال سے گھر منتقل ہونے والے تھے۔

اس دوران میں شائلہ وقفے وقفے سے ہمارے گھر آتی رہی۔

وہ بہت پُرکشش لڑکی تھی اور میں اسے چاہنے لگا تھا لیکن اس کی اور ہماری کلاس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں اسے چاہ تو سکتا تھا حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

چوہے نے سائرن بجا دیا

قبرص کے ایک یونانی علاقے میں ایک روز بہت سویرے خطرے کا سائرن بجنے لگا۔ سائرن بجا تو ہر یونانی سر پر پاؤں رکھ کر پناہ گاہوں کی طرف بھاگا۔ پورے علاقے میں شور مچ گیا کہ ترکوں کا ہوائی حملہ شروع ہو گیا ہے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور کوئی حملہ واقع نہ ہوا تو سائرن کو جا کر چیک کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک موٹا تازہ چوہا سائرن کی مشین میں گھسا بیٹھا ہے۔ وہ اس بٹن پر بیٹھا ہوا تھا جس کے دبنے سے سائرن بجتا ہے۔

(گلگت سے شیر خان کا انکشاف)

آخری کمبل

ایک مرتبہ ایک خاتون کمبل کی دکان پر گئیں اور کمبل دیکھنے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ سیلزمین ان کو ساری کے کمبل نکال کر دکھاتے دکھاتے بور ہو چکا ہے۔ جب صرف ایک کمبل دکھانے کے لیے رہ گیا تو انہوں نے کہا۔ ''مجھے بہت افسوس ہے، اصل میں میں اس وقت خریدنے نہیں آئی، میں یہ سب اپنی ایک دوست کے لیے دیکھ رہی ہوں۔''

''بہت بہتر مادام۔'' سیلزمین نے فکرمندی سے کہا۔ ''اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اس میں لپٹی ہوئی ہیں تو میں یہ آخری کمبل بھی آپ کو دکھائے دیتا ہوں۔''

(کراچی سے تنویر خان کی معصومیت)

ایک دن شائلہ گھر آئی تو بہت پریشان تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے شائلہ! تم آج کچھ زیادہ پریشان ہو؟''

''مجھے دہری پریشانی کا سامنا ہے امجد۔'' شائلہ نے کہا۔ ''مجھے سلطان اور اس کے آدمیوں کی طرف سے مسلسل دھمکیاں مل رہی ہیں کہ امجد کے کیس سے دست بردار ہو جاؤ ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ لیکن میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ میں نے علی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ انہوں نے میری حفاظت کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔''

''اور دوسری پریشانی کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسری پریشانی کچھ ذاتی قسم کی ہے۔'' اس نے

ہنس کر کہا۔
"اگر تم نہیں بتانا چاہتی ہو تو مت بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن پھر اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"
"اوہو، تم تو ناراض ہو گئے۔" شائلہ ہنس کر بولی۔ "دوسری پریشانی یہ ہے کہ علی نے مجھے پرپوز کیا ہے۔"
میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ ظاہر ہے علی کا تعلق اس کی کلاس سے تھا۔ وہ اسے پرپوز کر سکتا تھا۔
"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔
"بھئی پریشانی کی بات یہ ہے کہ میں اس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔"
"کیوں، اس میں کیا خرابی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"تم چاہتے ہو کہ میں اس سے شادی کر لوں؟" شائلہ نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔
"میری بات چھوڑو شائلہ! تم بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟"
"میں... میں... تو... تمہیں... چاہتی ہوں۔" وہ رک رک کر بولی اور جلدی سے اٹھ کر اندر امی کے پاس چلی گئی۔
وہ چند منٹ بعد واپس آئی تو بولی۔ "تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ کیسی بے حیا لڑکی ہے؟"
"نہیں... میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے یہ بات تم سے کہنے میں اتنی دیر کیوں کر دی... لیکن شائلہ ایک بات بتاؤ، کیا تم میرے ساتھ خوش رہ سکو گی... میری اور تمہاری کلاس اور رہن سہن میں زمین آسمان کا فرق ہے؟"
"دیکھو امجد تم اس بات پر مجھ سے بحث میں تو جیت ہی نہیں سکو گے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "اس لیے بحث مت کرنا۔ میں تمہارے ساتھ خوش رہوں گی پھر ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہو گی۔ تم بھی انجینئر ہو، میں بھی بیرسٹر ہوں، اور ہم مل کر کمائیں گے تو زندگی آسان ہو جائے گی۔"
"اور بچوں کو کس پر چھوڑو گی؟"
اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا پھر وہ آہستہ سے بولی۔ "اس پرابلم کا حل بھی نکل ہی آئے گا۔"
"علی سے تمہاری کیا بات ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔
"علی تو ایک دم ریش ہو گیا اور بولا اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں تو اتنی فری کیوں ہوئیں؟"
میں نے کہا۔ "علی! تم تو بہت با اصول مشہور ہو۔ اس معاملے میں بے اصولی کیوں کر رہے ہو۔ اب یہ مت کہنا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ علی بھی شرمندہ ہو گیا اور بولا۔ "سوری شائلہ! میں جذباتی ہو کر کچھ زیادہ ہی غصے میں آ گیا تھا۔"
اس دن دیر تک شائلہ اور میں مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔
دوسرے دن پھر اس نے سیل فون پر مجھے بتایا کہ سلطان کے آدمی نے ایک مرتبہ پھر دھمکی دی ہے۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ اگر اب میں اس کیس سے دست بردار ہو بھی جاؤں تو کوئی چھوٹا موٹا وکیل بھی یہ کیس جیت لے گا، اس کیس میں اب جان نہیں ہے سلطان کے آدمی نے کہا کہ آپ درمیان سے ہٹ جائیں، پھر کس وکیل کی مجال ہے کہ وہ کورٹ میں پیش ہو سکے، بیرسٹر انصاری کی تو پہنچ ہے کہ وہ کسی بھی وکیل کو تمہارے کیس کی پیروی نہیں کرنے دے گا اور یہ آپ کے لیے آخری وارننگ ہے۔
میں نے علی کو بتایا تو اس نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ تم فکر مت کرو سلطان یا اس کا کوئی آدمی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔
"شائلہ! اس کے باوجود تم اپنے طور پر گارڈز کا بندوبست کر لو۔ وہ لوگ بہت کمینے اور گھٹیا ہیں۔"
"ہاں، ڈیڈی بھی یہی کہہ رہے تھے۔ وہ کل میرے لیے گارڈز کا بندوبست کر دیں گے۔"
دوسرے دن مجھے اطلاع ملی کہ شائلہ گھر سے کورٹ کے لیے نکلی تھی لیکن وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کا ایک گارڈ شدید زخمی تھا دوسرا معجزانہ طور پر بچ گیا تھا۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ شائلہ بی بی گھر سے نکلیں تو سرور گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور میں پسنجر سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ڈیفنس کے فیز فور سے نکلتے ہی ایک گاڑی ہمارے بالکل نزدیک آ گئی۔ اس نے سرور کو رکنے کا اشارہ کیا... گاڑی میں مشکوک قسم کے آدمی سوار تھے۔ سرور نے رکنے کے بجائے اپنی گن نکال لی اور اس نے فائر کر دیا۔ اس سے پہلے کہ ہم سنبھلتے، اس گاڑی سے فائرنگ ہوئی اور سرور شدید زخمی ہو گیا۔ اس کے باوجود اس نے گاڑی روک دی ورنہ ہماری گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا جاتی۔ گاڑی رکتے ہی وہ گاڑی بھی اچانک ہمارے سر پر پہنچ گئی۔ ان میں سے ایک آدمی نے پچھلی سیٹ کا شیشہ توڑ کر شائلہ بی بی کو گن پوائنٹ پر لے لیا، پھر ان لوگوں نے میرے سر پر کوئی بھاری چیز ماری جس سے میں بے ہوش ہو گیا۔ اگر وہ شائلہ بی بی کو گن پوائنٹ پر نہ لیتے تو میں بی بی کو بھی نہ نکلنے دیتا۔

میں علی سے ملا تو وہ بھی بہت پریشان تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے اپنے جن لوگوں کی ڈیوٹی لگائی تھی، ان کی گاڑی راستے میں پنکچر ہو گئی تھی۔ انہیں ٹائر بدلنے میں مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے۔ وہ کچھ آگے بڑھے تو انہیں شائلہ کی گاڑی نظر آئی لیکن اس میں شائلہ نہیں تھی۔ انہی لوگوں نے زخمی گارڈ کو اسپتال پہنچایا تھا۔
"میرا تو سو فیصد خیال ہے کہ شائلہ کو سلطان کے آدمیوں نے اغوا کیا ہے۔" میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔
"مجھے بھی یقین ہے لیکن ہم محض اپنے شک کی بنا پر سلطان کو گرفتار نہیں کر سکتے۔"
"سلطان، شائلہ کو دھمکی آمیز کالز تو کرتا رہا ہے؟" میں نے کہا۔
"اس نے کون سی اپنے نام سے اسے کالز کی ہوں گی پھر شائلہ بتاتی تھی کہ سلطان خود اسے کال نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ سلطان کا کوئی آدمی ہی شائلہ کو کال کرتا تھا لیکن تم فکر مت کرو... میں بارہ گھنٹے کے اندر اندر شائلہ کا سراغ لگا لوں گا۔"
وہ سراغ لگاتا یا نہیں لگاتا میں نے اپنے طور پر ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اسی دن شائلہ کے دوسرے گارڈ ناظم سے ملا۔
اسے خود بھی شائلہ کے اغوا کا بہت افسوس تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ناظم! مجھے یقین ہے کہ شائلہ کو سلطان نے اغوا کرایا ہے۔ میں سلطان کو اغوا کر کے اس سے شائلہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم جیسے تین چار آدمیوں کی ضرورت ہے۔"
"میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اب آپ بھی میرے ساتھ ہیں تو مجھے فیصلہ کرنے میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ چار کیا سر، بندے تو دس مل جائیں گے، آپ حکم کریں۔"
"دس نہیں مجھے صرف تین آدمیوں کی ضرورت ہے، چوتھے تم ہو گے اور پانچواں میں ہوں۔ تینوں بندے اعتبار کے ہونے چاہئیں، میں نہیں چاہتا کہ اس معاملے کی کسی کو خبر ہو، خاص طور پر ایس ایس پی علی کو تو بالکل نہیں۔ وہ انتہائی کھرا اور با اصول آدمی ہے۔ وہ اس پر ہم کو گرفتار بھی کر سکتا ہے۔"
"آپ بالکل فکر مت کریں صاحب!" میرے آدمی بہت با اعتبار ہیں۔"
"جب تم لوگوں کا بندوبست کر لو تو مجھے کال کر دینا میرا اسیل نمبر محفوظ کر لو۔"
"سر! آدمیوں کا بندوبست تو ابھی آدھے گھنٹے میں ہو جائے گا۔"
"لیکن ابھی دن ہے۔ میں اس آدمی کو رات کے وقت اٹھانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اس وقت مجھے اپنا لہجہ عجیب لگ رہا تھا۔ میں انجینئرنگ فائنل سمسٹر سے فارغ ہو چکا تھا اور اب رزلٹ کا انتظار تھا۔ اس کیس کی وجہ سے میرا فائنل سمسٹر ایسا نہیں ہوا تھا جیسے بقیہ سمسٹر ہوئے تھے لیکن مجھے امید تھی کہ میں پوزیشن سے کم نہ سہی، اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں گا۔
پھر مجھے خیال آیا کہ ناظم کو سلطان کے بارے میں بتا تو دوں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے تاکہ وہ اسی لحاظ سے تیاری کرے یا پھر انکار کر سکے۔ عین وقت پر اگر وہ انکار کرتا تو مجھے بہت کوفت ہوتی۔
میں نے ناظم کو کال کی اور اس سے کہا کہ تم فوری طور پر میرے گھر آ کر مجھ سے مل لو۔
دس منٹ کے اندر اندر ناظم آ گیا۔ اس کا تعلق سندھ کے کسی گاؤں سے تھا۔ وہ بلوچ تھا اور کسی جنگجو قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ جہاں قبیلوں میں آئے دن لڑائیاں ہوتی ہیں، گولیاں چلتی ہیں اور ہر مہینے، دو مہینے بعد دونوں طرف دس پندرہ لاشیں گر جاتی ہیں۔ انہیں لڑانے والے آرام سے کراچی اور اسلام آباد کے ائرکنڈیشنڈ گھروں میں بیٹھے عیاشی کرتے ہیں۔
"ناظم!" میں نے اس سے کہا۔ "میں نے جس آدمی کو اٹھانے کا ارادہ کیا ہے، وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔"
"سر! کتنا خاص ہے۔ کوئی وزیر یا گورنر ہے کیا؟"
"وہ ایک جرائم پیشہ گینگ کا چیف ہے۔"
"سر! اس کا نام کیا ہے۔ شاید میں نے یا میرے کسی آدمی نے اس کا نام سنا ہو؟"
"اس کا نام سلطان ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ ہر قسم کے غیر قانونی کام کرنے میں ماہر ہے۔ اغوا برائے تاوان، اسمگلنگ، ڈکیتی۔"
"سلطان!" ناظم زیر لب بڑبڑایا۔ "میں نے اس کا نام کہیں سنا تو ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ آپ بتائیں یہ رہتا کہاں ہے؟"
"یہ ڈیفنس میں کہیں رہتا ہے لیکن رات کو دیر تک اپنے بی مارکیٹ کے ایک اڈے پر بیٹھتا ہے۔"
میں نے اسے بتایا۔ میں نے اس دوران میں سلطان کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔

خاص طور پر اس وقت جب اس نے شائلہ کو دھمکیاں دینا شروع کی تھیں۔

"ہم اس کے بی مارکیٹ والے اڈے پر جائیں گے اور اس کے باہر نکلنے کا انتظار کریں گے۔ جب وہ وہاں سے اپنے گھر جائے گا تو راستے میں ہم اسے اٹھالیں گے۔ اس کے ساتھ دو تین گارڈز بھی ہوتے ہیں۔ اس چکر میں فائرنگ بھی ہو سکتی ہے۔ ہم میں سے کوئی زخمی بھی ہو سکتا ہے اور مر بھی سکتا ہے۔ یہ باتیں میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم ہر بات کے لیے ذہنی طور پر تیار رہو۔"

"موت کی پروا نہیں ہے سر!" اس نے کہا۔ "وہ شائلہ بی بی کو بھی اس لیے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے ایک آدمی نے ان کی کنپٹی پر گن رکھ دی تھی۔ میں ذرا سی بھی حرکت کرتا تو وہ شائلہ بی بی کو مار دیتے ورنہ میں ان کے دو تین آدمیوں کو تو ساتھ لے مرتا۔" اس کی اردو کراچی میں رہ کر بہت صاف ہو گئی تھی۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں کراچی آ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر جا کر تیاری کرو۔ ایسے لوگوں کا بندوبست کرنا جو تمہاری طرح موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکیں۔"

"آپ فکر مت کریں سر!" میں نے کہا۔ "مجھے تو اپنے دوست سرور کا بدلہ بھی لینا ہے۔" ناظم نے کہا اور روانہ ہو گیا۔

میں نے خود آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ مجھے ریوالور چلانا تو دور کی بات ہے، صحیح طریقے سے پکڑنا بھی نہیں آتا تھا۔

ٹھیک بارہ بجے گلی کے نکڑ پر مجھے ایک ڈبل کیبن پک اپ دکھائی دی۔ میں نے ناظم سے یہی کہا تھا کہ وہ گاڑی لے کر گلی کے نکڑ پر آ جائے۔

گاڑی میں ناظم سمیت پانچ آدمی سوار تھے۔ ان میں سے جو شخص پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا وہ مجھے دیکھ کر نیچے اتر گیا اور بولا۔ "سائیں آپ ادھر بیٹھو، میں پک اپ کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاؤں گا۔"

میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ناظم تھا۔ ہم سست رفتاری سے چلتے ہوئے تقریباً چالیس منٹ میں بی مارکیٹ پہنچے۔

میں نے ناظم سے پک اپ ایسی جگہ پارک کرنے کو کہا جہاں اندھیرا تھا۔ وہاں دو تین سوزوکی پک اپ اور ایک منی ٹرک کھڑا تھا۔ ناظم نے بھی اپنی گاڑی وہاں پارک کر دی۔

ہمیں وہاں تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ سلطان تقریباً پونے دو بجے وہاں سے نکلا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی لیکن وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔ اس کے ساتھ خوفناک چہروں والے تین مسلح آدمی بھی تھے اور تینوں ہی شکلوں سے بلوچ لگ رہے تھے۔

سلطان ہماری پک اپ سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ایک آدمی نئے ماڈل کی ہنڈا اسوک لے کر وہاں آ گیا۔

سلطان ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کے دو ساتھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور سست روی سے چلتی ہوئی مین روڈ کی طرف بڑھی۔ ان کے جانے کے بعد ناظم نے بھی گاڑی اسٹارٹ کی لیکن اس کے ہیڈ لیمپس روشن نہیں کیے۔ وہ بھی اسی رفتار سے سلطان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ ہماری گاڑیاں جب ایف ٹی سی کا پل اتریں تو میں نے ناظم کو ہوشیار رہنے کا اشارہ کیا۔ سلطان کالے پل سے پہلے یا بعد میں کسی بھی طرف ٹرن لے سکتا تھا۔

کالا پل گزرنے کے بعد سلطان کے ڈرائیور نے بائیں طرف گاڑی موڑ لی۔ وہ علاقہ خاصا سنسان تھا۔ میں نے ناظم کو اشارہ کیا۔ اس نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں کو ہوشیار رہنے کو کہا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا کر اچانک سلطان کی گاڑی کو اوورٹیک کر لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ سلطان کا ڈرائیور کچھ سمجھ سکتا، ناظم نے گاڑی ایک دم سلطان کی گاڑی کے سامنے روک دی۔ سلطان کا ڈرائیور اگر ماہر نہ ہوتا تو تصادم یقینی تھا۔ ناظم کے آدمیوں نے فوراً ہی فائر کر دیا پھر ان کی طرف سے بھی فائر ہوا لیکن کوئی زخمی نہیں ہوا۔ میں گاڑی سے اتر کر تیزی سے بیٹھے بیٹھے دوسری طرف نکل گیا تھا۔ ناظم میرے ساتھ ساتھ تھا اور وہی مجھے گائیڈ کر رہا تھا۔

میں نے سلطان کو گاڑی سے نکل کر بائیں طرف بھاگتے دیکھا۔ ناظم نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی اور بھاگتے ہوئے پیچھے سے اس کی ٹانگوں پر اڑنگا لگا کر اسے گرا دیا۔ اس کے گرتے ہی ناظم نے اس کے سینے پر رائفل کی نال رکھ دی اور غرا کر بولا۔ "بس سلطان! اپنے آدمیوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں اور واپس چلے جائیں۔ جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ فائرنگ کی آواز سن کر کوئی بھی پولیس پارٹی اس طرف آ سکتی ہے۔ ایسا ہوا تو میں کم سے کم تمہاری کھوپڑی تو اڑا ہی دوں گا۔" اس نے

[..]بان پکڑ کر سلطان کو اٹھالیا۔

سلطان نے بلند آواز میں کہا۔ "تم لوگ واپس جاؤ، [..] بھی لے جاؤ۔ یہ دوست ہیں میں خود واپس آ جاؤں [..]"

وہ لوگ فوراً ہی واپس چلے گئے۔ ناظم نے چند منٹ [..]کیا پھر اپنے ایک آدمی کو پک اپ کی طرف بھیجا۔ وہاں [..] بھی نہیں تھا۔ اس نے آواز دے کر ہمیں بھی بلا لیا۔

پک اپ میں بیٹھ کر ناظم اسے طوفانی رفتار سے [..]نے لگا۔ اب اس کا رخ کورنگی کے صنعتی علاقے کی طرف [..]

وہاں پہنچ کر اس نے گیٹ پر پہنچ کر ہارن بجایا۔ فوراً [..] کھل گیا اور ناظم گاڑی اندر لے گیا۔ اندر جاتے ہی [..]ٹ پھر بند ہو گیا۔

وہ کوئی زیرِ تعمیر فیکٹری تھی جو ایکڑوں کے رقبے میں [..] تھی۔ وہاں ابھی عمارت کا ڈھانچا ہی کھڑا ہوا تھا۔ [..]رے ایسے تھے جو استعمال کے قابل تھے۔ شاید وہاں [..]ے والے چوکیداروں نے انہیں قابلِ استعمال بنایا تھا۔ [..]م نے سلطان کو باندھ کر اس پر بھی ایک ترپال ڈال دیا۔ اچانک میں سلطان کے سامنے آ گیا۔ سلطان نے [..] کر مجھے دیکھا، پھر حیرت سے بولا۔ "تم... تم امجد [..]"

"شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔ میرا تو خیال ہے کہ [..] میں تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو گے۔"

"ہاں، لیکن یہ سب کیا ہے؟" سلطان نے الجھ کر [..]چھا۔

"شائلہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کون شائلہ؟" سلطان نے مجھ سے پوچھا۔

ناظم نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ [..]ا۔ "تو شائلہ کو نہیں جانتا۔ بتا شائلہ کہاں ہے؟"

"تم کس شائلہ کی بات کر رہے ہو؟" سلطان نے [..] پوچھا۔

"تم شائلہ کو نہیں جانتے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "[..]شائلہ، جس نے میرا کیس لڑا ہے بلکہ اب بھی لڑ رہی [..]"

"اچھا، تم بیرسٹر شائلہ کی بات کر رہے ہو۔" سلطان [..] پوچھا۔

"ہاں، میں بیرسٹر شائلہ کی بات کر رہا ہوں۔" میں [..] "تم نے اسے اغوا کرنے کے بعد کہاں رکھا ہے؟"

باپ کا باپ

گرمیوں کی تعطیلات کے لیے اسکول بند ہوا تو ایک مشہور ڈائجسٹ کے مشہور مدیرِ اعلیٰ نے جنہیں اپنی بیوی اور بچوں کے مشکل مشکل نام رکھنے کا بڑا شوق تھا، اپنے بڑے لڑکے کو دو ماہ کی دینی تعلیم کے لیے پنجابی سوداگران کے ایک مدرسے میں داخل کرا دیا۔

پہلے روز جب بچہ مدرسے سے واپس آیا تو انہوں نے پوچھا۔ "کہو بیٹا، آج مدرسے میں کیا پڑھایا گیا؟"

"استاد جی سے کلمے یاد کیے اور بعد میں ایک دلچسپ کہانی سنائی۔"

"دلچسپ کہانی؟" مدیرِ اعلیٰ کی رگِ مدیرانہ پھڑک اٹھی۔ "ہم بھی تو سنیں۔"

بچے نے کہا۔ "بہت زمانہ گزرا، مصر کے بادشاہ اور ایک بڑے پیغمبر کے درمیان حق و ناحق کی جنگ چھڑ گئی۔ آخر اللہ کے وہ برگزیدہ پیغمبر اپنی قوم کو لے کر دریائے نیل کی سمت گئے اور جلدی جلدی ایک بڑا سا پل تعمیر کرایا۔ اس پل کو انہوں نے پوری قوم سمیت پار کیا۔ اسی اثنا میں مصر کا ظالم بادشاہ پیچھا کرتا ہوا ادھر آ گیا۔ جونہی اس نے پل پر قدم رکھا، اللہ کے پیغمبر نے ڈائنامائٹ کے ذریعے پل اڑا دیا۔ بادشاہ اور اس کے سارے ساتھی ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔"

مدیرِ اعلیٰ نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کہانی استاد جی نے سنائی تھی؟ اس شخص نے سنائی تھی جس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ معصوم بچوں کی دینی معلومات میں اضافہ کرے گا؟"

"نہیں۔" بچے نے کہا۔ "انہوں نے تو بڑی عجیب سی کہانی سنائی تھی، میں نے اصلاح کر کے اسے حقیقت سے قریب کر دیا ہے۔"

"حدیقہ!" مدیرِ اعلیٰ نے خوش ہو کر بیگم کو آواز دی۔ "بھئی، آج ہم اس نظریے کے اس مقولے کے قائل ہو گئے کہ ہر بچہ اپنے باپ کا باپ ہوتا ہے۔"

(محمد حنان، مریدکے)

"میں اسے کیوں اغوا کروں گا؟" سلطان نے کہا۔
ناظم نے پھر اس کے چہرے پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ "سچ بول ورنہ تیری آواز سننے والا بھی یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں تجھے گولی نہیں ماروں گا بلکہ ذبح کروں گا۔"
"تم مجھے ذبح کرو یا گولی مارو، میں نے شمائلہ کو اغوا نہیں کیا ہے۔" سلطان نے کہا۔
"تم یا تمہارا کوئی آدمی اسے ٹیلی فون پر دھمکیاں دیتا رہا تھا۔"
"کیسی دھمکیاں؟" سلطان نے پوچھا۔ "میرا شمائلہ سے کیا تعلق ہے اور میں اسے دھمکیاں کیوں دوں گا؟"
"وہ اس لیے کہ وہ میرے کیس سے دست بردار ہو جائے۔" میں نے کہا۔
"تمہارے کیس میں اب رہا ہی کیا ہے۔ اگر شمائلہ کیس سے دست بردار ہو گئی تب بھی مجسٹریٹ تمہیں بری کر دے گا۔"
"دیکھو سلطان!" میں نے کہا۔ "میں آخری دفعہ تم سے پوچھ رہا ہوں، اس کے بعد میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا۔ یہ بہت خون خوار لوگ ہیں اور بات بعد میں کرتے ہیں، گولی پہلے مارتے ہیں۔"
"اچھا، تو تم نے اپنا گینگ بنایا ہے؟" سلطان نے کہا۔
"میری بات کا جواب دو۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "شمائلہ کہاں ہے؟"
"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے شمائلہ کو اغوا نہیں کیا۔ ہاں، مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے کچھ دن پہلے کہیں پڑھا تو تھا کہ ملک کی ایک عورت بیرسٹر شمائلہ عرفان کو اغوا کر لیا گیا۔"
"مجھ سے زیادہ بکواس کرنے کی کوشش نہ کرو ورنہ یہ لوگ زندہ تمہاری کھال اتار لیں گے۔"
"میں سچ بول رہا ہوں۔" سلطان نے کہا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ اس کے ساتھ گارڈ بھی تھے۔ تم اس کے گارڈز سے معلوم کیوں نہیں کرتے۔"
"میں شمائلہ بی بی کا گارڈ ہوں۔" ناظم نے کہا۔
"اب تم مجھے ذبح کرو یا گولی مارو مجھے شمائلہ کے بارے میں کوئی علم نہیں۔"
ناظم نے اپنی جیب سے بڑا سا ایک چاقو نکال لیا اور اس کی طرف بڑھا۔ میں نے اشارے سے ناظم کو روک دیا
اور اسے باہر چلنے کو کہا۔
باہر آ کر میں نے ناظم سے کہا۔ "تم لوگ وہاں پولیس کے گارڈز بھی تو تھے۔ شاید ان ... اغوا کرنے والے کو دیکھا ہو؟"
"ان کی گاڑی پنکچر ہو گئی تھی۔ ... وہاں پہنچے، سلطان کے آدمی یہ کام کر کے جا ...
"اب اس کا ایک ہی حل ہے۔" ...
"سلطان کو ایس ایس پی علی کے حوالے کر دو۔ ... خود ہی اگلوا لے گا۔"
"بات تو آپ کی ٹھیک ہے سر!"
"پھر اسے ابھی علی کے حوالے کر دیتے ... نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ "میں ... علی کو یہیں بلا لیتا ہوں۔"
میں نے اپنے سیل فون پر علی کا نمبر تلاش ... کا نمبر شاید میں نے غلطی سے مٹا دیا تھا یا اسے محفوظ ... کوشش ہی نہیں کی تھی۔
"ناظم!" میں نے کہا۔ "مجھے خود ہی علی ... پڑے گا۔ سلطان کو آج ہی علی کے حوالے کرنا ... ہے۔ ایسا کرو، اپنے آدمیوں کو یہیں چھوڑ دو اور میرے ... ناظم کے گھر چلو۔ اس کا گھر یہاں سے زیادہ دور ... وہ ڈیفنس میں رہتا ہے۔"
ناظم نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ قید ... خیال رکھنا اور کوئی اجنبی فیکٹری کے اندر داخل ... کوشش کرے تو اسے بلا جھجک گولی مار دینا۔
پھر ہم لوگ تیز رفتاری سے دوبارہ ڈیفنس ... گئے۔ ڈیفنس یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مشکل ... بارہ منٹ کی ڈرائیو تھی اور ناظم جس انداز میں ڈ... کر رہا تھا، اس سے لگتا تھا کہ وہ آٹھ منٹ میں ہی کل... پہنچ جائے گا۔
رات خاصی بیت چکی تھی۔ میں نے شور شرا... ناظم کے گھر والوں کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا او... اس کے بنگلے کے باہر ہی رکوا لی۔
مین گیٹ پر جو پولیس گارڈ تھا وہ مجھے بھی پہچانتا تھا اور ناظم کو بھی۔ اس نے مجھے سلام کیا او... کی ذیلی دروازہ کھول دیا۔
ہم لوگ بنگلے میں داخل ہوئے تو ڈرائنگ ... روشنی ہو رہی تھی اور وہاں سے باتوں کی آواز ... تھیں۔

... اور ناظم اس وقت برآمدے میں تھے کہ میں ... ہو کر رک گیا۔
... علی کہہ رہا تھا۔ "وہ ایک خود سر اور ضدی لڑکی ہے لیکن ... نکاح ہو جائے، پھر میں اس کی ساری خود سری اور ... نکال دوں گا۔"
... تم نکاح صبح بھی کر سکتے تھے۔" ایک اور آواز ...
... نے دو ہی دن میں میری زندگی اجیرن کر دی ... صبح تو اس کا باپ بھی بیرون ملک سے واپس آ رہا ... نکاح ہو جائے گا تو سب سیٹ ہو جائے گا۔"
... اس کا باپ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ ... مرنے کر دے گا۔"
... او چھوڑ یار۔" علی نے کہا۔ "میرا پولیس کا عہدہ اور ... اس ڈائریکٹر کا عہدہ کس دن کام آئے گا۔ ویسے بھی ... آئی جی ہونے والا ہوں۔"
"یہ شعر کہاں رہ گیا؟ یہ تو قاضی کو لینے گیا تھا۔"
میں مزید برداشت نہ کر سکا اور ناظم کو آگے بڑھنے کا ... دیا۔ ناظم نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑ ... اور اپنی رائفل مجھے پکڑا دی۔ مجھے رائفل چلانا نہیں آتی ... اس کی ایک دہشت تو ہوتی ہے۔
... ناظم نے دروازے پر لات ماری اور ایک دم ... میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی تھا۔ ... ہاتھ میں رائفل تھی۔
"بس ایس پی صاحب!" ناظم گرج کر بولا۔ "اب ... کھیل ختم ہو گیا۔ کسی نے بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش ... میں فائر کر دوں گا۔ تم سب لوگ اپنے ہاتھ سروں پر ... کھڑے ہو جاؤ۔"
... وہ سب مشینی انداز میں کھڑے ہو گئے۔
ناظم نے مجھ سے کہا کہ ان کی تلاشی لوں۔
میں نے باری باری سب کی تلاشی لی۔ صرف اکرم ٹیکس... اور علی کی جیب سے ریوالور نکلا۔
"شمائلہ کہاں ہے؟" میں نے گرج کر پوچھا اور ... نال علی کے سینے پر رکھ دی۔
"وہ اوپر والے کمرے میں ہے۔"
"میرے ساتھ چلو اور اسے یہاں لے کر آؤ۔" ناظم ... پھر اس نے باقی لوگوں کو اوندھے منہ فرش پر لیٹنے کا ... مجھ سے کہا۔ "امجد صاحب اگر ان میں سے کوئی ... کوشش کرے تو اسے گولی مار دیں۔" ناظم نے علی
کو پیچھے سے دھکا دیا۔ "چلو شمائلہ بی بی کے پاس!"
علی بوجھل قدموں سے زینے کی طرف بڑھا۔
میں اس دوران میں مضطرب انداز میں رائفل لیے ان سب کے سروں پر کھڑا رہا۔ وہ تعداد میں چھ تھے اور زمین پر مردوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔
تھوڑی دیر بعد ناظم، شمائلہ اور علی سمیت نیچے آیا۔
مجھے دیکھتے ہی شمائلہ، ناظم اور علی کی پروا کیے بغیر مجھ سے لپٹ گئی اور بے اختیار رونے لگی۔
"اب کیوں رو رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ "اب تو میں آ گیا ہوں۔" پھر میں علی سے مخاطب ہوا۔ "تم تو بہت بااصول اور ایمان دار بنتے تھے۔ یہ تمہارا کیسا اصول ہے؟"
"میرا ایک اصول یہ بھی ہے کہ میں جس بات کا فیصلہ کر لیتا ہوں اسے پورا ضرور کرتا ہوں۔" پھر وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اور محبت اور جنگ میں کوئی اصول کام نہیں آتا۔ اس مرتبہ تم بازی جیت گئے۔"
ناظم نے وہیں سے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا پھر پولیس اور قاضی ایک ساتھ وہاں پہنچے۔ پولیس کے ایک انسپکٹر نے علی اور اس کے تمام دوستوں کو حراست میں لے لیا۔
میں نے ناظم سے کہا۔ "تم جا کر سلطان سے معذرت کرنا اور اسے گھر چھوڑ کر واپس شمائلہ بی بی کے بنگلے پر آ جانا۔"

☆☆☆

آج میں ایک کامیاب انجینئر ہوں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ علی ابھی تک جیل میں ہے اور ناظم اب میرا اور شمائلہ دونوں کا گارڈ ہے۔ ہمارے دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ میں نے لیاقت آباد کا علاقہ چھوڑ کر اب ڈیفنس میں بنگلا لے لیا ہے۔ میرے دونوں بھائی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہیں اور آج کل میں بہت مصروف ہوں کیونکہ مجھے ایک مہینے بعد اپنی بہن کی شادی کرنا ہے۔
حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اب سلطان سے میری دوستی ہے۔ وہ اکثر میرے گھر آ جاتا ہے اور گھنٹوں ہمارے ساتھ گپ شپ کرتا ہے۔ میں اس کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس کی وجہ سے تو مجھے شمائلہ کا سراغ ملا تھا۔
مجھے حیرت ہوتی ہے کہ علی جیسے لوگ دہری زندگی کیسے گزارتے ہیں۔ وہ واقعی ایمان دار ہوتے ہیں یا مصلحتاً ایمان دار بننے کا ڈراما رچاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ایمان داری اور اصول پسندی کو طاق پر رکھ دیتے ہیں۔
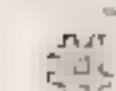
یوٹرن

احمد اقبال

زندگی کی طویل اننگز کھیلنے کے بعد کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اب پلٹ کر واپس اس دوراہے پر جانا چاہیے... جہاں سے چلے تھے... گزرے وقت کو آواز دینا اچھا لگتا ہے... لیکن کیا واپسی کا سفر ممکن ہوتا ہے... بیتے ہوئے وقت کو ایک بار پھر اپنا ہمسفر بنایا جا سکتا ہے... انہی سوالوں کے مدو جزر میں آگے بڑھتی کہانی کے اسرار و رموز... جس کے کردار محبت اور منزل کی تلاش میں بھٹک رہے تھے... منزل کا سنگِ میل پا لینے والے محبت کا کشکول لیے خالی ہاتھ کھڑے تھے۔

اپنی زندگی کا ایک اور دن ختم ہونے کا اعلان اس نے بڑے دھیان سے سنا۔ نیچے کشادہ اور گول سٹنگ روم کے ایک گوشے میں بڑے پُرغرور انداز میں کھڑے ہوئے "گرانڈ پا" کلاک نے ٹھہر ٹھہر کے بارہ سریلے گھنٹے بجائے۔ مہاگنی کی بیش قیمت لکڑی اور بگ بین کی شکل کا آٹھ فٹ اونچے کیبنٹ والا یہ کلاک وہ [illegible] سے لائی تھی۔ اس کا ڈائل سنہری تھا جس پر موجود ہندسے تاریکی میں روشن نظر آتے تھے۔ نچلے حصے میں شیشے کے پیچھے تین فٹ لمبا سنہرا [illegible] بڑے وقار کے ساتھ آہستہ آہستہ دائیں بائیں حرکت [illegible] تھا۔ مہمانوں کے بیٹھنے کا یہ ہال جیسا کمرا ایسی ہی دوسری خوب صورت اور بیش قیمت آرائشی اشیا سے بھرا [illegible] وہ ہر ملک سے یادگار کے طور پر زرِ کثیر خرچ کر کے [illegible]

ایک اور نیا دن... اس نے بوجھل دل [illegible] [illegible] کی منزل پر اپنی خواب گاہ کی مشرقی دیوار [illegible] [illegible] اور دس فٹ اونچی بیضوی گلاس کی کھڑکی کا بھاری [illegible] پردہ ذرا سا ہٹا کے باہر جھانکا جہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ [illegible] سرحد کو ہر روز کی طرح عبور کر لینے والا دن گویا وہیں [illegible] تھا۔ وہی خاموش پُرہول تاریکی سرد رات میں [illegible] سوئے ساکت درخت اور اسٹریٹ لائٹس کا منجمد [illegible] ... [illegible] کے ساتھ پیدا ہونے والا دن کہیں سے [illegible] مختلف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ایسا ہی حیران کرنے والا [illegible] سے چار سال پہلے بہت عجیب لگا تھا جب اس نے [illegible] ثقافتی وفد کے ساتھ واہگہ بارڈر کو کراس کیا تھا۔ صرف [illegible] قدم نے اسے پاکستان سے انڈیا پہنچا دیا تھا۔ وہ بے [illegible] سے دونوں طرف کے زمین اور آسمان کو... مٹی کو... [illegible] سہانی فصلوں کو... ادھر ادھر اڑتے پرندوں کو [illegible] ہو کر دیکھتی رہی تھی کہ اسے کہیں فرق نظر آئے۔ فرق خیال میں تھا مگر نظر میں نہ تھا۔

بیڈ پر بیٹھ کر اس نے ایک اور سگریٹ سلگائی۔ وہ سگریٹ [illegible] عادی نہیں تھی بلکہ باہر تو شاید کسی نے بھی اسے سگریٹ کا کش لیتے نہیں دیکھا تھا ورنہ اس کے پرستاروں کے بیچ کسی کیمرے کی آنکھ ایک نیا پوز محفوظ کر لیتی جو کسی شوبز کے میگزین کے رنگین کور کی زینت بنتا۔ سگریٹ اس کے اعصاب کو سکون فراہم کرتی تھی یا وہ ایسا سمجھتی تھی۔

وہ پوری طرح بیدار تھی اور انتظار کی مسلسل خلش میں مبتلا۔ اپنے لاکھوں پرستاروں سے الگ بھی بہت لوگ تھے جو خود کو اس کے مخلص دوستوں میں شامل سمجھتے تھے۔ ان میں ہم پیشہ بھی تھے اور وہ بھی جن سے اس کا تعلق "ذاتی" سمجھا جاتا تھا لیکن اب صرف ایک تھا جو اس کے غم اور پریشانی کے وقت میں احساس کی حد تک برابر کا شریک ہو سکتا تھا لیکن وہ بہت دور تھا۔ اس نے بہت دور سے بات کی تھی لیکن خلافِ معمول اس کے لہجے میں اجنبیت نہیں تھی۔ پرانے وقتوں کی اپنائیت والا دکھ تھا۔ یہ درد کا نیا رشتہ تھا جس نے صدا کو پھر اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ یہ دکھ کے احساس کی مجبوری تھی جو انتظار کے کرب میں ڈھل گئی تھی۔ اس کی نظر پرانے وقتوں کے فلیش بیک میں الجھی ہوئی تھی مگر کان منتظر تھے کہ خاموشی کے جبر کی برف ٹوٹے۔ کوئی فون بولے۔ ایک اس کا پرسنل موبائل فون نمبر تھا جو بدلتا رہتا تھا۔ ایک کاروباری جو [illegible] وقت خاموش کر دیا جاتا تھا۔ تیسرا ایک فرضی نام پر تھا۔ اس نام کا وجود فرضی نہیں تھا۔ ہوشیار لوگ ہر حوالے سے [illegible] کے ہر فون نمبر تک پہنچ جاتے تھے۔ ہر شہر میں سیکڑوں [illegible] محمد علی تھے جو صدا کی گلی کوچوں کے لاتعداد گھروں میں بکھرے ہوئے تھے۔ وہ محمد علی صرف ایک تھا جس کے بارے میں کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اسے صدا نے جنم دیا تھا۔ آٹھ سال سے اس راز کو وہ بڑی کامیابی سے چھپائے ہوئے تھی۔ کم سے کم صدا اس یقین کے ساتھ جی رہی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس کا یقین محض فریبِ خیال تھا... اور بھی کوئی تھا جس نے یہ راز جان لیا تھا اور بالآخر اس سے دہری قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک قیمت راز کو راز رکھنے کی۔ دوسری اس مامتا کی جو ازل سے ہر عورت کی سرشت میں شامل رکھنا خود خالقِ کائنات نے ناگزیر سمجھا تھا۔ اس نے محمد علی کو اغوا کر لیا تھا۔

☆☆☆

صدا اس کا نام نہیں تھا۔ جب اس نے گھر چھوڑا تھا تو یہ نام بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ آج اس نام سے جڑے وقت کا وجود صرف اس کی اپنی یادوں کے بہت پرانے البم تک محدود ہو کے رہ گیا تھا۔ بے شک کھوج لگانے والے بہت سے جاسوس قسم کے فلمی صحافی اب بھی اس کے پرستاروں کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ آج کی صدا وہی ہے جو شوبزنس کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے صدقہ خاتون تھی اور بدرالحسن کی ایک غیر معروف سنگر خیرات النساء عرف خیرن کی بیٹی... لیکن یہ سب ایک افسانہ تھا جس کی کوئی بھی حقیقت نہیں تھی۔ اس کہانی کو صدا کی زندگی کا حصہ بنانے میں ایک معروف فلمی صحافی کا بہت ہاتھ تھا جو فلمی دنیا کو اس کے ماحول اور لوگوں کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

اس نے کہا تھا۔ "بے بی! یہ بال کی کھال نکالنے والے بلیک میلر صحافیوں اور ہوس پرست مردوں کی دنیا ہے۔ آج کے کچھ انتہائی معزز نام اسی بازار کا بدنام پس منظر رکھتے ہیں۔ تم خود اس کا اعتراف کر لو گی تو تمہارے دامن پر بدنامی کے داغ دیکھنے کے خواہش مند بہت مایوس ہوں گے۔"

"لیکن کیا اس کے بعد وہ مجھ سے خیرن کے بارے میں... اور میرے باپ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے؟ ان کا تجسس ختم ہو جائے گا؟"

وہ ہنسا۔ "نہیں، جب وہ تصدیق کے لیے اس بازار کا رخ کریں گے تو انہیں مایوسی ہو گی۔ اس نام کی وہاں ایک نہیں دو ناچنے گانے والیاں تھیں۔ ایک کا قتل ہو گیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ ایک بار کسی زمیندار نے اسے گھر میں ڈال لیا تھا پھر وہ کسی ٹرانسپورٹر کے نکاح میں رہی اور غالباً اس کے کسی بچے کی ماں بھی بنی۔ بس مجھی کو وہ اپنی کسی رشتے دار بہن کے حوالے کر چکی تھی جب اس کا قتل ہوا۔ دوسری سے

سندھ کے کسی وڈیرے کے ساتھ تعلق بنایا اور اس کے گھر میں بھی لیکن اب وہ جہاں ہے زندہ ہے یا نہیں... اس بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ خود تمہیں کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ تمہاری پرورش کس نے کی اور کہاں کی۔ تم نے کہاں تعلیم حاصل کی اور تھی... جو خود زیادہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا، بازارِ حسن ہی جاکے معلوم کرلے۔"

"لیکن بازارِ حسن ہی کیوں؟"

"میں نے کہا نا... اس سے انہیں مایوسی ہوگی جو تمہیں تمہارے عزت دار خاندان کو بلیک میل کرکے اپنی صحافت کی دکان چمکانے کی کوششیں کریں گے۔ عام خیال یہی ہے کہ شوبزنس میں آنے والی بازار سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ تم خود یہ تسلیم کرلوگی تو وہ آگے کہاں جائیں گے۔ ان تمام دستاویزات اور کاغذات کو جلادو جن میں تمہارا نام صادقہ لکھا ہوا ہے اور تمہارے باپ کا نام..."

"سب جلادوں؟" صادقہ نے بے بسی سے کہا۔

"میری پیدائش کا سرٹیفکیٹ... میٹرک کی سند اور بی اے کی ڈگری..."

وہ صادقہ کو دیکھتا رہا۔ "ان کی ضرورت کہاں پڑے گی تمہیں؟ آنے والے وقتوں میں تمہارا حوالہ صرف تم ہو... تمہارا یہ معصوم چہرہ... یہ گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ اور یہ ساحر آنکھیں... یہ چہرے کے قاتل نقوش اور یہ اجلا رنگ۔" آہستہ آہستہ اس کی انگلی صادقہ کے چہرے پر پھسلتی گئی۔ "یہ گردن کی سنہری محراب اور اس سے آگے..."

اس کا خداداد حسن، ایک متناسب اور نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا بھرپور بدن اس کا سب سے بڑا اثاثہ تھے جس کے سامنے باقی سب بے معنی ہو جاتے تھے۔ اسے رہنمائی فراہم کرنے والوں نے بڑے خلوص کے ساتھ ایک بہت کامیاب مستقبل کی خوش خبری اور گارنٹی دی تھی۔ صادقہ سے صدا بننے کے بعد وہ ایک دھماکے سے شوبز میں وارد ہوئی اور ہٹ ہوگئی۔ اس کی کامیابی کی پیش گوئی کرنے اور اسے متعارف کرانے کا کریڈٹ لینے والے سارے مخلص دوست آج بھی وہیں کھڑے تھے اور نئی آنے والی شوقین لڑکیوں کو رہنمائی فراہم کرنے میں مصروف تھے۔ صدا بہت آگے جا چکی تھی۔ وہ ایک سپر ماڈل، ٹاپ کلاس ہیروئن اور شوبز کا بڑا نام تھی۔ اس کا ایک نامی فلاحی ادارہ رفتہ رفتہ پھیلنے لگا تھا اور اس میں صدا کا تیج بننے والی پروفیشنل پبلک ریلیشن کمپنیوں کا بہت ہاتھ تھا۔ اس سے بڑی تعداد استعمال اور میک اپ، کتنی شوخی اور کتنی متانت

ہونی چاہیے۔ اس کے انداز و اطوار میں کتنا حسن ہونا چاہیے اور کتنی سیکس اپیل۔ اسے کیسے مسکرانا چاہیے... کیسے چلنا چاہیے... لہجہ کیسا رکھنا چاہیے اور کہاں انگریزی بولنی چاہیے کہاں اردو یا پنجابی... اس سب کی تربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔ باقی کام فلمی صحافی کرتے تھے۔ وہ صاف گو ہے، بے باک ہے اور سیٹ پر انتہائی پروفیشنل... اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ گھریلو زندگی میں تنہائی اور سادگی پسند ہے۔ خاموشی سے یتیم بچوں اور بیواؤں کی کفالت کرتی ہے۔ اسکرپٹ اور کردار دیکھ کے کنٹریکٹ سائن کرتی ہے۔ اس کے دوست بہت کم ہیں۔ اسے فیض اور فراز پسند ہیں۔ مہدی حسن اور عابدہ پروین کو سنتی ہے۔ یہ سب پی آر کا حصہ تھا۔ ایک عمر تک اسے بھی وہ پی آر والوں کے مشورے پر چلی تھی۔ پھر اپنے فیصلے خود کرنے لگی اور بے وجہ چلی، کہتا رہے۔ یہاں تک کہ وہ جو اس کے ساتھ تھے سب پیچھے رہ گئے۔

اب جو کسی خاص موقع پر کسی خاص صحافی کو انٹرویو دیتی تھی تو اس کی منظوری بھی پی آر والے دیتے تھے۔ وہی سوال اور ان کے جواب مرتب کرتے تھے۔ خواہ شو کچھ بھی ہو۔ بیشتر لوگ میک اپ کے اس مصنوعی ہالے کی حقیقت کو سمجھنے کے باوجود اعتراف کرتے تھے کہ آج کی "چیپ اینڈ ڈرٹی" لڑکیوں کے مقابلے میں وہ یقیناً فرشتہ ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ جب صدا نئی تھی تو اس کا موازنہ اسی طرح پہلے وقت کی ہیروئن سے کیا جاتا تھا۔ اب وہ ستارے ماضی اور قصہ پارینہ ہو چکی تھیں اور صدا خود بھی محسوس کرتی تھی کہ وقت اسے بھی آگے دھکیلتا ہوا اسی منزل تک لے جا رہا ہے جہاں اس کا نام بھی ایک حوالے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ وہ خود ہی اپنی فلموں اور جوانی کی تصویروں کو دیکھ کر تنہائی میں آہیں بھرے گی۔ اسے کسی دستک کا انتظار بھی نہ رہے گا۔ کسی پروڈیوسر، کسی فلم رپورٹر یا فوٹوگرافر... کسی پرستار کی... جب بھیڑ چھٹ جاتی ہے تو اکیلا پن کتنا بڑا دکھ ہے۔

☆☆☆

گھنٹی بجتے ہی اس نے موبائل فون کو جھپٹ کر اٹھایا۔

"ہیلو..."

"صدا! اس الو کے پٹھے کو بتاؤ کہ میں کون ہوں... اس سے کہو دروازہ کھولے..."

صدا نے بلا ارادہ کہہ دیا۔ "ناصر تم... یہاں...؟"

ناصر نے بگڑ کر کہا۔ "لگتا ہے تمہیں میرا آنا برا لگا... تو واپس چلا جاؤں؟"

اس نے جلدی سے کہا۔ "نہیں، وہ دراصل... تم فون

پر کال کرتے..."

پردے کو تھوڑا سا ہٹانے پر اس نے گیٹ سے ناصر کی گاڑی کو اندر آتے دیکھا۔ گیٹ لائٹس کے مدھم جالے میں وہ غصے میں نظر آیا۔ پورچ کی لائٹس میں اس کا سراپا پہلی بار پورا صدا کی نظروں میں آیا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ آٹھ سال میں وہ کچھ بھاری جسم ہو گیا تھا اور سامنے سے سر کے بال بھی اڑے ہوئے لگتے تھے۔ فوری طور پر اسے دو فیصلے کرنے تھے۔ ایک یہ کہ کیا وہ اپنے سابق محبت کرنے والے شوہر کا نیچے جاکے استقبال کرے؟ دوسرا یہ کہ کیا وہ اس کو اپنے بیڈروم میں آنے دے؟ پہلے سوال پر اس نے خوش اخلاقی کا سمجھوتا کرلیا۔ یہ گھر اس نے بنایا تھا اور اندر آکے وہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ کدھر جائے۔ اسے صدا تک پہنچانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ ملازم سب سو رہے تھے۔

دوسرے سوال پر اس کا جواب واضح نفی میں تھا۔ یہ حق وہ بہت پہلے کھو چکا تھا۔

ہال کا صرف ایک فانوس روشن تھا۔ صدا نے دوسری سب لائٹس جلاکے اسے دیکھا۔ "آیئے ناصر صاحب!"

ناصر کی نظر اس پر رہی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ "تم ذرا بھی نہیں بدلی ہو... بالکل ویسی ہی نظر آتی ہو جیسی اپنی فلموں میں۔"

صدا اس کے قریب دوسرے صوفے پر ٹک گئی۔ اس نے ناصر کے تبصرے کو سرد مہری سے ٹال دیا۔ "میں تمہاری طرف سے فون پر کسی پیغام کی منتظر تھی۔"

ایک گہرا سانس لے کر اس نے صوفے کی پشت کا سہارا لیا۔ "کیا اس کا مطلب یہ لوں... کہ مجھے آنے کی ضرورت نہیں تھی؟ میں نے اچھا نہیں کیا خود آکے؟"

"بلاوجہ اپنی مرضی کے مطلب نکالنا نہیں چھوڑا تم نے... چائے لوگے یا کافی؟"

"کون بنائے گا؟ ملازم تو سب سو رہے ہوں گے؟"

"اتنا کام میں اب بھی کرلیتی ہوں۔ خود مجھے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔"

"میں نے بھی چار گھنٹے ڈرائیونگ کی... رات کے وقت سڑک خالی تھی... میں رکا کہیں نہیں۔"

"میں کافی لاتی ہوں۔" وہ شال کو سنبھال کے اٹھی۔

ناصر نے جیب سے سگریٹ نکالی اور صدا کی طرف دیکھ کے واپس رکھ لی۔ "میں بھول گیا تھا۔"

"اب میں سگریٹ کے دھوئیں سے الرجک نہیں

ہوں۔" وہ جاتے جاتے رکی۔ "بلکہ... کبھی خود بھی پی لیتی ہوں جب ٹینشن ہو۔"

ناصر نے سرہلا کے سگریٹ سلگائی۔ "پھر تو آج ضرور پی ہوگی... یہ ایک تبدیلی ہے۔"

صدا نے کافی کے دو مگ سینٹر ٹیبل پر رکھے تو وہ ہال کی آرائش کا جائزہ لے رہا تھا۔ "بالآخر یہ کلاک مل ہی گیا تمہیں..."

صدا نے رکھائی سے کہا۔ "کام کی بات کرو۔ تم یہاں میرے نئے گھر کی تعریف کرنے نہیں آئے ہو۔"

"میں بھی کوئی شوقِ دیدار میں یہاں نہیں آیا ہوں۔" اس نے ترش ہو کے کہا۔

"لیکن اب سے مسائل پیدا ہوں گے تو صرف میرے لیے... یہ تمہیں سمجھنا چاہیے۔"

وہ طنز سے بولا۔ "کمال ہے... کیسی ماں ہو تم کہ تمہیں اپنے بیٹے کی خیر و عافیت سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ میرے آنے کی خبر اخبار والوں تک پہنچ گئی تو تمہارے لیے بڑی پریشانی کی بات ہوگی۔"

"دیکھو ناصر! فضول بات کو مت بڑھاؤ۔ میں کیسی ماں ہوں، یہ جاننے کے لیے مجھے نہ تمہاری رائے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دوسرے کی۔ اس پریشانی کی وجہ سے ہی میں جاگ رہی تھی۔ اگر تمہارے یہاں آنے کی خبر پھیل گئی تو بتاؤ میں کیا جواب دوں گی؟ تم میری پریشانی دور کرنے آئے ہو یا بڑھانے؟" وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

وہ کچھ پشیمان ہوا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے ہی چلا جاؤں گا۔"

"فون پر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سب کے پاس موبائل فون ہیں۔"

"ہاں، یہ بات وہ بھی جانتے تھے اور خود بھی موبائل پر پیغام دے رہے تھے۔ یہ خطرہ نہیں تھا کہ گفتگو کوئی اور سن لے گا یا پولیس بعد میں سراغ لگا لے گی۔ انہوں نے کہا کہ جب تک ہم خود سراغ لگانے والوں کو اپنا نمبر نہیں دیں گے، کوئی کمپنی سے بھی گفتگو کا ریکارڈ نہیں لے سکتا۔ میں نے انہیں بتادیا کہ ہم ایسی بے وقوفی نہیں کرسکتے۔"

"پھر؟ کوئی مطالبہ کیا انہوں نے؟"

ناصر نے نفی میں سرہلایا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ ہم انتظار کریں۔"

"بوبی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تم نے؟" صدا بے چینی سے بولی۔

"پوچھا تھا انہوں نے کہا کہ وہ ٹھیک ہے ابھی تک۔"
"کیا یہ کوئی دھمکی تھی؟"
"ظاہر ہے۔ انہوں نے واضح کر دیا ہے کہ بوبی کا ٹھیک رہنا منحصر ہے ہمارے رویے پر۔"
صدا نے پہلو بدلا۔ "انہوں نے تمہاری بوبی سے بات نہیں کرائی؟"
"ابھی نہیں، میں نے کہا تھا لیکن انہوں نے بتایا کہ بوبی سو رہا ہے۔"
"یہ کب کی بات ہے؟"
ناصر نے سوچ کے کہا۔ "شاید گیارہ پینتیس ہوئے تھے۔"
"کیا بوبی کو علم ہے کہ وہ اغوا ہو چکا ہے؟"
"یہ تو اس سے بات کر کے ہی معلوم ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اسے پتا ہو گا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بوبی کو سوتے ہوئے اٹھا لیا ہو یا اٹھانے سے پہلے سلا دیا ہو۔ وہ راستے میں ہوں بات کرتے وقت... یہ سب میں ان سے کیسے پوچھ سکتا تھا اور پوچھتا بھی تو وہ مجھے نہ بتاتے۔ وہ بڑے پروفیشنل طریقے سے بات کر رہے تھے۔"
"کیا مطلب... وہ بچے سے بے رحم اور سفاک نہیں تھے؟" صدا کی آنکھوں سے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔
"دیکھو صدا پلیز! رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے مزید آزمائش میں مت ڈالو۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ بچے سے وہ بڑے مہذب اور شریف یا رحم دل بنے تھے۔ آفٹر آل وہ پرانے کھلاڑی ہیں۔ خواہ مخواہ تاوان کرنے والے عام مجرم نہیں ہوتے۔" ناصر نے صدا کے ساتھ بیٹھ کر اس کے آنسو پونچھے۔
صدا صوفے پر سرک کے دور ہو گئی۔ "تمہارا کیا خیال ہے... ان کا مطالبہ کیا ہو گا؟"
ناصر نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے کوئی آئیڈیا نہیں... لیکن ظاہر ہے کہ وہ اسی دیکھ کے بات کرتے ہیں۔"
"کیا نہیں معلوم ہے...؟"
"یہ بس بے وقوفی کی بات ہے۔ وہ ہر بات معلوم کر چکے ہوں گے۔ تمام تفصیلات... جو ہمارا خیال تھا کہ کوئی نہیں جانتا میرے تمہارے سوا۔ آج تک اخبار والے اس سے بے خبر ہیں کہ بوبی کا اصل نام کیا ہے اور وہ ہمارا بیٹا ہے۔ وہ کسی صورت میں پچاس کروڑ سے کم نہیں مانگ سکتے۔"
"پچاس کروڑ...؟"
"ہاں، ان کی نظریں تمہاری اور میری مالی حیثیت پر ضرور ہوں گی۔ دس بیس کروڑ تو بلوچستان میں اغوا کیے جانے والے ڈاکٹروں کے مانگے جاتے ہیں اور سندھ میں علاقہ جو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ ہے، مطالبہ ان کا بھی کروڑ ہوتا ہے۔ بعد میں سودا کم پر بھی ہو جاتا ہے۔ سودا، والوں پر منحصر ہے۔ میرا بس چلے تو سب کو شوٹ کر دوں۔ "تم جانتے ہو نہیں...؟"
ناصر نے خفگی سے کہا۔ "کون نہیں جانتا انہیں... میں سب آتا رہتا ہے۔ عدالتی کارروائی میں ان کا حوالہ ہے مگر راج بھی تو انہی کا ہے۔ پولیس اور یہ نام نہاد قانون کرنے والے ادارے... سب ان کے پیچھے ہیں۔ کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ صدا... میں صرف یہ کہنے آیا ہوں گھبرانا نہیں اور پریشان مت ہونا... انشاء اللہ بوبی آ جائے گا۔ رقم کا بندوبست بھی کر لوں گا میں۔"
"مجھ سے ملینک چیک لے لو تم... ابھی..."
اس نے صدا کے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا۔
"بات میرے یا تمہارے پیسے کی نہیں۔ ہمارے بیٹے کی ہے۔ یہ وہ خود بتائیں گے کہ انہیں رقم کیسے چاہیے، کہاں اور کب چاہیے۔"
"آخر مجھ سے بات کیوں نہیں کی انہوں نے؟"
ناصر اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی فون آئے تو ان سے سوال کرنا۔ میں کیا بتاؤں۔ اس وقت بھی تمہارے لیے یہ مسئلہ بن گیا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے باپ سے بات کی، ماں سے کیوں نہیں کی۔ بے وقوفی کی بھی حد ہے... سیدھی سی بات ہے کہ میں عام بزنس مین ہوں۔ مجھ سے کوئی بھی فون پر بات کر سکتا ہے۔ تمہارے فون سیکریٹری میں ہیں۔ آخری اجازت تمہاری سیکریٹری کی ہوتی ہے۔ مجھے تو وہ ساری بات یاد ہے جب تم سے بیڈ روم میں ملاقات کے لیے بھی اپائنٹمنٹ لے کر آنا پڑتا تھا۔ یہ بچہ پیدا کرنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے ملی تھی مجھے..."
"تم نے ہمیشہ ذاتی مفاد کو دیکھا۔ میری محبت میں بھی اور... بچے کی محبت میں..." اس نے برہمی سے کہا۔ "اس وقت میں نئی تھی اور شوبز میں قدم جما رہی تھی۔ مجھے مہلت درکار تھی۔"
"آج بھی تمہیں اپنے کیریئر کی فکر زیادہ ہے۔" ناصر نے تلخی سے کہا۔ "ایسا ہی ہے تو پھر بوبی کی فکر کیوں؟ وہ بچہ اسے میرے پاس... چھوڑ دو۔"
"کیسے چھوڑ دوں؟ میں ماں ہوں اس کی۔" صدا نے چیخ کے جواب دیا۔

"ماں!" ناصر طنز سے ہنسا۔ "کیسی ماں؟ وہ جو دنیا کے سامنے یہ اعتراف کرے کہ وہ کسی دس سال کے بچے کی ماں ہے تو اسے اپنی مارکیٹ ویلیو کے متاثر ہونے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ یہ جو تم ٹین ایجر بنی پھرتی ہو... اپنی پیدائش کا صرف دن بتاتی ہو، سال نہیں... اور کبھی دو سال یا تین سال میں ایک سالگرہ کا ڈراما رچاتی ہو۔"
صدا صوفے پر بیٹھ کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کے رونے لگی۔ "تم مجھے حوصلہ اور تسلی دینے آئے تھے یا ذلیل کرنے...؟"
ناصر کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "آئی... آئی ایم سوری... مجھے معاف کر دو پلیز۔" وہ صدا کے ساتھ بیٹھ گیا۔
صدا نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔ "جاؤ... چھوڑ دو مجھے میرے حال پر... دھمکی کس بات کی دیتے ہو... بتا دو سب کو کہ بوبی میرا بیٹا ہے۔ اب نہیں ڈرتی میں کسی سے... جس کا جو دل چاہے سمجھے اور کہے... مجھے بلیک میل مت کرو مسٹر ناصر... اسے میں تمہاری شرافت سمجھتی تھی کہ تم نے اپنے وعدے کا پاس رکھا... غلطی میری تھی۔"
ناصر اسے منانے لگا۔ "دیکھو صدا! میں شرمندہ ہوں۔ پریشانی میں ایک بات نکل گئی میرے منہ سے۔ جو تمہیں بلیک میل کرے اس پر لعنت ہزار بار... میں نے واقعی تم سے کیے ہوئے وعدے کو آج تک نبھایا۔ آئندہ بھی نبھاؤں گا۔ پلیز... اب یہ رونا بند کرو۔ مجھے جانا ہے، ملازموں کے بیدار ہونے سے پہلے۔"
صدا آنکھوں میں نمی لیے گھٹنوں پر سر ٹکائے اسے ہال سے باہر جاتا دیکھتی رہی۔ وہ کسی نشے میں دھت شرابی کی طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ عین دروازے میں جیسے اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور گر گیا۔ اس کا ماتھا دروازے کی دہلیز سے ٹکرایا... پھر وہ بے سدھ ہو گیا۔
"ناصر..." صدا ایک دم اٹھ کے دوڑی۔ "کیا ہوا تمہیں ناصر... اٹھو..." اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے ناصر کے بھاری بھرکم وجود کو اٹھانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ دہلیز پر اٹکا ہوا تھا۔ ہلکا سا کراہ کے وہ فرش پر لڑھک گیا۔
صدا نے گارڈ کو آواز دی۔ "دھر آؤ... جلدی... بے وقوف کہیں وہیں چھوڑ دو۔"
گارڈ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر اس نے ناصر کو اٹھا کے صوفے پر لٹا دیا۔ صدا خود سرونٹ کوارٹرز تک گئی۔ پرانی خادمہ اٹھنے ہی والی تھی کہ اس نے دروازے پر دستک سنی اور اپنی مالکن کی آواز... "ماما... ماما جلدی سے آؤ۔"
ماما کا شوہر بوڑھا مالی آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا۔ "کیا ہوا بیگم صاحب... خیریت ہے نا...؟"
"بابا... اپنے بیٹے راجو کو اٹھاؤ، اس سے کہو کہ گاڑی نکالے۔" صدا واپس ہال کی طرف چلی۔
"یہ تو بے ہوش ہیں میڈم!" گارڈ نے کہا۔
"وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے آخر کیا ہوا ہے انہیں؟ خیر اب تم ماما سے کہو گیسٹ روم کھولے اور راجو کے ساتھ مل کے صاحب کو وہاں پہنچاؤ۔ میں فون کرتی ہوں ڈاکٹر کو... ورنہ اسپتال جانا پڑے گا۔ مجھے تو یہ ہارٹ اٹیک لگتا ہے۔"
دس منٹ بعد ناصر کو گیسٹ روم کے بیڈ پر لٹا دیا گیا تھا۔ کسی ملازم سے اب کچھ بھی پوشیدہ نہ رہا تھا۔ میڈم کے سابق شوہر رات یہاں آئے تھے۔ صبح جاتے وقت بے ہوش ہو گئے۔ وہ سب مالکن کو تشویش میں مبتلا دیکھ کے چپ تھے لیکن ان کی خاموشی میں صدا کو بہت سے شکوک بھرے سوال سنائی دے رہے تھے۔ صاحب کیوں آئے تھے یہاں اور کب؟ یہ دل کا دورہ تھا یا کچھ اور؟ کہیں میڈم نے انہیں زہر تو نہیں دے دیا؟ یہ سوال صرف راجو کے ذہن میں آیا۔ محبت اور رقابت میں سب کچھ ہو سکتا ہے... اور یہ تو ہے ہی فلمی دنیا... کہانی فلمی کیوں نہیں ہو سکتی۔
آدھ گھنٹے بعد جب رات کی سیاہی پر دن کا اجالا غالب آ چکا تھا، صدا کے فیملی ڈاکٹر نے جو درحقیقت اس کا ایک دیوانہ تھا اور یہ اعزازی خدمت بڑے جذبے کے ساتھ کرتا تھا، ناصر کا معائنہ خاصی تشویش اور بیزاری کے ساتھ کیا۔ بیزار وہ ناوقت اٹھ کر آنے پر تھا۔ نیند اس کی آنکھوں میں تھی اور وہ بار بار منہ پھاڑ کے جماہی پر جماہی لے رہا تھا۔ پریشان بالوں کے ساتھ نائٹ سوٹ پر گاؤن پہن کے وہ گاڑی میں بیٹھ گیا کیونکہ صدا کی پکار میں واقعی خطرے کی گھنٹی فائر بریگیڈ کے گھنٹے کی طرح گونج رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ محض موت کی تصدیق کے لیے جا رہا ہے... مجبوراً... تشویش اسے کسی اجنبی لاش کے بجائے زندہ ناصر کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ وہ نہ صرف زندہ بلکہ ہوش میں تھا ورا سے نہ دل کا دورہ پڑا تھا اور نہ دماغ کا۔ صدا کو اپنے سابق شوہر کے لیے پریشان دیکھنا الگ تشویش کی بات تھی۔ اس نے صدا کی تسلی کے لیے ناصر کو ایک انجکشن لگا دیا۔ "یہ ٹینشن اور ڈپریشن کا نتیجہ ہے... ان کا بلڈ شوگر لیول بہت گر گیا تھا... کیا یہ ذیابیطک ہیں؟"

ملک چھٹیوں گزار آتی تھی لیکن بوبی کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ اس کی ماں کیا کرتی ہے اور کہاں رہتی ہے۔ ماں باپ الگ الگ اس سے ملنے کیوں آتے ہیں اور ایک ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ اب تک وہ مصروفیت کا بہانہ کرتے آئے تھے لیکن دو بار صدا اسے ناصر کے گھر میں مل چکی تھی۔

"بھئی ماما کا اپنا بزنس ہے اور اپنی مصروفیات۔" ناصر کہتا تھا۔

"تمہارے پاپا کو ٹائم کہاں ملتا ہے میرے ساتھ آنے کا۔" صدا اسے بتاتی تھی اور بوبی مجبور تھا کہ دونوں پر یقین کرے۔ اس کے دل میں ابھی وہ شکوک پیدا نہیں ہوئے تھے جو سوال بن کے زبان پر آتے تو جواب مانگتے۔

خاموشی کے اس طویل وقفے کو فون کی گھنٹی نے توڑا۔ ناصر نے جھپٹ کر اپنا فون اٹھالیا۔ "ہیلو..."

صدا نے اسپیکر آن کرنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اس نے دوسری طرف سے بات کرنے والے کی آواز صاف سنی۔

"مسٹر ناصر! اگر تم اسی طرح ہماری بات مانتے رہے تو بیٹا تمہیں مل جائے گا... زندہ سلامت۔"

"دیکھو ابھی تک میں نے کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔" ناصر نے کہا۔

"لیکن کل رات سے تم غائب ہو؟"

"ہاں... میں ایک دوست کے پاس آگیا ہوں لیکن اسے بھی میں نے کچھ نہیں بتایا۔"

"کہاں رہتا ہے یہ دوست... نام کیا ہے اس کا؟"

"دیکھو... یہ سب جان کے تم کیا کرو گے؟ دوست، رشتے دار سب ہیں میرے مگر تمہیں ڈیل تو مجھ سے ہی کرنا ہے۔"

"ہم معلوم کر لیں گے سب۔"

"یہ بتاؤ بوبی کہاں ہے؟ میں بات کروں گا اس سے۔"

"وہ باہر کھیل رہا ہے۔ دیکھ لو۔"

صدا یک دم ناصر کی طرف لپکی اور اس کے کندھے کا سہارا لے کر فون پر جھک گئی۔ فون کی اسکرین پر ایک رنگین تصویر ابھر آئی۔ بوبی کسی باغ یا لان میں گھٹنوں کے بل بیٹھا ایک خرگوش کو گاجر کھلا رہا تھا۔ یہ صرف دس سیکنڈ کا منظر تھا جس میں باغ کا صرف ایک حصہ فوکس کیا گیا تھا۔ یہ کسی بھی گھر کا باغ ہو سکتا تھا۔ بوبی نے ایک بار پلٹ کے بھی دیکھا تھا۔ شاید اس کے چہرے کا کلوز اپ دکھانے کے لیے اسے آواز دی گئی تھی۔ وہ صحت مند اور خوش و خرم تھا۔

فون بند ہو گیا تھا مگر صدا اسی طرح ناصر کے کندھے پر سر رکھے کرسی کے بازو پر ٹکی ہوئی تھی۔ بوبی کو دیکھتے ہی اس کے جذبات میں مامتا کا ابال آیا تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک کر بہہ نکلے تھے۔ ناصر نے اس کے بال اور آہستہ سے گالوں پر تھپکی دی۔ "رونے کی کیا بات ہے۔ بوبی بالکل ٹھیک تھا... تم نے دیکھا۔"

وہ سیدھی ہو کے کھڑی ہو گئی۔ "ان سے کہو ناصر... کو چھوڑ دیں... ہم پیسے آج ہی دے سکتے ہیں۔"

"وہ جو بھی کریں گے، اپنی مرضی سے کریں گے۔ یوں... انہوں نے مجھ پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ خدا کا شکر کہ میں رات کے وقت نکلا تھا ورنہ شاید تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں آجاتے۔ خیر اس سے انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا میں بوبی کی ماں سے ملنے آیا تھا۔"

"ناصر... اگر یہ انہیں معلوم نہ ہو... میں ابھی سے نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں... اور اسی لیے آج تک میں نے ... کیا وہ وعدہ نبھایا ہے۔ اس میں بوبی کا فائدہ ہے۔ وہ ہر قسم کی منفی پبلسٹی سے بچا ہوا ہے۔"

"میں جب اس سے ملنے جاتی ہوں اور اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہوں تو یہ میک اپ نہیں ہوتا اور میں حجاب پہنتی ہوں۔ بوبی کیا کوئی بھی صدا کو پہچان نہیں سکتا۔ اس لیے میں آج بھی صادقہ ہوں... صادقہ ناصر... آئندہ یہاں مت آنا پلیز... میں تمہارے گھر آجاؤں گی... تمہاری بیوی کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"میری بیوی؟ کس بیوی کی بات کر رہی ہو تم... میری کوئی بیوی نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے شادی کی تھی تم نے... جھوٹ مت بولو فاخرہ نام تھا اس کا۔"

"ہاں، ایک سال بھی نہیں چلی وہ۔ اسے چڑ تھی تمہارے نام سے بھی اور بلا ارادہ میرے منہ سے کوئی بات نکل جاتی تھی جس کا تعلق تم سے ہوتا تھا۔ پھر کچھ چیزیں تھیں... جو میں پھینک نہیں سکتا تھا مثلاً تمہارا زیور... وہ حد سے زیادہ بدزبان اور شکی مزاج تھی۔ دیر ہو جاتی تو پوچھتی تھی کہ کہاں گئے تھے۔ سیدھا سوال کرتی تھی کہ کیا شوٹنگ دیکھنے گئے تھے صدا کی... بار بار کہتی تھی کہ جسے فلمی ٹھرک لگ جائے، وہ چھوڑ نہیں سکتا اور پھر ان فلمی پریوں کے مقابلے میں انہیں دوسری عورت کہاں اچھی لگتی ہے جو ان کی طرح نہ ناچ سکے نہ ناز نخرے دکھا سکے۔ روز تو نئی شادی کرتی ہیں وہ... تم سے بھی پھر نکاح پڑھوا لو گے کسی دن مولوی بلا کے... میں کہاں تک برداشت کرتا۔" اس نے ایک گہرا

سانس لی۔ "تم جب چاہو آؤ۔"
"میں چاہتی ہوں... بوبی پھر ہمیں ایک ساتھ دیکھ لے۔ اس گھر میں... ہم مل کے اس سے بات کریں۔ اسے تسلی دیں۔ آخر وہ کب تک برداشت کرے گا۔"
"ابھی تو ایک دن گزرا ہے۔ معلوم نہیں وہ کیسے بہل گیا۔ ضد کرے گا تو وہ ماریں گے... سختی بھی کریں گے۔"
صدا نے ناصر کا بازو پکڑ لیا۔ "تم انہیں سمجھاؤ... قائل کرو... یہ ظلم نہ کریں... ہم پوری رقم دینے کے لیے تیار ہیں آج ہی۔"
ناصر نے آہستہ سے اپنا بازو چھڑایا۔ "پریشان ہونے سے کیا فائدہ... بات وہ اپنی مرضی سے کرتے ہیں... میں کوشش کروں تو ان کا فون ہی بند ملتا ہے۔ میں بھی تم سے کم پریشان نہیں ہوں۔"
"ان کا فون آنے سے پہلے تمہیں نہیں معلوم تھا؟"
"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟" ناصر نے جھنجلا کے پوچھا۔
"اسکول کے پرنسپل... ہاسٹل کے وارڈن... سیکیورٹی گارڈ... اس کے دوست کسی نے تو دیکھا ہوگا؟"
"نہیں، وہ ہاسٹل کے پیچھے والے گارڈن میں اکیلا تھا۔ یہ لوگ خاردار تاروں کی باڑھ کو کاٹ کے اندر گئے۔ وہیں سڑک پر ان کی کار کھڑی تھی۔ انہوں نے بوبی کو اٹھا کے کار میں ڈالا اور نکل گئے۔"
"ایسے کیسے نکل گئے؟" صدا چلائی۔ "ہم نے اپنا بچہ ان کے حوالے کیا تھا۔ وہ ذمے دار تھے۔ کیا سیکیورٹی تھی ان کی؟"
"دیکھو صرف ہم ہی نہیں، ہم جیسے سیکڑوں والدین کے بچے وہاں رہتے ہیں۔ پڑھتے ہیں اور صرف چھٹیوں میں گھر جاتے ہیں۔ سب بچے پیسے والوں کے ہیں۔ آج تک ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی۔ اب دہشت گردی کا راج ہے سارے ملک میں... کہیں ایک واقعہ ہو جاتا ہے پھر ہوش آتا ہے سب کو... یہ واقعہ مغرب کے وقت پیش آیا تھا۔ انہوں نے دس منٹ بعد مجھے فون کر کے خود بتایا اور مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ ورنہ نقصان بوبی کو ہی پہنچتا۔"
"اور تم خاموش ہو کے بیٹھ گئے؟"
ناصر نے بے بسی سے کہا۔ "اور کیا کرتا میں؟ ریڈیو، ٹی وی پر خبر چلوا دیتا۔ اخبار والوں کو بلا لیتا [illegible] جی کو فون کرتا۔ دماغ خراب ہے تمہارا... مجھے صرف [illegible] [illegible] پرنسپل سے اس نے خبر [illegible] ناصر سے وہ خود اس واردات سے بے خبر تھا۔ اس

نے میری بات سن کے کہا کہ وہ معلوم کر کے بتائے گا کہ حقیقت ہے یا کسی کی شرارت۔ اس کا فون پندرہ منٹ بعد آیا۔ اس نے تصدیق کی کہ خاردار تار کٹی ہوئی ہے اور بوبی ہاسٹل کے کمرے میں بھی نہیں ہے۔ وہ شام کے وقت پیچھے والے باغ میں تتلیاں پکڑتا ہے جو وہاں پھولوں پر آتی ہیں۔ وہ بہت پریشان تھا لیکن میں نے اسے صورت حال کی نزاکت سمجھائی اور خاموشی سے کارروائی کرنے کے لیے کہا۔ کارروائی سے مراد ہے اس نے سیکیورٹی کو چوکس کیا۔ چند اضافی گارڈ اگلے دن طلب کیے لیکن بوبی کے بارے میں میرے کہنے پر اس نے یہ کہا کہ وہ اپنے ممی پاپا کے ساتھ چلا گیا ہے۔ ان کے گھر میں کوئی تقریب تھی۔ اس نے راتوں رات تاروں کی باڑھ کی بھی مرمت کرا دی۔ میری اس سے کئی بار بات ہوئی۔ وہ مجھ سے تعاون کر رہا تھا اور سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ ظاہر ہے اسے فکر تھی اسکول کی۔ یہ بات میڈیا میں آ جاتی تو مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ والدین اسکول پر یلغار کر دیتے۔ پولیس اور پریس والے الگ اس کی جان عذاب میں ڈال دیتے۔ سارا الزام اسی پر آتا۔ اس نے کہا کہ وہ طلبہ پر پابندیاں عائد کرے گا کہ اکیلے کہیں نہ جائیں۔ خاردار تاروں میں رات کے وقت کرنٹ ہوگا۔ کلوز سرکٹ کیمرے لگائے جائیں گے۔ میں نے کہا کہ اب تم جو چاہو کرو۔ تمہیں اپنی فکر ہے، مجھے بوبی کی۔"
"آخر بوبی کیسے چلا گیا ان کے ساتھ؟" صدا کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔
"بچوں کو بہلانا پھسلانا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ تتلیوں کا دیوانہ تھا۔ اسے خرگوش اور بلیاں پسند ہیں اور بچہ لالچ میں نہ آئے تو اسے اٹھا کے لے جانا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ بہت سوچ سمجھ کے انہوں نے بوبی کا انتخاب کیا ہوگا اور اغوا سے پہلے بوبی پر نظر رکھی ہوگی۔"
"لیکن وہاں تو بہت بچے تھے... [illegible] بھی؟"
ناصر نے [illegible] [illegible] ... وہ کسی اور کا انتخاب بھی کر سکتے تھے اور دوبارہ وہ کبھی کسی جائیں ادھر نہیں جائیں گے... انہیں سب پتا چل جائے گا۔ اسکول میں حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں۔"
"پلیز ناصر، اب ان کا فون آئے تو کہنا کہ بوبی کی ماں کی حالت بہت خراب ہے... وہ بوبی کو چھوڑ دیں۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]"
"[illegible] [illegible] وہ معاملہ [illegible] بوبی کی زندگی [illegible] [illegible] [illegible]

اطمینان کے بعد اگلا قدم اٹھائیں گے۔ میں ایک دم پچاس کروڑ نقد ادا کرنے کی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جانتے ہیں، میں ایک بزنس مین ہوں۔ اتنی بڑی رقم کوئی بینک فوراً فراہم نہیں کرتا... اور نقد کا تو سوال ہی نہیں۔ تفتیشی ادارے فوراً حرکت میں آ جاتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی کر کے رقم نکلوانے اور جمع کرنے میں بھی وقت لگے گا اگر آج ان کا مطالبہ سنتے ہی میں کہوں کہ بتاؤ رقم کہاں پہنچائی جائے تو وہ کھٹک جائیں گے کہ یہ انہیں پھنسانے کی چال ہے۔ کوئی اتنی آسانی سے اغوا کاروں کا مطالبہ نہیں مانتا... سب روتے پیٹتے ہیں کہ رقم بہت زیادہ ہے... کم کرو... اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ حوصلہ رکھو۔ یہ بازار سے مرسیڈیز خریدنے کی بات نہیں ہے کہ قیمت ادا کی اور لے آئے۔ یہ خطرات کا سودا ہے۔ تمہیں مجھ پر بھروسا رکھنا چاہیے اور خود پر قابو... بوبی واپس آئے گا... ضرور آئے گا لیکن کب اور کیسے، یہ میں بھی نہیں جانتا... کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے... اس کے لیے ضروری ہے کہ تم نارمل نظر آؤ۔"
وہ چلائی۔ "کیسے نارمل نظر آؤں میں ناصر؟"
اس نے رکھائی سے کہا۔ "یہ تمہارا معاملہ ہے... بوبی کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے صدا... تمہیں سمجھنا چاہیے۔"
اس کے چلے جانے کے بعد صدا کو احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے۔ ناصر ایک اجنبی ہے اس کے لیے... اسے صدا کی [illegible] پروا نہیں ورنہ وہ اسے چھوڑ کے ہی کیوں جاتا۔ وہ بستر پر گر کے زار و قطار روتی رہی۔ پھر اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سکون آور گولیوں کی شیشی نکالی اور ہتھیلی پر خالی کر دی۔ پانی کا پورا گلاس بھر کے اس نے نیند... پھر بے ہوشی اور پھر موت کا تصور کیا... ایک دو گولیاں وہ ہر رات کھا لیتی تھی۔ دس گولیاں بہت ہوتی ہیں۔ اس نے کھلی آنکھوں سے بوبی کے بارے میں سوچا... ناصر نے کہا تھا کہ تاوان کی رقم ادا کرنے کے بعد بھی اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ اندر کے لوگوں میں ایسا کون ہو سکتا تھا جو دوستی کے پردے میں ایسی دشمنی کرے یا گزرے ہوئے دس برسوں میں رنجش اور اختلاف تو نہ جانے کتنے لوگوں سے ہوا... کچھ سے قطع تعلق بھی رہا مگر ایسا تو سب کی زندگی میں ہوتا ہے۔ خود اس کی ذات سے دانستہ کسی کا ایسا ناقابل تلافی نقصان نہیں ہوا تھا کہ کوئی اب تک انتقام کی آگ میں جلتا رہا ہو... انتقام لینے والا پہلے اسے نشانہ بنائے گا۔ ایسے واقعات ہو جاتے تھے کہ کسی نے تیزاب پھینک کے کسی بے وفا کا حسین چہرہ بگاڑ دیا

اور اس کا مستقبل تاریک کر دیا۔ کرنے والے قتل بھی کر دیتے تھے مگر کسی کے بچے کو قتل کر کے ماں کو سزا دے... یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ کیا پتا اسے ناصر سے عداوت ہو... ہر صورت میں صدا کے لیے بوبی کو بے جان لاش کے روپ میں دیکھنا ناقابل برداشت سزا ہوگی۔ وہ تو اسے مار کے کہیں بھی پھینک دیں گے۔
صدا کے لیے تصور میں مردہ خانے اور گلی سڑی ٹوٹی پھوٹی لاشوں کے درمیان بوبی کو دیکھنا یہ بھیانک خیال تھا جس نے اس کے جسم پر کپکپی طاری کر دی۔ بے اختیار وہ اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔ بوبی زندہ رہے گا اور اس کے لیے میں زندہ رہوں گی۔ اس نے تمام گولیوں کو پھر شیشی میں ڈال دیا۔ کتنا صدمہ ہوتا بوبی کو رہائی کے بعد جب وہ دیکھتا کہ ماں نہیں رہی۔ اس نے خودکشی کر لی۔ بوبی کو اس کی ضرورت ہے... ہمیشہ رہے گی۔
کھانے سے انکار کر کے اس نے ایک جام حلق سے اتارا اور سگریٹ سلگالی۔ شاید حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ خودفریبی ہے کہ بوبی کو میری جیسی ماں کی ضرورت ہوگی۔ کیا اہمیت ہے بوبی کے لیے میری؟ ایسا کون سا جذباتی رشتہ بنایا تھا میں نے جو اس کے لیے زندگی کے سارے رشتوں سے زیادہ اہم ہو، ناگزیر ہو... کتنی توجہ ملی ہے اسے مجھ سے؟ کتنا پیار نچھاور کیا ہے میں نے بوبی پر... اس سے زیادہ فکر تو مجھے اپنی رہی۔ اپنے کیریئر کے بارے میں زیادہ سوچا میں نے۔ بوبی کی زندگی کے سارے سکھ تو اس دولت مندی کے طفیل تھے جو اسے بیک وقت ماں اور باپ سے ملی۔ ابھی وہ بچہ ہے جب وہ بڑا ہوگا تو اس کی جذباتی وابستگی کس کے ساتھ ہوگی؟ ماں کے ساتھ؟ باپ کے ساتھ... یا ان کی دولت کے ساتھ؟
آج کی دنیا میں جذبات کے رشتوں کی کیا ضرورت رہ گئی ہے؟ کبھی نہ کبھی وہ بھی کہہ دے گا کہ آخر کیا کروں میں ولدیت کے خانے میں لکھے ہوئے نام کا؟ اور ماں کی ممتا کا؟ کام تو پیسا ہی آئے گا۔ خود آپ ساری دنیا کی طرح اسی کے پیچھے بھاگتے رہے... اپنے ماں باپ کو خود آپ نے کہاں رکھا تھا بالحاظ اہمیت؟ مال و زر سے پہلے یا اس کے بعد؟
یہ بڑا بے رحم سوال تھا اور اس کا جواب صدا کی زندگی تھی جو شاید کبھی اس کی نہ تھی۔

☆☆☆

دس سال سے زیادہ تو اسی شہر میں گزر گئے تھے۔ ابھی وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ بھی وقت کی مسافت طے کرنے والی عمر کی ٹرین کا کوئی جنکشن تھا جہاں وہ زیادہ دیر رکی رہی تھی یا

آخری اسٹیشن... سفر کی لکیر اس کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ وقت اس کا بستر ایک ایسا شخص بھی رہا تھا جو رات دن کے ساتھ بدل جاتا تھا۔ دن میں وہ عامل، نجومی، ستارہ شناس اور سفلی علوم کا وہ ماہر تھا جس کی تقدیر بدلنے کی کرشاتی قوت کے اشتہار اس شہر کے گلی کوچوں میں ہر جگہ دیواروں پر لکھے نظر آتے تھے۔ رات کو دھندے کا ٹائم ختم ہوتے ہی وہ اپنے جٹا دھاری بال اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اتار کے ایک طرف رکھتا تھا۔ جوگیوں والا فقیری چولا... رنگین موتیوں کی مالائیں اور آنکھوں میں جلال کی سرخی دکھانے والے لینز بھی غائب ہو جاتے تھے۔ غسل سے اس کا سیاہی مائل رنگ بھی دھل جاتا تھا اور وہ صاف گندمی رنگ والا ایک خاصا قبول صورت جوان آدمی بن جاتا تھا جس کے گھنے بال بڑی نفاست سے شہر کا ایک مشہور ہیئر ڈریسر سیٹ کرتا تھا۔ مشہور برانڈ کی شرٹ پتلون اور اسٹائلش جوتوں کے ساتھ بیش قیمت سنہری گھڑی باندھ کے وہ گاڑی نکالتا تھا اور لاہور کی نائٹ لائف کو انجوائے کرنے نکل جاتا تھا۔ ایک ہوٹل میں فرسٹ فلور پر اس کا کمرا پورا سال بک رہتا تھا۔ ایک کروڑ آبادی والے اس شہر میں بے عقلوں کی کوئی کمی نہ تھی اور اس جیسے سب ہی خواب فروش انہیں سو سو طرح سے بے وقوف بنا کے لوٹ رہے تھے۔ ہوٹل میں اور ایک مخصوص حلقۂ احباب میں وہ پرنس کہلاتا تھا۔

صدا اس کے ساتھ دو ماہ تک ہوٹل میں رہی تھی۔ اگر وہ ایک رات نشے کی سرمستی میں اپنی دہری شخصیت کا راز خود فاش نہ کرتا تو صدا کو اس کی حقیقت کبھی معلوم نہ ہوتی۔ یہ سنسنی خیز انکشاف کرتے وقت وہ ہنس ہنس کے بے حال ہو رہا تھا۔

اس نے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر صدا کو خوش خبری دی تھی کہ بہت جلد اسے بیرون ملک کا سفر درپیش ہوگا۔ صدا نے دہری زندگی اور دھوکے بازی کے عادی اس شخص کا ساتھ بھی چھوڑ دیا تھا مگر بعد میں اسے احساس ہوا کہ وہ خود ایسا ہی کر رہی تھی۔ بیرون ملک سفر کی بات تو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح نکلتے ہی ختم ہو گئی تھی مگر اس کا سفر جاری رہا تھا۔ خانہ بہ خانہ۔ کوچہ بہ کوچہ۔ شہر بہ شہر... اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ جو تھا اس کا رستہ صدا بھول چکی تھی لیکن تصویر جیسا ایک نقش اس کے تصور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پس منظر میں پہاڑ تھے جن کی برف پوش چوٹیاں دھوپ میں چمکتی تھیں۔ ایک ندی تھی جسے چھوٹے چھوٹے جھرنے اور پہاڑی چشمے اپنا پانی دیتے تھے۔ وہ نہ جانے کہاں سے شروع اور کہاں ختم ہوتی تھی۔ کسی ڈھلوان پر چیڑ

اور سرو کے بلند و بالا درختوں کے درمیان ایک نیم پختہ مکان تھا جس کی چھت پرانے ٹین کی تھی۔ ایک عورت جو بالکل صدا کا فرسٹ پرنٹ تھی، اس کی ماں کہلاتی تھی اور بیساکھی کے سہارے پر پھرنے والا ایک بہت بڑے خونخوار جانور جیسا مرد اس کا باپ... اس کی ایک ٹانگ پولیو سے خراب تھی۔ دن میں صدا نے اسے کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بیساکھی سے وہ دو ہی کام لیتا تھا۔ ایک سہارے کا اور دوسرا اپنی بیوی کی ہڈیاں توڑنے کا... دن کے وقت وہ گھر میں سونے کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔ اور اٹھتا تھا تو کھانے کو مانگتا تھا۔ غصہ اسے صبح شام آتا تھا۔ صبح اس وقت جب ماں صدا کو اسکول بھیجتی تھی۔ رات کو اس وقت جب وہ باہر جانے سے پہلے اپنی بیوی سے پیسے مانگتا تھا۔

وہ بہت رات گئے لوٹتا تھا۔ اس تجربے کو یاد کر کے آج بھی صدا کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے پرسکون گرم بستر اور ماں کے بدن کی حرارت سے محروم کر کے اسے کسی برف کی سل پر لٹا دیا گیا ہے۔ ماں اسے گود میں اٹھا کے ساتھ والے اسٹور جیسے مختصر کمرے میں ٹھنڈے فرش پر بچھے بستر پر لٹا دیتی تھی۔ وہ نیند میں احتجاج کرتی تھی۔ ماں پر غصہ کرتی تھی۔ آخر ابا کیوں آتا ہے رات کو... وہ وہاں کیوں نہیں سو سکتا جہاں تم مجھے سلاتی ہو... اور اسے ہمیشہ ایک جواب ملتا تھا۔ ایسا نہیں کہتے... ایک عجیب بات یہ تھی کہ ابا جس وقت بھی آتا تھا، کبھی دروازے سے سیدھا اندر نہیں آتا تھا۔ وہ کھڑکی پر دستک دیتا تھا۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ اور گہری نیند میں بھی صدا چونک پڑتی تھی۔ اس آواز کا ڈر صدا کے لاشعور میں بیٹھ گیا تھا۔ آج بھی اس طرح دستک اس کے جسم میں سردی کی لہر بن کے اتر جاتی تھی۔ یہ انکشاف تو اس پر بہت دیر سے کئی سالوں بعد ہوا تھا کہ دستک دے کر آنے والا اس کا باپ نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت وہ اپنی پہاڑی بستی سے قریب ترین شہر راولپنڈی آ چکے تھے۔

اس عورت کا چہرہ آج بھی فریم کی ہوئی تصویر کی طرح صدا کے حافظے کی سپاٹ دیوار پر سجا ہوا تھا۔ یہ صدا کا اپنا چہرہ تھا چنانچہ صدا خود اپنے کمرے میں اپنی کوئی تصویر لگانے سے ڈرتی تھی۔ حالانکہ ہزاروں وہ کیمروں کی زد میں رہتی تھی جو اس کی ہزاروں تصویریں بنا چکے تھے جو رسالوں، اخباروں، ہوٹلوں اور پان سگریٹ کی دکانوں، بل بورڈ اور سینما گھروں پر نت نئے پوز میں نظر آتی تھیں۔ اس کا اجلا رنگ، شفاف جلد اور گہری جھیل جیسی آنکھیں اور چہرے کے متناسب نقوش سب اس کی ماں کا تحفہ تھے۔

وہ بھی دختر کہسار تھی۔ وہ پہاڑی ندی جو چاندی جیسی برف کے پگھلنے والے پانی سے اپنا وجود پاتی ہے مگر میدانوں اور شہروں سے گزرتی ہے تو سیوریج کے بدبودار کیچڑ جیسے پانی کا گندہ نالا بن جاتی ہے۔

معلوم نہیں اس کی ماں نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا لیا تھا۔ یقیناً وہ بے پناہ حوصلہ اور ہمت رکھنے والی عورت تھی۔ شاید اسے خود سے زیادہ اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ آزادی سے عزت کی زندگی گزارنے کے لیے عورت کو کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے تجربے نے ثابت کیا کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک عورت ایک مرد کی قید سے فرار ہوئی تھی اور اسے ہر طرف سے مردوں نے گھیر لیا تھا۔ محنت مزدوری کر کے حق حلال کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کی خواہش ایک سراب ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اپنی دکھ بھری کہانی کے سارے واقعات اور کردار بدل کے ایک بزنس مین کی کوٹھی میں ملازمت حاصل کر لی اور اسے رہنے کے لیے سرونٹ کوارٹر میں جگہ بھی مل گئی۔ اس نے صدا کو ایک اسکول میں داخل بھی کرا دیا جہاں اس کا نام صدقہ خاتون رکھ دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد مالک نے صدا کی ماں سے سوال جواب کیے تو وہ مشکوک ٹھہری... وہ عورت واقعی اپنا کوئی حوالہ نہیں رکھتی تھی۔ گھروں میں چوری، ڈکیتی کی وارداتوں کو ایسی ہی عورتوں سے منسوب کیا جا رہا تھا۔ گھر کے مالک نے کہا کہ سچ سچ بتا دو ورنہ پولیس سچ اگلوا لے گی۔ صدا کی ماں نے ڈر کے سب بتا دیا مگر یہ سچ اسے بہت مہنگا پڑا۔ انہیں بے گھر ہونا پڑا۔ یہ کہانی اس وقت تک دہرائی جاتی رہی جب تک صدا کی ماں نے عزت کی زندگی کے خواب چھوڑ کر دوبارہ بے عزت ہونا قبول نہیں کیا۔ بے شک اب وہ جسمانی جبر اور تشدد سے محفوظ تھی لیکن ایک بیٹی کی وجہ سے زندہ رہنے کی مجبوری کا عذاب بہت سخت تھا۔ اس سے زیادہ روز بروز جوان ہوتی بیٹی کے مستقبل کا خوف سے کھائے جا رہا تھا۔ ابھی وہ خود بھی جوان اور خوب صورت تھی۔ ایک وقت ایسا آیا جب وہ انتخاب کرنے پر مجبور ہوئی کہ گناہ کی زندگی اختیار کرے یا ایک آخری گناہ کر کے محفوظ ہو جائے۔

اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور مطلقہ یا بیوہ نہ ہونے کے باوجود اپنی عمر سے دگنی عمر کے مرد سے شادی کر لی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ پہلے شوہر سے طلاق لے اور پھر دوسری شادی کرے۔ اس نے نکاح پر نکاح کے گناہ کا انتخاب کیا اور بیوی بنے رہنے کی سزا قبول کر لی۔

خود کو یقین دلانے کے باوجود کہ جان بچانے کے لیے حرام کو بھی حلال کی سند مل جاتی ہے اور بندوں سے زیادہ خدا اس کی مجبوری کو سمجھتا ہے۔ وہ مرتے دم تک احساس گناہ کے آزار میں مبتلا رہی۔ بیٹی کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید وہ خودکشی کی حرام موت کا انتخاب کرتی۔ نکاح کے بغیر رات، جنسی مریض کے ساتھ گزارنا... ایک شوہر کے ہوتے دوسرا کرنا یا خودکشی کرنا... تینوں گناہ کبیرہ تھے۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے تک صادقہ یعنی صدا کو نہ جانے کتنے مجنوں یہ یقین دلا چکے تھے کہ وہ دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہے اور مس یونیورس کے مقابلے میں جاتی تو اشوریا رائے خود اس کے سر پر تاج رکھتی۔ غرور حسن خود صدا کو شہ دے رہا تھا کہ وہ چاہے تو تسخیر کائنات بھی اس کے ایک اشارۂ ابرو کی بات ہے۔ ماں کی خواہش تھی کہ جلد از جلد صدا کو کسی اچھے ذمے دار شوہر کے حوالے کر دے تاکہ اس کی روح کا آزار ختم ہو اور وہ سکون سے مر سکے لیکن صدا نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کالج جانا چاہتی ہے اور بی اے سے پہلے شادی نہیں کرے گی۔ اسے سوتیلے باپ کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تو ماں نے ہتھیار ڈال دیے۔

سیکنڈ ایئر میں پہنچنے تک صدا کو اپنی قوت تسخیر کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے زندگی کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیا تھا جو اتنا دلکش تھا کہ صدا کو اپنے ماضی کی بدصورتی سے نفرت ہو گئی۔ ناتجربہ کاری اور احساس محرومی اسے سوچے سمجھے بغیر اس خوب صورت زندگی کی طرف کھینچتی چلی گئی جو فلموں کے ساتھ ٹی وی ڈراموں میں نظر آتا تھا۔ چند ابتدائی غلطیوں سے سبق حاصل کر کے اس نے "دوستی" کے لیے ان شوقین امیرزادوں کا انتخاب کیا جو اپنی لمبی لمبی شاندار کاروں میں زندگی کی ہر مسرت خرید کے دے سکتے تھے۔ ماں اس کے بدلتے ہوئے انداز دیکھ رہی تھی مگر بے بس تھی۔

پھر ایک ساتھ کئی واقعات ہوئے جنہوں نے صدا کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ سب سے پہلے تو اس پر ایک ٹی وی پروڈیوسر کی نگاہ انتخاب ٹھہری۔ اس نے چند ماہ بعد ہی صدا کو اپنے اگلے سیریل میں ہیروئن کے لیے منتخب کر لیا۔ صدا کے لیے یہ اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ وہ خود کو عزت، دولت، شہرت کے افق پر سب سے روشن ستارے کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ گناہ و ثواب، غلط اور صحیح کی روایتی سوچ اس کی راہ میں بھی دیوار نہیں بنی تھی۔ اس نے یہ آفر قبول کر لی۔ صدا کے راستے کی ایک مشکل اس وقت دور ہوئی جب سیریل کی شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اس کا سوتیلا

ان کے خلاف انکم ٹیکس اور فراڈ کے کیس کھل گئے۔ آمدنی کے غلط گوشوارے کون داخل نہیں کرتا مگر پکڑا وہی جاتا ہے جس پر دباؤ ڈالنا مقصود ہو۔ میرے دو بہت بڑے ایونٹس خراب کیے گئے۔ بجلی تو خیر جاتی رہتی ہے لیکن وہاں متبادل سپلائی کے لیے جو جنریٹرز لگائے گئے تھے، ان میں آگ لگی۔ پھر اندر اندھیرے میں ایک دھماکا ہو گیا۔ دوسری تقریب کے وقت گراؤنڈ میں اسٹالز کے درمیان پانی چھوڑ دیا گیا۔ وہ بھی سیوریج کا۔ نہ جانے کہاں سے درجنوں کتے آ گئے۔ بس یہ ہی معاملات خراب ہوئے تو کلائنٹس نے مجھ سے معذرت کر لی۔ اپنا نقصان کوئی نہیں چاہتا تھا۔ چھ مہینے بھی نہیں لگے مجھے دوالیہ ہونے میں۔"

"تم ٹھنڈے دماغ سے کام لینے والے اتنے جذباتی کیسے ہو گئے؟"

"یہ تم نہیں سمجھو گی۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، ورمیں سیاسی دباؤ کا مقابلہ سیاسی اثر و رسوخ سے نہیں کر سکتا تھا، ور اس کے ساتھ مل کے بھی میری برسوں کی گڈ ول برباد ہو جاتی۔ مجھے بتاؤ کیا سیاسی پشت پناہی سے تم ٹاپ کی ماڈل ور فلم اسٹار بن سکتی تھیں؟ ملک کا صدر اپنے بیٹے کو پاکستان کی ٹیسٹ کرکٹ کا شاہد آفریدی بنا سکتا ہے... لیکن وہ شاہد آفریدی کے ساتھ ہو تو پاکستان کی پوری کرکٹ ٹیم کا خانہ خراب... یہ کوئی سرکاری ٹھیکے لینے کا بزنس نہیں تھا۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد صدا نے کہا۔

"آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"سوچنے کے سوا میں نے کیا کیا ہے... مگر بزنس ہوتا ہے سرمائے سے... سوچنے سے نہیں... میں یہ سمجھتا ہوں کہ حریف مجھے سزا دے کے بھول گئے۔ ان کے میرے درمیان خاندانی دشمنی کوئی نہیں۔ ہاں، اس فیلڈ میں پھر قدم جمانے کی کوشش کا مطلب ہو گا انہیں پھر مقابلے پر اکسانا... میں ایک پروڈکشن ہاؤس بنا سکتا ہوں جہاں ٹی وی کے لیے اشتہاری فلمیں اور ڈرامے ریکارڈ کیے جائیں۔ چینل اتنے زیادہ ہیں کہ پروگرام شارٹ ہیں... کوئی کی پرواہ کسی کو نہیں... ہر شخص پروگرام بنانا چاہتا ہے۔ ڈراما... ٹاک شو... میوزک... ویڈیو۔ ہر شخص خود کو سنگر، ڈانسر، ایکٹر سمجھتا ہے اور پبلسٹی چاہتا ہے... جگہ میرے پاس ہے لیکن کوئی، ریکارڈنگ کے لیے آج کل جو ڈیجیٹل اور کمپیوٹرائزڈ ایکوپمنٹ آ رہا ہے، وہ لاکھوں کا نہیں کروڑوں کا ہے۔"

"کتنے کروڑ کا؟"

"میرا خیال ہے، دو تین کروڑ کافی ہونے چاہئیں... اس میں پارٹنرشپ ہو سکتی ہے... میری گڈ ول اپنی جگہ... مالی طور پر میں ایک چوتھائی کا بندوبست کر لوں گا... ابھی تک کسی فنانسر نے ہامی نہیں بھری... بات کئی ایک سے ہو چکی ہے۔"

خاموشی کے دوسرے وقفے میں وہ کافی پیتے رہے۔ ٹیرس میں چاندنی بھری ہوئی تھی۔ ستارے خاموش رات میں چمک رہے تھے۔ صدا نے اچانک کہا۔ "ناصر میں تیار ہوں۔ میں ہوں گی تمہاری پارٹنر اور تمہارے پروجیکٹ کو فنانس کروں گی۔"

ناصر اسے دیکھتا رہا۔ "تم جذباتی ہو رہی ہو۔"

"نہیں مجھے تم پر اعتماد ہے اور میرا جذباتی ہونا بھی غلط نہیں۔ ایک وقت تھا جب تم نے مجھے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے میں مدد دی تھی۔ مجھے وہ قرض بھی چکانا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے تمہیں سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا چاہیے۔"

"دیکھو ناصر! تین سال گزر جانے کے بعد آج میں اپنے پروفیشن میں بہت کامیاب ہوں لیکن اس عرصے میں مجھے شوبزنس میں بہت کچھ دیکھنے سمجھنے اور سیکھنے کو ملا ہے۔ ایک تو یہ کہا جاتا ہے کہ ماڈل ہمیشہ ناٹ روپ پر چلتی ہے۔ خصوصاً پانچ سال بعد اس کا مستقبل غیر یقینی ہو جاتا ہے۔ انڈسٹری ہمیشہ نئے چہروں کی تلاش میں رہتی ہے اور کوئی چہرہ اچانک کسی بھی وقت نمودار ہو کے کسی بھی اسٹار کی ویلیو ختم کر سکتا ہے۔ ایسا ہوا ہے اور میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر مجھے مزید دو سال بھی عروج حاصل رہے تب بھی مستقبل کی ضمانت نہیں۔ ایک دو کو چھوڑ دو جو بہت طویل عرصے سے اپنی اجارہ داری قائم رکھے ہوئے ہیں، شادی شدہ اور ایک سے زیادہ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود..."

"یہ اچھی بات ہے کہ تم اتنی حقیقت پسند ہو۔"

"میں نے یہاں شوبزنس کے لوگوں کو مستقبل کی فکر میں بہت کچھ کرتے دیکھا ہے۔ خواتین نے شہرت سے فائدہ اٹھا کے بوتیک کھول لیے ہیں یا بیوٹی پارلر... مردوں میں بھی ہمایوں سعید... اعجاز اسلم اور شبیر جان کی مثال ہے... آصف رضا میر کی طرح کچھ نے پروڈکشن ہاؤس بھی بنائے ہیں۔ میں خود ایسا ہی کرتی۔ تمہارا پروپوزل میرے مفاد میں بھی ہے۔ ابھی میں سارا وقت ایک طرف دے رہی ہوں... یہ کام تم سنبھالے رہو گے۔ کیا پتا بعد میں کسی دن مجھے عملاً تمہارے ساتھ آنا پڑے۔ عملاً تمہارا ساتھ دینے کے لیے... ہم پارٹنر بن سکتے ہیں۔"

"ملاؤ پھر ہاتھ۔" ناصر نے صدا کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

زندگی کے کچھ فیصلے تقدیر کرتی ہے، کچھ کے لیے حالات از خود سازگار ہو جاتے ہیں۔ ناصر کی شخصیت اور مزاج نے تین سال قبل بھی صدا کو گرویدہ کر لیا تھا مگر اس وقت وہ ایک ناتجربہ کار جذباتی لڑکی تھی تو اپنی کامیابی کی راہ کا مرحلہ تھی۔ گر اس وقت وہ ناصر سے شادی کر لیتی تو یہ کامیابی آج دو تین بچوں والے ایک گھر تک محدود ہو کے رہ جاتی۔ بلکہ پارٹنر بنتے وقت بھی صدا نے لائف پارٹنر بننے کے بارے میں سوچا نہیں تھا لیکن اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خواہش ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ اگلے تین یا چار سال میں وہ کسی جیون ساتھی کا انتخاب کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس نے ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کی بڑی بڑی سپر اسٹارز کو دیکھا تھا کہ اپنے کیریئر کے عروج پر انہوں نے شوبزنس سے دستبردار ہو کے ہاؤس وائف بننا قبول کر لیا تھا۔ وہ پاکستان کی بیو اور مسرت نذیر ہوں یا ممبئی کی مادھوری اور ٹیشور یہ... شاید عورت کی جبلت میں تھا کہ وہ بیوی اور ماں بنے اور اپنے شوہر کے گھر میں آباد ہو۔ ورنہ ان سپر اسٹارز کو دولت اور شہرت کی ضرورت تھی اور نہ پرستاروں کی۔ وہ بیوی بن کے مرد کی بالادستی کو قبول کرتی تھیں اور چمک دمک اور گلیمر سے دستبرداری قبول کر لیتی تھیں۔

صدا کے لیے ابھی وہ وقت دور تھا، مگر نا گزیر تھا۔ کیسے زندگی گزرنے اور بیٹوں بیٹیوں کے اور پوتے نواسوں کے خیر باد جانے کا تصور اسے بھی ڈراتا تھا۔ اس رات یہ فیصلہ اچانک ہوا۔ صدا کو کرنا پڑا وہ نیند میں کسی آہٹ پر بیدار ہوئی۔ اس نے تاریکی میں آنکھیں کھول کے خاموشی پر غور کیا۔ کہیں کچھ خلاف معمول تھا۔ ناصر کو بیدار کرنے کے بجائے وہ آہستہ سے اٹھی اور کچھ دیر ساکت رہی۔ ایک بار پھر اس نے ہلکا سا کھٹکا سنا اور اسے ذرا شک نہ رہا کہ کمرے کے اندر کوئی اور بھی ہے۔ اسے شروع سے نائٹ لیمپ کے بغیر مکمل اندھیرے میں سونے کی عادت تھی۔ کھڑکیوں پر پڑے پردے اسے صبح کے احساس سے محفوظ رکھتے تھے اور وہ نصف شب کے بعد بھی سوتی تھی تو اگلے دن دوپہر تک اس پر پرسکون رات کا سایہ رہتا تھا اور وہ سوئی رہتی تھی لیکن اسی چیز نے اسے الو کی طرح تاریکی میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

اسے اندھیرے میں حرکت محسوس ہوئی۔ یوں جیسے تاریکی کا ایک زیادہ تاریک ٹکڑا الگ ہوا ہو۔ یہ ٹکڑا کسی حد تک انسانی ہیولے جیسا تھا۔ "کون ہے؟" یہ اس نے دہشت سے پوچھا اور بیڈ سائیڈ لیمپ کو روشن کر دیا۔ صدا نے پینتیس چالیس سال کے کرخت نقوش والے ایک شخص کو دیکھا جو اس کے بیڈ روم میں صرف چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ یہ بڑی ناقابل یقین بات تھی۔ مسلح ڈکیتیوں کے اس دور میں وہ پرانے وقتوں کے نقب زنوں کی طرح پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی کوٹھی کے جدید حفاظتی حصار کو طاقت سے توڑ کے اندر داخل ہونا عملاً ناممکن تھا۔ اس نے حیرت انگیز پیشہ ورانہ مہارت سے گھر میں داخل ہونے کے بعد بیڈ روم میں داخل ہونے کی ہمت کی تھی اور دیوار میں نصب تجوری کا تالا کھولنے میں بھی کامیاب رہا تھا حالانکہ تجوری ایک پینٹنگ کے پیچھے تھی اور اس میں کوڈ والے نمبر لاک تھے۔ اسی نمبر کی ہلکی سی کلک نے صدا کو بیدار کیا تھا۔

وہ عام قسم کی شرٹ میں تھا جس کا گریبان اوپر سے نیچے تک کھلا ہوا تھا اور اس کی پتلون بھی معمولی تھی۔ صدا کی چیخ نے اسے ایک دم کسی جنگلی جانور کی طرح چوکس اور خطرے سے لڑنے کے لیے تیار کر دیا۔ صدا اس کی راہ میں حائل نہ ہوتی تو شاید وہ بندر جیسی پھرتی کے ساتھ جست لگا کے کمرے سے نکل جاتا لیکن صدا کے حلق سے بے اختیار نکلنے والی چیخ نے ناصر کو بیدار کر دیا تھا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" اجنبی چلایا اور نہ جانے کہاں سے اس کے ہاتھ میں پر تاثیر دانی والا خنجر آ گیا۔

ناصر کے اٹھتے ہی اجنبی نے صدا پر جست لگائی اور تقریباً اڑتا ہوا گیا تو وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اجنبی اس پر گرا اور یک دم اٹھی صدا کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو اپنے بیڈ پر پڑی تھی اور ناصر اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ ناصر کے گلے میں جھول گئی۔ اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ "وہ... وہ..." اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"صدا... پلیز صدا... وہ پکڑا گیا ہے۔ بھاگ کے وہ کہاں جا سکتا تھا۔ تم نے بڑی غلطی کی کہ اس کی راہ میں حائل ہو گئے... اس کے پاس ریوالور ہوتا تو... تمہیں سامنے دیکھ اور میری لڑکی سے... چلانے پر مجبور ہوتے... لیکن خنجر سے وہ کیا کرتا۔ یہ لو پانی پیو۔"

صدا نے دو گھونٹ لے کر گلاس واپس لوٹا دیا۔ "مگر... وہ اندر آیا کیسے؟"

"یہ سب اس سے پولیس معلوم کر لے گی۔ ہمت سے زیادہ میں اس کی ذہانت کی داد دیتا ہوں کہ وہ سارے حفاظتی انتظامات کے باوجود تمہارے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ یہ یقیناً سیکیورٹی والوں کی غفلت ہے۔ کیمرے کام نہیں کر رہے

ہیں یا مانیٹر پر کسی کی نظر نہیں تھی۔ ویسے تو انفرا ریڈ شعاعوں کا نظر نہ آنے والا احصار ہونا چاہیے۔"

"یہ تم دیکھ لینا پلیز... مجھے تو کچھ پتا نہیں... سیکیورٹی کمپنی والے آخر کس بات کے پیسے لیتے ہیں؟"

"صدا ڈیئر! سیکیورٹی کمپنی بیڈ روم کے اندر تو تمہاری حفاظت نہیں کرے گی۔ یہ تمہاری غفلت ہے۔ اس تجوری میں کیا ہے؟"

"میرے زیورات، کیش اور بانڈ... پراپرٹی کے کاغذات۔"

"اس کے لاک کا سیکرٹ کوڈ تمہارے علاوہ کس کو معلوم ہے؟"

صدا نے نفی میں سر ہلایا۔ "خود مجھے یاد نہیں رہتا۔ ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔"

"ایک اور حماقت... کوڈ چاہے آسان ہو... مگر زبانی یاد ہونا چاہیے اور اسے بدل دینا چاہیے ہر مہینے ورنہ سال میں چار بار۔"

"تم جیسا کہو گے ویسا ہی کروں گی میں۔" صدا نے دراز کھولی۔

"یہ کیا ہے؟ سلیپنگ پلز۔" ناصر نے اس سے شیشی چھین لی۔ "اس کے بغیر اب میں سو نہیں سکتی ناصر۔"

"ٹھیک ہے جاگتی رہو... میں بھی جاگ رہا ہوں۔"

اس نے لائٹ بجھادی۔

صبح ہونے تک وہ خوف سے جاگتی رہی اور ناصر کے بازوؤں میں سسکی کانپتی رہی۔ بالآخر اس نے کہہ دیا۔ "ناصر! کیوں نہ ہم شادی کرلیں۔ میں اب اور اکیلی نہیں رہ سکتی۔"

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا جب تم سے پہلی بار ملا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن اس وقت تمہاری ترجیح تھی اپنا کیریئر... میں نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔"

"ایک بات بتاؤں؟ اگر تم کہتے تو میں اس وقت بھی مان جاتی۔"

"لیکن میں نے تمہاری کامیابی کا راستہ نہیں روکا۔ تمہاری مدد کی اور انتظار کیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہی ہوگا۔ وہ دن ایک سال کے بعد آئے، پانچ سال بعد یا دس سال بعد... بالآخر تم تھک جاؤ گی اور محسوس کروگی کہ اپنی تمام دولت اور شہرت کے ساتھ بھی تم تنہا ہو۔"

"اور اگر اس سے پہلے ہی میں کسی اور کو اپنا لیتی... یہ نہیں سوچا تم نے؟"

"نہیں... جانے کیوں میں نے ایسا نہیں سوچا...

یہ یقین میرے ساتھ رہا کہ تم صرف میرے ہی ہو۔"

یہ شادی ایک بہت بڑا واقعہ تھی جسے میڈیا نے بھرپور کوریج دی۔ ہر جگہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہتی رہی کہ شادی سے اس کا کیریئر متاثر نہیں ہوگا اور وہ ماڈلنگ بھی نہیں چھوڑے گی لیکن قسمت ساتھ نہ دیتی تو اس کا اعتماد غلط ثابت ہو جاتا۔ اس نے خود کو فٹ رکھا اور حیرت انگیز طور پر اس کی مصروفیت میں اضافہ ہوگیا۔ انڈسٹری میں نئی پر کوئی لڑکی اس کی جگہ نہ لے سکی۔ صدا نے اپنا معاوضہ بڑھا دیا پھر بھی فرق نہ پڑا۔ بالواسطہ طور پر اسے یہ فیڈ بیک ملا کہ شادی نے اس کی نسوانیت کے حسن کی تکمیل کردی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ پاپولر ہو رہی ہے۔

ناصر صرف ایک نام تھا۔ وہ کسی تقریب، کسی شوٹنگ اور دعوت میں صدا کے ساتھ نظر نہیں آتا تھا۔ برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر یا پھر امریکا کی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے شوہروں کی طرح اس نے مکمل طور پر پس منظر میں رہنے کو ترجیح دی۔ صدا نے اپنی پرائیویٹ اور پبلک لائف میں ایک ڈسپلن اور توازن رکھا جس سے اس کی پرسٹیج میں اضافہ ہوا۔ ناصر نے دن رات لگا کے اپنا پروڈکشن ہاؤس بنا لیا اور ان دونوں کے تعلقات کی مدد سے اس میں کام کی بھی کمی نہ رہی۔ یہ ناصر کا کمال تھا کہ اس نے اپنی ٹیم میں بہترین پروفیشنل کیمرامین، ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور ایڈیٹر شامل کیے تھے۔ اس کا ایکوپمنٹ تو جدید ترین تھا ہی۔ دو سال بعد جب صدا کو یقین آگیا کہ شادی نے اس کے کیریئر پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالا ہے، اس نے ایک اور رسک لیا۔ ذہنی طور پر وہ تیار تھی کہ اپنی فیملی کے لیے وہ کیریئر کو خیرباد کہہ سکتی ہے۔ بچی کی پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد وہ تقریباً دو سال کیمرے کے سامنے نہیں آئی۔

یہ اس کا ٹیلنٹ تھا۔ خوش قسمتی یا پی آر کہ اس بریک کے بعد وہ پھر نمودار ہوئی تو اس کے کچھ اشتہار کلک کر گئے۔ وہ سمر فیشن کا سیزن تھا اور لان کے دو نئے برانڈ لانے والوں کے پرنٹ ہٹ ہوئے تو کریڈٹ دونوں کو گیا۔ ڈیزائنر کو بھی اور ماڈل کو بھی۔ صدا پھر چھا گئی۔ اس نے فٹ رہنے کے لیے بہت محنت کی تھی لیکن کہنے والے کہتے تھے کہ ماتا کے ساتھ اس کی دلکشی حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی ہے۔ حسن کا یہ بونس اسے شادی نے دیا، اس سے زیادہ ماں بن کر ملا اور وہ دوسری نادیہ حسین کہلانے لگی۔

خرابی گھر کے اندر کسی وجہ کے بغیر پیدا ہوئی۔ وہ ایک شوٹنگ کے دوران پیش آنے والا حادثہ تھا۔ ایک ڈراما چینل

کے بہت ہٹ سیریل کی ریکارڈنگ کے دوران ایک مشہور ہیرو نے اس کے ساتھ غیر ضروری طور پر بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ صدا نے سب کے سامنے اس کے ساتھ برہمی کا سخت رویہ اختیار کیا تو وہ سیخ پا ہوگیا اور اس نے شرمندگی مٹانے کے لیے ایک ایسی بات کہہ دی جو کسی طرح بھی گالی سے کم نہ تھی۔ صدا اس کے گال پر تھپڑ مار کر سیٹ پر سے چلی گئی۔ بات وہاں بھی ختم ہو جاتی لیکن جب بات کو اچھالنے والے میڈیا کے نمائندے پہنچے تو اس ... نے صدا کے بارے میں بہت کچھ کہہ دیا جو بے بنیاد تھا۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ سب کے سامنے پارسا بننے والی اس کی خلوت میں کہاں کہاں شریک رہی ہے، یہ شوبزنس میں کون نہیں جانتا۔

صدا کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ اس شخص کی یہ تہمت اور بدکرداری کی وہاں انتہا نہیں اور وہ اپنے آپ کو اس کی ... کے چھینٹوں سے بچانے کی کوشش کرے گی تو وہ اسے گٹر میں ڈال دے گا۔ اس پست ذہنیت والے شخص کے لیے یہ توہین اتنی ناقابلِ برداشت تھی کہ اس نے صدا کو ٹارگٹ کرلیا اور شاید جب تک خود صدا جا کے اپنے آپ کو اس کے قدموں میں نہ پھینک دیتی اور اس کے قدموں میں سر رکھ کے معافی نہ مانگتی، وہ اس پر اپنے رکیک حملے بند نہ کرتا۔ جو اسے جانتے تھے، انہوں نے اہمیت نہ دی لیکن انڈیا، پاکستان کے طول و عرض میں زرد صحافت کرنے والوں اور چسکے لینے والوں کی موج آگئی۔ نقصان نہ صدا کے کیریئر کو ہوا اور نہ اس کی گڈ ول کو... نقصان اس کی ازدواجی زندگی کو ہوا۔

معلوم نہیں کیسے اور کب غصے میں ناصر نے کہہ دیا کہ دھواں تو وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ اس سے اعتماد کے رشتے میں پہلی دراڑ پڑی... جو آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی۔ پروڈکشن ہاؤس بھی ایک بھتی گنگا تھا۔ گانے ناچنے اور اداکاری کرنے کے شوقین لڑکوں کو چانس دیا جاتا یا انہی کو چانس دیا جاتا تھا جو سرمایہ کاری کر سکتے ہوں۔ لڑکیوں کو رنگ روپ، ہمت اور شوق کی انتہا دیکھ کر منتخب کیا جاتا تھا۔ بیشتر تو شرافت کو گھر میں چھوڑ کے آتی تھیں اور سب کو خوش رکھتی تھیں تو خود بھی عیش کرتی تھیں۔ اگر ناصر پروڈیوسر کی کان میں تھوڑی بہت کالک نظر آتی تھی تو صدا اور گزر کرتی تھی۔ یہ مردوں کی دنیا ہے تو مردوں کی ہی چلے گی۔ لیکن اس نام نہاد اسکینڈل کے سبب جو ہوا، وہ بات تو بنی ہی نہ تھی۔ ناصر نے بھی اس کو ... کیا تو وہ چونکی۔ ناصر بھی اسی دنیا کا باسی تھا۔ سب جانتا تھا کہ صدا وہاں سے کہاں سے آئی ہے اور کیا

کرتی ہے۔ آج اس کے ماضی میں پاکیزگی اور شرافت کے آثار تلاش کرنا چہ معنی دارد۔ وجہ اسے بہت جلد معلوم ہو گئی۔ وہ ایک نئی سنگر ماڈل کو پروموٹ کر رہا تھا جو یورپ میں پلی بڑھی تھی مگر پاکستانی تھی اور شوبزنس میں پاکستان کا نام روشن کرنے کے لیے ناصر سے انیج ہوگئی تھی۔ ناصر نے اس کا پاپ نیم آئینہ رکھا تھا۔

حالات روز بروز خراب ہونے لگے تو ناصر نے کھل کر کہا کہ وہ اپنی بیوی کی بدنامی پر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا اور صدا نے قصہ مختصر کہا کہ میرا منہ چھوڑو... اس لڑکی آئینہ کا منہ زیادہ اچھا ہے جو نئی عفت مآب، باحیا اور مذہبی گھرانے کی پروردہ مشرقی لڑکی ہے۔ پہلے ان کے بیڈ روم الگ ہوئے پھر گھر الگ ہوئے... ناصر نے اسے طلاق دی تو صدا نے اس کے بزنس سے اپنا سرمایہ نکال لیا۔ ناصر دیوالیہ ہوگیا اور اس نے پروڈکشن ہاؤس بیچ کے گلبرگ میں بک اسٹور اور سی ڈی شاپ کھول لی۔ یہ سب اخباروں کی سرخی بنا لیکن چھوٹے بچے کے مفاد میں وہ بروقت سنبھل گئے۔ انہوں نے اتفاقِ رائے سے فیصلہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی بیان بازی نہیں کریں گے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ہم اکٹھے رہ سکتے تھے تو رہے اور اب نہیں رہ سکتے تو یہ کسی اور کا مسئلہ نہیں۔

آئینہ حسین، پُرشباب، دولت مند در امپورٹڈ تھی۔ وہ سنجیدگی سے نہ کوئی کام کر سکتی تھی اور نہ کرنا چاہتی تھی۔ ادھر اُدھر اڑتی پھرنے والی رنگین تتلی کی طرح وہ بھی گئی اور ناصر نے کچھ عرصہ آزاد زندگی کے مزے لیے۔ اس کا پہلا اور پسند کا کام وہی تھا جو اس نے صدا کے لیے کیا تھا۔ ایونٹ مینجمنٹ ہی اس کے لیے چیلنج تھا جو اس کی انتظامی اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دیتا تھا پھر پروڈکشن ہاؤس میں بھی وہ دن رات پیسا کماتا رہا۔ عیاشی کرتا رہا اور اپنی ذہانت بھی استعمال کرتا رہا۔ دکان چلانا اس کے لیے ایک بیزار کن کام تھا جو اس نے مجبوری میں کیا تاہم اسے آمدنی ہوتی رہی۔ اب اس نے ایک شادی بھی کرلی۔ وہ ایک اچھی بزنس فیملی کی لڑکی تھی لیکن حد سے زیادہ شکی مزاج۔ وہ ناصر کے مستقبل کو اس کے ماضی کی روشنی میں دیکھتی تھی اور اس پر بالکل اعتبار کرنے کو تیار نہ تھی۔ جسے ناصر نے اس کی وارفتگی سمجھا تھا، وہ اس کا حاسد نہ پاگل پن تھا۔ اسے یقین تھا کہ صدا اور آئینہ جیسی لڑکیوں کے علاوہ سیکڑوں رنگین فلمی پریوں کے جھرمٹ میں دن رات مصروف رہنے والا اچھا شوہر تو بن ہی نہیں سکتا اور ہر روز پنج وقتہ بیوی سے بے وفائی کا مرتکب ہونا اس کی فطرت بن چکی ہے۔ ظاہر ہے

ناصر اس کا بندر بن کے نہیں رہ سکتا تھا جسے وہ گلے میں رسی ڈال کے رکھے۔ وہ سمجھانے کی کوشش کرتا تو پاگل ہو جاتا۔

بوبی دوسرا مسئلۂ کشمیر بن گیا تھا۔ صدا اور ناصر نے اتفاقِ رائے سے اپنے بچے کو آپس کے اختلافات سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، جب تک بھی یہ ممکن ہو... پھر وہ بڑا ہو جائے گا تو ہم سمجھا دیں گے اور وہ سمجھ لے گا کہ کیسے دونوں کے ساتھ رہے یا کسی کے ساتھ نہ رہے۔ اسے نرسری میں ایک گورنس کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا جس کا انتخاب ان دونوں نے بہت احتیاط سے کیا تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو ماں نہیں بن سکتی تھی اور اس جرم میں گھر سے بے گھر کر دی گئی تھی۔ طبعاً وہ شائستہ اور محبت کرنے والی تھی اور صدا نے اسے سب سمجھا کے اس کو دنیا کی فکروں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ بوبی چار سال کا تھا جب بورڈنگ اسکول کے ایک ملازم نے کا... کی مدد سے اسے اغوا کر کے ریپ اور پھر قتل کر دیا۔ اسی سال بوبی پرائمری سیکشن میں پہنچ گیا اور اسے گورنس کی ضرورت نہ رہی۔ بورڈنگ ہاؤس میں بچے اپنا کام خود کرتے تھے اور نوکر چاکر ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔

ناصر اس سے ہفتے میں ایک بار ضرور ملنے جاتا تھا۔ صدا کوشش ضرور کرتی تھی کہ مہینے میں ایک چکر لگا لے۔ عموماً وہ الگ الگ جاتے تھے مگر ایک دو بار ساتھ بھی گئے تھے۔ صدا ہمیشہ عام عورت کے روپ میں حجاب پہن کر جاتی تھی اور بوبی کے سامنے وہ یہی ظاہر کرتے تھے کہ وہی اس کے ماں باپ ہیں اور عام لوگوں کی طرح ان کی بھی زندگی ہے۔ وہ مطمئن تھے کہ وہ دنیا کی بے رحمی سے دور اسے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس کے معصوم ذہن کو مسموم نہیں ہونے دیا اور جو ناممکن لگتا تھا، وہ ممکن کر دکھایا۔ سائے کی طرح تعاقب کرنے والے پاپا رازی جو مشہور شخصیات کی پرائیویٹ لائف کا ہر پہلو پبلک کو دکھانے کے درپے رہتے ہیں، ان کے راز کو نہ پا سکے تھے۔

اور اب بوبی اغوا ہو چکا تھا۔ فوٹوگرافر، اخباری نمائندے، پولیس، سراغ رساں بھی سب بے خبر تھے۔ یہ خبر چھپائی نہیں جا سکتی تھی۔ ان کی برسوں کی جدوجہد کو یوں ختم ہونا تھا۔ خاموشی کے بعد اتنا بڑا طوفان آنے کو تھا۔

☆☆☆

سب کچھ تہس نہس کر دینے والے دکھ کی پہلی لہر سے جانبر ہو جانے کے بعد وہ فقط زندہ تھی۔ اب تک وہ صرف اپنی بقا اور زندگی کے مقاصد کی جدوجہد میں شب و روز مصروف تھی۔ اس نے اپنی عالی شان کوٹھی اور اس میں بھرے ہوئے قیمتی ساز و سامان، اپنی کاروں، اپنے خدمت گاروں اور ذاتی منافع کی لگن میں اس کے سامنے دولت نچھاور کرنے والوں اور ہوس کے مارے پرستاروں کے درمیان...... فخر اور غرور کی ایک دنیا آباد کر رکھی تھی۔ یہ محسوس کیے بغیر کہ یہ سب ضرورت مندی کے لاحاصل ... ہیں۔ ورنہ وہ پہلے کی طرح آج بھی اکیلی تھی۔

آج اچانک اس نے یہ سب کچھ ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اسے کسی اور کے لیے جینے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر وہ اپنے ہی مزید دس سال گزار لے گی تب بھی اکیلی ہو گی۔ شاید یہ سب کچھ دگنا، تین گنا ہو جائے گا جو آج اس کے پاس ہے۔ بینک میں جمع رقوم کے اعداد و شمار کروڑوں سے اربوں تک جا سکتے ہیں۔ ہر سال نئی گاڑی ایک سے بڑھ کر دوسری بیش قیمت... ایک کے بعد دوسری کوٹھی چار سے آٹھ کنال... لیکن دن کے چوبیس گھنٹوں میں کمائی کو خرچ کرنے کی صلاحیت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اضافہ عمر میں ہوتا ہے، زندہ رہنے کے لیے باقی فرصت کم ہوتی جاتی ہے۔

اچانک اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے حصے کے کام سے کہیں زیادہ کام کر لیا۔ توقع سے کہیں زیادہ کما لیا۔ ... کہ وہ دونوں ہاتھوں سے خرچ کرنا چاہے، تب بھی نہیں ... تھی۔ چنانچہ اب یہ کام سے دام کمانے کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ آگے بڑھتے جانے کی مسلسل دیوانہ وار جدوجہد میں اس مقام پر صدا کو یو ٹرن لے کر دوں... کی زندگی کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ اپنے اصل کی طرف واپسی میں ہی سکون ہے اور نجات ہے۔ زندگی کا سارا وقت آج تک اس نے دنیا کو دیا۔ باقی وقت پر اس کا حق ہے۔ اس نے اپنی زندگی تو کبھی گزاری ہی نہیں۔ ہمیشہ دوسروں کی مرضی کے تابع جیتی رہی ہے۔ بستر میں ماں کی ممتا بھری آغوش سے محرومی ہو یا اس کے کیریئر کو سپورٹ کرنے والوں کی پُرہوس آغوش۔ سب حالات کا جبر تھا جس پر اسے اختیار نہ تھا۔ اس نے اپنا انتقام لے لیا... لیکن اس کی کتنی بڑی قیمت ادا کی۔

فون کی گھنٹی اسے خیال کی دنیا سے حقائق کی دنیا میں کھینچ لائی۔ ایک خودکار عمل کے تحت اس نے کہا۔ ''ہیلو ناصر کوئی پیش رفت؟''

''ہاں، اس کا میسیج ملا تھا کل... نہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے پرنسپل سے بات کی ہے لیکن میں نے وضاحت کر دی کہ یہ ضروری تھا، ورنہ میں نے پرنسپل سے کہا ہے کہ وہ بھی خاموشی اختیار کرے۔''

''دیکھو، دو دن ہو گئے... بوبی ضرور پریشان ہو گا... چھوٹا بچہ ہے وہ...''

''انہوں نے دکھایا تو نہیں لیکن بوبی سے بات کرا دی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا پاپا، یہ کون لوگ ہیں۔ میں نے کہا کہ بیٹا یہ انکل ہیں تمہارے۔ وہ چلانے لگا کہ مجھے انکل کے پاس نہیں رہنا... پھر انہوں نے فون بند کر دیا۔''

صدا کے دل پر چھری سی چل گئی۔ ''ناصر! آخر کیوں آزما رہے ہیں وہ ہمارے صبر کو؟''

''بچوں کو اغوا کرنے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔''

''مگر ہم منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں تو پھر یہ سب کس لیے؟''

''صدا! مجھ پر بھروسا کرو۔ ایک منٹ... کوئی کال آ رہی ہے۔'' ناصر نے فون بند کر دیا۔

صدا اضطراری کیفیت میں کمرے کے اندر چکر لگاتی رہی۔ اس نے بھی سنا تھا کہ پولیس کی طرح اغوا کار بھی پیسے وصول کرنے کے لیے تشدد کرتے ہیں۔ لواحقین کو چیخنے چلانے کی درد بھری آوازیں سنا کے ایکسپلائٹ کرتے ہیں۔ پھر ماں اپنا زیور بیچے یا بیوی خود کو... انہیں پیسا مل جاتا ہے۔ ایسے لوگ سفاکی اور بے رحمی میں جبر انتہا تک چلے جاتے ہیں اور اب تو زمانہ بے آواز کے ساتھ تصویر پہنچانے کا... وہ کسی کو تکلیف سے تڑپتا ہوا بھی دکھا سکتے ہیں۔ ایسا کہ قریب المرگ لگے۔ کس ماں کا کلیجا نہ پھٹ جائے گا، پھر کون سا باپ پیسا بچانے کا سوچے گا۔ وہ اپنا گھر گروی رکھے یا سود خور سے مانگے۔ ساری زندگی کے لیے مقروض ہو جائے یا اس کی فیملی تباہ ہو جائے۔ وہ مطالبہ پورا کرتا ہے۔ کہیں یہ ظالم بھی ایسا ہی تو نہیں کریں گے؟

تصور نے صدا کو ایسے ایسے منظر دکھائے جو اس کی برداشت سے بھی باہر تھے۔ اسے چکر سا آیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ وقت پر بجنے والی فون کی گھنٹی نے اسے بے ہوش نہیں ہونے دیا۔ وہ چلائی۔ ''ہیلو... کیا ہوا ناصر؟''

''وہی جس کا ڈر تھا۔''

''صاف صاف کہو... مجھے وحشت زدہ کیوں کر رہے ہو۔''

''تم نہ سن سکو گی اور نہ دیکھ پاؤ گی۔ ورنہ میں تمہیں ایم ایم ایس کر دیتا۔ اب وہ دس کروڑ پر اڑ گئے ہیں۔''

صدا نے چیخ کے کہا۔ ''کیا مطلب... پہلے تم کم کرانے میں لگے ہوئے تھے... کیوں ناصر... اپنے بیٹے کی اذیت کے مقابلے میں تمہیں پیسا زیادہ عزیز ہے... بولو... پہلے کتنے مانگ رہے تھے وہ؟''

''پچیس کروڑ... میں نے دس کروڑ پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ اب ان پر ہے کہ کب اور کہاں لیتے ہیں۔''

''پچیس کروڑ میں دوں گی ناصر...''

''اب بات ہو چکی نا... حوصلے سے انتظار کرو۔ وہ پیشہ ور مجرم ہیں۔ اتنی آسانی سے یقین نہیں کریں گے اور رقم وصول کرنے سے پہلے اپنی حفاظت کو یقینی بنائیں گے۔ حوصلے کے ساتھ انتظار کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''

''ناصر! میں تمہاری طرف آ رہی ہوں... ابھی۔''

''یہی بہتر ہے لیکن اپنے ساتھ اور کسی کو مت لانا۔ ڈرائیور، سیکیورٹی گارڈ... اگر ممکن ہو تو ٹیکسی میں آ جاؤ۔''

صدا نے فوری طور پر اسے اپنے ارادے اور فیصلے سے مطلع نہیں کیا۔ اس کی ہدایات کے مطابق ایک گھنٹے بعد صدا نے ٹیکسی کو ناصر کے گھر سے سو گز کے فاصلے پر چھوڑ دیا۔ وہ اس وقت برقع میں تھی اور اس کے پاس ایک ہینڈ بیگ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ رات کے وقت سائڈ اسٹریٹ سنسان پڑی تھی۔ اس نے ٹیکسی سے اتر کے ایک گھر کے دروازے پر لگی ہوئی نیم پلیٹ اور نمبر کو دیکھا۔ وہ ٹیکسی کے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس علاقے میں ٹیکسی کا آنا معمول کی بات نہیں تھی۔ یہاں اس جیسی برقع پوش بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ سامنے سے آنے والی ایک کار کی ہیڈ لائٹس سیدھی اس پر پڑی مگر صدا کو پہچانے جانے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ٹیکسی کے نکل جانے کے بعد اس نے سیدھا چلنا شروع کیا۔ ایک قصرِ عالی شان کے گارڈ نے اس کو عورت کی بے وقوفی سمجھا کہ وہ ٹیکسی سے اتر کر باقی فاصلہ پیدل طے کر رہی تھی۔

ناصر کا یہ گھر یہاں کے چھوٹے گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ سابق مالکان نے چار کنال زمین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو گھر بنائے تھے۔ اس کے کال بیل دبانے پر کہیں اندر جیسے چڑیاں بولنے لگیں پھر باہر کی لائٹ جلی اور کسی ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس کے مزاحم ہونے کے باوجود وہ اندر گھستی چلی گئی۔ ناصر کی کار پورچ میں کھڑی تھی اور اب تک وہی تھی جو آج سے کئی سال قبل تھی۔

''ناصر صاحب سے ملنا ہے مجھے... تم جانتے نہیں؟''

صدا نے پلٹ کر دیکھے بغیر کچھ حیران ملازم سے کہا۔

اس کی آواز پر ناصر آیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

''یہ نیا ملازم ہے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ تم صدا ہو تو ابھی تمہارے قدموں میں دل ڈال دے۔''

وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''تم پی رہے تھے؟'' اس نے میز پر

رکھے جام اور شراب کو دیکھا۔
"ہاں پی رہا ہوں جب سکون کہیں نہیں ملتا۔ سکون ملتا ہے تمہاری بانہوں میں... یا شراب میں۔" وہ ہنسا۔
"بہت زیادہ پی لی ہے تم نے۔"
"ہاں، غم بھی تو بہت زیادہ تھا۔"
"اب میں آگئی ہوں ناصر! میں اور نہیں پینے دوں گی تمہیں۔"
"جب تم چلی جاؤ گی؟"
"میں جانے کے لیے نہیں آئی ناصر۔" صدا نے بڑے یقین کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔
وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ "سچ صدا! تم سچ کہہ رہی ہو... مجھے یقین نہیں آتا۔ ہم شادی کرلیں دوبارہ... کیا یہ ہوسکتا ہے؟"
"ہاں، جیسے میرے بعد تم نے ایک شادی کرکے دیکھ لیا۔ میں نے بھی کی تھی ایک شادی... پھر مجھے بھی احساس ہوا کہ وہ ہم دونوں کی ایک ہی غلطی تھی۔ جب ہم نے ایک دوسرے کو چھوڑا تھا۔ دیکھو آج ہم پھر اکیلے ہیں اور ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔"
ناصر اس کو دیوانہ وار چومنے لگا۔ "اب ایسا نہیں ہوگا صدا... ہم مرتے دم تک ساتھ رہیں گے۔ مرنے کے بعد بھی ساتھ رہیں گے۔" وہ نشے اور جذبات میں اس کی گود میں سر رکھ کے رونے لگا۔
رات کو کسی وقت فون کی گھنٹی نے صدا کو اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ رات ڈھائی بجے ان کے سوا یہ نمبر کون استعمال کرسکتا ہے۔ "ہیلو!" اس نے کہا۔
ناصر نے اٹھ کے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "لاؤ مجھے بات کرنے دو۔"
صدا نے خود کو دور کرلیا۔ "یہ بیٹے کی محبت تھی یا اس کے باپ کی جو تمہیں یہاں لے آئی... مس صدا۔"
صدا چلائی۔ "میری بات سنو... تمہیں جتنا پیسا چاہیے مجھ سے لو... میرا ابوبی مجھے دے دو... تم دس کروڑ نہیں پچیس کروڑ لے لو۔"
"ہم بات پر قائم رہنے والے لوگ ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم دونوں وعدہ خلافی تو نہیں کرتے... اگر تم نے کسی سے بات کی..."
"نہیں، ہم نے کسی کو نہیں بتایا اور بتائیں گے بھی نہیں..."
"پھر ہم بھی نہیں بتائیں گے کہ صدا کہاں ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "پریس والے بھی تو پولیس سے کم نہیں ہوتے... وہ فوراً پہنچ جائیں گے۔" فون بند ہوگیا۔
صدا چلاتی رہ گئی۔ "دیکھو، بوبی سے میری بات کرادو..." مگر فون بند ہوگیا تھا۔ وہ سسکیاں لینے لگی۔
ناصر نے اس کو سمیٹ لیا۔ "حوصلہ تو رکھنا پڑے گا جان... چند دن کی بات ہے پھر بوبی آجائے گا۔"
"چند دن کیوں؟ کل کیوں نہیں... تم نے تو کہا تھا کہ وہ اس پر تشدد کررہے ہیں۔" وہ چلانے لگی۔
"یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے صدا... یہ آزمائش ہے ہماری۔"
"مجھے وہ ویڈیو دکھاؤ۔"
ناصر نے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ میں نہیں کرسکتا... کسی صورت نہیں کرسکتا... کوئی فائدہ نہیں اس کا... تم سے برداشت نہیں ہوگا۔"
"میں نے اپنے دل کو سخت کرلیا ہے۔ تم دکھاؤ مجھے۔"
ناصر اپنی بات پر اڑا رہا۔ "میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہوجائے گا۔"
"مجھے چھوڑو میں خود دیکھ لوں گی۔" صدا نے اس کا فون اٹھالیا مگر کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہوسکی۔
"وہ دوسرا فون تھا صدا۔" ناصر نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ "چھوڑو اب سوجاؤ۔"
صبح وہ واش روم میں تھی جب اس نے ناصر کو کسی سے باتیں کرتے سنا۔ وہ جلد از جلد باہر آگئی۔ ناصر ناشتے کی میز پر کسی سے فون پر بات کررہا تھا۔ "کل تم کہہ رہے تھے کہ ہم بات پر قائم رہنے والے لوگ ہیں۔ پھر؟ اب کیا ہوگیا... صدا اس کی ماں ضرور ہے مگر بیوی نہیں ہے میری... وہ جذباتی ہوگئی تھی۔ بے وقوف عورت ہے۔ تم نے مجھ سے دس کروڑ میں سودا کیا تھا۔ میں تمہیں دس کروڑ سے ایک پیسا زیادہ نہیں دوں گا۔ میرے پاس پچیس کروڑ نہیں ہیں۔" اس نے دہاڑ کے کہا۔
صدا نے موبائل فون اس سے چھین لیا۔ "ہیلو... مجھ سے بات کرو۔ میں دوں گی تمہیں پچیس کروڑ۔" لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔ وہ ناصر پر چیخنے لگی۔ "تم ذلیل گھٹیا آدمی... پیسے کے لیے تم میرے بیٹے کی زندگی سے کھیل رہے ہو؟"
"وہ میرا بھی بیٹا ہے۔" ناصر دہاڑا۔
"ہوس کرتے ہو تم۔ تمہارا بیٹا ہوتا تو تمہیں پیسے

بچانے کی فکر نہ ہوتی۔ یہ نہ کہتے تم کہ میرے پاس پچیس کروڑ نہیں ہیں۔"
ناصر کا سر جھک گیا۔ "یہ غلط نہیں کہا تھا میں نے صدا... میرے پاس تو دس کروڑ بھی نہیں ہیں۔"
صدا اس کے قریب والی کرسی پر گر گئی۔ "میں سب دے دوں گی... میں نے تو کہا تھا تم سے۔"
"سچ تو یہ ہے صدا... اس روز تمہارے پاس آنے کا میرا مقصد بھی یہی تھا۔ مجھے شرم آئی تم سے مانگتے ہوئے۔ اب یہ میں کس منہ سے کہتا کہ بوبی کو میں اپنا بیٹا مانتا ہوں۔ لیکن اس کی زندگی کی قیمت تم دو... کس منہ سے کہتا میں یہ بات اور کس بھروسے پر۔ لیکن حقیقت یہی ہے صدا... میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرا کاروبار تباہ ہوچکا ہے۔ تباہ کیا ہونا... ابھی تک میں سیٹ نہیں ہوسکا۔ بہت کام کیے میں نے مگر صرف نقصان اٹھایا۔ جب فائدہ ہوا تو قرض خواہ لے گئے۔ یہ گھر ہے اور وہ جگہ جہاں میرا پروڈکشن ہاؤس تھا۔ اس پر بھی دو کروڑ کا قرضہ مل سکتا ہے گھڑے گھڑے۔ میری آمدنی اتنی کم بھی نہیں۔ دس لاکھ ہوجاتی ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے آج کل... آدمی کو سنبھالنے والا کوئی نہیں... مجھے سنبھالنے والا کوئی نہیں۔"
وہ میز پر سر رکھ کے ہچکیوں سے رونے لگا۔
ناشتے کے بعد جب وہ ایک جذباتی بحران سے گزر چکے تھے اور ان کے پاس انتظار کے سوا کرنے کو کچھ بھی نہ تھا، صدا نے کہا۔ "مجھے واقعی اندازہ نہ تھا کہ تمہارے کاروباری معاملات ٹھیک نہیں۔"
"ہوتا بھی کیسے... ہمارے درمیان تعلق ہی نہیں تھا۔" اس نے ایک آہ بھری۔ "حقیقت یہ ہے کہ تقدیر ہی ہم سے روٹھ گئی تھی۔ تقدیر مہربان تھی تو میں مٹی میں ہاتھ ڈالتا تھا اور وہ سونا بن جاتی تھی۔ اسی خوش بختی کے زمانے میں تم بھی مجھے ملی تھیں... لیکن پھر سب کچھ الٹ گیا۔ کیسی فضول تھی وہ بات جسے میں نے تنازع کی بنیاد بنالیا۔ وہ خود کو ہیرو کہنے والا ایک محفل میں ملا تو بہت پیے ہوئے تھا۔ نشے میں آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ میرے سامنے آیا تو ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا۔ کہنے لگا۔ "ہاں! میں نے تمہارا گھر توڑا... جھوٹ بولا تھا میں نے... بکواس کی تھی تمہاری بیوی کے خلاف... اس نے سب کے سامنے میری عزت دو کوڑی کی کردی تھی... بدلہ لینے کے لیے میں نے اس کو بدنام کیا... ایسے الزامات لگائے اس پر جن کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ تو مجھ سے کبھی اکیلے میں نہیں ملی... بہت برداشت کیا اس نے میری بدتمیزی کو... میں سمجھتا تھا کہ مجھ سے بڑا لیڈی کلر کون ہے... صدا کیسے انکار کرسکتی ہے مجھے۔"
"یہ اس نے خود کہا؟" صدا پلک جھپکائے بغیر تکتی رہی۔
"میں نے کہا نا... وہ ہوش میں نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کر اچانک اسے اپنی کمینگی یاد آگئی اور اس نے سب کے سامنے اس کا اعتراف بھی کرلیا لیکن کیا فائدہ۔"
"یہ کب کی بات ہے ناصر... اور کہاں ملا تھا وہ تم سے... اس کی یہ بات اخبار والوں نے نہیں اچھالی؟"
"وہ ایک پرائیویٹ محفل تھی۔ اخبار والوں کا داخلہ وہاں ممنوع تھا۔" ناصر نے کہا۔ "میرا دل چاہا اس حرام زادے کو وہیں گلا گھونٹ کے ماردوں... میری زندگی برباد کرکے اب اعتراف جرم کررہا ہے جب میں کچھ نہیں کرسکتا۔ احساس مجھے پہلے بھی تھا کہ میں نے جلد بازی کی۔ میرا دماغ خراب ہوگیا تھا کہ میں شک کا شکار رہا... لیکن بدبختی آدمی کو ایسے ہی گھیرتی ہے... شیطان تو بدنام ہے، آدمی کی اپنی عقل ماری جاتی ہے۔ تمہارا ملنا قدرت کا انعام تھا۔ جب میں نے اسے ٹھکرایا تو کفرانِ نعمت تھا۔ خدا نے سزا دی ہے۔ پھر ایک پاگل عورت میرے گلے پڑ گئی۔"
"تم آج ایسا کہہ رہے ہو... جب اس سے شادی کی تھی تو تم نے اس میں خوبیاں ہی خوبیاں دیکھی ہوں گی۔ کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا تمہیں... جو کیا تھا اپنی مرضی سے کیا تھا۔"
"تمہاری خفگی جائز ہے۔ میری عقل پر واقعی پتھر پڑ گئے تھے۔ اس کے بعد سب الٹا ہوتا رہا۔ دو سال میں اس عورت نے بھی میری زندگی اجیرن کی مگر خود میں نے بہت غلط کاروباری فیصلے کیے۔ میں وہی تھا... میری عقل... میرا تجربہ... میرے کاروباری تعلقات... سب وہی تھے مگر کچھ بھی ٹھیک نہیں ہورہا تھا۔ ایک عذاب سے تو میں نے جان چھڑالی، اس عورت سے... لیکن بدقسمتی کے اس گرداب سے نہ نکل سکا۔ تم اور میں بھی ایک ساتھ بوبی کے پاس گئے تو میری انا آڑے آگئی۔ میں جانتا تھا کہ مجھ سے الگ ہوکے تمہاری عزت، شہرت، دولت سب میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے اور یہ بات بھی مجھے حسد اور جلن میں مبتلا کرتی تھی۔ میں تمہارے سامنے اپنی ناکامی، بدبختی یا غلطی کا اعتراف کیسے کرلیتا؟ میری مردانہ انا کے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا۔ صرف یہ تاثر دینے کے لیے کہ میں تم سے الگ ہوکے زیادہ خوش، کامیاب اور خوش حال ہوں... میں جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہا۔"
"ہمارا سارا وقت تو تلخ ترش باتوں میں گزرتا تھا۔"

"بس اچھی بات یہ رہی کہ بوبی کے سامنے ہم ایک رہے۔ ہم نے اسے کچھ پتا نہیں چلنے دیا۔ کتنی بار وہ میرے گھر آیا تو تم بھی وہاں تھیں۔ دو بار میں تمہارے ساتھ باہر بھی گیا۔ اسے نہیں معلوم کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں رہا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ٹی وی پر اتنی حسین نظر آنے والی ماڈل ایکٹریس صدا ہی اس کی ماں ہے۔"

"اسے دکھ ہوگا یہ جان کر... کہ ہم اس سے جھوٹ بولتے رہے... اسے دھوکا دیتے رہے۔"

"وہ بڑا ہو کے ہماری پوزیشن کو سمجھ لے گا لیکن صدا... یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اسے حقیقت کا کبھی علم نہ ہو... اگر ہم اور تم پھر ایک ہو جائیں۔ تم نے کہا تھا نا... کیا تم واقعی ایسا چاہتی ہو؟"

"ہاں لیکن ناصر! یہ آسان نہیں ہوگا میرے لیے... شوبزنس کی شادیاں خاموشی سے نہیں ہوتیں۔"

"لیکن تمہاری دوسری شادی کا پتا کسی کو نہیں چلا تھا۔"

"وہ لندن میں ہوئی تھی۔ وہ بی بی سی میں تھا۔ ایک بہت پڑھا لکھا آدمی... اس نے میرا انٹرویو لیا تھا۔ دو چار بار ملا۔ میں دوسری بار گئی تو ہم نے شادی کرلی مگر وہ اس کی پبلسٹی نہیں چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ کسی کو پتا چلتا... وہ مر گیا... اس نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ جگر کے کینسر میں مبتلا ہے۔ صرف پچیس سال عمر تھی اس کی۔ یہ شادی صرف ریکارڈ پر ہے اور اس کی بیوہ کی حیثیت سے میں برطانوی شہری ہوں۔ اس کا ایک فلیٹ بھی مجھے ملا تھا لیکن اب میں نے یوٹرن لینے کا فیصلہ کرلیا ہے ناصر... ہاں، میں پھر صدیقہ خاتون بن جاؤں گی... راتوں رات... ایک صبح آئے گی جب صدا کا وجود کہیں نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے میں اپنے تمام پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز کو بتادوں گی کہ میں نے شوبزنس کی دنیا چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ان کے پروجیکٹس پورے ہوتے ہی میں چلی جاؤں گی۔ کہاں؟ یہ بتانا ابھی میرے لیے ممکن نہیں۔ آپ جتنی قیاس آرائیاں کرنا چاہیں کریں۔ کوئی کچھ نہیں جان سکتا کہ میں نے اپنے مستقبل کے لیے کیا سوچا ہے... مگر یہ سو فیصد درست ہے کہ اس کا شوبز کی دنیا سے دور کا بھی تعلق نہیں۔"

"یہ سوال بھی ضرور کیا جائے گا کہ کیا آپ تیسری شادی کررہی ہیں؟"

"اس کا آسان جواب ہے۔ نو کمنٹس... آپ جو چاہیں فرض کرتے رہیں اور میرے مستقبل کے شریک سفر کی تلاش میں اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو لگا دیں۔" صدا مسکرائی۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"تم روپوش کیسے ہوسکتی ہو؟"

"یہ تم دیکھو گے... کسی کا دھیان تمہاری طرف نہیں جاسکتا کہ صدا لوٹ کے اپنے پہلے شوہر کے پاس چلی گئی ہے اور صدیقہ خاتون نے صادقہ ناصر بن کے خود کو گھر کے اندر تک محدود کرلیا ہے۔ ہم گھر اور شہر کیا، ملک چھوڑ کے بھی جاسکتے ہیں۔ کراچی میں گم ہوسکتے ہیں یا لندن میں رہ سکتے ہیں... یہ مشکل ہے ناممکن نہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ کبھی نہ کسی کو میرے تمہارے کسی رابطے کا پتا چلے... اور نہ بوبی والے معاملے کا... جب میرے معاملات سمٹ جائیں گے تو میں راتوں رات غائب ہو جاؤں گی۔"

"بعد میں اگر کبھی بوبی کو پتا چلا کہ اس کی ماں ہی صدا تھی؟"

"ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی صورت تمہاری ماں سے کافی ملتی ہے... ہم مل کے اور جھوٹ سوچ لیں گے۔"

دوپہر سے پہلے جب وہ اپنے اپنے اثاثوں کی تفصیلات مرتب کررہے تھے اور یہ حساب لگا رہے تھے کہ وہ کتنا نقد جمع کرسکتے ہیں اور کہاں سے... بوبی کو اغوا کرنے والوں نے پھر فون کیا۔ "کیا تم نے پچیس کروڑ کا بندوبست کرلیا ہے؟" فون کے اسپیکر سے آواز آئی۔

"دیکھو... یہ شرافت نہیں ہے... تم نے مجھ سے دس کروڑ میں بات کی تھی۔"

"لیکن اس کی ماں پچیس کروڑ دینے پر راضی ہے۔"

"کون ہے اس کی ماں؟ میری بیوی۔" ناصر نے برہمی سے کہا۔ "جب میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کرسکتا تو وہ کہاں سے لائے گی... تم سب جانتے ہو میری مالی حیثیت کیا ہے۔"

"ہم انکم ٹیکس والے نہیں ہیں کہ تم اثاثے بیوی کے نام پر رکھ کے دھوکا دے سکو۔ یہ آفر اس نے خود کی تھی۔ ہمارے ساتھ یہ گیم مت کھیلو... اس کا نقصان بوبی کو ہوگا۔" اس شخص نے خطرناک دھمکی دی۔

صدا چلائی۔ "خدا کے لیے بوبی کو بخش دو۔ میں دوں گی تمہیں پچیس کروڑ۔"

"سنو... کیا کہہ رہی ہے۔"

"وہ ہوش میں نہیں ہے۔ صدمے نے اسے پاگل کردیا ہے... میں شوہر ہوں اس کا۔"

صدا نے ناصر سے فون چھیننے کی کوشش کی۔ "یہ جھوٹ ہے" ناصر نے اسے دھکا دیا تو وہ پیچھے جا گری۔ اس کے اٹھ کر سنبھلنے تک کال کٹ گئی تھی۔ "صدا! ان مجرموں سے مجھے نمٹنے دو۔ یہ کوئی فلمی سچوئیشن نہیں کہ تم ان سے سوال جواب کرسکو۔ میں جانتا ہوں ان سے کیسے ڈیل کرنا چاہیے۔"

"یہ سودے بازی بوبی کی جان لے لے گی ناصر۔" صدا رونے لگی۔

"نہیں... ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ ساری قیمت بوبی کی جان کی ہے۔ اسے وہ کیسے مار سکتے ہیں؟ وہ دس پونڈ یا دس لاکھ میں بھی بوبی کو نہ خریدتے لیکن اس کے نام پر انہیں ہم سے دس کروڑ مل رہے تھے۔ وہ ایک کروڑ پر بھی آجاتے... ایک کروڑ کم نہیں ہوتے لیکن میں مجبور ہوں تمہاری وجہ سے... تمہیں جلدی ہے... یہ ذرا صبر اور حوصلے کا سودا ہے... دس کروڑ کی جگہ خود انہیں پچیس پیش کرنے میں کون سی عقل مندی ہے؟ میں تمہارا نقصان نہیں چاہتا۔"

وہ چلائی۔ "نقصان... تم نفع نقصان کا حساب لگا رہے ہو؟ ایک ماں سے پوچھو اس کے بچے کی قیمت... کتنے پتھر دل ہو تم کہ اس وقت بھی بزنس کررہے ہو... میں مر جاؤں گی ناصر اگر بوبی کو کچھ ہوا... پھر تمہیں مار دوں گی اور خود کو بھی۔"

"او کے... او کے... اگر تمہیں اپنا سب کچھ لٹانا ہے تو مجھے کیا... اب فون آئے تو تم بات کرلینا... دے دینا انہیں پچیس کروڑ... لیکن ذرا مجھے یہ سمجھا دو کہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست تم کیسے کروگی؟" ناصر نے اس کے آنسو پونچھے۔

ایک طویل اعصاب شکن دن کا ہر منٹ صدا کے لیے آزمائش کی ایک گھڑی جیسا تھا۔ اس کے اور ناصر کے درمیان جذبات کے فرق کی ایک خلیج حائل ہوگئی تھی۔ وہ بوبی کے لیے اپنا سب کچھ دے دینے پر تیار تھی۔ چاہتی تھی کہ انتظار کے وقت کا ہر لمحہ خرید لے۔ بوبی کو جلد از جلد ان بے رحم قاتلوں کے پنجے سے چھڑا کے اپنی ممتا کی آغوش میں محفوظ کرلے۔ اسے ناصر کے رویے میں بڑی سفاکی محسوس ہوتی تھی کہ وہ اغواکاروں کے ساتھ ایک اعصابی مقابلے کو طول دے کر اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔ وہ صدا کے پندرہ کروڑ بچانا چاہتا تھا۔ آخر کیوں۔ اس لیے کہ اب یہ پندرہ کروڑ اسے اپنے لگتے تھے۔ یہ اس کے کام آسکتے تھے۔ دوبارہ شادی کے جذباتی فیصلے پر لالچ غالب آرہا تھا لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ پچیس کروڑ وہ بوبی کی زندگی کے لیے نچھاور کردے گی لیکن ناصر کے مستقبل کی خوش حالی کے لیے ایک کروڑ بھی نہیں دے گی۔

ان کے درمیان بات چیت عملاً بند تھی۔ ناصر نے اس سے کھانے کے لیے پوچھا تھا۔ اس نے انکار کردیا۔ وہ خود تمام دن بھوکی رہی اور کافی پیتی رہی۔ اعصابی دباؤ اب اس کی قوتِ برداشت کو ختم کرچکا تھا اور وہ کسی لکڑی کے تنے کی طرح رہ گئی تھی جس کو اندر سے دیمک نے کھوکھلا کردیا ہو۔ تھکان اور جسمانی کمزوری سے اس کو چکر آرہے تھے۔ شام ہوتے ہی وہ اٹھنے کی کوشش میں چکرا کے گری اور بے ہوش ہوگئی۔ جب اس نے غنودگی میں دیکھا تو وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور ایک ڈاکٹر اس کا معائنہ کررہا تھا۔ اس نے وقت دیکھنا چاہا تو دیوار پر لگی گھڑی اسے دھندلی سی دکھائی دی جس کے چہرے پر نہ حروف تھے نہ ایک دوسرے کا تعاقب کرنے والی سوئیاں۔

ہوش کے دوسرے وقفے میں اس نے خاصا بہتر محسوس کیا۔ اس کے سوال پر ناصر نے رکھائی سے کہا۔ ”اگر تم نے خودکشی کا فیصلہ ہی کرلیا ہے تو یوبی کے بارے میں مت پوچھو۔ تم کیسے بچاؤ گی اسے جب خود مر جاؤ گی۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ”میں کیا کروں ناصر؟“

”جو تمہارا جی چاہے کرو... مرنے سے پہلے پچیس کروڑ کا انتظام کرجاؤ گی تو یوبی بچ جائے گا۔ ورنہ تمہیں کیا۔“

”آئی ایم سوری... میں وہ کروں گی جو تم کہو گے۔“ صدا نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

رات بھر میں صدا کی حالت بہت سنبھل گئی۔ اس کی سمجھ میں ناصر کی بات آگئی تھی۔ یوبی کو بچانے کے لیے خود اس کا عقل اور ہمت سے کام لینا ضروری تھا۔ اس نے رات کو دوا بھی لی اور کھانا بھی کھایا۔ دوا میں شاید خواب آور گولیاں بھی شامل تھیں۔ وہ ساری رات بے ہوشی کی نیند لے کر اٹھی تو بالکل نارمل محسوس کررہی تھی۔ ناصر سے اسے معلوم ہوا کہ درمیان میں دو راتیں گزر گئی ہیں۔ یوبی کو اغوا کرنے والوں نے انہیں نوٹس دے دیا تھا کہ اگلے تین دن میں وہ پوری رقم کا انتظام کرلیں۔ وصول کرنے کی جگہ اور وقت کے بارے میں وہ بعد میں بتائیں گے۔

”اب بات پچیس کروڑ پر ٹھہر گئی ہے۔“ ناصر نے بے بسی سے کہا۔

”تم نے یوبی سے بات کی؟ وہ کیسا ہے؟“

ناصر نے کچھ دیر سوچ کے کہا۔ ”زندہ ہے... میرا مطلب ہے وہ خوش تو نہیں ہوسکتا... اب اسے اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ قید میں ہے اور اس کی ضد یا چیخ پکار نہیں چلے گی۔“

صدا تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔ ”کیا انہوں نے تشدد کیا ہے اس پر؟“

”صدا! یہ سب ہوتا ہے۔ دباؤ بڑھانے کے لیے انہوں نے مجھے تین ایم ایم ایس بھیجے۔ میں نے سب دیکھا اور سنا... لیکن تمہیں نہیں دکھا سکتا... تمہارا ہارٹ فیل ہو جائے گا اس لیے ضد نہ کرنا... میں مجبور ہوں۔“

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شاید تم ٹھیک کہتے ہو... میرا دل پھٹ جائے گا۔ اب ان سے بات ہو تو کہنا کہ وقت اور جگہ بتادیں۔“

ناصر نے سر ہلایا۔ ”اس کے لیے پہلے ہم بھی تیار ہوں۔ اگر انہوں نے نقد مانگے پھر... میں نے بات تو کی ہے کچھ لوگوں سے لیکن اپنی بساط کے مطابق۔“

دوپہر تک ناصر نے سارا حساب کتاب کیا۔ ”کوئی بینک اتنی بڑی نقد رقم فراہم نہیں کرسکتا۔ یہ انٹرنیشنل سطح کے کرنسی ڈیلر کرسکتے ہیں۔ گارنٹی پر... اِدھر اُدھر کے چور دروازوں سے بینک انہیں رقم فراہم کرے گا... لون کی صورت میں... تھرڈ پارٹی ڈیل سے... ذمے داری تمہاری ہوگی اور سب تمہارے اثاثوں کی بنیاد پر ہوگا۔ بینک یہ کہتا ہے پراپرٹی کیا ہے... جیولری اور دوسرے اثاثے مثلاً لندن کا فلیٹ۔“

صدا گھبرا گئی۔ ”کیسے ہوگا یہ سب کچھ... مجھے تو کچھ پتا نہیں۔“

”وہ میں کرلوں گا۔ اس کے لیے تمہیں سب سے پہلے اپنے بینک کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ بتانا پڑے گا کہ تمہاری مجبوری کیا ہے۔ بینک باقی سب خود کرلے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دو چار کروڑ تم سے اپنی خدمات کا وصول کرلے۔ ایسے تمام... معاملات طے کیے بغیر اتنی بڑی کیش کی ٹرانزکشن ممکن ہی نہیں۔ رقم ہمیں مل جائے گی اور ہم ان تک پہنچادیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ پاکستانی کرنسی نہ لیں۔ ڈالر، پاؤنڈ یا یورو طلب کریں اور دبئی میں مانگیں۔“

”دبئی میں... ہم اتنی بڑی رقم کیسے لے جائیں گے؟“

ناصر ہنسنے لگا۔ ”رقم ٹرانسفر ہوگی۔ میرا بھی ایک اکاؤنٹ ہے وہاں۔ کاروبار اچھا تھا تو آپریٹ بھی ہوتا تھا۔ اب ذرا مجھے تفصیلات دو کہ اندازاً تمہارے پاس نقد کتنا ہوگا؟ جیولری کی صورت میں کتنا؟ شیئرز اور بونڈز کی صورت میں کتنا... میں اپنا حساب تو لگا چکا ہوں۔ میں تقریباً تین کروڑ کا بندوبست کرلوں گا۔ تمہیں یقیناً مایوسی ہوگی کہ باپ کی حیثیت سے میرا حصہ کچھ نہیں۔ جس رات تم نے مجھ سے پھر شادی کا کہا تھا... میں نے سوچا تھا کہ تمہیں بتادوں... تمہارے مقابلے میں میری مالی حیثیت کیا ہے۔“

”اب اسے چھوڑو۔“ صدا نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”دو دن سے میں بنا بتائے غائب ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ معاملہ پولیس تک پہنچ جائے۔ ماما کو پتا تھا، وہ ایسا نہیں ہونے دے گی لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ اپنی سیکریٹری سے بھی بات کرلوں۔ فی الحال وہ علالت کی بات کرے۔ یوبی آجائے پھر میں اپنے یوٹرن کا پلان بھی فائنل کروں گی۔ دو تین مہینے تو لگ جائیں گے مجھے اپنا کام ختم کرنے میں... نیا کنٹریکٹ میں نہیں لوں گی... یہ بھی ایک مرحلہ ہوگا۔“

ملازمہ نے اندر آکے کہا۔ ”صاحب جی! کھانا ٹیبل پر کھائیں گے یا یہیں لے آؤں؟“

”یہیں لے آؤ۔“ ناصر نے کہا۔

”ناصر! تمہاری یہ ملازمہ تو بہت پرانی ہے۔ مجھے جانتی ہے۔ یہ کسی سے بات تو نہیں کرے گی؟“

”میں نے اسے سختی سے منع کردیا ہے۔ ڈرائیور نیا ہے۔“

”وہ جس نے دروازہ کھولا تھا پرسوں۔ یاد نہیں آتا میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا تھا۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

☆☆☆

ناصر نے کیش کی فراہمی کے سارے پیچیدہ معاملات حیرت انگیز مہارت اور مستعدی کے ساتھ سنبھالے تھے۔ اس کے پاس ایونٹ مینجمنٹ اور پروڈکشن ہاؤس کے علاوہ بھی ہر قسم کے کاروبار کا عملی تجربہ تھا اور وہ پاکستان سے دبئی تک انڈر ورلڈ کے تمام کاروباری امور کو سمجھتا تھا۔ اس کے مقابلے میں صدا صرف ایک کٹھ پتلی تھی جو دوسروں کے اشاروں پر چلتی آئی تھی۔ اسے کب کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، کب ہنسنا اور کب رونا ہے... کب کہاں کس کو جسمانی تحویل میں دینا ہے اور اپنے وقت کا یا جسم کا سودا کس بھاؤ پر کرنا ہے۔ یہ سب ہمیشہ اسے دوسروں نے سمجھایا تھا۔ جاگتے میں تو اس کا کچھ بھی اپنا نہیں تھا۔ پروڈیوسرز ڈائریکٹرز ہی نہیں اس کے نام نہاد پرستار بھی اسے بتاتے تھے کہ وہ کیسی نظر آئے... کتنی نظر آئے... وہ اس کی مسکراہٹ اور ادائے حسن کو قبولیت کی سند نہ دیتے تو وہ ٹھوکریں کھا کے کب کی قعرِ گمنامی میں کھو چکی ہوتی۔ نیند میں بھی اس کے خواب اپنے نہ تھے۔ جو بھیانک خواب وہ دیکھ رہی تھی، اسے دوسرے دکھا رہے تھے تاکہ اس کا استحصال کیا جاسکے۔ اسے استعمال کیا جاسکے۔

اس کی ذات پریشانی اور آزار کے مختلف حصوں میں بٹے ہوئے وقت کا نام تھا۔ نہ جانے وہ کتنی بار ایسے ہی گھبرا کے اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے کانپتے وجود پر ٹھنڈا پسینا بہتا رہتا تھا۔ پانی پی کر وہ خدا کا شکر بجا لاتی تھی کہ یہ صرف ایک خواب ہی تھا۔ ابھی ابھی ایک خنجر بکف قاتل نے پھر اسے قتل کرنا چاہا تھا۔ پہلے بھی کئی بار وہ اس پر حملہ آور ہوچکا تھا۔ وہ جیسے اندھیرے میں سے لپکتا ہوا آتا تھا۔ وہ بروقت جاگ جاتی تھی۔ آج تک پولیس اس کا سراغ نہیں لگا پائی تھی۔ انہوں نے صدا کے گھر میں تفتیش کی رسمی کارروائی پوری کی تھی۔ صدا کے دو چار پرستاروں میں بااثر لوگ بھی تھے۔ انہوں نے اعلیٰ حکام پر دباؤ ڈالا تھا اور تفتیشی افسران کئی دن چکر لگاتے رہے تھے۔ حملہ آور اپنا خنجر چھوڑ گیا تھا۔ اس پر اور تجوری پر فنگر پرنٹس تھے لیکن اس سے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ انہوں نے تجوری کے لاک سے گھر کے سیکیورٹی سسٹم تک، سب کو اطمینان بخش قرار دیا تھا اور حیران کا اظہار کرتے رہے تھے کہ آخر اس کے بیڈروم کے اندر کوئی پہنچا کیسے اور پہنچا تو فرار کیسے ہوگیا... سیکیورٹی کمپنی اور گارڈز کی شامت آئی تھی۔ صدا نے سب کو بدل دیا تھا۔

لیکن اس حملہ آور کا بھوت صدا کے خوابوں میں آکے اسے ڈرا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ناصر کو غیر موجود پایا۔ اس نے لائٹ آن کی۔ تکیے کے پیچھے سے ناصر کا موبائل فون جھانک رہا تھا۔ اس نے موبائل فون اٹھالیا۔ ایک اندرونی تجسس نے اسے پھر مجبور کردیا کہ وہ ناصر کے نام آنے والے ایس ایم ایس اور ایم ایم ایس دیکھے۔ پہلے دو بار وہ اپنی کوشش میں ناکام ہوچکی تھی۔ ہر موبائل فون کا نظام اسے چیلنج کرتا تھا۔ وہ ٹین ایجر نہیں تھی مگر اسے اچھے سے اچھا اور نیا موبائل فون رکھنے کا شوق تھا۔ پہلے ہر تیسرے مہینے وہ کسی نئے ماڈل کے اشتہار سے متاثر ہوکے اپنا فون بدل لیتی تھی اور پھر اس کے سسٹم کو سمجھنا صدا کے لیے کھیل بن جاتا تھا مگر اب سال بھر سے اس کا یہ شوق ماند پڑ گیا تھا۔ ناصر کے انتظار میں وہ خاموش بیٹھی فون کی ٹچ اسکرین کو اپنی انگلیوں سے سہلاتی رہی۔

اچانک فوٹو گیلری کی ایک تصویر اس کے سامنے ٹھہر گئی۔ تصویر میں ایک چہرہ یوبی کا تھا لیکن وہ دوسرے چہرے کو دیکھ کر چونکی۔ ایک نظر میں اجنبی نظر آنے والے کو صدا نے فوراً پہچان لیا اور اس کے پورے وجود میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس چہرے کو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ یہ صدا کو خوابوں میں دہشت زدہ کرنے والا وہی چہرہ تھا جس نے ایک رات اس کے بیڈروم میں پہنچ کے اس پر خنجر سے حملہ کیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھتی رہی۔ وہ یوبی کے سامنے بڑے جارحانہ انداز میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی تھی اور آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ تھپڑ مارنے کے انداز میں اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کے مقابل بہت چھوٹا، کمزور اور بے بس دکھائی دینے والا یوبی انتہائی سہما ہوا تھا۔ تصویر میں آنسو تو نظر نہیں آتے تھے مگر اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک تھی۔

صدا کا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا سینے کی دیواروں سے دیوانہ وار ٹکریں مار رہا ہے۔ یہ منظر بھی اس کا دیکھا ہوا تھا... مگر کہاں... پھر اسے یاد آگیا... یوبی کی یہ تصویر اسے ناصر نے دکھائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ اغوا کرنے والوں نے بھیجی ہے۔ وہ آدھے منٹ کی وڈیو تھی جس میں یوبی کسی باغیچے میں کھیل رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی مگر وہ

شخص وہاں کیسے موجود تھا اور بوبی کو کیوں مار رہا تھا؟ صدا کے خیالوں پر سوالوں کی یلغار تھی جن کا اس کے پاس جواب نہ تھا۔ اس نے باہر سے آہٹ سنی اور موبائل کو پھر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ وال کلاک میں رات کے سوا دو بجے تھے۔ ناصر اس وقت کہاں گیا ہے؟ اس نے بیڈ سے اٹھ کر دروازے کا رخ کیا۔ باہر کوئی آواز نہ تھی۔ اس نے آہستہ سے پکارا۔ ''ناصر!'' اور اسے اپنی آواز کی گونج رات کی خاموشی میں پکار جیسی لگی۔

واپس آکے اس نے دروازے کے لاک کا بٹن اندر سے دبایا اور پھر تکیے کے نیچے سے موبائل فون نکال لیا۔ اب وہ تصویروں تک پہنچ گئی تھی تو اس نے بٹن دبا دبا کے انہیں آگے بڑھایا۔ ہر تصویر ایک دہشت ناک تجربہ ثابت ہو رہی تھی لیکن اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کے اپنی چیخ کو دبا لیا۔ خوف سے رگوں میں اس کا لہو جمنے لگا تھا لیکن وہ ہوش کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ہر تصویر میں وہی گمنام اور مفرور قاتل تھا جو بوبی کو تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اسے بری طرح سے نوچ رہا تھا اور بوبی کا کھلا منہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ چیخ رہا ہے۔ دو تصویروں میں وہ بوبی کے نازک بدن پر جلتی سگریٹ لگا رہا تھا۔ بوبی کی اذیت کو محسوس کر کے وہ تڑپ اٹھی۔ بس... اس نے خود سے کہا۔ مجھے بے ہوش نہیں ہونا ہے۔

ناصر نے باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ کھٹکے پر وہ اچھل پڑی۔ فون پر ایک ویڈیو چل پڑی تھی۔ اس میں بوبی تڑپ رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ تصویروں سے اور اب ویڈیو سے اس نے جگہ کو شناخت کر لیا تھا۔ بس اسے عقل اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ ناصر نے باہر سے دروازے کو ہلایا اور دھڑ دھڑ اس پر ہاتھ مارے۔ صدا نے ایک دم موبائل کو بند کیا اور اسے پھر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ چند سیکنڈ اس نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پانے میں صرف کیے۔ ناصر نے باہر سے کہا۔ ''صدا... دروازہ اندر سے کیوں بند ہے؟''

وہ ایک ایکٹریس تھی۔ چہرے اور آواز میں جذبات اور تاثرات کو ایک دم بدل لینا اس کے لیے مشکل تھا، ناممکن نہیں۔ اس نے خواب آور لہجے میں کہا۔ ''کیا ہے... کون ہے یار؟''

ناصر نے پھر پکارا۔ ''صدا! دروازہ کھولو اندر سے۔''

صدا نے بلند آواز میں کہا۔ ''اوہ... کیا مصیبت ہے؟'' اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک جا کے لاک کھول دیا پھر وہ دیکھے بغیر پلٹی اور تکیے پر گر گئی۔

''صدا! دروازہ کیوں لاک کیا تھا اندر سے؟'' ناصر نے برہمی سے اس کا کندھا ہلایا۔

صدا نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ ''میں نے؟ تم کہاں گئے تھے اس وقت اٹھ کے؟''

''میری بات کا جواب دو۔''

''یار! خود تم سے بٹن دب گیا ہوگا دروازے کو بند کرتے وقت... ہو جاتا ہے کبھی... مجھ پر کیوں چلا رہے ہو؟''

ناصر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ صدا کو یقین تھا کہ اس نے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے موبائل فون کو نکال کے ضرور دیکھا ہوگا لیکن وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اپنے جسم کی لرزش... اپنی تیز سانسوں... اپنے وجود پر مسلط خوف اور اپنے اندیشوں کو ناصر سے چھپائے رکھنے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے وہ واقعی پہلے کی طرح گہری نیند میں ہے، صدا کو سخت جدوجہد کرنا پڑی۔ شاید یہ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی جس میں اس نے خود کو ایک کامیاب ایکٹریس ثابت کر دیا۔ خود کو قائل کر لیا کہ وہ ایکٹریس ہے، کٹھ پتلی نہیں جو صرف دوسروں کی انگلی کے اشارے پر سب کچھ کرتی ہے۔ یہ اداکاری کا ایسا مظاہرہ تھا جس پر وہ سب سے بڑے ایوارڈ کی مستحق ثابت ہوتی تھی۔

ناصر کو بالکل اندازہ نہ ہو سکا کہ صدا نے وہ سب پہلے ہی دیکھ لیا ہے جس کی شوٹنگ ہو چکی تھی۔

لیکن اداکاری کا اصل امتحان ابھی باقی تھا۔ کٹھ پتلی کو یہ ظاہر نہیں ہونے دینا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے بھی کچھ کر سکتی ہے۔

☆☆☆

اس نے ایک دل خراش چیخ ماری پھر دیوانہ وار اٹھ کے دیوار سے سر ٹکرا دیا۔ ''میں نہیں دیکھ سکتی یہ سب... مجھے مرنے دو۔''

ناصر نے اسے پکڑ کے بیڈ پر لٹا دیا۔ ''خدا کے لیے خود کو سنبھالو صدا۔''

صدا کی نظروں کے سامنے اندھیرا گہرا ہو گیا۔ سر کی چوٹ نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ جب اسے ہوش آیا تو ناصر اس پر پانی کے چھینٹے ڈال رہا تھا اور اس کے تلوے سہلا رہا تھا۔ ''یہ کیا دیوانگی ہے صدا... تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اسی لیے میں تمہیں ان کی بھیجی ہوئی تصویر نہیں دکھا رہا تھا۔''

صدا کراہی۔ ''مجھے زندہ نہیں رہنا۔ وہ بوبی کو مار ڈالیں گے... وہ بے رحم درندے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا صدا! اب تو بات ہو گئی ہے۔ پچیس کروڑ کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ آج کل میں تمہارا بوبی آجائے گا۔ یہ پرانی تصویریں تھیں۔ پرانی ویڈیوز تھیں۔ وہ ایسا کرتے ہیں تاکہ رقم کی بحفاظت وصولی یقینی ہو جائے۔''

گویا میں نے اپنی بے ساختہ اداکاری سے ناصر کو شک میں مبتلا ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ سمجھتا رہے کہ میں اس کے اشاروں پر چلنے والی کٹھ پتلی ہی ہوں۔ وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو چکا ہے۔ صدا نے اپنے رول کو سمجھ لیا تھا۔ اسے ایک ایسی ماں کا رول کرنا تھا جس کے اکلوتے بچے کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی اور اسے اپنا سب کچھ دے کر بھی بچے کو درندہ صفت قاتلوں سے رہائی دلانی تھی لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دینا تھی۔ اسے خود کو ایک کم عقل، جذبات کی دیوانگی میں مبتلا کمزور عورت کے رول کو کامیابی سے نبھانا تھا کہ کسی کو اداکاری کا شک ہی نہ ہو۔ صدا کا دل اب بہت مطمئن اور توانا تھا کیونکہ وہ اس کرائم اسٹوری کے پلاٹ کو اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ بوبی کو اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس سے پچیس کروڑ ہتھیانے والوں کو اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ پوری طرح ان کے چنگل میں تھی... جیسے کٹھ پتلی کسی بازی گر کی انگلیوں سے بندھی ڈوریوں میں۔

ناصر نے ایک مخلص دوست... محبت کرنے والے اور زندگی کے سفر میں صدا کے ساتھ پھر شریک ہونے والے اچھے ساتھی کی حیثیت سے صدا کی پوری غم گساری کی اور اس کی تیمارداری میں کمی نہ آنے دی۔ وہ معاملات کو بھی بڑی ہوشیاری سے سنبھالتا رہا اور سودا کرنے والوں سے جو بات کرتا رہا، صدا کو بتاتا رہا۔ بالآخر اس نے صدا کو خوش خبری دی۔ ''خدا نے چاہا تو آج رات تمہارا بوبی تمہیں مل جائے گا۔ سارے انتظامات ہو گئے ہیں اور تمہارا بوبی بالکل محفوظ ہے۔'' نادانستگی میں وہ بار بار ''تمہارا بوبی'' کہتا رہا۔

صدا ڈری سہمی سی بیٹھی رہی۔ ''ناصر... میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ ایسا نہ ہو، وہ بوبی کو دے کر تمہیں لے جائیں۔ میں اپنی حفاظت تو کر سکتا ہوں، تمہاری حفاظت کیسے کروں گا۔ تم بھی شوبزنس والوں کے لیے بڑی قیمتی چیز ہو۔''

''تمہارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کیا ہے؟'' اس نے پرخوف نظروں سے ناصر کو دیکھا۔

وہ عیاری سے مسکرایا۔ اٹھ کر بیڈ سائڈ ٹیبل تک گیا۔ ''یہ ہے میرا محافظ۔'' اس نے دراز میں سے ایک نیا ریوالور نکالا۔ ''اٹالین بریٹا... ایک اسمگلر سے بہت مہنگا خریدا تھا... تین لاکھ کا۔''

''یعنی اس کا لائسنس نہیں ہے تمہارے نام پر...''

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ پاکستان میں کتنا اسلحہ ہے لائسنس کے بغیر اور انتہائی خطرناک... اے کے فورٹی سیون! جسے عام طور پر کلاشنکوف کہا جاتا ہے، لائٹ مشین گن... راکٹ لانچر... یہاں تو لینڈ مائنز اور دستی بم تک مل جاتے ہیں اور اس کے مقابلے میں لائسنس والا اسلحہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔''

صدا نے معصومیت سے ہاتھ بڑھایا۔ ''ہونا تو میرے پاس بھی چاہیے۔ سنا ہے لیڈیز ماڈل کے ریوالور بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوڈڈ ہے؟''

ناصر نے ریوالور اسے تھما دیا۔ ''ڈرو نہیں... لوڈڈ تو ہے مگر یہ سیفٹی پن جب تک نہ ہٹائی جائے... فائر نہیں ہوتا۔''

صدا نے اسے الٹ پلٹ کے دیکھا اور واپس کر دیا۔ گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اس کی نظر نے اپنا ایکشن پلان بنا لیا تھا۔ ناصر جھک کر ریوالور کو واپس دراز میں رکھ رہا تھا جب صدا نے کارنر ٹیبل پر سے لمبی گردن والا پیتل کا صراحی جیسا گل دان اٹھا لیا۔ صحیح گرفت کے ساتھ اس نے صراحی کے گول حصے کو ناصر کے سر پر مارا۔ تقریباً ایک کلو وزن کا گرز جیسا گول حصہ ناصر کے سر کے پیچھے پڑ جاتا تو اس کی کھوپڑی کھل جاتی اور وہ ایسا گرتا کہ پھر نہ اٹھتا۔ لیکن ایک سیکنڈ کی تاخیر کے باعث وہ سیدھا ہونے کے لیے سر گھما چکا تھا۔ وار اس کی پیشانی پر پڑا۔ صدا نے اپنی جنونی نظر سے ناصر کی آنکھوں میں بے یقینی کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ پھر وہ نیچے گر گیا۔

صدا کا ہاتھ دوبارہ بلند ہوا۔ وہ ناصر کے شیطانی سر کو پاش پاش کر ڈالتی مگر کسی انجانی قوت نے چلا کے کہا۔ ''رک جاؤ صدا... تم ایک ماں بھی ہو۔ بوبی کو تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے ہاتھوں پر خون کی سرخی نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں بوبی کے باپ کا قاتل نہیں بننا ہے۔ صدا! رک جاؤ۔ یہ الزام مت لو۔ سمجھو یہ فلم کا آخری سین ہے۔ تمہاری زندگی کا آخری سین نہیں ہے۔ کیا آخری سین میں تم تختہ دار پر نظر آؤ گی؟''

صدا بیڈ پر گر گئی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس نے اپنا خشک حلق تر کیا اور پھر بستر پر سے چادر کھینچ لی۔ اس کا ایک کونا اپنے دانتوں سے کاٹ کے اس نے چوڑائی کے رخ

چارانچ کی پٹی پھاڑی۔ اچانک اس کے اندر ہمت اور توانائی بھر گئی تھی۔ اس نے الٹے پڑے ہوئے ناصر کے دونوں ہاتھوں کو کمر کے پیچھے مضبوطی سے باندھا۔ ہاتھوں پر دوسری رسی جیسی پٹی لپیٹ کر وہ مطمئن ہو گئی۔ ناصر چاہے جتنا زور لگا لے، اپنے ہاتھوں کو آزاد نہیں کرا سکتا تھا۔ دو پٹیوں سے اس نے ناصر کے پیروں کو بھی باندھ دیا۔ دراز میں سے ریوالور نکال کے اس نے سیفٹی پن کو کھینچ کر پیچھے کیا اور ایک انگلی سے ٹریگر کو چھوا پھر وہ ناصر کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی دستِ غیب نے فنا کے اندھے کنوئیں میں گرنے سے بچا لیا۔ اگر وہ سب ہو جاتا جو ناصر نے پلان کیا تھا تو؟ واقعات کی کڑیاں آپس میں ملتی جا رہی تھیں۔ صدا کو ناصر کے اعترافِ جرم کی ضرورت نہیں تھی لیکن ایک بلکہ دو معاملات میں اس کی وضاحت درکار تھی۔ لالچ نے اسے اتنا خود غرض، سفاک اور اندھا کر دیا تھا کہ اس نے اپنے ہی بیٹے کے اغوا کا ڈراما رچا کے اس کی ماں سے تاوان وصول کرنے کی کوشش کی... اور صدا جو اداکاری پر عبور رکھتی تھی، اس کی اداکاری کو سمجھ نہ سکی۔ اپنی کمزوری کے باعث وہ اس کی محبت کے جال میں پھر گرفتار ہو گئی۔ ناصر نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کہ وہ آج بھی صدا کو کسی کٹھ پتلی کی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ وہ جتنی کمزور ایک عورت کی حیثیت سے ہے، اس سے کہیں زیادہ کمزور ماں ثابت ہوگی۔

اچانک بجنے والی فون کی گھنٹی پر وہ چونکی۔ اس نے اسکرین پر نمودار ہونے والے نمبر کو دیکھا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ کیا یہ ناصر کے کسی سازش میں شریک ساتھی کا ہوگا جو اس سے تاوان پر بات کرے گا؟ ابھی کسی کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ سازش ناکام ہو چکی ہے۔ الٹا اسے یہ تاثر ملنا چاہیے کہ سب کچھ ان کے پلان کے مطابق جا رہا ہے۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہیلو۔“

دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ ”ہیلو... مجھے ناصر صاحب سے بات کرنا تھی۔“

”وہ تو موجود نہیں ہیں۔“

”اچھا، کیا آپ ان کی واقف ہیں؟ میں ابراہیم عباسی بول رہا ہوں... پرنسپل۔“

صدا مستعد ہو گئی۔ ”عباسی صاحب! میں بوبی کی ماما ہوں۔“

”مسز ناصر! بوبی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ وہ کب تک اسکول آئے گا... مسٹر ناصر اسے لے گئے تھے۔“

وہ بُری طرح چونکی۔ ”مسٹر ناصر اسے لے گئے تھے... کہاں؟ اور کب؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”اگر آپ اس کی مدر ہیں تو آپ کو پتا ہونا چاہیے۔“

”آئی ایم سوری... میں کراچی میں ہوں۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ بوبی کو میرے شوہر خود لے گئے تھے؟“

”آپ کیسی بات کر رہی ہیں؟ وہ میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ گھر میں کوئی تقریب ہے۔ بوبی کو دو دن کی رخصت دی جائے۔ پھر ان کا فون آیا کہ وہ بیمار ہو گیا ہے۔ ابھی اسکول نہیں آ سکتا۔ اور اس سوال کا مقصد کیا ہے مسز ناصر کہ خود آپ کے شوہر اسے لے گئے تھے؟ آپ اسکول کے پروسیجر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ سوائے پیرنٹس کے ہم بچے کو کسی سے ملنے بھی نہیں دیتے۔ ساتھ لے جانے کا کیا سوال... جتنا بچہ اپنی ماں اور باپ کو جانتا ہے، اتنا ہی ہم بھی جانتے ہیں۔“

صدا نے معذرت کی۔ ”سوری سر! میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل ناصر سے میری بات ہی نہیں ہوئی تھی بوبی کی بیماری کے مسئلے پر... شاید میری پریشانی کے خیال سے انہوں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ بوبی آ جائے گا ایک دو روز میں۔“

عباسی نے کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ شاید اس نے صدا کی بات کا بُرا مانا تھا۔ صدا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ”یا میرے خدا! کیا ہو گیا تھا مجھے؟ ایسا اندھا یقین تھا میرا ناصر پر... اس نے جو کہا میں مانتی چلی گئی۔ میں نے تصدیق کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور میرے مقابلے میں اس کو کتنا اعتماد تھا۔ میرے اندھے پن پر... میری کم عقلی پر... وہ جانتا تھا کہ میں اسکول جا کے تصدیق کی ضرورت محسوس ہی نہیں کروں گی کیونکہ یہ فرض کیا ہی نہیں جا سکتا کہ ایک باپ خود اپنے بیٹے کے اغوا کا ڈراما کرے گا اور اس عورت سے تاوان بھی وصول کر لے گا جو اس کے بچے کی ماں ہے۔ ایسی گھناؤنی سازش... وہ تو شاید مجھے کنگال کر کے باہر نکل جاتا۔ میں اس کے خلاف کیا ثابت کرتی اور کیسے ثابت کرتی۔ اسکول والے بھی بوبی کے اغوا سے لاعلمی ظاہر کرتے اور صحیح ہوتے... میں کہتی کہ وہ اپنی ساکھ بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔ بوبی کے خیروعافیت سے واپس مل جانے کے بعد میں صرف خدا کا لاکھ بار شکر ادا کرتی۔ شاید بوبی کو کسی دوسرے اسکول میں داخل کرا دیتی۔ لیکن میرا سب کچھ ہتھیا لینے کے بعد کیا ناصر مجھ سے شادی کرتا؟

ناصر کے کراہنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ آنکھیں کھول کے اور گردن گھما کے صدا کو دیکھ رہا تھا۔

”صدا... ایسا کیوں کیا تم نے آخر؟“ وہ کراہا۔

صدا نے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کی۔ ”اب بھی حوصلہ ہے تم میں مجھ سے سوال کرنے کا؟ بوبی کے پرنسپل نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے... باقی میں نے پہلے ہی جان لیا تھا۔ اس نے تمہارے شیطانی منصوبے کا راز فاش کیا... یہ ہے تمہارا نامۂ اعمال۔“ اس نے موبائل فون کو ناصر کی ناک کے سامنے لہرایا۔

وہ چلّایا۔ ”کچھ ثابت نہیں ہوتا اس سے... اور بے وقوف عورت... اپنا بیٹا گنوا کے تم ساری عمر روتی رہو گی۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“

”میں بتاتی ہوں تم نے کیا کیا... تم نے میری... بے وقوفی سے... میرے اعتماد سے اور میری کمزوری سے فائدہ اٹھایا... میری جذباتی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنایا اور مجھے ایک کٹھ پتلی کی طرح استعمال کیا... جب میں تمہاری محبت کے جال میں پھر گرفتار ہو گئی تو تم نے میری ساری دولت ہتھیانے کی سازش کی۔ مجھے یہ احساس دلایا کہ میں تنہا اور کمزور ہوں۔ تم میرا مضبوط سہارا بن سکتے ہو... میرے بیڈروم میں مجھ پر خنجر سے قاتلانہ حملے کا ڈراما اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ میں کیا پولیس بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ تمام سیکیورٹی کے باوجود وہ قاتل میری خواب گاہ کے اندر کیسے پہنچا۔ اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ اسے تم نے اندر پہنچایا تھا جب تم خود اندر آئے تھے۔ شاید وہ تمہاری کار کی ڈکی میں ہوگا۔“

”یہ جھوٹ ہے... بکواس ہے... کون یقین کرے گا اس پر...“

”جب میں ثبوت پیش کروں گی۔“ صدا نے موبائل فون اٹھا کے کہا۔ ”تو تردید کون کر سکے گا؟ اس کی آواز بھی کافی تھی۔ آج کل آواز کا گراف بھی بن جاتا ہے لیکن تصویر سامنے ہوگی تو تم کیا کہو گے؟ کیا وہی شخص تمہارا ڈرائیور نہیں ہے؟ جب میں نے اسے دیکھا تو فوراً میرا خیال اس کی طرف نہیں گیا تھا... لیکن اس کی صورت مجھے خواب میں ڈراتی تھی۔ ایک دن میں نے تم سے پوچھا بھی تھا۔ اس شخص کا مقصد محض مجھے دہشت میں مبتلا کرنا تھا۔ تم مجھے احساس دلانا چاہتے تھے کہ اکیلی میں کتنی غیر محفوظ ہوں۔ تمام حفاظتی انتظامات بیکار ہیں۔ میرے محافظ صرف تم ہو اور میں نے جذبات کی رو میں یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ صرف تم جیسا شوہر ہی مجھے تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔“

”اس طرح تم اپنا بیٹا گنوا دو گی صدا۔“

”میرا بیٹا؟ کیا اکیلے میں نے اسے پیدا کر لیا تھا؟“

صدا نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا۔ ”میری قوتِ برداشت کا امتحان مت لو ناصر! جو تم نے اپنی اولاد کے ساتھ کیا ہے، ناقابلِ تصور ہے۔ کوئی باپ خود اپنی اولاد پر ایسا وحشیانہ تشدد نہیں کرا سکتا۔ لالچ میں ایسا اندھا نہیں ہو سکتا کہ وہ خون کے رشتے کو دفن کر دے۔ صرف مجھے دکھانے اور دہشت زدہ کرنے... مجھے مجبور اور پاگل کرنے کے لیے تم نے اس معصوم بچے پر وہ ظلم کیا جو دشمن اپنے قیدی پر کرتے ہیں، جو پولیس کسی مجرم سے اقبالِ جرم کرانے کے لیے کرتی ہے... اس کی چیخوں سے تمہارا دل نہیں پھٹا... تم نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کرنے کے لیے وہ تشدد کیا۔ خود اپنے اکلوتے بیٹے پر... جو تھانے والے رشوت وصول کرنے کے لیے کسی بے گناہ پر کرتے ہیں۔ اور تم کامیاب رہے۔ کتنی خوشی ملی ہوگی تمہیں جب میں نے خود دس کروڑ کی رقم کو بڑھا کے پچیس کروڑ کر دیا تھا۔ کیا کرتے تم اگر وہ سب تمہیں مل جاتے؟ بوبی کو میرے حوالے کر کے مجھے چھوڑ جاتے؟ مجھ سے شادی کرنا تو کبھی تمہارا مقصد نہیں تھا۔ تم پر کوئی الزام نہ آتا مگر تم مجھ پر کوئی الزام لگا کے نکل جاتے... تمہارے دامن پر کوئی داغ نہ ہوتا۔ میں مجرم بن جاتی۔ میری زندگی بھر کی کمائی تمہارے کام آتی۔“

ناصر نے کراہ کے کہا۔ ”خدا کے لیے میرے ہاتھ پیر کھول دو... مجھے سخت اذیت ہو رہی ہے۔“

صدا نے سیفٹی کیچ ہٹا کے ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا۔ ”اذیت ہو رہی ہے؟ تمہیں کوئی احساس نہیں اس اذیت کا جو میں نے برداشت کی۔ جو ایک معصوم آٹھ سال کے بچے نے جھیلی۔ کیوں نہ میں تمہارے شیطانی سر میں ایک سوراخ کر کے تمہاری ساری اذیت کا خاتمہ کر دوں۔ اگر میں نے تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا ناصر... تو تم تفتیش کی اذیت کو دس منٹ بھی برداشت نہ کر سکو گے اور سب بتا دو گے۔ خود اپنے بیٹے کا سوچو... کتنے دن اس نے سب کچھ جھیلا... پولیس کے طریقوں سے تو واقف ہو گے تم؟“

وہ چلّایا۔ ”بار بار پولیس کی دھمکی کیوں دیتی ہو؟ بلا لو پولیس کو اور ختم کرو یہ تماشا۔“

صدا نے اس کے منہ پر ایک لات رسید کی۔ ناصر کے ہونٹوں کے کنارے پھٹ گئے۔ ”تمہیں اعتماد ہوگا کہ رشوت دے کر تم بچ جاؤ گے۔ تمہارے خلاف کوئی جرم ثابت بھی نہیں ہوگا لیکن میری اسکول کے پرنسپل سے بھی بات ہو چکی ہے۔ اس نے بتا دیا تھا کہ تم خود جھوٹ بول کے

بوبی کو لاتے تھے۔ میں ایک موقع دے رہی ہوں تمہیں کیونکہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ بوبی زندہ ہے۔ میرا سب کچھ میرا ہی ہے۔ بینک نے کسی کو ادائیگی نہیں کی۔ میرے اثاثے محفوظ ہیں۔ بوبی کو میرے حوالے کردو۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔"

"میرے جیسے شیطان پر یہ مہربانی کیوں؟" وہ تلخی سے بولا۔

"تمہارا جرم ناقابلِ معافی ہے لیکن ایک ماں مجبور ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ سب بوبی کو معلوم ہو۔ یہ کیس میڈیا میں اپنی تمام مکروہ تفصیلات کے ساتھ آئے۔ میری جیسی عورت کے لیے اسکینڈل اور منفی پبلسٹی بھی شہرت کا ذریعہ بنتی ہے۔ بدنامی سے اس کا کیا جاتا ہے جو اپنی ساری نیک نامی نیلام کرچکی ہو۔ لیکن میرا ایک بیٹا ہے۔ اس کا بہترین۔۔۔۔ مستقبل اس کے سامنے ہے۔ اسے داغ دار نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں نے اپنے کیریئر کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں یوٹرن لے کر صدا سے پھر صادقہ خاتون بن جاؤں گی۔ میں اپنا کیریئر ہی نہیں۔۔۔ یہ شہر اور یہ ملک بھی چھوڑ جاؤں گی۔ بوبی کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس کی ماں کا ماضی کیا تھا اور اس کا باپ کتنا خودغرض اور سفاک تھا۔ اس یوٹرن کے بعد ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا اپنے ماضی سے فاصلہ بڑھتا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بیٹے کا مستقبل ہی نہیں، ماضی بھی قابلِ فخر ہو۔ یہ ماضی میں اسے بنا کے دوں گی۔ اسی طرح جیسے میں اس کا مستقبل بنانے میں اس کے ساتھ ہوں۔ بعض اوقات سچ کے مقابلے میں جھوٹ ایک نیکی بن جاتا ہے۔ میں اسے بتا سکتی ہوں کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ وہ ایک کالج میں پروفیسر تھا۔ میں خود اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اس کا دادا ایک مسجد میں پیش امام تھا اور نانا ایک حکیم۔۔۔ تمہارے جھوٹ کی انتہا بھی کوئی نہ تھی۔ پھر میں کیوں کمی کروں جب میرے جھوٹ سے فائدہ میرے بیٹے کو ہو۔۔۔ بولو بوبی کہاں ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ اسی گھر میں کہیں ہوگا۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "تمہارا خیال درست ہے۔"

☆☆☆

لنکن ان میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلے کے تمام خواہش مند اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

"مسٹر محمد علی۔۔۔ فرام پاکستان۔" ایک اسپیکر سے کسی انگریز خاتون کی آواز سنائی دی۔

ہال میں بیٹھے ہوئے درجنوں افراد میں سے ایک خوب صورت، دراز قد نوجوان بڑی مستعدی سے اٹھا۔ وہ سیاہ سوٹ اور بلیک بوٹائی میں تھا۔ اس کے ساتھ اٹھنے والی عورت شاید چالیس سے اوپر کی ہوگی مگر رکھ رکھاؤ اور وقار نے اس کی شخصیت کو پُرکشش بنا دیا تھا۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی باندھ رکھی تھی اور نازک سنہری فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ نوجوان کے ساتھ ہی دروازے سے اس کانفرنس روم میں پہنچی جہاں ایک ٹیبل کے گرد عمر رسیدہ سفید سروں والے شفیق صورت لوگ بیٹھے تھے۔ ماں بیٹا ایک کنارے پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

"مسٹر محمد علی!" ایک شخص نے شائستگی سے سوال کیا۔ "آپ کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ لیکن کیا آپ ہمیں بتائیں گے کہ دوسرے تمام منافع بخش سمجھے جانے والے پیشوں پر آپ وکالت کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟"

"بس سر! پیسا کمانا کبھی میری ترجیح نہیں رہا اور پیسے تو لوگ غیر قانونی، غیر اخلاقی اور ناجائز ذرائع سے کما ہی رہے ہیں۔ میرے پیشِ نظر اعلیٰ و ارفع مقاصد تھے۔ میں علم کی روشنی پھیلانا چاہتا تھا، یا مظلوم کو انصاف کی فراہمی۔"

عورت نے اپنے بیٹے کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔ "میں مداخلت پر معذرت خواہ ہوں لیکن کیا میں بھی کچھ کہہ سکتی ہوں؟"

سب کے سر اس کی طرف گھوم گئے۔ "اگر کوئی اہم نکتہ ہے تو ہم سن رہے ہیں۔"

"یہ بہت اہم ہے جنٹلمین۔۔۔ بہت پہلے اس معتبر ادارے میں ایک طالب علم آیا تھا۔ ایک صدی سے زیادہ ہوا۔ اس کا نام بھی محمد علی تھا، محمد علی جناح۔۔۔ وہ یہاں سے قانون کی اعلیٰ سند حاصل کر کے گیا اور اسی نے وہ ملک پاکستان بنایا تھا جہاں سے آج میرا بیٹا۔۔۔ ایک اور محمد علی۔۔۔ اتنے ہی بلند اور نیک عزائم کے ساتھ یہاں آیا ہے۔ پلیز اسے مایوس نہ لوٹائیں۔۔۔ تاکہ وہ بھی اتنا ہی عظیم انسان بنے۔"

ہال میں انٹرویو کرنے والے بورڈ کے چیئرمین کی ایک تالی گونجی۔ "آپ کے بیٹے کو کسی تعریف یا سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم میرٹ پر اس کے داخلے کا اصولی فیصلہ کر چکے تھے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ ہماری توقعات پر بھی پورا اترے گا۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لیے اٹھی اور اس نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ سر اٹھا کے بیٹے کے ساتھ باہر نکل گئی۔ برسوں پہلے اس نے جو یوٹرن لیا تھا، صحیح سمت میں تھا۔